سخن

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

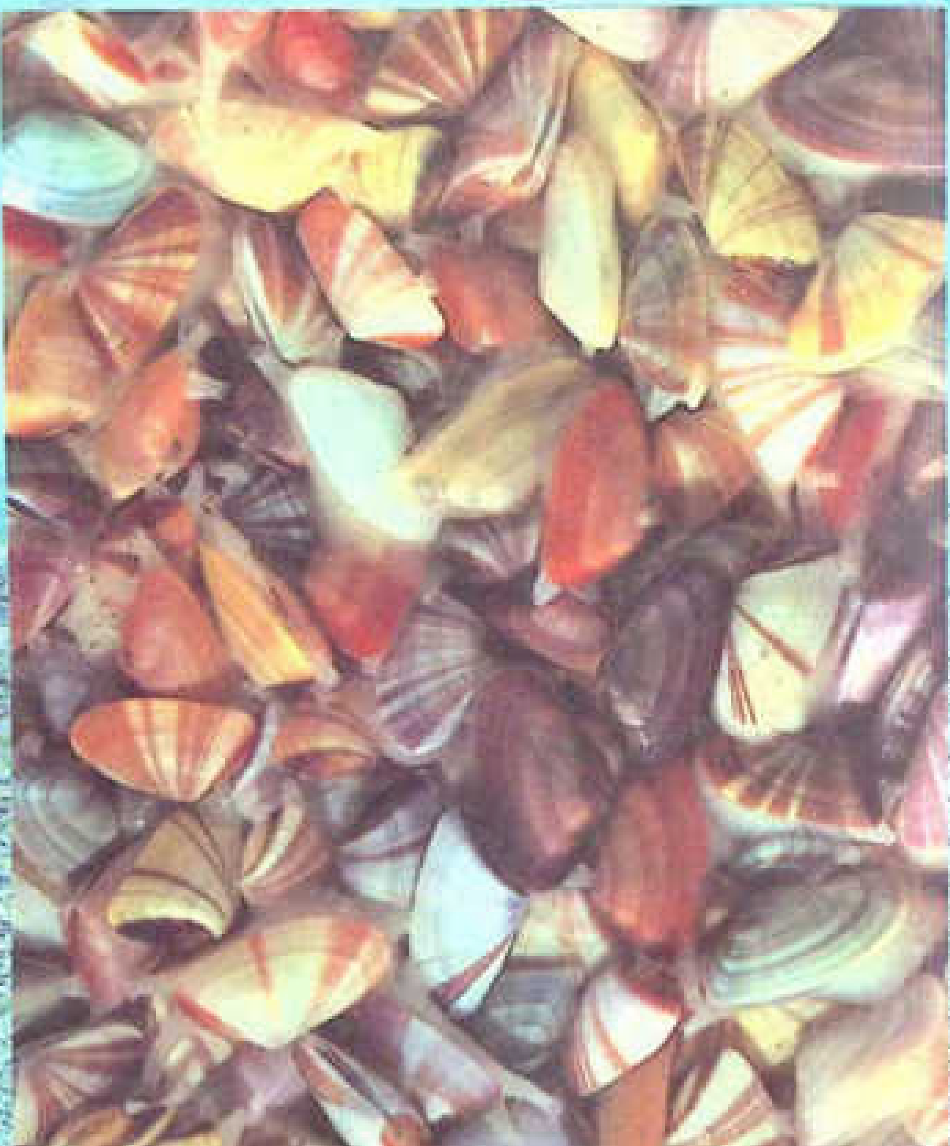

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

لا اله الا الله
محمد رسول الله

لا اله الا الله
محمد رسول الله

ترجمہ ________ ایم اے انصاری

تدوین ________ رضا ایچ رضوانی

کتابت ________ ایس اشرف راحت

تصحیح ________ کاظم اے گجراتی

مطبع ________ پراعتماد پرنٹرز

طبع دوم ________ ۱۴۱۳ھ - ۱۹۹۲ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں، یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہٰذا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دی جائیگی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کیجائیگی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنیوالے پر یہ شرط عائد نہ کرنیکے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی

جامعہ تعلیمات اسلامی

انتساب

آغوشِ رسولؐ کے پروردہ
اِقلیمِ سُخن کے بادشاہ
اِمام علی بن ابی طالبؑ کے نام

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی دنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا" لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرنا اور اس گرانبہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔ یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۵۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بناپر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ۴۰ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دعا ہے کہ خداوندِ منان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

دعاؤں کا طلبگار:

شیخ یوسف علی نفسی نجفی

قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارۂ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس ارشادِ ربانی کی تعمیل ہو سکے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

(سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکریٹری نشرواشاعت

فہرست

سخن ہائے گفتنی	9
تقویٰ	۱۳
آثارِ تقویٰ	۳۸
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حقیقت	۶۴
اسلام میں اجتہاد کا مقام	۹۴
احیائے فکرِ دینی	۱۳۲
فریضۂ علم	۱۵۵
نوجوان نسل کی رہنمائی	۱۹۱
خطبہ اور منبر (۱)	۲۳۲
خطبہ اور منبر (۲)	۲۴۵
دینی رہبری کے نظام کی بنیادی شکل	۲۸۱
امام علیؑ اور اصولِ عدل	۳۲۱
اسلام میں عدل کی اہمیت	۳۵۰
اسلام میں حقوقِ انسانی کی بنیاد	۳۸۱

رعایتِ حقوق اور دنیا کی بے وقعتی ۴۰۸
صحیح امتیاز اور غلط امتیاز ۴۳۸
خدا کے رازق ہونے کا مطلب ۴۶۹
امام جعفر صادق علیہ السلام ۴۸۵
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ۵۰۸
مشکلات و مصائب کی اصلیت ۵۲۱
ایمان کے فوائد ۵۳۳
دنیا کے بارے میں دین کا نقطۂ نظر ۵۴۸
اسلام اور علم ۵۶۴
دینی سوالات پوچھنے کے حدود ۵۷۶
عقل اور دل ۵۸۵
موسم بہار اور نمودِ حیات ۵۹۸
قرآن اور مطالعۂ کائنات ۶۱۳
قرآن نے حیات کو دلیل توحید قرار دیا ہے ۶۲۴
دعاء و مناجات ۶۴۲
انسان کی قوتِ ادراک ۶۵۹
نامعلوم امور کا بے جا انکار ۶۷۵
عربی متن ۶۸۵

بنام خدائے بیاں آفریں

سخن ہائے گفتنی

کوئی پچیس برس اُدھر کی بات ہے کہ تہران میں چند ایک علماء و فضلاءؒ نے ماہانہ علمی اجتماعات کے ایک مبارک سلسلے کا آغاز کیا۔ ان اجتماعات کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ دینی موضوعات پر تسلسل کے ساتھ سنجیدہ بحث و تحقیق کی جائے۔ اس بنا پر انھوں نے باہم طے کیا کہ اس اجتماع میں اگر کوئی مقرر تقریر کی عام روش سے ہٹ کر بھی بات کرے تو یہ چیز اس بزم علمی کے طریق کار کی خلاف ورزی تصور نہیں کی جائے گی۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ کسی وقت تقریر کے دوران میں ایک کتاب میں سے کوئی اقتباس پڑھ کر سنایا جانا ضروری ہو۔ اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ کسی مقرر نے اپنی تحقیق کے مطابق جو کچھ بیان کیا ہو، وہ اپنے مزید مطالعہ کے نتیجے میں کسی دوسرے موقع پر اپنے پہلے قول کی خود ہی تردید کر دے۔ علاوہ ازیں ان اجتماعات میں یہ گنجائش بھی موجود تھی کہ کوئی دوسرا مقرر اپنے سے پہلے مقرر کی کسی بات کو دلیل و برہان کے ساتھ غلط قرار دیدے۔

چونکہ ان اجتماعات میں ہر مقرر کو شروعات میں اپنے موضوع کا اعلان لازماً کرنا ہوتا تھا' اس لیے وہ پوری طرح تیاری کر کے آتا اور سامعین کو بھی پہلے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ آج وہ کس موضوع پر تقریر سنیں گے۔ لہٰذا وہ خود کو اس خاص موضوع پر ہونیوالی گفتگو سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیتے تھے۔ یہ تھا وہ مخصوص طریقۂ کار جس کی بدولت ان علمی اجتماعات میں افادہ اور استفادہ کے یکساں مواقع میسر تھے۔

ان علمی محافل میں بافضیلت افراد مجتمع ہوتے اور وہاں اپنے وقت کے عظیم اور باکمال ـــــ ارباب سخن ـــــ داد سخن دیتے۔ ان میں ایک ممتاز نام ـــــ استاد مطہری شہید کا ہے۔ انھوں نے ان علمی مجالس میں مختلف اسلامی موضوعات پر اپنے مخصوص انداز میں جو یادگار تقریریں کیں' زیر نظر کتاب ـــــ سخن ـــــ ان کا ایک شاندار مجموعہ ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایسی بلند پایہ سخنرانی ایک ایسے ہی سخن سنج کا کام تھا جو رسوخ علم' وسعت نظر اور تحرک فکر کا حامل اور اسلامی اقدار کے احیاء کا عزم رکھنے کے علاوہ ایک دردمند دل بھی رکھتا ہو۔ ع

نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پرسوز

نیز وہ احیائے اسلام کی خاطر چلائی جانے والی زندہ تحریکوں سے عملی وابستگی بھی رکھتا ہو۔ ہاں ـــ وہ استاد مطہری کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ جس میں مذکورہ بالا تمام تر صفات یکجا ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ تقاریر ہمیشہ کی طرح آج بھی تر و تازہ اور بالیدہ ہیں۔ چنانچہ ان تقریروں پر مشتمل زیر نظر کتاب سخن ـــــ میں علمی تبحر' تاریخی استناد' تحقیقی زاویے' تخلیقی قوت' عصری شعور اور بلاغت کے ساتھ ساتھ مطالب کی گہرائی اور گیرائی سبھی کچھ

نظر آتا ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ہر علم دوست شخص کو دینی موضوعات پر علمی و تحقیقی کتابوں کی کمی کا سخت احساس ہوتا تھا، لیکن ــــ بحمداللہ اب محرومیت کا یہ تصور آج کی کامرانی اور آنیوالے کل کے لیے بلند تر توقعات میں بدل رہا ہے۔ کیونکہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی نے اُردو، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں جو مختلف النوع علمی و تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں' ان کے پیشِ نظر خواص کے ساتھ عوام بھی اپنے گرانقدر اسلامی علمی ورثہ پر نازاں ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ اپنی اس کامیابی پر جامعہ بدرگاہ خدائے تعالیٰ کے حضور سپاس گزار ہے۔ اس ضمن میں ہم یہ تو نہیں کہتے کہ "کاری کردیم"۔ ــــ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ ہم نے کام کرنے کی ایک نئی راہ نکالی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ؎

دیگراں آیند و کاری کنند

یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو ہمارے سلسلۂ بیان میں در آیا۔ اس کے بعد ہم بات پھر وہیں سے شروع کرتے ہیں ــــ جہاں چھوڑی تھی۔ ہم کہہ رہے تھے کہ ــــ سخن ــــ میں تمام علمی و فنی خصوصیات موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کلام اپنے متکلم کی ذات کا نقش پیش کرتا ہے۔ چونکہ استاد مرتضیٰ مطہری شہید ایک جامع صفات ہستی کے مالک تھے' اس لیے ان کی ذات کا جلوہ ان کی اس کتاب میں بھی نظر آتا ہے۔

جیسا کہ صاحبانِ فکر و نظر جانتے ہیں کہ ہر عہد اور ہر نسل کا ایک خاص مطمع نظر ہوتا ہے۔ جس کے مطابق تاریخ کی تعبیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ آج اُمتِ مسلمہ کا ہدف "احیائے فکر دینی" ہے ــــ اور استاد مطہری اس میدان کے پیش رس شہسواروں میں ہیں۔ ان کی یہ کتاب ــــ سخن ــــ ہمارے علمی سلسلۂ اشاعت کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس

کی طباعت و اشاعت میں ہم نے درج ذیل مقاصد کو مدِّ نظر رکھا ہے:

(۱) سخن کے مطالعہ سے ہمارے خطیب، مقرر اور ذاکر حضرات دینی موضوعات پر غور و فکر کرنے کے نئے انداز اور اظہار و بیان کے نئے اسلوب سے روشناس ہوں۔ پھر وہ اسلامی نظریات کے ماتحت عصرِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور دینی و اخلاقی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر واضح کریں۔

(۲) سخن ـــــ میں کارفرما فکر و نظر سے استفاضہ کرتے ہوئے ہمارے علماء و فضلاء بھی اسی نہج پر خالص علمی و تحقیقی مجالس کا اہتمام کریں، جہاں اسلامی اور عصری علوم پر عبور رکھنے والے افاضل نئے مسائل کا اسلامی حل پیش کریں اور حاضرین ـــــ بالخصوص مسلم نوجوانوں کے اشکالات کو رفع کریں تاکہ وہ مطمئن قلب و ذہن کے ساتھ اسلام دشمن قوتوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دینے کے لیے آمادہ اور تیار رہیں۔

آخر کلام میں یہ گزارش کر دینا بھی ضروری ہے کہ سخن کی ترتیب و تدوین میں فارسی سے اُردو ترجمہ ہونے کے باوصف بھی ہم نے استاد مطہریؒ کے اندازِ خطابت اور طرزِ بلاغت کو قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں، اس کا فیصلہ ہم نے محترم قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔

ناشر

تقویٰ

تقویٰ کے لغوی معنی

تقویٰ کا لفظ ایک کثیر الاستعمال اور مقبول عام دینی اصطلاح ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اسم اور فعل دونوں صورتوں میں پچاسوں جگہ آیا ہے۔ یہ لفظ تقریباً اتنی ہی بار استعمال ہوا ہے جتنی بار مثلاً ایمان یا عمل کا لفظ یا جتنی بار صلات اور زکات کا لفظ۔ قرآنِ کریم میں روزہ کی نسبت تقویٰ کا تذکرہ بہت زیادہ ہے۔ نہج البلاغہ میں جن الفاظ کا استعمال بار بار ہوا ہے ان میں سے ایک تقویٰ بھی ہے۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ ہے جس کا نام "خطبہ متقین" ہے۔ یہ خطبہ امیر المومنینؑ نے کسی شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا جس نے درخواست کی تھی کہ متقی کے اوصاف ایسی

وضاحت سے بیان کیے جائیں کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ ابتدا میں تو امام نے اس کی درخواست مسترد کر دی اور پھر صرف تین چار جملوں پر اکتفا فرمایا لیکن جب وہ شخص جس کا نام ہمام بن شریح تھا اور جو بہت ہوشیار اور تیز آدمی تھا کسی طرح مطمئن نہ ہوا اور اصرار ہی کرتا رہا اور اس نے منت سماجت شروع کر دی تو امیر المومنینؑ نے بھی مفصل گفتگو کا آغاز کر دیا۔ آپ نے متقی کی سو سے زیادہ صفات بیان کیں اور اس کی سو سے زاید خصوصیات کا نقشہ کھینچا اور اس کے فکری، اخلاقی اور عملی اوصاف پر بیان ختم ہوا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جیسے ہی امام علیؑ کی گفتگو ختم ہوئی، ہمام نے ایک چیخ ماری اور وہیں جاں بحق ہو گیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تقوٰی کا لفظ عام طور پر رائج دینی اصطلاح ہے اور عام لوگوں کی زبان پر بھی یہ لفظ بار بار آتا ہے۔

اس لفظ کا مادہ و ق ی ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت، اس کا بچاؤ اور نگہداشت۔ اِتِّقاء کے معنی ہیں محفوظ رکھنا، لیکن یہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا کہ ہماری زبان میں تقوٰی کا ترجمہ حفاظت، بچاؤ یا نگہداشت کیا گیا ہو۔ جب یہ لفظ اسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو تقوٰی کا ترجمہ پرہیزگاری اور متقی کا ترجمہ پرہیزگار کیا جاتا ہے۔ مثلاً ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے۔ اگر یہی لفظ بطور فعل استعمال ہوتا ہے تو اگر امر کا صیغہ ہو اور اس کا مفعول بھی مذکور ہو تو اس کا ترجمہ خوف اور ڈر کیا جاتا ہے۔ مثلاً اِتَّقُوا اللّٰہَ کا ترجمہ ہوگا ڈرو اللہ سے، اور اِتَّقُوا النَّارَ کا ترجمہ ہوگا ڈرو آتش جہنم سے۔

یہ ضرور ہے کہ آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تقوٰی کا ترجمہ ڈر اور

خوف یا کسی چیز سے پرہیز اور اجتناب ہے لیکن چونکہ کسی چیز سے خوف کا لازمی نتیجہ ہے اس چیز کا ترک اور اس سے اپنا بچاؤ، اس لیے خوف اور بچاؤ لازم و ملزوم ہیں۔ ان باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مادّہ مجازاً بعض موقعوں پر اجتناب کے معنی میں اور بعض موقعوں پر خوف اور ڈر کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس میں تو کوئی حرج نہیں کہ یہ لفظ مجازاً اجتناب یا خوف کے معنی میں استعمال کیا جائے لیکن ساتھ ہی اس کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی ہی مقصود ہوں یعنی مثلاً ڈر یا اجتناب۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ کے یہی معنی ہیں کہ اللہ سے ڈرو یا اِتَّقُوا النَّارَ کے یہی معنی ہیں کہ آتش دوزخ سے ڈرو بلکہ اس قسم کے جملوں کے دراصل یہ معنی ہیں کہ اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھو' یا خود کو آتشِ دوزخ سے بچاؤ۔ لہٰذا تقوٰی کا صحیح ترجمہ ہوا اپنی حفاظت یا اپنا بچاؤ، ضبطِ نفس کا بھی یہی مطلب ہے۔ اس طرح متقین کے معنی ہوئے اپنی حفاظت کرنے والے۔

راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات القرآن میں کہتا ہے:

"وِقَایَۃ" کے معنی ہیں کسی چیز کو نقصان دینے والی باتوں سے محفوظ رکھنا' اور تقوٰی کا مطلب ہے ان باتوں سے بچنا جن کا خوف ہو۔ یہ تو ہوئی اس کی لفظی تحقیق۔ بعد میں کبھی کبھی خوف کو تقوٰی اور تقوٰی کو خوف کہا جانے لگا جیسا کہ سبب کو مسبب کے معنی میں یا مسبب کو سبب کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی اصطلاح میں تقوٰی کے معنی ہو گئے نفس کو گناہ سے محفوظ رکھنا اور منہیات سے اجتناب کرنا۔" [1]

راغب یہ تو تصریح کرتا ہے کہ تقوٰی کے معنی ہیں خود کو محفوظ رکھنا لیکن

وہ صراحتاً یہ نہیں کہتا کہ خوف تقویٰ کے مجازی معنی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ کے مجازی معنی مقصود ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے، اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ اس طرح کے جملوں میں تقویٰ کا لفظ مجازی معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔

یہ بات نسبتاً عجیب معلوم ہوتی ہے کہ فارسی (اور اردو) میں اس لفظ کا ترجمہ پرہیزگاری کیا گیا ہے۔ اب تک یہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی جگہ اہلِ لغت نے یہ کہا ہو کہ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابھی ہم نے دیکھا کہ راغب نے یہ تذکرہ تو کیا ہے کہ یہ لفظ خوف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن پرہیزگاری کا تو اس نے نام بھی نہیں لیا۔ معلوم نہیں کب سے اور کیوں اس کا ترجمہ پرہیزگاری رواج پا گیا۔ کوئی اہلِ زبان دورِ قدیم یا دورِ جدید میں اس لفظ کا یہ مفہوم بیان نہیں کرتا۔ اس میں تو شک نہیں کہ تقویٰ اور کسی چیز سے حفاظتِ نفس کا لازمی نتیجہ اس چیز کا ترک اور اس سے اجتناب ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تقویٰ کے معنی ہی ترک، پرہیز اور اجتناب کے ہو گئے۔

خوفِ خدا

چونکہ ضمناً خوفِ خدا کا تذکرہ آ گیا ہے، یہ نکتہ بھی بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ خوفِ خدا کا کیا مطلب ہے؟ کیا خدا کوئی خوفناک چیز ہے؟ خدا تو کامل و اکمل اور اس قابل ہے کہ انسان اس سے محبت کرے اور اسے دوست رکھے۔ پھر خدا سے ڈرنے کے کیا معنی ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ واقعی ذاتِ خداوندی خوف اور دہشت کا سبب نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے اس کا مطلب یہ ہے کہ عدلِ الٰہی کے قانون سے ڈرنا چاہیے۔ دعا میں آیا ہے:

یَا مَنْ لَا یُرْجٰی اِلَّا فَضْلُهٗ وَلَا یُخَافُ اِلَّا عَدْلُهٗ.

"اے وہ ذات کہ جس کے فضل و کرم ہی سے امیدیں وابستہ ہیں اور خوف صرف اس کے عدل کا ہے۔"

اسی طرح دعا میں یہ بھی آیا ہے:

جَلَلْتَ اَنْ یُّخَافَ مِنْكَ اِلَّا الْعَدْلُ وَاَنْ یُّرْجٰی مِنْكَ اِلَّا الْاِحْسَانُ وَالْفَضْلُ.

"تو اس سے بالاتر ہے کہ تجھ سے سوائے تیرے عدل کے کسی اور وجہ سے ڈرا جائے اور تجھ سے سوائے تیرے لطف و کرم کے کوئی اور امید رکھی جائے۔"

عدل و انصاف بھی بذاتِ خود کوئی ڈرنے اور خوف کھانے کی چیز نہیں۔ انسان اگر عدل سے ڈرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنی ذات یا اپنے اعمال سے ڈرتا ہے کہ مبادا اس نے ماضی میں کوئی غلطی کی ہو یا آئندہ اپنی حدود سے تجاوز کرے اور دوسروں کے حقوق پامال کرے۔ لہٰذا خوف و رجا کے یہ معنی ہیں کہ مومن ہمیشہ پُرامید بھی رہے اور خائف بھی، بھلائی کی توقع بھی رکھے اور فکر مند بھی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسِ امارہ کی سرکشی سے خوف زدہ رہے کہ کہیں عقل و ایمان کی باگ ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے اور ساتھ ہی ذاتِ خداوندی پر بھروسہ بھی رکھے اور یہ آس لگائے رہے کہ اللہ کی مدد ہمیشہ اس کے شاملِ حال رہے گی۔ حضرت علی بن الحسین علیہ السلام مشہور دعائے "ابوحمزہ ثمالی" میں فرماتے ہیں:

مَوْلَایَ اِذَا رَاَیْتُ ذُنُوْبِیْ فَزِعْتُ وَ اِذَا رَاَیْتُ کَرَمَکَ طَمِعْتُ۔

"میرے آقا! جب میں اپنی خطائیں دیکھتا ہوں تو مجھ پر خوف وہراس چھا جاتا ہے لیکن جب تیرے کرم پر نظر پڑتی ہے تو امید بندھ جاتی ہے۔"

یہ وہ نکتہ ہے جسے ہم نے ضروری سمجھا کہ ضمناً بیان کر دیا جائے۔

تقویٰ کی حقیقت اور اس کے معنی

تقویٰ کے جو لغوی معنی بیان کیے گئے ہیں ان سے کسی حد تک یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تقویٰ کی حقیقت اور اس کے معنی کیا ہیں لیکن ضروری ہے کہ اسلامی اور مذہبی آثار میں اس کے محلِ استعمال پر دوبارہ نظر ڈال لی جائے تاکہ تقویٰ کے معنی پوری طرح واضح ہو جائیں۔ پہلے ہم ایک تمہید بیان کرتے ہیں۔

اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی اصول ہو اور وہ اس اصول پر کاربند رہے تو چاہے اس اصول کا مآخذ دین و مذہب ہو یا کچھ اور اسے لازماً اپنے لیے ایک خاص روش متعین کرنی ہوگی تاکہ وہ جو کام بھی کرے وہ افراتفری اور بے اصولی کا شکار نہ ہو جائے۔ ایک متعین روش اختیار کرنے اور خاص مسلک اور عقیدہ اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک مخصوص سمت میں ایک خاص مقصد کی طرف بڑھتا رہے اور ان کاموں سے اجتناب کرے جو اس کی وقتی خواہشات سے مطابقت تو رکھتے ہیں لیکن اس کے اصول اور مقصد کے منافی ہیں۔

اس لیے وسیع ترمعنی میں تقویٰ ہر اس فرد کی زندگی کا لازمہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ "انسان" بن کر رہے اور عقل کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے اور کسی خاص اصول کا پابند ہو۔

دینی لحاظ سے تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں دینی اصولوں کو اپنائے اور جو کام دین کے نقطۂ نظر سے غلط اور گناہ ہیں اور ناپاک اور برے سمجھے گئے ہیں ان سے بچے اور ان کا مرتکب نہ ہو۔

اب بات یہ ہوئی کہ گناہوں کی آلودگی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا نام تقویٰ ہے۔ اس کی ممکنہ شکلیں دو ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن ہے کہ ہم تقویٰ کی دو قسموں میں سے کوئی ایک اختیار کریں۔ پہلی قسم ہے ضعیف تقویٰ اور دوسری ہے قوی تقویٰ۔

پہلی قسم تو یہ ہے کہ ہم گناہوں کی آلودگی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور ان اسباب سے احتراز کریں جن کی وجہ سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہ کے ماحول سے دور رکھیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرے اور بیماری کے ماحول، جراثیم اور بیماری کی چھوت سے بچنے کی کوشش کرے مثلاً وہاں نہ جائے جہاں ملیریا پھیلا ہوا ہو اور ان لوگوں سے دور رہے جو کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہوں۔

دوسری قسم یہ ہے کہ انسان میں ایسی روحانی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ اخلاقی اور روحانی ہر لحاظ سے ہر قسم کے گناہوں سے مامون اور محفوظ ہو جائے۔ اگر بالفرض وہ کسی ایسے ماحول میں بھی پہنچ جائے جہاں معصیت کے سارے اسباب اور وسائل فراہم ہوں تب بھی اس کی روحانی طاقت اس کا دفاع کرے اور وہ گناہوں کی آلودگی سے محفوظ رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے

کوئی شخص اپنے جسم میں کسی بیماری کے خلاف ایسی قوت مدافعت پیدا کرے کہ اس بیماری کے جراثیم اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

ہمارے زمانے میں تقویٰ کا جو تصور عام طور پر پایا جاتا ہے' وہ یہی پہلی قسم کا تقویٰ ہے۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ متقی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ محتاط ہے' تنہائی پسند ہے اور گناہ آلود ماحول سے دور رہتا ہے یہ تقویٰ کی وہ قسم ہے جسے ہم نے ابھی ضعیف کہا ہے۔

شاید یہ تصور اس لیے پیدا ہوا ہے کہ ہم نے ابتدا ہی سے تقویٰ کا ترجمہ پرہیزگاری کیا ہے۔ رفتہ رفتہ گناہ سے پرہیز کا مطلب ان عوامل اور اس ماحول سے اجتناب ہو گیا جو گناہ پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام کی نظر میں تقویٰ کے معنی گوشہ نشینی اور سوسائٹی سے دور رہنے کے ہو گئے۔ عام بول چال میں جب یہ لفظ کان میں پڑتا ہے تو علیحدگی پسندی' افسردگی اور پسپائی کی تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔

اس سے قبل ہم نے کہا تھا کہ فطری اور معقول زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان متعین اصولوں کا پابند ہو اور پابندی اصول کے لیے لازمی ہے کہ آدمی ایسے کاموں سے اجتناب کرے جو گو اس کی خواہشات کے عین مطابق ہوں مگر اس نے اپنی زندگی کے جو اصول اپنائے ہیں' ان کے منافی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی دنیا تج دے اور عزلت پسند اور گوشہ نشین ہو جائے۔ جیسا کہ ہم اس سلسلہ میں بعد میں دینی شواہد پیش کریں گے بہتر صورت یہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر ایسی استعداد اور ایسی قوتِ مدافعت پیدا کرے جو گناہوں سے اس کی حفاظت کر سکے۔

اتفاق کی بات ہے کہ خود ہمارے ادب میں خواہ وہ نظم ہو یا نثر ایسی مثالیں

موجود ہیں جو تقویٰ کی پہلی صورت کی تصویر کشی کرتی ہیں جو درحقیقت ضعف و کمزوری کی نشانی ہے۔ گلستان میں شیخ سعدی کہتے ہیں:

بدیدم عابدے در کوہسارے قناعت کردہ از دنیا بغارے	میں نے پہاڑ پر ایک عابد کو دیکھا جس نے دنیا کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لے رکھی تھی۔
چرا گفتم بشہر اندر نیائی کہ بارے بند از دل برکشائی	میں نے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے ہو کہ ایک دفعہ تمہارے دل کی بندگی بھی کھل جائے۔
بگفت آنجا پری رویان نغزند چو گل بسیار شد پیلان بلغزند	کہنے لگا کہ وہاں حسینوں کا جمگھٹ ہے جب کیچڑ بہت ہو تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں۔

یہ تقویٰ اور گناہوں سے محفوظ رہنے کی وہ صورت ہے جسے ایک طرح کی کمزوری کہا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی خاص بات نہیں کہ آدمی ایسے ماحول سے دور رہے جہاں پاؤں پھسلنے کا احتمال نہ ہو اور وہ نہ پھسلے لطف تو اس میں ہے کہ ایسے ماحول میں رہ کر جہاں بہتوں کے پاؤں پھسل جاتے ہوں خود کو محفوظ رکھا جائے۔

یا مثلاً بابا طاہر کہتے ہیں:

ز دست دیدہ و دل ہر دو فریاد ہر آنچہ دیدہ بیند دل کند یاد	میں آنکھ اور دل دونوں کے ہاتھوں مصیبت میں ہوں۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی دل اسے یاد رکھتا ہے۔

بسازم خنجرے نیشش ز فولاد | میں ایسا خنجر بناؤں گا جس کی نوک فولاد کی ہوگی۔ اس
زنم بر دیدہ تا دل گردد آزاد | سے آنکھیں نکال دوں گا تاکہ دل آزاد ہو جائے۔

اس میں شک نہیں جہاں نظر جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے دل بھی وہیں پہنچتا ہے لیکن کیا اس کا علاج یہ ہے کہ آنکھ ہی نکال ڈالی جائے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ دل میں ایسی طاقت اور قوت پیدا کی جائے کہ آنکھ اسے اپنے پیچھے نہ کھینچ سکے۔

اگر یہی طریقہ عمل رہے کہ دل کی آزادی اور رہائی کے لیے فولادی نوک کا خنجر بنانے کی ضرورت ہو تو پھر کانوں کے لیے بھی ایک اور خنجر بنانا پڑے گا کیونکہ کان جو کچھ سنتا ہے، دل وہ بھی یاد کر لیتا ہے۔ یہی حال چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتوں کا ہے۔ پھر انسان واقعی بغیر دُم، بغیر سر اور بغیر پیٹ کے اس شیر کی طرح ہو جائے گا جس کی داستان مولوی نے اپنی مثنوی میں بیان کی ہے۔

عملی مجبوری پیدا کرنا

بعض اخلاقی کتابوں میں کچھ ایسے بزرگوں کا تذکرہ ملتا ہے جو بسیار گوئی سے بچنے کے لیے اور اس خیال سے کہ کہیں کوئی لغو اور بری بات ان کے منہ سے نہ نکل جائے، اپنے منہ میں کنکریاں بھر لیتے تھے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس قسم کے طرز عمل کو مثالی نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ گناہ سے بچنے کے لیے اس قسم کی مجبوری پیدا کرنا اور پھر گناہ سے بچنا کوئی کمال کی بات نہیں۔ اگر ہم اس قسم کی کوئی حرکت کر کے گناہ کے ارتکاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں تو گناہ سے تو ضرور بچ گئے مگر ہمارا نفس تو پھر بھی ویسے کا ویسا ہی پاپی رہا، صرف وسائل کی عدم موجودگی کے سبب قدرے مطمئن ہو گیا۔

کمال تو یہ ہے کہ بغیر کسی عملی مجبوری کے اور اسباب و وسائل کی موجودگی کے باوجود معصیت سے پرہیز کیا جائے۔ اگر گناہوں سے اس طرح کے اجتناب کو کمال بھی تصور کیا جائے تب بھی یہ محض تقویٰ کی تمہید اور مشق ہے، خود تقویٰ نہیں۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ تقویٰ کا ملکہ اور استعداد پیدا کرنے کے لیے ابتدائی مرحلہ کی سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ تقویٰ کا ملکہ بڑی مشق کے بعد پیدا ہوتا ہے لیکن پھر بھی خود تقویٰ ان باتوں سے مختلف چیز ہے۔ در اصل تقویٰ وہ بلند اور پاک روحانی طاقت ہے جو از خود انسان کی محافظت کرتی ہے اس لیے پوری کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ تقویٰ کی حقیقی روح پیدا ہو جائے۔

نہج البلاغہ میں تقویٰ کا بیان

مذہبی روایات خصوصاً نہج البلاغہ میں تقویٰ پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ ہر جگہ تقویٰ اس مقدس ملکہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایسی روحانی طاقت پیدا کرتا ہے جس سے نفس امارہ اور سرکش نفسانی خواہشات خود بخود زیر ہو جاتی ہیں۔ خطبہ نمبر ۱۱۲ میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

> "تقویٰ اللہ کے دوستوں کو منہیات سے بچاتا اور ان کے دل میں خوفِ خدا پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ صائم النہار اور قائم اللیل بن جاتے ہیں۔" ؎

اس جملہ میں صراحت کے ساتھ تقویٰ اس روحانی طاقت کو کہا گیا ہے جو گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے اور خوفِ خدا کو تقویٰ کا ایک ثمرہ بتلایا گیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود تقویٰ کے معنی خوف نہیں بلکہ تقویٰ کا ایک اثر یہ ہے کہ وہ دل میں خوفِ خدا پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا

اِتَّقُوا اللہَ کے یہ معنی نہیں کہ اللہ سے ڈرو۔

نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۶ میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں اور اس کی صحت کا ضامن ہوں۔ اگر گزشتہ واقعات سے عبرت کسی شخص کے لیے آئندہ واقعات کا آئینہ بن سکے تو تقویٰ اسے مشتبہ کاموں کے ارتکاب سے روکے گا۔" ؎

اسی خطبہ میں آگے چل کر آپ فرماتے ہیں:

"یاد رکھو! غلط روی کی مثال ایسے سرکش گھوڑوں کی سی ہے جو لگام کو توڑ کر سوار کو بے بس کر دیں اور بالآخر اسے آتش دوزخ میں گرا دیں، اور تقویٰ کی مثال ایسے گھوڑوں کی ہے جو رام ہوں، سوار کے اشارہ پر چلیں اور اسے باغ جنت میں پہنچا دیں۔" ؎

یہاں صراحت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک تقویٰ کو ایسی روحانی حالت قرار دیا گیا ہے جسے ہم ضبط نفس کی مکمل کیفیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ضمناً ایک اور اہم حقیقت بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ہوا و ہوس کے تابع فرمان ہونے اور نفس سرکش کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینے کا نتیجہ بے بسی، کمزوری اور شخصیت کے فقدان کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی صورت میں آدمی کی حالت اس بے بس سوار کی سی ہو جاتی ہے جو سرکش گھوڑے پر سوار ہو اور جس کا نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پاؤں رکاب میں، اور جو اپنے ارادے سے کچھ نہ کر سکے۔ تقویٰ کا لازمی نتیجہ ضبط نفس، قوت ارادی میں اضافہ اور روحانی اور فطری شخصیت کی بلندی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایک متقی شخص کی حالت اس سوار کی سی ہوتی ہے جو سدھائے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو اور اسے اپنی مرضی سے بہ آسانی جدھر چاہے

سے جائے۔

جو شخص ہوا و ہوس، شہرت طلبی، حرص و لالچ اور جاہ پسندی کے سرکش گھوڑے پر سوار ہو اور ان ہی باتوں کے درپے ہو، زمام اختیار اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے وہ ان ہی باتوں کا مجبور رہتا ہے اور دیوانہ وار ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔ مصلحت بینی اور مآل اندیشی سے اسے کوئی واسطہ نہیں رہتا لیکن جو تقویٰ پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے اسے اپنے آپ پر پورا اختیار رہتا ہے اور وہ اپنے نفس کو جدھر چاہے موڑ سکتا اور حرکت دے سکتا ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۸۹ میں فرمایا گیا ہے:

فَاِنَّ التَّقْوٰی فِی الْیَوْمِ الْحِرْزُ وَ الْجُنَّۃُ وَفِیْ غَدٍ الطَّرِیْقُ اِلَی الْجَنَّۃِ.

یعنی انسان کے لیے آج تقویٰ بمنزلہ ایک حصار اور ایک ڈھال کے ہے اور کل جنت کا راستہ ہو گا۔

حضرت امیرالمومنینؑ کے خطبات میں اس طرح کے کلمات بکثرت ہیں مثلاً آپ نے خطبہ نمبر ۱۵۵ میں تقویٰ کو بلند و مستحکم پناہ گاہ سے تعبیر کیا ہے۔ ؎

یہ چند مثالیں بطور نمونہ اس لیے بیان کی گئیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے تقویٰ کی اصل حقیقت واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی کون متقی کہلانے کا مستحق ہے۔ اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دراصل تقویٰ اس روحانی حالت کا نام ہے جو روح انسانی کے لیے حصار اور دفاعی ہتھیار کا کام دیتی ہے۔ آدمی کے نفس کو اس کا مطیع و فرمانبردار بناتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تقویٰ ایک روحانی طاقت ہے۔

تقویٰ اور آزادی

ہم کہہ چکے ہیں کہ حیوانی زندگی چھوڑ کر انسانی زندگی اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی متعین اصولوں کی پیروی کرے اور اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان اصولوں کے مطابق ڈھالے اور ان سے سرمو تجاوز نہ کرے۔ اگر وقتی خواہشات اسے اپنی حدود سے تجاوز کرنے پر ابھاریں تو وہ اس سے باز رہے اور باز رہنے کے لیے اسے کچھ چیزیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ تقویٰ بھی نماز روزہ کی طرح دینداری کے لوازم میں سے ہے۔ تقویٰ تو انسانیت کا خاصہ ہے۔ آدمی اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ حیوانوں کی سی جنگلی زندگی گزارنے کی بجائے انسانی زندگی گزارے تو وہ مجبور ہے کہ تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل معاشرتی تقویٰ اور سیاسی تقویٰ جیسی اصطلاحیں بھی استعمال ہونے لگی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دینی تقویٰ میں کچھ اور ہی بلندیٔ تقدس اور استحکام ہے۔ حقیقتاً تقویٰ کی بنیاد محض دین پر ہے اور دین ہی کی بنیاد پر مستحکم اور اصولی تقویٰ وجود میں آتا ہے۔ ایمان باللہ کی مضبوط بنیاد کے علاوہ تقویٰ کے لیے کوئی اور مستحکم اور قابلِ اعتماد بنیاد موجود ہی نہیں۔

اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"آیا وہ شخص بہتر ہے کہ جس نے اپنی زندگی کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی بنیاد کھوکھلی اور غیر مستحکم گڑھے پر اٹھائی اور وہ اسے لیکر سیدھی جہنم میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۹)

بہرحال تقویٰ چاہے اس کی بنیاد مذہب پر ہو یا نہ ہو لازمۂ انسانیت ہے

اور اس کا لازمی نتیجہ کچھ چیزوں کا ترک کرنا اور اجتناب برتنا ہے۔

اس بات کے پیش نظر کہ ائمۂ اہلبیت علیہم السلام نے تقویٰ کو حصار، قلعہ اور اسی طرح کی چیزوں سے تشبیہ دی ہے ممکن ہے بعض دلدادگانِ آزادی یہ تصور کریں کہ تقویٰ بھی آزادی کا دشمن اور آدمی کے پاؤں کی زنجیر ہے۔

پابندی یا مدافعت

لہٰذا اب اس نکتہ کی بھی وضاحت ہو جانی چاہیے کہ تقویٰ پابندی نہیں بلکہ مدافعت ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے لیکن اگر اسے پابندی بھی کہا جائے جب بھی یہ پابندی عین مدافعت ہے۔

چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔ آدمی گھر تعمیر کرتا ہے، کمرے بناتا ہے، مضبوط دروازے اور کھڑکیاں لگاتا ہے، مکان کے اردگرد دیوار کھینچتا ہے۔ وہ یہ سب کام کیوں کرتا ہے؟ یہی نا کہ سردی کے موسم میں ٹھنڈک اور گرمی کے موسم میں تپش سے بچاؤ ہو سکے، تاکہ وہ اپنی ضرورت کی چیزوں کو اس طرح محفوظ رکھ سکے کہ وہ صرف اس کے ذاتی تصرف میں رہیں لیکن وہ اپنی زندگی کو ایک مخصوص چاردیواری میں محدود کر لیتا ہے۔ اب اس کو کیا کہا جائے گا؟ کیا گھر اور مکان کا وجود انسان پر پابندی اور اس کی آزادی کے منافی ہے یا اس کی مدافعت اور بچاؤ کا ایک طریقہ! یہی حال لباس کا ہے۔ آدمی اپنے پاؤں کو جوتے میں، سر کو ٹوپی میں اور بدن کو مختلف کپڑوں میں محصور کر لیتا ہے تاکہ اپنے جسم کو صاف ستھرا رکھ سکے اور گرمی و سردی سے بچ سکے۔ اب اس کو کیا کہیں گے؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنے جسم کو قید کر دیا؟ کیا اس پر اظہار افسوس کرنا چاہیے کہ پاؤں جوتے میں، سر ٹوپی میں اور بدن کپڑوں میں قید ہو گیا؟ کیا انہیں اس قید سے نجات

دلانے کی آرزو کرنی چاہیے؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھر اور مکان رکھنا کوئی پابندی ہے یا آزادی کے منافی؟

تقویٰ بھی روح کے لیے ایسا ہی ہے جیسے زندگی بسر کرنے کے لیے گھر اور بدن کے لیے کپڑے۔ اتفاق دیکھیے کہ قرآن مجید میں تقویٰ کو لباس ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف، آیت ۲۶ میں بدن کے چند کپڑوں کا نام لیکر اللہ فرماتا ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ.

یعنی تقویٰ جو روح کا لباس ہے سب سے بہتر ہے۔

پابندی تو اسے کہا جاتا ہے کہ انسان کو کسی صلاحیت اور کسی مسرت سے محروم کر دیا جائے لیکن وہ چیز جو انسان کا تحفظ کرتی ہو اور اسے خطرات سے بچاتی ہو، اسے پابندی کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے؟ وہ تو مدافعت ہے۔ تقویٰ کو مدافعت کہنا، یہ تعبیر بھی امیر المومنینؑ کی ہے۔

امام فرماتے ہیں:

اَلَا فَصُوْنُوْهَا وَتَصَوَّنُوْا بِهَا.

یعنی تقویٰ کی حفاظت کرو اور اس کے ذریعہ سے خود اپنا تحفظ کرو۔

امیر المومنینؑ اس سے بھی بڑھ کر تقویٰ کی تعبیر فرماتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اسے پابندی نہیں سمجھتے بلکہ تقوائے الٰہی کو آزادی کا ایک بڑا ذریعہ گردانتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۲۸ میں آپ فرماتے ہیں:

"تقویٰ راست روی کی کنجی اور آخرت کی پونجی ہے۔ اس سے ہر قسم کی غلامی سے آزادی اور ہر مصیبت سے رستگاری ملتی ہے۔

تقویٰ کے ذریعے سے آدمی اپنا مقصد حاصل کرتا اور دشمن سے چھٹکارا پاتا ہے اور اس کے وسیلے سے اس کی خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ تقویٰ براہِ راست انسان کو روحانی اور اخلاقی آزادی بخشتا ہے اور ہوا و ہوس کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ حرص و ہوس، حسد و شہوت اور غم و غصہ کی زنجیروں سے اس کی گردن کو چھڑاتا ہے۔

معاشرتی غلامی دراصل روحانی غلامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو شخص دولت اور عزت و مرتبہ کا غلام ہے وہ معاشرتی لحاظ سے بھی آزادانہ زندگی نہیں گزار سکتا لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ :

عِتْقٌ مِّنْ كُلِّ مَلَكَةٍ ۔

اس لیے تقویٰ نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی قید یا پابندی نہیں بلکہ عینِ حرّیت اور آزادی ہے۔

تقویٰ کی نگہبانی

ممکن ہے کہ تقویٰ کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ نگہبان اور محافظ ہے، یہ بات بعض لوگوں کے لیے غرور و غفلت کا سبب بن جائے اور وہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ متقی شخص معصوم عن الخطا ہے اور یہ سمجھ کر ان خطرات کی طرف دھیان نہ دیں جو تقویٰ کو متزلزل کرتے اور اس کی جڑ کاٹتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ خواہ کتنے ہی اونچے درجے کا ہو اسے بجائے خود خطرہ لاحق رہتا ہے اس لیے آدمی کو چاہیے کہ جہاں وہ تقویٰ کی محافظت اور

نگہبانی میں زندگی بسر کرے وہیں خود تقویٰ کی بھی حفاظت کرے۔ اس میں کوئی منطقی مغالطہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جو چیز ہماری حفاظت کا ذریعہ ہو ہمارا بھی فرض ہو کہ خود اس چیز کی حفاظت کریں۔ ابھی ہم نے مثال دی ہے کہ کپڑے آدمی کا گرمی سردی سے بچاؤ کرتے ہیں لیکن انسان کو بھی کپڑوں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ نے ایک ہی جملہ میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

أَلَا فَصُونُوهَا وَتَصَوَّنُوا بِهَا.

یعنی تقویٰ کی حفاظت کرو اور اس کے ذریعہ سے خود اپنی حفاظت کرو۔

اس لیے اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ تقویٰ ہمارا محافظ ہے یا خود ہمیں تقویٰ کی حفاظت کرنی چاہیے تو ہم یہی کہیں گے کہ دونوں باتیں درست ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ آیا تقویٰ سے مقامِ قربِ الٰہی تک پہنچنے میں مدد لینی چاہیے یا اللہ سے حصولِ تقویٰ میں مدد کی التجا کرنی چاہیے تو ہم کہیں گے دونوں کام ضروری ہیں۔ تقویٰ کے ذریعہ رضائے الٰہی کے حصول کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور اللہ سے تقویٰ کی توفیق مزید کی دعا بھی کرنی چاہیے۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے:

> "اے اللہ کے بندو! میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ تقویٰ تمہارے اوپر اللہ کا حق ہے اور اس کی وجہ سے تمہارا بھی اللہ پر حق بن جاتا ہے۔ تم اللہ سے مدد مانگو کہ وہ تمہیں تقویٰ کی توفیق عطا کرے اور تقویٰ سے اللہ تک پہنچنے میں مدد حاصل کرو۔" ۵

بہرحال چونکہ ایسے خطرات موجود ہیں جو تقویٰ کی بنیاد متزلزل کر سکتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات میں گو تقویٰ کو بہت سے گناہوں سے حفاظت کا

ذریعہ قرار دیا گیا ہے لیکن بعض دوسرے گناہوں کی نسبت جن میں کشش بہت قوی ہے مزید احتیاط کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

مثلاً مذہبی تعلیمات میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ چوری، شراب خوری یا ارتکاب قتل کے خطرے کے پیش نظر تنہائی حرام ہے۔ مثلاً اس کی ممانعت نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص معاذ اللہ شراب پینی چاہتا ہے تو وہ رات کو گھر میں تنہا نہ رہے کیونکہ وہاں بظاہر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ وہی ایمان اور تقویٰ اس کے محافظ ہوں گے۔ اس کے برخلاف جنس کی کشش چونکہ زیادہ قوی ہے اور اس کی خواہش انسانی جبلت میں داخل ہے اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ اگر خلوت میں بے عفتی کا اندیشہ ہو تو وہ ممنوع ہے کیونکہ یہ ایسا خطرہ ہے جو تقویٰ کے حصار کو توڑ سکتا ہے اور اس پر غالب آسکتا ہے۔

حافظؔ کی ایک مشہور غزل میں ایک شعر ہے، میں جب بھی وہ شعر پڑھتا ہوں میری نظر میں یہی مضمون گھوم جاتا ہے۔ حافظؔ نے اپنی مخصوص شیریں زبان میں اسی روحانی حقیقت کو بیان کیا ہے:

قوتِ بازوئے پرہیز بخوباں مفروش
کہ دریں خیل حصارے بسوارے گیرند

تقویٰ کی قوت کو حسینوں پر مت آزماؤ کیونکہ اس لشکر کا ایک ہی سوار ایک حصار کو توڑنے کے لیے کافی ہے۔

اس شعر میں تقویٰ کو حصار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ امیر المومنینؑ کے ملفوظات میں بھی بعینہٖ یہی تشبیہ آئی ہے۔ اس کے بعد حافظؔ نے حسینوں کے لشکر کی کشش اور طاقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ تقویٰ کا حصار حسینوں کے لشکر کے سامنے نہیں باندھا جا سکتا کیونکہ اس لشکر کا ہر سپاہی تنہا اس حصار کو

توڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کسی اجتماعی پرورش کی بھی ضرورت نہیں۔

تقویٰ کی قدر و قیمت اور اس کا اثر

ایک اور موضوع تقویٰ کی قدر و قیمت اور اس کے اثرات ہیں۔ تقویٰ کا جو اثر انسان کی اخروی زندگی پر مرتب ہوتا ہے اس سے قطع نظر انسان کی دنیاوی زندگی میں بھی تقویٰ کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ امیرالمومنینؑ نے اپنی تعلیمات میں تقویٰ کا مطلب بار بار دہرایا ہے اور تقویٰ کی ترغیب دی ہے۔ آپ نے اس کے اثرات بھی بکثرت بیان فرمائے ہیں۔ کہیں کہیں عام انداز میں بڑے عجیب طریقے سے اس کے فوائد کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا:

عِتْقٌ مِّنْ كُلِّ مَلَكَةٍ نَجَاةٌ مِّنْ كُلِّ هَلَكَةٍ.

یعنی یہ آزادی ہے ہر قسم کی غلامی سے اور نجات ہے ہر قسم کی مصیبت سے۔

یا فرمایا:

"تقویٰ تمہارے دلوں کی بیماری کے لیے دوا ہے اور تمہارے جسمانی امراض کے لیے شفا ہے۔ تمہارے سینہ کی خرابی کی اصلاح ہے اور تمہارے نفوس کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔"[۹]

امیرالمومنین امام علیؑ تقویٰ کو ہر تکلیف اور ہر مصیبت میں مفید قرار دیتے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر ہم تقویٰ کا صرف منفی پہلو نہ دیکھیں اور تقویٰ کے معنی صرف منہیات سے اجتناب کے نہ سمجھیں بلکہ اسے اسی نقطہ نظر سے دیکھیں جو امامؑ کا ہے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ تقویٰ انسانی زندگی کا ایک اہم ستون ہے چاہے یہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اگر تقویٰ نہ ہو تو زندگی

کی بنیاد ہی ہل جائے۔

کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ آیا کوئی دوسری چیز اس کی جگہ لے سکتی ہے یا نہیں۔ تقویٰ زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی دوسری چیز اس کی جگہ نہیں لے سکتی نہ طاقت، نہ دولت، نہ قانون، نہ کچھ اور۔

اس دور کی آفات میں سے ایک آفت قوانین کی کثرت ہے۔ ہر روز نئے قوانین بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ ایک قانون بنتا ہے، اس کے قواعد مرتب ہوتے ہیں، ضوابط تیار ہوتے ہیں، پھر معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد تو حاصل ہی نہیں ہوا، قانون میں ترمیم کی جاتی ہے۔ قواعد و ضوابط میں اضافے ہوتے ہیں۔ پھر بھی مطلب پورا نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں قانون بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اللہ تعالےٰ کے بنائے ہوئے ناقابلِ تغیر قوانین کے علاوہ بھی کچھ سول قوانین اور ضابطوں کا وضع کیا جانا ضروری ہے لیکن کیا صرف قوانین وضع کرنے اور ان میں اضافہ کرتے رہنے سے معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے؟ قانون کا کام حدود کا تعین ہے۔ ان حدود کا احترام لوگوں کا اپنا کام ہے جس کے لیے انہیں ایک اندرونی طاقت درکار ہوتی ہے اسی کا نام تقویٰ ہے۔ کہتے ہیں کہ قوانین کا احترام کیا جانا چاہیے یہ درست ہے لیکن جب تک تقویٰ کے اصول کا احترام نہ ہو قانون کا احترام کیسے ہو سکتا ہے؟

نمونہ کے طور پر عصرِ حاضر کے مسائل کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے موجودہ دور میں ہماری زندگی کافی مشکل ہو گئی ہے۔ جن مسائل کے متعلق لوگ اخبارات میں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور ان کے حل کی کوشش کرتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ طلاق کے روز افزوں

واقعات ہیں۔ ایک اور مسئلہ انتخابات کی اصلاح ہے، ایک مسئلہ ٹریفک کا ہے۔
میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھے طلاق کے بڑھتے ہوئے واقعات کے اسباب کا پورا علم ہے اور میں ان اسباب کو بیان کر سکتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اسباب میں گوناگوں معاشرتی عوامل کا دخل ہے۔

لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ طلاق کے واقعات کی افزائش کا اصل سبب، تقویٰ کا فقدان ہے۔ اگر لوگوں میں تقویٰ کی کمی نہ ہوتی اور لوگ مادر پدر آزاد نہ ہو گئے ہوتے تو طلاق کے واقعات اتنے زیادہ نہ ہوتے۔ قدیم زمانے میں آج کے مقابلے میں زیادہ مشکلات اور نقائص تھے۔ آج کی خانگی زندگی میں مشکلات ہیں یقیناً پرانے زمانے میں اس سے زیادہ تھیں لیکن ساتھ ہی ایمان اور تقویٰ کا وجود ان مشکلات کے حل میں ممد و معاون ثابت ہوتا تھا لیکن آج جب ہم تقویٰ کا عنصر کھو بیٹھے، زندگی کی تمام سہولتوں کے باوجود ہماری مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ قانون کے زور اور عدلیہ اور انتظامیہ کی طاقت اور قواعد و ضوابط میں رد و بدل کر کے طلاقوں کی تعداد میں کمی کر دیں، مگر

ایں خیال است و محال است و جنوں

جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ انتخابات میں خرابی کی جڑ انتخابی قوانین کا نقص ہے جو نصف صدی پیشتر بنائے گئے تھے اور وہ آج کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہم انتخابات کے موجودہ قوانین کا دفاع کرنا نہیں چاہتے۔ ان میں یقیناً نقائص ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ قانون جیسا کچھ بھی ہے کیا لوگ اس پر عمل کرتے ہیں اور ان کے اس پر عمل کرنے کے باوجود خرابیاں پیدا ہوتی ہیں یا خرابی کا سبب یہ ہے کہ قانون پر

عمل ہی نہیں ہوتا۔ درحقیقت کوئی شخص نہ اپنی ذمہ داری کا قائل ہے نہ دوسروں کے حقوق کا۔ موجودہ قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے شہر میں جائے جہاں کے باشندوں نے نہ کبھی اسے دیکھا ہو نہ اسے جانتے ہوں اور نہ کبھی اس کا نام سنا ہوا اور وہ اپنی طاقت کے بل پر یہ کہے کہ تم مانو یا نہ مانو میں تمہارا نمائندہ ہوں۔ اس قسم کے مفاسد کو مزید قانون بنا کر یا موجودہ قانون میں رد و بدل کر کے دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ لوگوں میں بیداری، ایمان اور تقویٰ پیدا ہو۔

اب تیز رفتاری، اوور ٹیکنگ اور ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کو لیجیے۔ کیا ان خرابیوں کا سبب قوانین کی کمی ہے یا کچھ اور؟

موجودہ دور میں ہم بے شمار معاشرتی مسائل میں گھرے ہوتے ہیں جن کے متعلق لوگوں میں واویلا مچا ہوا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ طلاق کے واقعات کیوں روز بروز بڑھ رہے ہیں؟ قتل اور چوری کے جرائم میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ ملاوٹ اور دھوکہ بازی کیوں عام ہے؟ فحاشی کیوں بڑھ رہی ہے؟

بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان خرابیوں کا ایک بڑا سبب ایمان کی کمزوری ہے۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ لوگ خود ہمیشہ یہ سب سوال اٹھاتے ہیں، ان مسائل پر لکھتے ہیں لیکن چونکہ ایمان اور تقویٰ کے عنصر سے محروم ہیں اس لیے کوشش کرتے ہیں کہ ان مسائل کے اصل اسباب کی طرف لوگوں کو متوجہ نہ ہونے دیں۔ ان میں اخلاقی انتشار پیدا کرتے رہیں اور تقویٰ اور اس سے پیدا ہونے والی قوت مدافعت کی بیخ کنی کرتے رہیں۔ نعوذ باللہ اگر ایمان اور تقویٰ کی حقیقت چھپی ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کل کچھ لوگ یہ بھی پوچھنے لگیں کہ جرم چوری

کیوں نہ کریں، دھوکہ کیوں نہ دیں اور ملاوٹ کیوں نہ کریں وغیرہ۔

تقویٰ اور صحت

امیرالمومنینؑ نے تقویٰ کے بارے میں فرمایا ہے:

شِفَاءُ مَرَضِ اَجْسَادِكُمْ۔

یعنی تقویٰ تمہاری جسمانی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ شاید آپ یہ سوال کریں کہ تقویٰ تو ایک روحانی معاملہ ہے۔ اس کا صحت سے کیا تعلق؟ یہ صحیح ہے کہ تقویٰ کوئی پاؤڈر یا انجکشن نہیں ہے لیکن اگر تقویٰ نہ ہو تو شفاخانوں کا نظام بھی درست نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر بھی صحیح کام نہیں کریں گے۔ نرسیں بھی اپنے فرائض کما حقہ انجام نہیں دیں گی۔ دوا بھی صحیح نہیں ملے گی۔ اگر تقویٰ نہ ہو تو آدمی اپنی صحت بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ متقی آدمی جو اپنی حدود کے اندر رہتا ہے اور صرف اپنے حق پر قانع اور راضی رہتا ہے اس کی روح زیادہ مطمئن رہتی ہے۔ اس کے اعصاب میں تناؤ نہیں ہوتا اور اس کا دل ٹھیک کام کرتا ہے۔ اسے یہ فکر نہیں رہتی کہ کس چیز پر قبضہ کرے، کیا چیز کھا جائے اور کسے نگل جائے۔ اعصابی بیماریاں اس کے پھیپھڑوں میں زخم نہیں ڈالتیں اور اسے معدہ کے السر میں مبتلا نہیں کرتیں۔ شہوت رانی کی زیادتی اسے کمزور نہیں کرتی۔ عمر اس کی طویل ہوتی ہے۔ بدن کی سلامتی، روح کی سلامتی اور معاشرہ کی سلامتی، سب کا تقویٰ سے گہرا تعلق ہے۔

دو خاص نکتے اور باقی رہ گئے۔ ایک تو یہ کہ تقویٰ روشن ضمیری اور بصیرت عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا۔

یعنی تقویٰ کا ایک بڑا نتیجہ بصیرت اور بھلے بُرے کی پہچان ہے۔
اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ تقویٰ مرحلۂ عرفان میں سیر و سلوک کی راہ ہموار کرتا ہے۔
تقویٰ کا ایک دوسرا اثر یہ ہے کہ تقویٰ مشکلات کو حل کرتا ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ طلاق میں ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔

جو تقوائے الٰہی کی دولت سے مالا مال ہے اللہ اس کے لیے مشکلات میں سے نکلنے کا کوئی راستا پیدا کر دیگا اور اسے ایسے راستے سے رزق دیگا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا جو اللہ پر بھروسا کرتا ہے، اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا ایک حساب مقرر کر رکھا ہے۔ (آیت ۲-۳)

چونکہ یہ دونوں نکتے مزید تفصیل چاہتے ہیں اس لیے ان کا مفصل بیان ہم اگلے جلسہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

آثارِ تقویٰ

تقویٰ کے دو خاص اثر

پچھلے لکچر میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس دفعہ تقویٰ کے ان دو خاص اثرات کے بارے میں گفتگو ہو گی جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ ان میں سے ایک روشن ضمیری اور بصیرت ہے جس کے متعلق سورۃ انفال کی آیت ۲۹ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا.

یعنی اگر تمہیں تقوائے الٰہی حاصل ہو گا تو اللہ تمہارے لیے ایسی کسوٹی بہم پہنچا دے گا جس سے تم برے بھلے کی تمیز کر سکو۔

تقویٰ کا دوسرا اثر مشکلات میں آسانی پیدا ہونا ہے۔ سورۂ طلاق کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا .

یعنی جسے تقوائے الٰہی حاصل ہو گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔

اسی سورہ میں دو آیات کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا .

یعنی جسے تقوائے الٰہی حاصل ہو گا اللہ اس کے کاموں میں ایک طرح کی آسانی پیدا کر دے گا۔

تقویٰ اور روشن ضمیری

جہاں تک تقویٰ کے پہلے اثر کا تعلق ہے اس کے متعلق قرآن مجید میں بھی ایک آیت نہیں یہ تو اسلام میں ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہے۔ احادیث نبوی اور روایات ائمہ اطہار میں بھی یہ مضمون بار بار دہرایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلے جلسہ میں عرض کیا تھا یہی وہ مضمون ہے جس سے سلوک و عرفان کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اہل عرفان نے تو آیہ کریمہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى

سے بھی استدلال کیا ہے۔ یہ قرآن شریف کی طویل ترین آیت ہے۔ اس کا وہ حصہ جس میں تقویٰ کے اثر کی طرف اشارہ ہے یہ ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ .

تقوائے الٰہی اختیار کرو، اللہ تمہیں تعلیم دے گا۔

کہتے ہیں کہ اس آیت میں تقویٰ کے بعد تعلیم کا جو ذکر ہے اس کا مطلب

یہ ہے کہ تقویٰ کی صورت میں خاص فیضانِ الٰہی سے تمہیں تعلیم دی جائے گی۔

حدیث نبوی ہے:

جَاهِدُوا اَنْفُسَكُمْ عَلٰى اَهْوَائِكُمْ تَحُلَّ قُلُوبَهُمُ الْحِكْمَةُ.

یعنی ہوا و ہوس کے خلاف جہاد کرو تاکہ حکمت تمہارے دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔

ایک اور حدیث نبوی ہے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ کسی حدیث کی کتاب میں بعینہٖ یہ جملہ دیکھا ہو لیکن دیگر اسلامی کتابوں میں یہ حدیث خاصی مشہور ہے:

مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا جَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ.

جو اللہ کے لیے چالیس روز مخصوص کر دے گا حکمت کے چشمے اس کے دل سے پھوٹیں گے اور اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔

یہی مضمون تغیر لفظی کے ساتھ اصول کافی، باب الاخلاص میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

جو شخص خلوصِ دل سے چالیس روز تک اللہ پر ایمان رکھے گا یا آپ نے فرمایا: جو شخص چالیس روز تک اللہ کو خوب یاد کرے گا اللہ اسے دنیا میں زہد عطا کرے گا اور اسے ایسی بصیرت دے گا کہ اسے دنیا کی بیماریاں اور ان کی دوائیں نظر آنے لگیں گی، حکمت اس کے قلب میں جاگزیں کر دے گا جو اس کی زبان پر جاری ہو جائے گی۔ [۱]

حافظؔ نے مندرجہ ذیل رباعی میں اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے:

شنیدم رہرو در سرزمینے
ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینے

میں نے کسی مقام پر ایک مسافر کی بات سنی
جو اپنے دوست سے یہ معما کہہ رہا تھا
کہ اے صوفی شراب اس وقت صاف ہوتی ہے
جب شیشہ میں چالیس دن تک رہے۔

حضرت علامہ محمد حسین طباطبائیؒ نے اپنی تفسیر "المیزان" میں اہل تسنن کی کتابوں سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا:

لَوْلَا تَكْثِيرٌ فِي كَلَامِكُمْ وَتَمْرِيجٌ فِي قُلُوبِكُمْ لَرَأَيْتُمْ مَا أَرَىٰ وَلَسَمِعْتُمْ مَا أَسْمَعُ.

اگر تم یاوہ گوئی میں مبتلا نہ ہوتے اور لغو خیالات تمہارے دل میں نہ گھسے پھرتے تو تم بھی وہی کچھ دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہی کچھ سنتے جو میں سنتا ہوں۔

اس حدیث میں تمریج کا لفظ ہے جس کا مادہ مرج ہے اس کے معنی چمن زار اور چراگاہ کے ہیں جس میں ہر جانور داخل ہو سکتا ہے اور چر سکتا ہے۔ رسول خدا فرماتے ہیں کہ تمہارے دل کھلی ہوئی چراگاہ کی مانند ہیں جس میں ہر قسم کے جانور داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اگر شیاطین فرزندانِ آدم کے دلوں کے ارد گرد نہ گھومتے پھرتے تو وہ بھی ملکوتِ سماوی کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔ [۱]

اس قسم کی روایات ہماری دینی کتابوں میں بہت ہیں جن میں تقویٰ اور گناہوں سے پرہیز کو براہِ راست بصیرت اور روشن ضمیری کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے یا بالواسطہ طور پر یہی مضمون بیان کیا گیا ہے مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ ہوا پرستی اور ترکِ تقویٰ کا نتیجہ روح کی تاریکی، دل کی تیرگی اور نورِ عقل کا خاتمہ ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ عَشِقَ شَيْئاً اَعْشٰى بَصَرَهٗ وَ اَمْرَضَ قَلْبَهٗ.

کسی چیز کی حد سے بڑھی ہوئی محبت آنکھ کو اندھا اور دل کو بیمار کر دیتی ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۷)

نہج البلاغہ میں آپ کا ایک اور ملفوظ ہے:

عُجْبُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ اَحَدُ حُسَّادِ عَقْلِهٖ.

آدمی کی خود پسندی اس کی عقل کی دشمن ہے۔

آپ ہی کا ایک اور قول ہے:

اَكْثَرُ مَصَارِعِ الْعُقُوْلِ تَحْتَ بُرُوْقِ الْمَطَامِعِ.

عموماً عقل وہاں ماری جاتی ہے جہاں لالچ کی بجلی چمکتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں تو یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ اسلامی ادبیات میں بھی خواہ وہ عربی ہو یا فارسی، اس حقیقت کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں ادباء اور فضلاء نے اس مضمون کو اقتباس کر کے اس سے خوب کام لیا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مضمون اسلامی ادبیات کا ایک اہم ستون ہے۔ نمونہ کے طور پر ابو الفتح بستی کے مشہور قصیدہ نونیہ کا ایک شعر تمثیلاً پیش کرتا ہوں۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

زِيَادَةُ الْمَرْءِ فِيْ دُنْيَاهُ نُقْصَانٌ

وَ رِبْحُهٗ غَيْرَ مَحْضِ الْخَيْرِ خُسْرَانٌ

یہ قصیدہ ادبیات عربی کا شاہکار تصور ہوتا ہے۔ جس شعر سے ہمیں استشہاد مقصود ہے وہ یہ ہے:

هُمَا رَضِيعَا لِبَانٍ حِكْمَةٌ وَتُقًى
وَسَاكِنَا وَطَنٍ مَالٌ وَطُغْيَانُ

حکمت اور تقویٰ دودھ شریک بھائی ہیں اور دولت و سرکشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

سعدی نے بوستان میں سلطان محمود غزنوی اور ایاز کی محبت کا قصہ بیان کیا ہے اور اس میں محمود پر ملامت کی ہے۔ داستان کے آخر میں کہتے ہیں:

حقیقت سرا است آراستہ	حقیقت کی مثال ایک آراستہ مکان کی سی ہے
ہوا و ہوس گرد برخاستہ	مگر ہوا و ہوس نے گرد اڑا رکھی ہے
نہ بینی کہ ہر جا کہ برخاست گرد	تم دیکھو گے جہاں گرد اڑ رہی ہو
نہ بیند نظر گرچہ بیناست مرد	اچھے بھلے بینا آدمی کو کچھ نظر نہیں آتا

گلستان میں کہتے ہیں:

بدوزد شرہ دیدۂ ہوشمند	لالچ ایسی بلا ہے کہ ہوشیار آدمی کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے
در آرد طمع مرغ و ماہی بہ بند	طمع مرغ و ماہی کو جال میں پھنسا دیتی ہے

حافظ کہتے ہیں:

جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ و لے	جمالِ یار پردہ میں چھپا ہوا نہیں ہے
غبارِ رہ بنشاں تا نظر توانی کرد	لیکن غبارِ رہ کو دور کرو تا کہ کچھ نظر آئے

اس طرح کے مضامین عربی اور فارسی ادب میں بکثرت ملتے ہیں۔

دین اسلام اور اسلامی ثقافت دونوں کے لحاظ سے یہ مضمون ایک امرِ مسلّم ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ تقویٰ اور بصیرت میں کیا منطقی تعلق ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ ایک اخلاقی فضیلت ہے اور اس کا تعلق آدمی کے طرزِ عمل

سے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ انسان کی عقل و فکر اور اس کی قوتِ فیصلہ پر اثر انداز ہو؟ اور آدمی میں ایسا شعور پیدا ہو جائے جس کا حصول تقویٰ کے بغیر ممکن نہ ہو؟ مجھے احساس ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس بات کی صحت پر یقین نہیں آئے گا اور وہ اسے محض تخیل کی پرواز اور شاعری سمجھیں گے۔

مجھے یاد ہے کہ چند سال پیشتر میں نے ایک مادّہ پرست کی ایک تحریر پڑھی تھی جس میں اس خیال کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تقویٰ بھی کوئی ریتی ہے جس سے گھِس کر روحِ انسانی کو جلادی جا سکتی ہے؟

تقویٰ اور عملی سوجھ بوجھ

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقویٰ کے نتیجہ میں جو روشنی اور بھلے برے کی تمیز حاصل ہوتی ہے اصطلاحاً وہ حکمتِ عملی ہے، حکمتِ نظری نہیں۔

فلاسفہ کی اصطلاح میں عقل اور سوجھ بوجھ کی دو قسمیں ہیں، ایک عقلِ نظری دوسری عقلِ عملی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کی قوتِ مفکرہ یا فکری استعداد کی دو قسمیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ قوتِ مفکرہ سے دو قسم کے افکار پیدا ہوتے ہیں، ایک عملی دوسرے نظری۔

یہ اس کا موقع نہیں ہے کہ ہم اس بارے میں کسی فلسفیانہ بحث میں الجھیں اور عملی افکار اور نظری افکار کا فرق بیان کریں۔ اس کام کے لیے تو علٰحدہ سے کئی لیکچروں کی ضرورت ہوگی۔ اجمالاً اس قدر عرض ہے کہ عقلِ نظری وہ ہے جس پر طبیعیات، ریاضیات اور مابعد الطبیعیات جیسے علوم کی بنیاد قائم ہے۔ ان سب علوم میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان میں عقل کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ واقعہ کیا ہے؟ فلاں بات اس طرح ہے یا نہیں؟ فلاں چیز فلاں اثر یا خاصیت

رکھتی ہے یا نہیں، فلاں خیال صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے برخلاف عقلِ عملی ان علوم کی بنیاد ہے جن کے مطابق زندگی گزاری جاتی ہے اور جو اخلاقی اصول کی بنیاد ہیں۔ قدماء کے بقول علمِ اخلاق علمِ تدبیرِ منزل (ہوم اکنامکس) اور علم سیاست مدن (پولیٹیکل سائنس) اسی ضمن میں آتے ہیں۔ عقلِ عملی کی صورت میں یہ فیصلہ کرنا نہیں ہوتا کہ واقعہ کیا ہے اور آیا معاملہ کی صورت اس طرح ہے یا اس طرح بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے اور مجھے یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں، مجھے اس طرح کرنا چاہیے یا اُس طرح۔ یہ عقلِ عملی ہی ہے جو خوب و ناخوب "امر و نہی" چاہیے اور نہیں چاہیے اور اسی طرح کے سوال اٹھاتی ہے۔ آدمی جب اپنے لیے طریقۂ زندگی کا انتخاب کرتا ہے تو اس کے کام کرنے کے طریقے اور فیصلہ کرنے کے طریقے کا تعلق اس کی عقلِ عملی ہی سے ہوتا ہے، عقلِ نظری سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ جو مذہبی تعلیمات میں کہا گیا ہے کہ تقویٰ عقل کو روشن کرتا ہے اور آدمی کی سوجھ بوجھ میں اضافہ کرتا ہے، اس کا تعلق جیسا کہ اندازِ بیان سے ظاہر ہے عقلِ عملی ہی سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کے نتیجہ میں وہ اپنی ضرورتوں کو بہتر طریقے سے پورا کر سکتا ہے اور بہتر طرزِ زندگی دریافت کر سکتا ہے۔ اس بات کا تعلق عقلِ نظری سے نہیں ہے یعنی مطلب یہ نہیں ہے کہ تقویٰ عقلِ نظری پر اثر انداز ہوتا ہے اور تقویٰ کے ذریعے سے آدمی ریاضی یا طبعیات کے مسائل بہتر طور پر سمجھنے لگتا ہے اور ان علوم کی مشکلات بہتر طریقے سے حل کرنے لگتا ہے۔ خود مابعد الطبعیات کا بھی جہاں تک اس کے منطقی اور استدلالی پہلو کا تعلق ہے یہی حال ہے۔ معارفِ الٰہیہ کی ایک دوسری قسم میں البتہ تقویٰ اور پاکیزگی کا دخل ہے لیکن اس قسم کا بھی فلسفہ، استدلال، منطق اور نتیجہ اخذ کرنے کے لیے

ترتیب مقدمات سے کوئی تعلق نہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ تقویٰ سے سوجھ بوجھ بڑھتی ہے اور بصیرت اور روشن ضمیری میں اضافہ ہوتا ہے اس بات کا تعلق نظریاتی مسائل اور عقلِ نظری سے نہیں اور بعض لوگوں کو جو اس بات کو ماننے میں مشکل محسوس ہوتی ہے، شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ تقویٰ سے نظریاتی مسائل کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

البتہ جہاں تک عقلِ عملی کا تعلق ہے تو یہ بالکل صحیح ہے کہ تقویٰ، پاکیزگی اور نفسِ امارہ کو زیر کرنے سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور روشن ضمیری کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ اس بات کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں بلکہ تجربہ خود اس کا گواہ ہے۔

تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل بمنزلہ چراغ کے ہے اور تقویٰ تیل کا کام دیتا ہے کہ تقویٰ کے بغیر عقل کام ہی نہ کرے، نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل گویا بجلی کا جنریٹر ہے جو بجلی کی ایک خاص مقدار پیدا کرتا ہے اور تقویٰ سے بجلی کی اضافی مقدار پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس قسم کی کوئی بات نہیں یہاں کچھ اور ہی صورت ہے۔ وضاحت کے لیے پہلے ایک تمہید بیان کرتا ہوں۔

دشمنانِ عقل کے دشمن

امام علیؑ کے ملفوظات میں ہے:

اَصْدِقَاءُكَ ثَلَاثَةٌ وَ اَعْدَاءُكَ ثَلَاثَةٌ.

یعنی تیرے تین دوست ہیں اور تین دشمن۔

فَاَصْدِقَاؤُکَ : صَدِیْقُکَ وَصَدِیْقُ صَدِیْقِکَ وَعَدُوُّ عَدُوِّکَ ۔

یعنی تیرا ایک دوست تو وہ ہے جو براہ راست تیرا دوست ہے، دوسرا دوست وہ ہے جو تیرے دوست کا دوست ہے اور تیسرا دوست وہ ہے جو تیرے دشمن کا دشمن ہے۔

وَاَعْدَاؤُکَ : عَدُوُّکَ وَعَدُوُّ صَدِیْقِکَ وَصَدِیْقُ عَدُوِّکَ ۔

یعنی تیرے تین ہی دشمن ہیں، ایک تو وہ جو تیرا براہِ راست دشمن ہو، دوسرا وہ جو تیرے دوست کا دشمن ہو اور تیسرا وہ جو تیرے دشمن کا دوست ہو۔

اس کلام کو نقل کرنے سے میرا مقصد یہ واضح کرتا ہے کہ دوستوں کی ایک قسم دشمن کا دشمن بھی ہے۔ دشمن کے دشمن کو جو دوست کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دشمن کو کمزور کرتا ہے، اس کے ہاتھ باندھ دیتا ہے اور اس طرح آدمی کی مدد کرتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک قاعدہ ہے کہ دشمن کا دشمن دوست کی طرح آدمی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ جس طرح انسان پر چسپاں ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے حالات اور اس کی خلاقی و روحانی طاقتوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ انسان کی اندرونی طاقتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بعض صورتوں میں ایک طاقت دوسری پر منفی اثر ڈالتی ہے اور اسے بیکار کر دیتی ہے۔ یہ ایسا قاعدہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اعتراف قدیم و جدید سب ہی عالموں نے کیا ہے اور یہ خود اپنی جگہ ایک وسیع مضمون ہے۔

روشن ضمیری میں تقویٰ کے اثر کا راز

کچھ حالات اور کچھ قوتیں ایسی ہیں جو انسان کی عقلِ عملی یعنی اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان سے متاثر ہو کر آدمی یہ طے کرتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا، کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اس قسم کی منفی قوتوں میں نفس پرستی، لالچ، ضد، تعصب وغیرہ شامل ہیں کیونکہ انسان کے طرزِ عمل کا اس کے احساسات، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ قوتیں حدِ اعتدال سے گزر جائیں اور انسان ان پر حاکم ہونے کی بجائے ان کا محکوم ہو جائے تو پھر وہ عقل اور ضمیر کی آواز کو دبا دیتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر آدمی ان کے شور و غل میں ضمیر کی آواز نہیں سن سکتا۔ عقل کے چراغ پر دھند چھا جاتی ہے۔ دیکھیے اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہوئے کہہ بھی رہے ہیں، سن بھی رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک آدمی بات کر رہا ہے، دوسرے خاموشی سے سن رہے ہیں۔ چراغ روشن ہیں، فضا بھی صاف و شفاف ہے لیکن اگر اسی فضا میں بیک وقت سبھی بولنا اور بلند آواز سے کچھ پڑھنا شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ بولنے والے کو خود اپنی آواز بھی صاف سنائی نہیں دے گی۔ اگر فضا میں گرد و غبار کے بادل چھا جائیں تو کوئی کسی کو نہیں دیکھ سکے گا۔

بقول سعدی:

حقیقت سرائی است آراستہ
ہوا و ہوس گرد برخاستہ

نہ بینی کہ ہرجا کہ برخاست گرد
نبیند نظر گرچہ بیناست مرد

کسی اور کا ایک شعر ہے:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

ہم ایک جوان طالب علم کی مثال لیتے ہیں۔ یہ نوجوان اپنے مدرسے سے واپس آکر سوچتا ہے کہ اپنے اسباق کی تیاری کرے اور اس مقصد کے لیے چند گھنٹے بیٹھ کر پڑھے لکھے، سوچے سمجھے کیونکہ ظاہر ہے بیکاری اور سستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امتحان میں فیل ہو جائے گا، جاہل اور پسماندہ رہ جائے گا اور ہزار خرابیاں پیدا ہوں گی۔ یہ تو ہے اس کی عقل کی آواز، مگر یہ ممکن ہے کہ اس آواز کے مقابل میں سیر و تفریح کا شوق یا آنکھیں لڑانے اور عیاشی کی خواہش اپنا غل مچانا شروع کر دے اور اسے نچلا نہ بیٹھنے دے۔ ظاہر ہے اگر ان خواہشات کا شور زیادہ ہوگا تو وہ نوجوان اپنی عقل کی آواز نہیں سن سکے گا، فطری روشنی سے آنکھیں چرائے گا اور دل میں کہے گا: فی الحال تو عیش کرو، بعد میں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس قسم کی ہوس بازی کی خواہش اگر شدید ہو تو آدمی کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ہوس بازی عقل کی دشمن ہے۔

تکبر اور خود پسندی کے بارے میں امام علیؑ نے فرمایا ہے:

عُجْبُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ اَحَدُ حُسَّادِ عَقْلِهِ

خود پسندی انسان کی عقل کی دشمن ہے۔

لالچ کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ عموماً عقل وہاں ماری جاتی ہے جہاں لالچ کی بجلی کوندتی ہے۔

بدو زود شرہ دیدۂ ہوشمند
درآرد طمع مرغ و ماہی بہ بند

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

اَعْدٰی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ.

تمہارے بدترین دشمن وہ سرکش جذبات ہیں جو خود تمہارے سینہ میں موجزن ہیں۔

ان کے بدترین دشمن ہونے کی وجہ ظاہر ہے۔ یہ عقل کے دشمن ہیں جو انسان کی بہترین دوست ہے۔ خود رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

آدمی کی عقل اس کی بہترین دوست ہے۔ ہر دشمن کا مقابلہ عقل کی مدد سے کیا جا سکتا ہے لیکن جو دشمن عقل ہی سلب کرے وہ خطرناک ترین دشمن ہے۔

صائب تبریزی کا ایک شعر ہے جو گویا مذکورہ بالا حدیثِ نبوی کا ترجمہ ہے۔

بسترِ راحت چہ اندازیم بہرِ خوابِ خوش
ما کہ چوں دل دشمنے داریم در پہلوی خویش

ہم کس طرح چین کی نیند سو سکتے ہیں جبکہ ہمارے پہلو میں دل جیسا دشمن موجود ہے۔

اس لیے اس مضمون پر پوری توجہ دینا ضروری ہے کہ انسان کے حالات اور اس کی اندرونی قوتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں اور ایک دوسرے کا اثر زائل کرتی رہتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک دوسرے سے دشمنی اور حسد رکھتی ہیں۔ عقل کے ساتھ ہوا و ہوس کی دشمنی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح تقویٰ عقل کو تقویت

دیتا ہے اور بصیرت اور روشن ضمیری میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ تقویٰ نہ ریتی ہے اور نہ چراغ کا تیل۔ چونکہ وہ عقل کے دشمن کا دشمن ہے اس لیے عقل کا دوست ہے۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ حضرت امیر المؤمنینؑ نے دوستوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں جن میں سے ایک ہے وَعَدُوُّ عَدُوِّكَ۔ جب تقویٰ کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ہوس کو جو عقل کی دشمن ہے، قابو میں کر لیتا ہے۔ پھر ہوس کی یہ مجال نہیں ہوتی کہ وہ عقل کو بیکار کر سکے یا اس کے راستے میں روڑے اٹکا سکے۔

مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے:

چونکہ تقویٰ بست دو دست ہوا جب تقویٰ ہوس کے ہاتھ باندھ دیتا ہے
حق گشاید ہر دو دست عقل را حق تعالیٰ عقل کے ہاتھ کھول دیتا ہے

ان باتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ تقویٰ واقعی انسان کے طرزِ فکر اور قوتِ فیصلہ پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اس کے اثر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ دشمن یعنی ہوس کے اثر کو زائل کرتا ہے اور عقل کے لیے آزادی سے اپنا کام کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس لیے امام علیؑ نے فرمایا ہے:

عِتْقٌ مِنْ كُلِّ مَلَكَةٍ

فلاسفہ اس قسم کے عوامل کو جن کا اثر بالواسطہ ہوتا ہے فاعل بالعرض کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عوامل کی دو قسمیں ہیں جن کا اثر براہِ راست ہو انہیں فاعل بالذات کہا جاتا ہے اور جن کا اثر بالواسطہ ہو انہیں فاعل بالعرض۔ فاعل بالعرض کی صورت میں اصل سبب تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن فاعل بالعرض رستے کی رکاوٹوں کو اس طرح دور کر دیتا ہے کہ اصل سبب کو کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے اس لیے آدمی بسا اوقات فاعل بالعرض کو ہی اصل سبب سمجھ لیتا ہے۔

اور کسی بات میں شک ہو تو ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ غصہ، شہوت رانی

لالچ، حسد، ضد، تعصب، خود پسندی اور ایسے ہی دوسرے عیوب آدمی کو زندگی میں اندھا اور بہرا بنا دیتے ہیں۔ ہوس کے سامنے آدمی اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ آدمی کو عموماً اپنے عیب نظر نہیں آتے۔ وہ دوسروں ہی کے عیب دیکھتا ہے چاہے وہ خود دوسروں سے زیادہ عیوب میں مبتلا ہو۔ اپنے عیب نظر نہ آنے کا سبب خود پسندی اور مغروری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں بھی کوئی شک ہے کہ اہلِ تقویٰ اپنے اخلاقی مجاہدات کے سبب خود پسندی، لالچ اور دوسرے نفسانی رذائل پر غالب آ جاتے ہیں۔ انہیں اپنے عیوب کا بہتر احساس اور ادراک ہوتا ہے۔ کیا انسان کے لیے اس سے بہتر اور مفید تر بھی کوئی علم و شعور ہو سکتا ہے کہ اسے اپنی ذات کا علم ہو۔ وہ اپنے عیبوں سے واقف ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنی اصلاح کر سکتا ہے؟

اگر خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم تقویٰ کی طاقت سے اپنے نفسِ امارہ کو زیر کر سکیں تو اس وقت ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سعادتِ ابدی حاصل کرنے کا راستہ کیسا صاف نظر آنے لگتا ہے اور ہماری عقل کتنی اچھی طرح ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس وقت ہم سمجھیں گے کہ یہ مسائل کچھ ایسے پیچیدہ اور دلائل کے محتاج نہیں تھے۔ ہر بات واضح اور روشن تھی۔ صرف ہوا و ہوس کے شور و شغب میں ہم عقل کی بات پر کان نہیں دھر رہے تھے۔

کیا ہوش اور عقل میں کچھ فرق ہے؟

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ علمی مسائل کو سمجھنے میں بہت ہوشیار اور دوسروں سے بہت آگے ہوتے ہیں لیکن یہی لوگ زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور زندگی میں اپنی راہ متعین کرنے کے معاملہ میں پھسڈی ثابت ہوتے

ہیں۔ یہاں ان کی سمجھ کام نہیں کرتی۔ بہت سے لوگ جو علمی لحاظ سے ان سے بہت پیچھے ہیں، اپنی زندگی کی مصلحتوں کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان میں دو چیزیں ہیں ایک ہوش، دوسری عقل؟ بعض لوگ زیادہ ہوشیار ہیں اور بعض دوسرے زیادہ عقلمند؟

حقیقت یہ ہے ہم میں دو ایسی قوتیں نہیں جن میں سے ایک کا نام عقل ہو اور دوسری کا ہوش۔ رہی یہ بات کہ کچھ ہوشمند لوگ عملی مسائل میں پریشان ہو جاتے ہیں اور ان کی سمجھ کام نہیں کرتی، اس کی وجہ یہی ہے کہ دشمنانِ عقل کی شورش سے ان کی عقل ناکارہ ہو جاتی ہے اور وہ عقل کی بات پر کان نہیں دھرتے۔ دراصل اس قسم کے لوگوں میں یہ شورش زیادہ ہوتی ہے مگر یہ بات نہیں کہ ان کی عقل میں کچھ کمی ہو۔

میں نے شروع میں اشارتاً کہا تھا کہ جہاں تک عقلِ نظری کا تعلق ہے تقویٰ، روح کی پاکیزگی اور مجاہدۂ اخلاقی وغیرہ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا حتیٰ کہ فلسفۂ الٰہی کا بھی ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے برخلاف معرفتِ الٰہی کے حصول میں تقویٰ اور مجاہدہ کی تاثیر مسلّم ہے۔ یہ مضمون مستقل بحث کا محتاج ہے۔ میں نے مختصر طور پر صرف اجمالی اشارے کیے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں بہت سے عقلاء کا یہ خیال رہا ہے کہ انسان میں عقل و ادراک کی دوسری قوتوں کے علاوہ ایک اور پر اسرار حس موجود ہے جس کو حسِ الہام گیری کہا جا سکتا ہے۔ عصرِ حاضر کی تحقیق بھی اس نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ اس کے مطابق انسان میں ایک ایسی حقیقی حس موجود ہے جو دوسرے تمام حواس اور قوتوں سے ممتاز ہے۔ یہ حس تمام افراد میں کمی بیشی اور

اور قوت و ضعف کے فرق کے ساتھ موجود ہے۔ تربیت اور مشق کے ذریعہ سے اس حس کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو اس حس کی پرورش نشو و نما اور تقویت کا سبب بنتی ہے۔

جو باتیں کہ اس حس کی نشو و نما اور تقویت کا سبب بنتی ہیں وہ ہیں تقویٰ، طہارت، اخلاقی مجاہدہ اور نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد۔ دینی تعلیمات کے مطابق بھی یہ ایک مسلّمہ اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ میں اس ضمن میں یہاں صرف چند جملے نہج البلاغہ سے نقل کرتا ہوں۔

حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

> اس نے اپنی عقل کو زندہ کر لیا اور اپنے نفسِ امّارہ کو کچل دیا۔ اس مجاہدہ کا اثر اس کے بدن پر بھی نظر آنے لگا۔ اس کی موٹی ہڈیاں نازک ہو گئیں اور اس کے وجود میں ایک لطافت پیدا ہو گئی۔ اس وقت ایک تیز روشنی چمکی جس نے اس کی راہ میں روشنی کر دی چنانچہ وہ صحیح راستہ پر چل پڑا اور سلامتی کے دروازہ تک پہنچ گیا۔ [۱]

> يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۶)

جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اس کے ذریعے ان کی سلامتی کے راستوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے اور انہیں سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

تقویٰ اور پاکیزگی احساسات

تقویٰ اور طہارت ایک اور سمت سے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سمت احساسات و جذبات کی ہے۔ تقویٰ سے احساسات زیادہ نازک اور لطیف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ صاحبِ تقویٰ جو اپنے آپ کو گندے اور برے کاموں سے باز رکھتا ہے اور ایسی برائیوں سے بچتا ہے جیسے ریاکاری، خوشامد اور کاسہ لیسی، اپنے ضمیر کو پاک و صاف رکھتا اور اپنی عزت نفس کو برقرار رکھتا ہے اور اس کی توجہ مادی امور سے زیادہ روحانی امور کی طرف مبذول رہتی ہے، اس کے احساسات و جذبات اس شخص کے سے ہوں جو گناہوں اور گندے کاموں میں غرق اور عیش پرستی میں منہمک ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبِ تقویٰ کے جذبات زیادہ بلند، زیادہ نازک اور زیادہ پاکیزہ ہوں گے۔ وہ روحانی حسن سے زیادہ متاثر ہوگا۔ وہ دنیا کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے کچھ اور ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ جو عقلی اور ذہنی حسن و جمال دنیا میں موجود ہے وہ اپنے لطیف احساس کی بدولت اسے بہتر طور پر محسوس کرتا ہے۔

کبھی کبھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اب کیوں پہلے جیسے شعراء پیدا نہیں ہوتے؟ جو لطف اور شگفتگی مثلاً سعدیؔ اور حافظؔ کے کلام میں ہے وہ آجکل کے شعراء کے کلام میں کیوں نہیں؟ حالانکہ ہر چیز نے ترقی کی ہے، علم میں پیشرفت اور خیالات میں بالیدگی آئی ہے اور ہر لحاظ سے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔

معاصر شعراء مانیں یا نہ مانیں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اچھے شعر کے

یہ فطری ذوق اور تخلیقی قوت کے علاوہ ضمیر کی شگفتگی، لطافت اور اثر پذیری بھی ضروری ہے اور یہ شگفتگی اور لطافت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر میں تقویٰ اور روحانیت بھی ہو۔ وہ غیظ و غضب اور شہوت کا بندہ نہ ہو۔ اس کے مزاج میں آزادی اور وارستگی ہو۔

یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ گزشتہ زمانے کے شعراء تو خود اپنی کتابوں میں آلودگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہے تو یہ عجیب معمّا لیکن میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی بداعمال شخص ذہنی اور روحانی لطافتوں کا صحیح ادراک نہیں کر سکتا اور نہ ایسے شگفتہ و دل پسند مضامین تخلیق کر سکتا ہے جو بعض شعراء کے کلام میں دیکھنے میں آتے ہیں۔

تقویٰ اور مشکلات پر قابو پانے کی طاقت

تقویٰ کے ایک اور اثر کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا.

یعنی جسے تقوائے الٰہی حاصل ہوگا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دیگا۔

ایک اور آیت میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا.

جسے تقوائے الٰہی حاصل ہوگا اللہ اس کے کاموں میں ایک طرح کی آسانی پیدا کر دے گا۔

امیرالمومنین سلام اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جس نے تقویٰ اختیار کیا اس پر مصیبتیں آتی ہیں لیکن ٹل جاتی

ہیں اور تلخیاں شیریں ہو جاتی ہیں، موجیں چڑھ کر آتی ہیں لیکن پرے ہٹ جاتی ہیں، صاعقے برستی ہیں لیکن چھٹ جاتی ہیں۔"[۱۲]

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ تو ایک روحانی اور اخلاقی معاملہ ہے اس کا مصائب و مشکلات پر قابو پانے سے کیا علاقہ!

مشکلات کی دو قسمیں

یہاں ایک تمہید عرض کرتا ہوں۔ مصائب و شدائد جو انسان کو پیش آتے ہیں اور جن مشکلات میں انسان گرفتار ہوتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک تو وہ مشکلات ہیں جن میں انسان کے اپنے ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً آدمی ہوائی جہاز پر سوار ہو اور جہاز خراب ہو جائے یا کشتی پر سوار ہو اور کشتی طوفان میں گھر جائے اور ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی مصیبت ہر شخص پر آ سکتی ہے اس کا پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا اور نہ انسان کے اپنے ارادہ و اختیار کو اس میں کوئی دخل ہے۔

مصائب کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان کے اپنے ارادہ کو دخل ہے اور وہ چاہے تو ان مصائب میں گرفتار ہو اور نہ چاہے تو نہ ہو اور اگر ان مصائب میں مبتلا بھی ہو جائے تو وہ اپنے ارادہ سے ان سے نکل سکتا ہے۔ یہ اخلاقی و اجتماعی مصائب ہیں۔

اب یہاں دو سوال پیش آتے ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ پہلی قسم کے مصائب کی صورت میں تقویٰ کا کیا اثر ہوتا ہے اور دوسرا بھی سوال دوسری قسم کے مصائب سے متعلق ہے۔

پہلی قسم کے متعلق تو میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا کہ قرآنی آیات کا

اطلاق اس قسم کے مصائب پر بھی ہے یا نہیں یقین ہو سکتا ہے کہ اس طرح کا کوئی روحانی آئین اور اس قسم کی ضمانت الٰہی موجود ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسی قبولیت دعا کی۔ البتہ نہج البلاغہ میں ایک فقرہ ہے جس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ قرآنی آیات میں مصائب و شدائد سے نجات سے مراد دوسری قسم کے مصائب اور تکالیف ہی ہیں۔ جناب امیر المومنینؑ خطبہ نمبر ۱۸۱ میں فرماتے ہیں:

وَاعْلَمُوْا اَنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا مِّنَ الْفِتَنِ وَنُوْرًا مِّنَ الظُّلَمِ۔

یہ سمجھ لو کہ جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے اللہ اسے فتنوں سے نکلنے اور تاریکیوں سے روشنی میں آنے کا کوئی نہ کوئی راستہ سجھا دیتا ہے۔

پہلی قسم کی مشکلات بہت کم پیش آتی ہیں۔ زیادہ تر مشکلات جو انسان کو پیش آتی ہیں اور اسکی زندگی کو تلخ اور مکدر کر دیتی ہیں اور دنیا و آخرت کی ہر سعادت سے اسے محروم کر دیتی ہیں وہ اخلاقی اور معاشرتی فتنے اور مصیبتیں ہی ہوتی ہیں۔

اس بات کے پیش نظر کہ خود انسان ہی اپنی زیادہ تر مشکلات کا ذمہ دار ہوتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آدمی خود ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہے۔

اَعْدٰی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ۔

ہر شخص اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرتا ہے لیکن عموماً اس کا رویہ اس کے ساتھ معاندانہ ہی ہوتا ہے۔

دشمن بدشمن آن نہ پسندد کہ بے خرد
با نفس خود کند بمراد ہوای خویش

کوئی دشمن بھی دشمن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتا جو بے عقل خود اپنے ساتھ ہوا و ہوس کے چکر میں پڑ کر کرتا ہے۔

ہماری زیادہ تر مشکلات باہر سے نہیں آتیں۔ خود ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ میں نے خود اپنی زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں بھی جن کو میں نے قریب سے دیکھا ہے یہی تجربہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ واقعی بات یہی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقویٰ کا ہتھیار کتنا موثر ہے۔ تقویٰ انسان کو فتنوں سے دور رکھتا ہے اور بالفرض اگر کوئی کسی مشکل میں گرفتار بھی ہو جائے تو یہ اسے اس مشکل سے نجات دلا دیتا ہے۔ قرآن کریم کی سورۂ اعراف آیت ۲۰۱ میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ.

اہل تقویٰ کا تو یہ حال ہے کہ اگر شیطان کے اثر سے کبھی کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ چونکتے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقویٰ کے پہلے اثر یعنی روشن ضمیری اور ازدیادِ بصیرت کے ساتھ ساتھ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کو ان مشکلات اور تکالیف سے نجات مل جاتی ہے جو گناہوں کی تاریکی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ معاصی اور ہوا و ہوس کے سیاہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور تقویٰ کی روشنی میں راستہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے تاکہ آدمی گڑھوں اور کھائیوں سے بچ کر چلے۔ اگر اتفاق سے کہیں پھنس بھی جائے تو تقویٰ کی روشنی میں باہر نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔

علاوہ ازیں تقویٰ اور احتیاط کے سبب آدمی اپنی اندرونی طاقتوں کے

اس ذخیرہ کو جو خود اس کے اندر موجود ہے، لغو و حرام کاموں اور لہو و لعب میں ضائع کرنے کی بجائے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی جو باہمت ہو، اپنی مرضی کا مالک ہو اور جس کی شخصیت مکمل ہو، بہتر فیصلے کر سکتا ہے اور اپنی نجات کی راہ تلاش کر سکتا ہے۔ جس طرح روشنی نجات کا ذریعہ ہے اسی طرح ہمت و ارادہ بھی ایسا وسیلہ ہے جو خداوند تعالیٰ نے آدمی کو دیا ہے۔

سورۂ یوسف کے اواخر میں ایک آیت ہے جسے اس عجیب اور ولولہ انگیز داستان کا اخلاقی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت یوسفؑ کا قصّہ تو کم و بیش سب ہی نے سنا ہے۔ جب یہ قصہ اختتام کو پہنچنے والا ہوتا ہے یعنی حضرت یوسفؑ عزیزِ مصر بن جاتے ہیں اور برادرانِ یوسف ایک قحط کے سبب غلّہ حاصل کرنے کے لیے کنعان سے مصر آتے ہیں، وہ یوسفؑ کو نہیں پہچانتے مگر یوسفؑ انہیں پہچان لیتے ہیں اور ایک بہانہ سے اپنے سگے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیتے ہیں۔ اس وقت برادرانِ یوسفؑ دوبارہ آتے ہیں اور بڑی عاجزی سے یوسفؑ سے غلّہ کی درخواست کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس تذلّل و زاری کا نقشہ اس آیت میں کھینچا ہے:

> اے سردار! ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں۔ آپ ہمیں پورا غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں۔ اللہ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔ ﴿۸۸﴾

اب تک یوسفؑ نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ اب انہوں نے چاہا کہ اپنا تعارف کرا دیں۔

تب انہوں نے کہا:

"تمہیں یاد ہے کہ از روئے نادانی و جہالت تم نے یوسف کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟" ۸۹

اس پر وہ چونکے اور کہنے لگے:

"ہائیں کیا تم ہی یوسف ہو؟" ۹۰

فرمایا: "ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اور اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔" ۹۰ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ "اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو ایسے لوگوں کا اجر اللہ کے یہاں ضائع نہیں جاتا۔" یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ نتیجہ ہے تقویٰ، پاکبازی کا اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کا۔ میں غلام بنا ہر کس و ناکس کا محکوم ہوا مگر میں نے تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصر کی سربرآوردہ ترین اور حسین ترین عورت نے مجھ جیسے حقیر فقیر سے اپنی خواہش پوری کرنے کی درخواست کی لیکن میں اپنے تقویٰ پر قائم رہا۔ میں نے کہا: بار الہا! مجھے قیدخانہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کام کے جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اس دن کے تقویٰ نے مجھے آج عزیز مصر بنا دیا۔ تقویٰ اور صبر، پاکبازی و پاکدامنی کبھی اس دنیا میں رائیگاں نہیں جاتی۔ تقویٰ آدمی کو قعر مذلت سے نکال کر اوج عزت پر پہنچاتا ہے۔ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے قصہ یوسفؑ کے اخلاقی نتیجہ کا خلاصہ اس

ایک آیت میں بیان کر دیا ہے کہ بالآخر تقویٰ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ تقویٰ آدمی کو بہت سے مصائب اور مشکلات سے نجات دلاتا ہے اور اوجِ عزت پر پہنچا دیتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔

جو صاحبانِ تقویٰ ہر حال میں اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں ان کے لیے ناکامی اور بے بسی کا کوئی وجود ہی نہیں۔

جب آدمی حضرت امام حسینؑ کے وہ اقوال اور خطبات دیکھتا ہے جو آپ نے اپنے خاندانِ محترم کے سامنے دیے تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ کس اعتماد و یقین کے ساتھ آپ انہیں اطمینان دلا رہے تھے۔ اللہ اللہ! کیا جذبہ اور کیا ایمان تھا۔ خدایا! یہ یقین انہیں کہاں سے حاصل ہوا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب وہ دوسری بار اپنے اہل بیتؑ سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا: اِسْتَعِدُّوْا لِلْبَلَاءِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ حَافِظُكُمْ وَحَامِيْكُمْ. سختی برداشت کرنے کے لیے تیار رہو اور سمجھ لو کہ اللہ تمہارا حافظ و مددگار ہے۔ وَسَيُنْجِيْكُمْ مِنْ شَرِّ الْاَعْدَاءِ وَيَجْعَلُ عَاقِبَةَ اَمْرِكُمْ اِلٰى خَيْرٍ۔ وہ تم کو دشمنوں کے شر سے نجات دے گا اور بالآخر تمہارا انجام بخیر ہوگا۔ وَيُعَذِّبُ اَعَادِيَكُمْ بِاَنْوَاعِ الْبَلَاءِ وَيُعَوِّضُكُمُ اللّٰهُ عَنْ هٰذِهِ الْبَلِيَّةِ بِاَنْوَاعِ النِّعَمِ وَالْكَرَامَةِ۔ تمہارے دشمنوں کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرے گا اور تم کو اس تکلیف کے بدلے طرح طرح کی نعمتوں سے نوازے گا۔ فَلَا تَشْكُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا بِاَلْسِنَتِكُمْ مَا يَنْقُصُ مِنْ قَدْرِكُمْ۔ لہٰذا شکایت مت کرو

اور کوئی ایسی بات زبان پرست لاؤ جو تمہارے شایانِ شان نہ ہو۔

امام حسینؑ کو جو اطمینان تھا کہ آخر میں وہی کامیاب ہوں گے اور جس کی تلقین وہ اپنے اہلِ خاندان کو کر رہے تھے اس کا سرچشمہ یہی آیت تھی:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔

اُن کے پاس قرآن کی ضمانت موجود تھی اور انہیں اسی قسم کا اطمینان اور یقین حاصل تھا جیسا یوسفِ صدیق کو حاصل تھا۔ جب ان کے تقویٰ کا نتیجہ برآمد ہوا تو حضرت یوسفؑ نے جوشِ مسرت سے کہا تھا: اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ لیکن امام حسینؑ کی نظر داستان تمام ہونے سے پہلے ہی نتیجہ پر تھی۔

امام حسینؑ کے نیچے تلے جملے ان کے اہلِ خاندان کے قلب پر تیر کی طرح اپنے نشانہ پر بیٹھے۔ انہوں نے سختی اور قید کو برداشت کیا لیکن تقویٰ اور صبر کی بدولت انجام وہی ہوا جس کی پیشین گوئی امام حسینؑ نے کی تھی اور جس کی ضمانت خداوندِ کریم نے قرآن میں دی تھی۔ چند ہی روز بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے امام حسین علیہ السلام کا قول جتنی الفاظ بڑے اطمینان سے دہرایا۔ یزید بن معاویہ کو مخاطب کر کے کہا:

"تو جو چاہے تدبیر کر اور جیسی چاہے کوشش کر کے دیکھ لے تو ہمارا نام نہیں مٹا سکتا اور نہ ہماری مقبولیت اور احترام میں کمی کر سکتا ہے اور نہ ہی تو اس وحی کو ختم کر سکتا ہے جو ہمارے خاندان میں زندہ ہے۔ تیرے لیے اس دنیا میں بجز ننگ و عار کچھ باقی نہ رہے گا۔" ؎۱۵

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حقیقت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا ایک عملی اصول ہے اور چونکہ خود قرآن مجید میں اس اصول کی صراحت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے اور بعدہٗ احادیث نبویؐ اور آثار ائمہ طاہرینؑ میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے اور بعد ازاں ہر دور اور ہر زمانہ میں ہر طبقہ کے بزرگانِ دین اور علماء نے اس کی اہمیت تحریر و تقریر کے ذریعہ بیان کی ہے اس لیے علمائے اسلام میں ہمیشہ یہ موضوع زیرِ بحث رہا ہے، فقہی کتابوں میں اس پر خوب بحث و تمحیص اور تحقیق کی گئی ہے۔

وہ مسائل جن کو فقہاء نے موضوع بحث بنایا

عام طور پر فقہاء اور غیر فقہاء جنہوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے،

انھوں نے اپنی بحث کو چند حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ میں ان تمام حصوں پر تو گفتگو نہیں کروں گا۔ مختصر طور پر ان کی فہرست ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ایک تو قرآن مجید کی آیات اور رسول اکرمؐ اور ائمۂ طاہرینؑ کی ان احادیث کا بیان جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں بقول شہید ثانی (زین الدین جبعی عاملی) ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے بوجھ سے کمر ٹوٹ جائے۔

دوسری بحث معروف و منکر کے معنی اور ان کی تعریف کی ہے۔ بعض فقہا نے اس ضمن میں علم کلام کے نقطۂ نظر سے حسن و قبیح عقلی کی بحث بھی کی ہے۔

ایک اور بحث کا موضوع یہ ہے کہ آیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب عینی ہے یا واجب کفائی؟

پھر اس کا بیان ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کی شرائط کیا ہیں؟ کچھ تو عمومی شرائط ہیں کہ ہر واجب ان کے ساتھ مشروط ہے۔ ان میں مشہور شرائط عقل، بلوغ، قدرت اور ایک لحاظ سے علم ہیں۔ ان کے علاوہ ممکن ہے کہ ہر واجب کی کچھ اپنی مخصوص شرائط بھی ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی کچھ مخصوص شرائط ہیں یا نہیں۔

عام طور پر فقہاء چار شرائط بیان کرتے ہیں:

- پہلی علم و معرفت،
- دوسری نتائج و عواقب کے تحمل کی طاقت،
- تیسری کوئی ضرر پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہونا یا بقول بعض فقہا کسی فساد کا احتمال نہ ہونا،
- چوتھی اصرار و مستقل یعنی جس نے کسی معروف کو ترک کیا ہو، وہ از خود نادم و پشیمان نہ ہو۔

ایک اور سوال جس کے متعلق فقہاء بحث کرتے ہیں وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجات کا۔ بطورِ کلی اخبار و احادیث میں نہی عن المنکر کے تین درجے بیان کیے گئے ہیں:

- ایک بالقلب
- دوسرا باللسان
- اور تیسرا بالید

فقہاء نے ان تینوں درجوں کی تشریح بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں پہلے درجہ میں مسلمان کو چاہیے کہ غلط کاری، واجبات کے ترک اور منہیات کے ارتکاب کے خلاف اپنے دل میں نفرت محسوس کرے۔ قلبی تنفر سب سے ادنیٰ درجہ ہے کیونکہ یہ صرف ایک منفی عمل ہے۔ اس میں منہیات کے مرتکب سے پہلوتہی ترکِ معاشرت اور اظہارِ تاسف و تکدر شامل ہے۔

دوسرا درجہ زبان سے منع کرنے کا ہے۔ اس درجہ میں بھی پہلے پند و نصیحت سے کام لینا چاہیے۔ اگر اس طرح کام نہ چلے تو پھر سخت الفاظ استعمال کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہوگی۔

تیسرا درجہ زبردستی روکنے کا ہے۔ اس کے بھی فقہاء نے مختلف مدارج بیان کیے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا ہے کہ کبھی معمولی طاقت کا استعمال کافی ہوتا ہے اور کبھی سخت سزا کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یہ بھی ممکن ہے کہ منہیات کا مرتکب زخمی ہو جائے اور کبھی معاملہ اس کے قتل تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ جب نوبت یہاں تک آجائے تو فقہاء اپنی اصطلاح میں توقف کی ہدایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں عام لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود ایسے معاملہ میں اقدام کرلیں۔ اس درجہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف حاکمِ شرع کا فریضہ ہے یا

کسی ایسے شخص کا جس کو حاکم شرع نے اس کی اجازت اور حکم دیا ہو۔ اگر عام لوگ ایسے کام کرنے لگیں تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں بد نظمی اور افراتفری سی پھیل جائے گی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحث کے ضمن میں فقہاء عموماً کچھ اور مسائل بھی بیان کرتے ہیں جن کا درحقیقت اس عنوان سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ایک الگ بحث ہے مثلاً اس قسم کے سوال کہ زمانۂ غیبتِ امامؑ میں حدود اور تعزیرات کا نفاذ کس کا فرضِ منصبی ہے۔ حد اُن سزاؤں کو کہتے ہیں جنکی حد اور مقدار شارعِ اسلام نے مقرر کر دی ہے جیسے چوری کی حد' زنا کی حد۔ تعزیر اس حد کو کہتے ہیں جس کی مقدار شارعِ اسلام کی طرف سے مقرر نہیں کی گئی بلکہ حاکم کو اختیار ہے کہ وہ جرم کی نوعیت اور جرم جن حالات میں سرزد ہوا ہے اس کا اندازہ لگا کر اپنی صوابدید کے مطابق سزا تجویز کرے۔

حدود و تعزیرات کی تشریع بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرح اسی غرض سے ہوئی ہے کہ بُرے کاموں کو روکا جائے اور نیک کاموں کی ترغیب دی جائے اور ان کی تائید کی جائے۔

یہ تھا خلاصہ ان مباحث کا جن سے اس سلسلہ میں بحث کی جاتی ہے۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس موضوع پر بحث کا طرز کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کی مختصر تاریخ پر بھی روشنی ڈال دی جائے یعنی اس کے متعلق بھی گفتگو ہو جائے کہ مسلمانوں نے اس اصول پر کس طرح عمل کیا ہے اور کس طرح اس اصول کو نافذ کیا ہے۔ آخر میں مختصر طور پر کچھ اور مطالب کا بھی اضافہ کیا جائے گا۔

اسلامی تاریخ میں حسبہ و احتساب

آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل اسلامی معاشرے میں اس وقت کی اسلامی حکومت نے ایک تنظیم قائم کی تھی جس کا نام حسبہ یا احتساب کا محکمہ تھا۔ یہ تنظیم صدیوں قائم رہی۔ یہ تنظیم کب قائم ہوئی اور اس کا یہ نام کب رکھا گیا یہ تو مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن یہ امر مسلّم ہے اور اس کا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ یہ محکمہ چوتھی صدی ہجری میں موجود تھا اور بظاہر تیسری صدی میں قائم ہوا تھا۔ یہ سرکاری محکمہ تھا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد ایک دینی ضرورت پر تھی۔ یہ اسی طرح کا محکمہ تھا جیسے قضا کا محکمہ جس کی اپنی تاریخ ہے۔ خلیفہ دوم کے زمانے سے خلیفہ کی اپنی ذات کے علاوہ دوسرے لوگ خلیفہ کے حکم سے قاضی مقرر کیے جانے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ اس محکمہ میں توسیع ہوتی گئی۔ خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں یہ محکمہ ابوحنیفہ کے شاگرد ابویوسف کی کوشش سے زیادہ منظم ہو گیا اور خود ابویوسف اس پوری تنظیم کے سربراہ (قاضی القضاۃ) مقرر ہوئے۔ اسی طرح ایک اور محکمہ تھا جس کو دیوان مظالم کہا جاتا تھا۔ بظاہر یہ پولیس کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اسی طرح نقابت وغیرہ دوسرے محکمے تھے جن کا تاریخ میں تذکرہ موجود ہے۔

یہ سب محکمے کسی نہ کسی طرح خلافت و حکومت کے ماتحت تھے۔

بہرحال احتساب کا محکمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہی محکمہ تھا اور اس کا رنگ دینی تھا۔ محتسبوں اور خصوصاً اس محکمہ کے سربراہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ عالم ہوں اور متقی و پرہیزگار اور امین ہونے کے ساتھ ساتھ عوام میں ان کا احترام ہو۔

محتسب لوگوں کے کردار اور چال چلن کی نگرانی کرتا تھا اور یہ دھیان رکھتا تھا کہ وہ منہیات کے مرتکب نہ ہوں خصوصاً شراب خوری کی روک تھام اور شراب خوروں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔ اسی لیے وہ غزل گو شعرا جن کو خمریات سے شغف تھا محتسب کے ظلم سے نالاں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں محتسب کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ کبھی کبھی خدا کا شکر کرتے ہیں کہ محتسب نہیں ہے یا محتسب دنیا سے اٹھ گیا۔ شاید حافظ نے سب سے زیادہ اپنے اشعار میں محتسب کا نام لیا ہے۔ کہتے ہیں:

اے دل بشارتے دہمت محتسب نماند
وز مے جہان پُر است و بت مے گسار ہم

کہتے ہیں کہ اس شعر میں حافظ کا اشارہ امیر مبارز الدین کی طرف ہے۔ یہ حضرت ایک مدت تک لوگوں کی توجہ منعطف کرانے کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے اور بظاہر ایک محتسب کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ان کو ہی حافظ نے محتسب کہا ہے چونکہ وہ محض ریاکاری سے کام لیتے تھے۔ حقیقت کچھ نہیں تھی اس لیے آخر میں خود ہی مے گساری کی نذر ہو گئے۔ اسی لیے حافظ اور دوسرے شعراء ان کو طعن و تضحیک کا نشانہ بنانے لگے۔

یا مثلاً سعدی گلستان کے باب دوم میں کہتے ہیں:
شیخ اجل شمس الدین ابو الفرج بن الجوزی نے مجھے ترک سماع کا حکم دیا تھا۔ وہ مجھے خلوت و عزلت میں نصیحت کرتے رہتے تھے مگر مجھ پر جوانی دیوانی کا غلبہ تھا اور میں ہوا و ہوس کے پنجہ میں گرفتار تھا۔ جب مجھے اپنے شیخ کی نصیحت یاد آتی تھی میں کہتا تھا:

قاضی ار با ما نشیند بر فشاند دست را
محتسب گر مے خورد معذور دارد مست را

سعدی کے اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی محتسب سے الگ ہوتا تھا اور قضاء کا محکمہ احتساب کے محکمہ سے جدا تھا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں حسبہ و احتساب کی اصطلاح بعد کی ایجاد ہے۔ جس زمانے سے احتساب کا محکمہ حکومت اسلامی میں قائم ہوا اس وقت سے یہ اصطلاح بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی میں استعمال نہیں ہوئی۔ نہ اخبار و روایات اہل تشیع میں یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے اور نہ ہی اخبار و روایات اہل تسنن میں دیکھا گیا ہے۔

بعد کے دور میں جب اس لفظ نے اسلامی معاشرے میں اپنی جگہ پیدا کر لی تو یہ بتدریج علماء و فقہاء کی اصطلاح میں بھی داخل ہو گیا۔ بعض فقہاء نے باب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو باب الحسبہ ہی کا عنوان دیا ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے شیعہ فقہا میں سب سے پہلے شہید اول محمد بن جمال الدین مکی نے اپنی کتاب 'دروس' میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تذکرہ کتاب الحسبہ کے عنوان کے تحت درج کیا ہے۔ محدثین میں سب سے پہلے مرحوم فیض کاشانی نے اپنی کتاب 'وافی' میں یہ عنوان اختیار کیا ہے۔ مگر فیض مرحوم نے حسبہ کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ انھوں نے جہاد اور حدود کو بھی اسی عنوان میں شامل کر لیا ہے۔ صاحب مجمع البحرین نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ ان کی کتاب کا تعلق تفسیر اور لغات قرآن کی تشریح سے ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، یہ مادہ قرآن و حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی میں نہیں آیا لیکن چونکہ صاحب مجمع البحرین کے زمانے میں یہ مادہ اس معنی میں

استعمال ہونے لگا تھا، وہ کہتے ہیں:

اَلْحِسْبَةُ هُوَ الْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْىُ عَنِ الْمُنْكَرِ

بہرحال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک محکمہ تاریخ اسلام میں موجود تھا اور اس محکمہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ گو حکومت و خلافت سے وابستہ ہونے کی بنا پر یہ محکمہ پوری طرح اسلامی نہیں تھا تاہم چونکہ اسلامی تعلیمات و احکام کے نفاذ کے لیے وجود میں آیا تھا اس لیے ایک مفید اور موثر ادارہ تھا۔ بہت سی عمدہ اور نفیس کتابیں بھی احتساب کے موضوع اور محتسب کے فرائض پر لکھی گئی ہیں۔

میں نے حال ہی میں ایک کتاب دیکھی ہے جس کا نام ہے معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ، فقہائے شافعیہ میں سے کسی کی تصنیف ہے اور ایک مستشرق نے یورپ سے شائع کی ہے۔ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں مسلمانوں نے معاشرتی اصلاحات کی طرف کس قدر توجہ کی تھی اور ان کا دینی شعور کتنا پختہ اور جامع تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کے مطابق وہ اس بات کو اپنا دینی فرض سمجھتے تھے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاحات عمل میں لائیں۔

احتساب کا دائرۂ کار

جرجی زیدان کہتا ہے کہ احتساب کا محکمہ قدیم زمانے میں وہی کام کرتا تھا جو آجکل میونسپلٹیاں کرتی ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ صحیح ہے کہ بہت سے فرائض جو آجکل میونسپلٹیاں انجام دیتی ہیں اس زمانہ میں وہ کام احتساب کا محکمہ کرتا تھا۔ مثلاً محتسب کے فرائض سے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ محتسب

کا فرض ہے کہ اس بات کی نگرانی کرے کہ شیر فروش دودھ دہی ڈھک کر رکھیں تاکہ مکھیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے انہیں گندا نہ کریں یا یہ دیکھے کہ قصاب نخیر فروش اور کبابیے جو کپڑے بطور صافی استعمال کرتے ہیں ان کو دن میں کم از کم ایک بار صابن سے دھوئیں۔ اسی طرح دودھ والا دن میں ایک بار اپنے دودھ دہی کے برتنوں کو دھوئے۔ اگر شہر پناہ کی دیوار مرمت طلب ہو جائے تو احتساب کا محکمہ اس کی مرمت کرائے۔ اگر شہر میں پانی کی کمی پڑ جائے تو احتساب کا محکمہ کافی پانی مہیا کرنے کا انتظام کرے۔ ہمارے زمانے میں یہ سب کام عموماً میونسپلٹیاں انجام دیتی ہیں۔

مگر احتساب کے محکمہ کے فرائض ان ہی کاموں تک محدود نہیں تھے۔ بہت سے ایسے کام بھی جو آجکل پولیس کے فرائض منصبی میں داخل سمجھے جاتے ہیں اس وقت محتسب انجام دیتے تھے؛ مثلاً روزہ خوری، شراب نوشی اور فحاشی کو روکنا محتسبوں کے فرائض میں شامل تھا۔ دوسرے بہت سے ایسے کام ہیں جو آج بالکل متروک ہیں اور کوئی بھی انہیں انجام نہیں دیتا جیسے مساجد و منابر کی نگرانی کہ مثلاً واعظ کوئی وضعی حدیث بیان نہ کرے۔ لوگوں کو کسی بدعت کی تلقین نہ کرے یا منبر پر بن سنور کر نہ آئے اور عورتوں کو لبھانے کی کوشش نہ کرے چونکہ ان باتوں کا تعلق روحانیت سے ہے اور حکومت کے کاموں سے ان کا براہ راست کوئی واسطہ نہیں اس لیے یہ آجکل بالکل متروک ہیں اور کوئی بھی یہ فرائض انجام نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ جرجی زیدان جو کہتا ہے کہ احتساب کا محکمہ وہی فرائض انجام دیتا تھا جو آجکل میونسپلٹیاں انجام دیتی ہیں یہ صحیح نہیں ہے چونکہ احتساب کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقدس اصول پر تھی اس لیے اس

دائرہ کار صرف تبلیغی سرگرمیوں تک محدود نہیں تھا۔

احتساب کے دائرے سے باہر امر بالمعروف

یہ نکتہ تو یاد رکھنے کے قابل ہے کہ احتساب کا محکمہ تو ایک سرکاری محکمہ تھا جو حکومت و خلافت سے منسلک تھا اور اسی حیثیت میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی لوگوں کا اس سلسلہ میں کوئی فرض نہیں تھا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فقہاء کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کئی درجے ہیں اور صرف وہ درجے عوام کے دائرہ کار سے خارج اور صرف حاکم کے فرائض میں داخل ہیں جن میں طاقت کا استعمال ضروری ہو اور قید کرنے، کوڑے مارنے اور قتل جیسی سزائیں ناگزیر ہوں۔ باقی وہ درجے جن میں پند و نصیحت یا قطع تعلق وغیرہ شامل ہیں ہر مسلمان کا فرض ہیں۔ پرانے زمانے میں ہر فرد اپنا فرض پہچانتا تھا اور حتی المقدور مسلمانوں کی اصلاح کے کام میں شرکت کرتا تھا۔

احتساب کا تقدس اور احترام

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ احتساب کا محکمہ جس کا دائرہ کار بہت وسیع تھا، آجکل اس کا کوئی بدل موجود نہیں۔ چونکہ اس محکمہ کی بنیاد مذہبی اور اس کا رنگ دینی تھا، عوام اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے کہ اس محکمہ کی مدد کریں اور اسے تقویت پہنچائیں، اس لیے مجبوراً محتسب کے عہدہ کے لیے ایسے اشخاص منتخب کیے جاتے تھے جو خود متقی اور پرہیزگار ہوں اور عوام ان کا احترام کرتے ہوں۔

گزشتہ دور میں مسلمانوں کے

اصلاحی نظریہ کی وسعت

ایک اور نکتہ جو تاریخ احتساب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ سابق میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں زیادہ وسعت تھی۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صرف نماز، روزہ، حج اور زکات ان چار عبادات تک محدود نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی نظر میں یہ اصول تمام اخلاقی اور معاشرتی اصلاحات کا ضامن تھا۔

اسلام کی تلقین اور تاکید

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ آثار دینی میں اس مقدس اصول کی کس کس طرح تلقین کی گئی ہے اور اس کے فوائد و نتائج کا کس طرح تذکرہ کیا گیا ہے مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

"مومن مرد ہوں یا عورتیں سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکات دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن پر اللہ کی رحمت ہوگی۔ اللہ یقیناً طاقت والا اور حکمت والا ہے۔" [۱]

اس آیت کریمہ میں علت و معلول کا ایک سلسلہ بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا

گیا ہے کہ کس بات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ حقیقی ایمان کا ــ تقلیدی ایمان کا نہیں ــ تقاضا یہ ہے کہ آپس میں محبت والفت کا رشتہ قائم ہو اور مومنین ومومنات ایک دوسرے کے حالات میں دلچسپی لیں۔ اس محبت اور دلچسپی کا تقاضا یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے پروردگار کی عبادت کریں یعنی نماز قائم کریں اور غریبوں کی دستگیری کریں یعنی زکات ادا کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دوسرا تقاضا ہے، خدا اور رسولؐ کی اطاعت اور تمام اسلامی احکام پر عمل؛ اور ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ ہے کہ اللہ جو قادر و توانا اور باتدبیر ہے۔ اس کی بے پایاں رحمت ان کے شامل حال ہو۔

امام باقرؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں فرمایا:

> "اسی اصول کی بدولت تمام تعلیمات پر عمل ہوتا ہے۔ راستے پرامن اور محفوظ ہو جاتے ہیں، حلال روزی کمانے کا موقع ملتا ہے، مظلوموں کی دادرسی ہوتی ہے، زمین آباد ہوتی ہے، دشمنوں سے انتقام لیا جاتا ہے اور سب کام روبراہ ہو جاتے ہیں۔"[۲۱]

جب آدمی ایک طرف تو ان تعلیمات اور ہدایات کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی دیکھتا ہے کہ ایک زمانے میں مسلمانوں نے کم وبیش ان ہدایات پر عمل کر کے فائدہ بھی اٹھایا ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوتا ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے زمانے کا محکمۂ احتساب بالکل بے عیب تھا اور شارع اسلام کے مقصد کو مکمل طور پر پورا کرتا تھا۔ مدعا صرف

یہ ہے، اگر ماضی کا حال سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم کس قدر پیچھے چلے گئے ہیں۔

آج علاوہ اس کے کہ کوئی ادارہ کسی شکل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے موجود نہیں بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ خیال بھی مسلمانوں کے دماغ سے بالکل نکل گیا اور اب احتساب کو جس سے کبھی اصلاحِ معاشرہ کا کچھ نہ کچھ کام لیا جاتا تھا، امورِ دینی میں شمار ہی نہیں کرتے۔ اگر کبھی کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ خیال بھی آتا ہے تو وہ یہ تصور ہی نہیں کرتا کہ اصلاحِ معاشرہ بھی اس فریضہ کا ایک جزو ہے۔ معروف و منکر کا وسیع تر مفہوم قطعاً غائب ہو گیا۔ اب اس کے مفہوم کو عبادات کے مسائل تک محدود کر لیا گیا ہے اور بدقسمتی سے اس پر بھی عمل نہیں ہوتا۔

اگر اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وسیع تر مفہوم موجود نہ ہوتا تو یہ ہرگز نہ کہا جاتا کہ "اسی اصول کی بدولت تمام اسلامی تعلیمات پر عمل ہوتا ہے۔ راستے پُرامن اور محفوظ ہو جاتے ہیں، حلال روزی کمانے کا موقع ملتا ہے۔ مظلوموں کی دادرسی ہوتی ہے، زمین آباد ہوتی ہے، دشمنوں سے انتقام لیا جاتا ہے اور سب کام روبراہ ہو جاتے ہیں۔"[۳۲]

آج ہمارے ذہنوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو محدود اور نامکمل تصور باقی رہ گیا ہے، اس پر تو کتنے ہی عمدہ طریقے سے عمل کیا جائے یہ نتائج ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔

اصلاحات سے لوگوں کی بے اعتنائی کی وجہ

چونکہ ذہن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بہت ہی محدود تصور

رہ گیا ہے اور لوگ معاشرتی زندگی سے متعلق کسی اصلاح کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہی نہیں' اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اگر بالفرض میونسپلٹی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق کوئی قدم اٹھاتی ہے یا شہر کی صفائی کرانا چاہتی ہے یا ٹریفک کے بہتر قوانین نافذ کرنا چاہتی ہے تو لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ بھی کوئی مذہبی معاملہ ہے یا ایسے قوانین پر عملدرآمد ان کا کوئی مذہبی فریضہ ہے۔ حالانکہ بقول شیخ محمد حسن صاحب جواہر الکلام ہر وہ کام جس سے بھلائی کو تقویت پہنچے اور برائی کی بیخ کنی ہو' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زمرہ میں آتا ہے۔ لوگ ان کاموں میں کوتاہی اسی وجہ سے کرتے ہیں کہ انہوں نے ان باتوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرہ ہی سے خارج کر دیا ہے۔

گزشتہ چند صدیوں میں

امر بالمعروف کی صورت حال

جو کچھ میں نے عرض کیا یہ تو مختصر تاریخ تھی اس دور کی جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رواج تھا اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بتلا دیا جائے کہ زمانۂ حال یعنی پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اس اصول پر کیسے عمل ہوتا رہا ہے۔ ابھی تک اس دور کی مفصل تاریخ کسی کتاب میں منضبط نہیں ہوئی ہے لیکن کچھ باتیں ہم نے اپنے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں سے ضرور سنی ہیں۔

جب آدمی آئمۂ دین کے احکام پر نظر ڈالتا ہے اور اس اصول کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو افسوس کرتا ہے کہ آج کیوں یہ اصول بھلا دیا گیا ہے۔ جب وہ

یہ سوچا ہے کہ آخری دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر کیسے کیسے ہولناک منظر دیکھنے میں آتے تھے تو خدا کا شکر کرتا ہے کہ اچھا ہی ہوا کہ اس قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اگر کہیں کچھ باقی رہ گیا ہو تو کاش وہ بھی ختم ہو جائے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہی مطلب ہے جس کے مناظر قریبی دور میں دیکھنے میں آتے تھے تو بہتر یہی ہے کہ یہ متروک ہی رہے۔

ایک فراموش شدہ اصول

ڈاکٹر ابراہیم آیتی[1] نے امر بالمعروف کے اصول کو فراموش شدہ اصول کہا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ اصول بھلا دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس اصول کو بھلایا کیوں گیا؟ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اور معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی بجائے بیرونی اسباب کی تلاش کے امیر المومنینؑ کے اس قول کی طرف توجہ دینی چاہیے: دَوَاؤُكَ فِيكَ وَدَاؤُكَ مِنْكَ۔ یعنی بیماری بھی تمہاری اپنی پیدا کی ہوئی ہے اور اس کا علاج بھی تمہارے اپنے ہی پاس ہے۔ ہم نے خود ہی ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ لوگ اس سے بیزار ہو گئے اور پھر ہم نے خود ہی اس اصول کو فراموش کر دیا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ اولین شرط تو یہی حسن نیت اور اخلاص کی ہے۔ ہمارا تعلق صرف ان برائیوں سے ہونا چاہیے جو علی الاعلان کی جاتی ہیں۔ ہمیں

---

[1] محقق ڈاکٹر آیتی نے اپنی کتاب تاریخ عاشورا میں ثابت کیا ہے کہ امام حسینؑ کا اقدام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعمیل کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

جاسوسی کرنے اور لوگوں کے پرائیویٹ معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں لیکن گزشتہ قریبی دور میں کچھ طالع آزما اور بدطینت لوگوں نے اس مقدس اصول کو اپنی مقصد برآری اور دوسروں کے ساتھ اپنے ذاتی جھگڑے چکانے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ مطلب برآری کے لیے کسی مدرسے کے کونے میں چند روز بسر کرتے اور پھر عبا و قبا، عمامہ و نعلین پہن کر اور داڑھی بڑھا کر عالمانہ صورت بنا لیتے تھے۔ کیا کیا جرائم تھے جو امر بالمعروف کے نام پر نہیں کیے گئے اور کن کن منہیات کا ارتکاب نہی عن المنکر کے نام پر نہیں ہوا۔ اس قسم کے قصے ہم سب ہی نے سن رکھے ہیں اور سب کو معلوم ہیں۔

کہتے ہیں آقائے نجفی اصفہانی مرحوم کی سربراہی کے زمانے میں چند اشخاص ان کے پاس آئے جو اپنے آپ کو طالب علم کہتے تھے مگر درحقیقت تھے نہیں کیونکہ اصل طالب علم ایسی حرکتیں نہیں کیا کرتے۔ بہرحال یہ لوگ ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا دائرہ اور ایک ٹوٹی ہوئی ڈھولک لیے ہوئے مرحوم آقائے نجفی کے گھر پہنچے۔ مرحوم نے ان سے پوچھا کیا بات ہے؟ کہاں سے آئے ہو اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

کہنے لگے: ہم مدرسہ میں تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ مدرسہ کے اس طرف کسی گھر عیوذ کر شادی ہو رہی ہے اور وہاں ڈھولک بجائی جا رہی ہے۔ ہم ایک گھر کی چھت پر سے دوسری چھت پر ہوتے ہوئے اس مکان میں داخل ہو گئے اور لوگوں کی خوب پٹائی کی۔ ایک نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں نے دولہا کے کان پر ایک زنّاٹے دار تھپڑ رسید کیا۔

مرحوم آقائے نجفی نے کہا: کیا نہی عن المنکر یہی ہے جو تم نے کیا؟ تم نے اس کے نام پر خود کتنی برائیوں کا ارتکاب کیا۔ اول تو یہ شادی کی محفل تھی۔ دوسرے

تمہیں جاسوسی کا کوئی حق نہیں تھا تیرے تمہیں کیا حق تھا کہ تم لوگوں کی چھتوں پر سے گزرو۔ چوتھے تمہیں مارپٹائی کا حق کس نے دیا؟

پرانے زمانے میں اس قسم کے قصے بہت ہوتے تھے۔ خوش قسمتی سے اب یہ بات نہیں رہی۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بہت سی صورتوں میں نہی عن المنکر از روئے قانون نہی عن المنکر نہیں ہوتا بلکہ خود ایسی برائی بن جاتا ہے جسے روکنے کی ضرورت ہے۔

زبانی نصیحت ورنہ پھر تشدد

ایک اور بات جو میں ضمناً کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہم نے زیادہ تر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے صرف دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی توجہ ان ہی دو طریقوں کی طرف ہے۔ اول زبانی حکم ورنہ پھر تشدد بشرطیکہ ہم میں مارپٹائی کرنے اور لوگوں کو بند کرنے کی طاقت ہو۔ ہم ان ہی دو طریقوں سے واقف ہیں اور یہی دو طریقے جانتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پند و نصیحت اور سمجھانا بجھانا بھی ایک ذریعہ ہے اور بعض صورتوں میں تشدد کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے لیکن کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے یہی دو راستے ہیں؟ کیا کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا؟

اخلاص اور عمل کی راہ

احادیث میں آیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تین درجے یا مرحلے ہیں:

بالقلب، باللسان اور بالید۔

ہم عام طور پر بالقلب کے مرحلہ کا مطلب اخلاص، حسن نیت اور مسلمانوں کے مستقبل سے دلچسپی کے احساس کے بجائے جوش و خروش اور بیجا تعصب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح باللسان کے مرحلہ کا مطلب واضح بیان اور تسلی بخش دلائل کی بجائے تحکم آمیز پند و نصیحت لیتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں واضح ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ اور بالید کے مرحلہ کا مطلب عملی تبلیغ، عملی تدابیر اور نیک عمل کی مثال قائم کرنے کی بجائے تشدد اور طاقت کا استعمال سمجھتے ہیں۔

عمومی طور پر ہم بولنے، لکھنے، خطابت اور مضمون نویسی کے زیادہ قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صرف زبان سے کہنے سے سب کام درست ہو جاتے ہیں حالانکہ:

سعدیا گرچہ سخندان و مصالح گوئی
بعمل کار برآید بسخندانی نیست

حدیث میں ہے:

کُوْنُوْا دُعَاۃً لِلنَّاسِ بِغَیْرِ اَلْسِنَتِکُمْ۔
یعنی زبان سے کام لیے بغیر لوگوں کو دینِ
حق اور اصلاحِ کار کی دعوت دو۔

مطلب یہ ہے کہ اپنے عمل سے نیک مثال قائم کرو اور دوسروں کو متاثر کرو۔ ایک اور حدیث ہے جو فقہاء عموماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب میں نقل کرتے ہیں:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ بَسْطَ اللِّسَانِ وَكَفَّ الْيَدِ وَاِنَّمَا جَعَلَهُمَا يَنْبَسِطَانِ مَعًا وَيَكُفَّانِ مَعًا.

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہو کہ زبان تو کھلے اور ہاتھ بند رہے بلکہ کھلیں تو دونوں کھلیں اور بند رہیں تو دونوں بند ہی رہیں۔

یعنی اگر عمل نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ زبان بھی بند رہے۔ فقہاء اسلام کی ایک بزرگ ترین ہستی نے اس حدیث اور اس طرح کی دوسری حدیثوں سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے میں ان ہی کی کتاب سے نقل کرتا ہوں:

شیخ ابوجعفر طوسی علیہ الرحمۃ نے جو شیخ الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں؛ اپنی کتاب "نہایہ" میں جو ہمارے یہاں فقہ کی ایک نہایت معتبر کتاب ہے لکھا ہے کہ امر بالمعروف ہاتھ کے ذریعے سے بھی ہوتا ہے اور زبان کے ذریعے سے بھی۔ ہاتھ سے امر بالمعروف کا یہ مطلب ہے کہ آدمی بذاتِ خود عاملِ بالخیر ہو اور منکرات سے اجتناب کرے تاکہ دوسرے لوگ خود بخود اس کی مثال پر عمل کریں۔ زبان سے امر بالمعروف کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی تلقین کرے اور انہیں خوشخبری سنائے کہ اگر وہ نیکی کی راہ پر چلیں گے تو دنیا میں تعریف کے مستحق ہوں گے اور آخرت میں رحمتِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوگی۔ ساتھ ہی انہیں عذابِ الٰہی سے ڈرائے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

ہاتھ سے امر بالمعروف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ منکرات کے مرتکب کو سزا دی جائے گی۔ اس صورت میں کسی کو قتل یا زخمی کرنے کی نوبت بھی آسکتی ہے لیکن حکومتِ شرعی کی ہدایت کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

صاحب "جواہر الکلام" نے شیخ طوسیؒ کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے "زیادہ صحیح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی سب سے بہتر، بالاتر اور مستحکم ترین صورت یہ ہے خصوصاً جہاں تک مذہبی رہنماؤں کا تعلق ہے (جن پر اور جن کے عمل پر لوگوں کی نگاہیں رہتی ہیں) یہ لوگ خود ورع و تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور تمام نیک اعمال میں چاہے وہ واجب ہوں یا مستحب خود دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ تمام برائیوں سے بچیں۔ اخلاق حسنہ سے اپنے نفس کی تکمیل کریں اور عادات ذمیمہ سے دور رہیں۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں: "حسنِ عمل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سب سے بہتر اور مؤثر ترین ذریعہ ہے اور ممکن ہی نہیں کہ اس کا اثر نہ ہو خصوصاً اگر اس کے ساتھ زبانی پند و نصیحت کا بھی اضافہ کر دیا جائے کیونکہ ہر موقع کے لیے بات کا ایک الگ ڈھنگ ہے اور ہر درد کی الگ دوا ہے۔ جسمانی معالجہ سے روحانی معالجہ زیادہ مشکل اور زیادہ پیچیدہ ہے۔"

آخر میں یہ کہہ کر بات ختم کرتے ہیں: "ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان مراتب تک پہنچنے کی ہمیں توفیق عطا کرے۔"

امام علیؑ فرماتے ہیں:

جو شخص لوگوں کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کو اپنے اتباع کی دعوت دینا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ دوسروں کو مخاطب کرنے سے پہلے خود اپنے آپ کو تعلیم و تلقین کرے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کی وعظ و نصیحت سے تربیت کرے اسے چاہیے کہ اچھے اعمال اور صحیح اخلاق اختیار

کرکے خود اپنی تربیت کرے۔ دوسروں کے معلم و مربی کی نسبت وہ شخص زیادہ احترام کا مستحق ہے جو خود اپنی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔

زبان اور کان سے ضرورت سے زیادہ توقع

یہ ایک بڑی ناواقفیت کی بات اور سخت غلطی ہے کہ ہم آج اپنے معاشرے میں تحریر و تقریر اور خطابت و مضمون نویسی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان سے حد سے بڑھ کر نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تحریر و تقریر سے خصوصاً اگر وہ اس طرح حکمت و موعظہ حسنہ ہو جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے، تو اس سے حقائق واضح ہوتے ہیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ وہ تحکم آمیز پند و نصیحت کی شکل اختیار نہ کرے۔ لوگوں کی اصلاح کے لیے تحریر و تقریر ایک لازمی شرط ہے مگر اتنا ہی کافی نہیں کیونکہ یہ اصطلاحاً علتِ تامہ نہیں۔ چونکہ ہم اپنی زبان اور لوگوں کے کانوں سے ضرورت سے زیادہ توقع وابستہ کیے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ صرف زبان اور کان کی مدد سے سب کام ہو جائیں، اس لیے ناکامی ہونے پر ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ ہم واویلا کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

گوش اگر گوش تو و نالہ اگر نالۂ من
آنچہ البتہ بجائے نرسد فریاد است

یہ شعر ہم پر ہر دور میں صادق آیا ہے۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ غلطی ہماری ہے۔ ہم نے بیچاری زبان اور کان سے حد سے زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ کبھی کبھی بلکہ اکثر آنکھوں سے بھی کام لیں۔ اپنے عمل کو

بہتر بنائیں۔ ہمارے اعمال اچھے ہونے چاہئیں تاکہ لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بیچاری زبان اور لوگوں کے کانوں کو ذرا آرام کرنے دیں۔

اجتماعی عمل

علاوہ اس کے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نفاذ میں ہمیں اپنے عمل کو بھی دخیل بنانا ضروری ہے یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انفرادی عمل کچھ زیادہ مفید نہیں ہے خصوصاً آج کی دنیا میں۔ یہ بھی ایک بڑی مشکل ہے کہ جو اہلِ عمل بھی ہیں ان کی توجہ بھی اجتماعی عمل کی طرف نہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے ہوتے ہے۔ انفرادی عمل سے کوئی کام چلتا ہے نہ انفرادی فکر سے ــــ انفرادی فیصلہ سے بھی کام نہیں بنتا۔ تعاون، ہم فکری اور اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا کے تحت تفسیر المیزان میں ایک بحث ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق صحیح سوچ صرف اجتماعی سوچ ہے۔

منطق یا تعبد

ایک اور بات جو بہت اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عملی جامہ پہنانے کے معاملے میں منطقی طریقۂ کار کو مطلق دخیل نہیں کرتے حالانکہ ہر کام کا ایک مخصوص منطقی طریقۂ کار ہے اور اسی میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ہم جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ ہے محض زبانی بات چیت نہ کہ عمل — اور اگر عمل کہیں ہے بھی تو وہ بھی انفرادی ہے اجتماعی نہیں۔

اب میں کہتا ہوں کہ جس چیز کی طرف سے سب سے زیادہ غفلت ہے، وہ ہے منطقی طرزِ عمل — کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معروف و منکر کے بارے میں بھی عملی تدابیر سوچی جانی چاہئیں اور یہ دیکھنا چاہیے کہ لوگوں کو کسی نیک عمل کی ترغیب دلانے کے لیے کیا تدبیر کی جائے اور کسی برے عمل سے باز رکھنے کے لیے کونسا طریقہ مفید ہوگا۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک روزنامہ میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا "ڈھیروں پند و نصیحت" — اس مضمون میں مضمون نگار نے پہلے تو یہ لکھا تھا کہ ہمارے ملک میں پند و نصیحت کے تو ڈھیر لگے ہوتے ہیں لیکن سب بے اثر ہیں۔ پھر ایک ضرب المثل تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سا علاج ڈھیروں نسخوں سے بہتر ہے۔ اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ امریکہ کی ریاست فلاڈلفیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں چند سال ہوئے عورتوں نے قمار بازی شروع کر دی تھی۔ پہلے تو پادریوں، اخبار نویسوں اور خطیبوں نے جہاں تک ہو سکا جوئے کی خرابیاں عورتوں کو جتائیں لیکن قطعاً کوئی اثر نہ ہوا۔ گویا پانی کی بوند پڑی اور پھسل گئی۔ بالآخر رئیس بلدیہ نے خود دو تین کلب کھولے۔ ایک زنانہ نمائش قائم کی جس میں مناسب سرگرمیاں فراہم کی گئیں مثلاً تندرست و صحت مند بچوں کی نمائش اور ان کی ماؤں کو انعام، دستکاریوں کی نمائش وغیرہ — ہر کام ایک خاص پروگرام کے تحت اور بڑے سلیقے سے کیا گیا تھا۔ لوگوں کو بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ دو تین سال نہیں گزرے تھے کہ عورتوں نے قمار بازی

کو ترک کر دیا۔

اس کو کہتے ہیں عملی تدبیر اور یہ معنی ہیں منطقی طریقۂ کار کے ــــ اگر یہ لوگ صرف وعظ و نصیحت، پادریوں کی تقریروں اور اخباروں کے مضامین پر ہی قناعت کرتے تو ہماری طرح ہی بیٹھے ہوتے اور ہماری طرح ہی کہتے:

گوش اگر گوش تو و نالہ اگر نالۂ من

آنچہ البتہ بجائے نرسد فریاد است

پرانے زمانے سے ہم لوگوں میں مشہور ہے کہ عورتیں بہت غیبت کرتی ہیں۔ آج بھی پردہ دار بڑی بوڑھیاں باوجود اس کے کہ نماز روزہ کی پابند اور عبادت گزار ہیں، غیبت بہت کرتی ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ہمارا قدیم گھریلو ماحول اس قسم کا ہے کہ عورت بیچاری اگر غیبت نہ کرے تو اس کے کرنے کے لیے کوئی بات ہے ہی نہیں، نہ کوئی اور کام ہے۔ پڑھی لکھی تو ہیں نہیں۔ دستکاری اور صنعت انہیں نہیں آتی۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر کوئی اور کام نہیں سوائے اس کے کہ اکٹھی ہو کر بیٹھ جائیں اور غیبت شروع کر دیں۔ روح آخر غذا چاہتی ہے۔ جب صحیح غذا نہیں ملتی تو مردے کا گوشت کھانے لگتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا۔ کیا تم میں کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟

حدیث میں غیبت کے متعلق آیا ہے کہ:

اَلْغِیْبَةُ اِدَامُ کِلَابِ النَّارِ۔

غیبت دوزخ کے کتوں کا سالن ہے۔

ہم نے اب تک اس حرکت کو روکنے کی جو بھی کوشش کی وہ صرف

زبان تک محدود رہی۔ عملی اور منطقی طریقۂ کار کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں۔ لہذا کوئی اثر بھی نہیں ہوا۔ پھر بجائے اس کے کہ ہم اپنے آپ کو الزام دیں، بیچاری عورتوں کو ملزم ٹھہراتے ہیں کہ وہ ایسی ہی ہوتی ہیں۔

اسی طرح ہماری آجکل کی نئی پود کی عورتوں میں جنہوں نے مغربی طور طریقے اختیار کر لیے ہیں، ایک اور بیماری ہے۔ یہ بیماری عیش پرستی، پارکوں میں گھومنا، شراب نوشی، فضول خرچی اور فیشن زدگی کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان باتوں کا علاج بھی وعظ و نصیحت اور زجر و ملامت سے کریں۔ مگر ان باتوں سے تو یہ کام ہونے سے رہا۔ اگر کبھی خدا ہمیں توفیق دے کہ صحیح علاج سوچیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے منطقی طریقۂ کار سے کام لیں تو سب مشکلات بآسانی حل ہو سکتی ہیں۔

اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ کیا واقعی اسلامی تعلیمات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے منطقی طریقۂ کار کی طرف کوئی اشارہ موجود ہے تو اس نکتہ پر غور کیجیے کہ فقہاء نے عموماً اخبار و احادیث کی بنا پر یہ کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس بات کا امکان موجود ہو کہ واقعی کچھ اثر ہو گا۔

اثر کے امکان یعنی نتیجہ نکلنے کے امکان کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ ہر حکم میں کچھ مصلحت ہوتی ہے۔ نماز میں بھی کچھ مصلحت ہے۔ روزہ میں بھی کچھ مصلحت ہے، وضو میں بھی کچھ مصلحت ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی ایک مصلحت ہے اور وہ مصلحت یہ ہے کہ مخاطب پر ہماری بات کا اثر ہو اور اس سلسلے میں ہم جو کام کریں اس کا کچھ نتیجہ نکلے۔ اس لیے اثر کے امکان کے وجود کا مطلب یہ ہے کہ جس غرض کے لیے امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر کی تشریع ہوئی ہے۔ تمہاری بات یا کام سے وہ غرض حاصل ہو اور جو نتیجہ مطلوب ہے وہ مرتب ہو۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نماز کے متعلق یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ اگر اس بات کا امکان ہو کہ تمہاری نماز کا اثر ہوگا اور جس مصلحت سے نماز واجب ہوئی ہے وہ نتیجہ مرتب ہوگا تو نماز پڑھو۔ ورنہ نہ پڑھو۔ یہی سوال وضو اور حج کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ یہ سب واجبات محض تعبدی ہیں یعنی ہر حال میں ان کے بجالانے کا حکم دیا گیا ہے اور انھیں عبادت کے طور پر ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔ ان کے لیے اس بارے میں کہ ان کو کس طرح بجالایا جائے، ہم اپنی عقل کو استعمال نہیں کر سکتے۔ نہ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ہمیں یہ کام کرنے چاہییں یا نہیں اور ان کو کس طرح کرنا چاہیے اور کس طرح نہیں۔ یہاں معاملہ محض حکم کی اطاعت کا ہے۔ اس کے برخلاف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کاموں میں سے ہے جن کی ساخت، کیفیت اور ترتیب کو اور اس بات کو کہ یہ کہاں اور کس شکل میں زیادہ مفید اور مؤثر ہے شارع نے ہماری عقل اور سمجھ پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ میں نے ہی عرض نہیں کیا صاحب جواہر بھی کہتے ہیں کہ ہر صورت میں یہ ایک بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کس طرح، کس شکل میں اور کس ذریعہ سے ہم اپنے نصب العین اور مقصد سے نزدیک ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں تو جو احادیث اور روایات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں آئی ہیں ان کے متعلق ہمارے طرز فکر میں تبدیلی آ سکتی ہے اور ان میں بظاہر جو ہمیں تضاد معلوم ہوتا ہے وہ بھی بڑی حد تک دور ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں

اس بارے میں مزید کچھ کہہ سکوں کیونکہ وقت کم ہے۔

بہرحال حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس اصول کو دوبارہ زندہ کیا جائے تو فقط باتوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہمیں وہ روش اختیار کرنی ہوگی جو انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہو اور اس کی بنیاد منطقی طرز عمل اور نفسیات و عمرانیات کے اصولوں پر ہو۔ ایسی صورت میں سو فیصدی کامیابی کی امید ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کردوں۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام لیا جاتا ہے تو فوراً یہ کہہ دیا جاتا ہے: کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ممکن بھی ہے؟ یہ بھی تو دیکھیے کہ رکاوٹیں کتنی ہیں!

اس کے برعکس میرا عقیدہ یہ ہے کہ وہ واحد چیز جو ہر دور میں ممکن ہے اور جس کو کوئی طاقت مکمل طور پر روک نہیں سکتی، یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ہاں اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد محض باتیں بنانا، جھگڑا پیدا کرنا اور پھر زور و زبردستی کرنا ہو تو ممکن ہے واقعی رکاوٹیں پیش آئیں۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیاد تو نیکوکاری پر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص خود تکلیف اٹھا کر خدمتِ خلق کرے اور یہ چاہے کہ خود بھی نیک ہو اور دوسروں کے ساتھ بھی بھلائی کرے اور ایسی صورت میں کوئی طاقت اسے نیک بننے اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے روک دے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیا جائے کہ نیک نہ بنو اور لوگوں سے بھلائی نہ کرو۔

بہرحال یہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقدس اصول اور وہ ہے اس مقدس اصول کے بارے میں ہمارا طرز عمل۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نہ صرف یہ اصول ہمارے معاشرے میں کالعدم ہو گیا ہے بلکہ اس کے متعلق ہمارے افکار و خیالات بھی مسخ ہو گئے ہیں اور ان کی شکل بھی بدل گئی ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اسلامی تاریخ میں ہمارے یہاں بڑے بڑے ادباء ہوئے، حکماء ہوئے، فقہاء ہوئے، شعراء ہوئے، بڑے بڑے واعظ اور خطیب ہوئے، بڑے بڑے مصنف اور انشاء پرداز ہوتے، بڑے بڑے منجم اور ریاضی داں ہوئے، بڑے بڑے سیاست داں ہوئے۔ صناع اور ہنرمند ہوئے لیکن جتنے ہوئے تو مصلح نہیں ہوئے۔ اس معاملے میں ہم بہت تہی مایہ ہیں۔ کچھ نہ کچھ مصلح ضرور ہوئے مگر توقع سے بہت کم حالانکہ اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول موجود ہے اور اس اصول کے نتیجے میں مصلحین کی کثیر تعداد وجود میں آنی چاہیے تھی۔ یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ ان کی تعداد اتنی ہی ہوگی جتنی کہ ادیبوں یا داناؤں یا فقیہوں یا منجموں یا ریاضی دانوں کی۔ پھر بھی مصلحین بھی ضروری ہیں اگرچہ مصلح میں ایسی خوبیاں درکار ہیں جو بہت ہی قلیل الوجود ہیں جیسے غیر معمولی ذہانت، بلند پایہ شخصیت، دور اندیشی، قوتِ برداشت وغیرہ، لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں مصلحین کی تعداد اندازے سے کم ہے لیکن کیوں ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا فوری جواب دینا میرے لیے ممکن نہیں۔

ہمارے یہاں مصلح زیادہ نہیں ہوتے۔ اصلاح کی بات بھی کم ہی سننے میں آتی ہے کیونکہ ہم یہ سوچتے ہی نہیں کہ مصلح ہونا بھی کوئی بڑائی کی بات ہے اور صرف بڑے لوگ ہی مصلح ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ امیرالمومنین یا سید الشہداء علیہما السلام ہر معنی میں حکیم تھے تو یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے اور ہم اسے ان حضرات کی مدح تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ فقیہ اور احکامِ الٰہی کا شناسا تھا یا فلاں شخص فصیح و بلیغ خطیب تھا تو یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہ مصلح تھا تو

ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور نہ ہم اس بات کو کوئی اہمیت دیتے ہیں حالانکہ مصلحین کی شان تو سب سے بڑھ کر ہے اور خود مصلحین نے اپنے لیے اسی نام اور اسی شان کو پسند کیا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ اَنَّهُ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْ كَانَ مِنَّا مُنَافَسَةً فِيْ سُلْطَانٍ وَلَا الْتِمَاسَ شَيْءٍ مِنْ فُضُوْلِ الْحُطَامِ وَلٰكِنْ لِنَرُدَّ الْمَعَالِمَ مِنْ دِيْنِكَ وَنُظْهِرَ الْاِصْلَاحَ فِيْ بِلَادِكَ فَيَاْمَنَ الْمَظْلُوْمُوْنَ مِنْ عِبَادِكَ وَتُقَامَ الْمُعَطَّلَةُ مِنْ حُدُوْدِكَ .

"الٰہی تو جانتا ہے کہ میں ریاست، زعامت اور حکومت کا طالب نہیں ہوں اور نہ دنیاوی مال و متاع کا طلب گار ہوں۔ میں تو فقط مصلح ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دین کی جو نشانیاں مٹا دی گئی ہیں انہیں بحال کر دوں اور تیری سرزمین میں اصلاح عمل میں لاؤں تاکہ مظلوموں کو امن ملے اور تیری حدود دوبارہ جاری ہوں۔"

سید الشہداء سلام اللہ علیہ نے اپنی وصیت میں جو آپ نے مدینہ سے مکہ کوچ کرتے وقت اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھ کر دی تھی لکھا تھا:

اِنِّيْ مَا خَرَجْتُ اَشِرًا وَلَا بَطِرًا وَلَا مُفْسِدًا وَلَا ظَالِمًا وَاِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِيْ اُمَّةِ جَدِّيْ .

میں جاہ و ہوس کے سبب نہیں نکل رہا ہوں اور نہ ہی میرا

مقصد فساد پھیلانا یا کسی پر ظلم کرنا ہے۔ میری تحریک کا فلسفہ اپنے نانا کی امت کی اصلاح ہے۔ میری غرض تو فقط امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

اسلام میں اجتہاد کا مقام

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ.

اجتہاد کا مطلب کیا ہے؟

اجتہاد و تقلید کا مسئلہ آجکل بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ پوچھتے ہیں یا خود سوچتے ہیں کہ اسلام میں اجتہاد کا کیا سوال ہے اور یہ اسلام میں کہاں سے آیا ہے؟ تقلید کیوں کرنی چاہیے؟ اجتہاد کی شرائط کیا ہیں؟ مجتہد کا فرضِ منصبی کیا ہے؟ مقلد کے کیا فرائض ہیں؟

مختصر طور پر اجتہاد کا مطلب دینی امور میں بصیرت پیدا کرنا اور ان کے

متعلق فیصلہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرنا ہے لیکن ہمارے یعنی شیعہ نقطۂ نظر سے دینی امور میں بصیرت اور فیصلہ کی صلاحیت کی دو قسمیں ہیں ایک مشروع دوسری ممنوع۔ اسی طرح تقلید کی بھی دو قسمیں ہیں ایک مشروع دوسری ممنوع۔

اجتہادِ ممنوع

ہماری نظر میں جو اجتہاد ممنوع ہے وہ ہے تشریع یا قانون سازی یعنی جو قرآن و سنت میں نہیں ہے مجتہد خود اپنی رائے سے اسے وضع کرے۔ اس کو اصطلاحاً اجتہاد بالرائے کہتے ہیں۔ اس قسم کا اجتہاد شیعہ نقطۂ نظر سے ممنوع ہے لیکن اہل سنت کے یہاں جائز ہے۔ وہ کہتے ہیں شرعی احکام کے تین مآخذ ہیں: کتاب، سنت اور اجتہاد۔ اجتہاد سے مراد وہی اجتہاد ہے جو کتاب و سنت کے بالمقابل ہو۔

اس اختلاف رائے کا اصلی سبب یہ ہے کہ اہل تسنن یہ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت میں احکام کی تعداد محدود ہے لیکن ان واقعات اور ان صورتوں کی تعداد جن کے متعلق احکام کی ضرورت ہے لامحدود ہے اس لیے ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے علاوہ بھی احکام کا کوئی مآخذ ہو۔

احکام الٰہی کی تشریع کا یہ مآخذ وہی ہے جسے ہم اجتہاد بالرائے کہتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں کچھ احادیث بھی رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب آنحضرتؐ نے معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم کس بنیاد پر کوئی حکم دو گے؟

انہوں نے کہا: کتاب اللہ کے مطابق

آپ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں وہ حکم تمہیں نہ ملے؟

انھوں نے کہا کہ پھر سنتِ رسولِ خدا سے استفادہ کروں گا۔

آپ نے فرمایا کہ اگر سنت میں بھی وہ حکم نہ ملے؟

انھوں نے کہا: "میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا" یعنی خود اپنی رائے اور ذوق سے کام لوں گا۔ اسی طرح کچھ اور احادیث بھی اس سلسلے میں روایت کی گئی ہیں۔

اس بارے میں کہ اجتہاد کی کیا صورت ہو اور اجتہاد کس طرح کرنا چاہیے" اہلِ تسنن میں اختلافِ رائے ہے۔ امام شافعی کی مشہور کتاب "الرسالہ" میں (جو اصولِ فقہ کی سب سے پہلی کتاب ہے) ایک باب ہے جس کا عنوان ہے باب الاجتہاد۔ شافعی کا اصرار ہے کہ جس اجتہاد کا ذکر احادیث میں آیا ہے وہ صرف قیاس تک محدود ہے۔ اجمالاً قیاس کا یہ مطلب ہے کہ کسی صورتِ حال میں وہ حکم دیا جائے جو اس سے ملتی جلتی اور اس سے مشابہ کسی اور صورتِ حال میں دیا گیا ہے۔

بعض دوسرے سنی فقہاء اجتہاد کو قیاس تک محدود نہیں سمجھتے۔ وہ استحسان کو بھی معتبر گردانتے ہیں۔ استحسان کا مطلب یہ ہے کہ ملتی جلتی مثالوں کو پیشِ نظر رکھے بغیر وہ حکم دیا جائے جو ہمیں حق و انصاف سے زیادہ قریب معلوم ہو اور ہماری عقل اور ہمارے ذوق کے مطابق ہو۔ اسی طرح ایک اور مآخذ استصلاح ہے جس کا مطلب ہے ایک مصلحت کو دوسری مصلحت پر ترجیح دینا۔ ایک دوسرا مآخذ تاویل کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نص کی موجودگی کے باوجود کسی آیت یا معتبر حدیثِ نبوی کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ بعض خاص صورتوں میں نص سے قطع نظر کر کے اپنے اجتہاد اور اپنی رائے کو ترجیح دیں۔ یہ سب اصطلاحات شرح و تفصیل کی محتاج ہیں اور اس تفصیل کو بیان کرنے میں شیعہ سنی کی بحث

ائمہ گھڑی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یعنی نص کے مقابل اجتہاد کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں شاید سب سے بہتر وہ رسالہ ہے جو حال ہی میں علامۂ جلیل مرحوم سید شرف الدین عاملی رحمۃ اللہ علیہ نے "النص والاجتہاد" کے نام سے لکھا ہے۔

بہرحال شیعہ نقطۂ نظر سے اس قسم کا اجتہاد مشروع نہیں۔ شیعہ اور ائمۂ شیعہ کے نقطۂ نظر سے اس قضیہ کی اساس ہی غلط ہے یعنی یہ بات صحیح نہیں کہ کتاب و سنت کے احکام کافی نہیں اور اسی لیے اجتہاد بالرائے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں بہت سی احادیث و روایات موجود ہیں کہ بطور کلی ہر چیز کا حکم کتاب و سنت میں موجود ہے۔ کافی میں باب البدع والمقائیس کے بعد ایک اور باب موجود ہے جس کا عنوان ہے:

بَابُ الرَّدِّ إِلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَأَنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ مِنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَجَمِيعِ مَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ النَّاسُ إِلَّا وَقَدْ جَاءَ فِيهِ كِتَابٌ أَوْ سُنَّةٌ۔

قدیم زمانے سے ائمۂ اہل بیتؑ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے قیاس کی مخالفت کی ہے۔

قیاس اور اجتہاد بالرائے کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے موضوع کا مطالعہ دو رُخ سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک رُخ تو وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا یعنی قیاس اور اجتہاد بالرائے کو کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ تشریع اسلامی کا ایک ماخذ تصور کیا جائے اور کہا جائے کہ بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں کتاب و سنت میں کوئی حکم موجود نہیں اس لیے ضروری ہے کہ مجتہدین اپنی رائے سے حکم بیان کریں۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ قیاس اور اجتہاد کو محض اصل احکام کے استنباط کا ایک ذریعہ سمجھا جائے اور اس سے اس طرح استفادہ کیا جائے جس طرح ہم خبرِ واحد سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم قیاس کو ایک ماخذ سمجھیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو محض ایک طریقہ تصور کریں۔

شیعہ فقہ میں قیاس و رائے کے یہ دونوں رخ معتبر نہیں۔ پہلا رخ تو اس لیے معتبر نہیں کہ ایسا کوئی حکم نہیں جس کی کتاب و سنت میں تشریع نہ کی گئی ہو کم از کم اصولی طور پر۔ دوسرا رخ اس لیے معتبر نہیں کہ قیاس و رائے کا تعلق محض ظن و تخمین سے ہے اور اس سے احکامِ شرعی میں غلطی کا زیادہ امکان ہے۔ بہرحال شیعہ سنی مخالفت کی اصل بنیاد پہلا رخ ہی ہے، گو دوسرا رخ زیادہ مشہور و معروف ہو گیا ہے۔

اہلِ تسنن کے درمیان اجتہاد کا حق مستقل طور پر نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عملی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں کیونکہ اگر یہ حق باقی رکھا جاتا، خصوصاً اگر نصوص میں تاویل و تصرف کی عام اجازت دی جاتی اور ہر شخص اپنی رائے کے مطابق تاویل و تصرف شروع کر دیتا تو دین کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہ رہ سکتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تدریجاً اجتہادِ مستقل کا حق سلب کر دیا گیا اور علمائے اہلِ تسنن کی رائے یہ ٹھہری کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ صرف چار مجتہدین یا چار مشہور ائمہ کی تقلید کریں۔ ان کے نام یہ ہیں:

ابوحنیفہ، شافعی، مالک بن انس اور احمد بن حنبل۔ ان کے علاوہ دوسروں کی تقلید اور پیروی سے منع کر دیا گیا۔ اس کام کی ابتدا ساتویں صدی میں مصر سے ہوئی۔ بعد میں تمام اسلامی ممالک میں اس پر عمل ہونے لگا۔

اجتہادِ مشروع

پانچویں صدی تک اجتہاد کا لفظ قیاس اور اجتہاد بالرائے کے معنی ہی میں استعمال ہوتا رہا، جو شیعہ نقطۂ نظر سے اجتہادِ ممنوع تھا۔ اس وقت تک شیعہ علماء اپنی کتابوں میں باب الاجتہاد صرف اس لیے باندھتے تھے کہ اس کا رد کریں، اسے باطل ٹھہرائیں، اسے ممنوع قرار دیں۔ جیسے شیخ طوسی نے اپنی کتاب 'عدہ' میں کیا ہے۔ رفتہ رفتہ اجتہاد کی تخصیص اجتہاد بالرائے کے ساتھ باقی نہیں رہی۔ خود علمائے اہلِ تسنن نے مثلاً ابن حاجب نے مختصر الاصول میں جس کی شرح عضدی نے لکھی ہے اور جو حال تک جامع ازہر میں اصولِ فقہ کے نصاب میں شامل تھی اور اس سے پہلے غزالی نے اپنی مشہور کتاب 'المستصفیٰ' میں اجتہاد کا لفظ اس خاص معنی یعنی ایسے اجتہاد بالرائے کے معنی میں جو کتاب و سنت سے ہٹ کر ہو، استعمال نہیں کیا بلکہ اجتہاد کے معنی استنباطِ حکمِ شرعی کے لیے مطلق جہد و کوشش ہی کے لیے ہیں اور اس کو اس طرح بیان کیا:

اِسْتِفْرَاغُ الْوُسْعِ فِی طَلَبِ الْحُکْمِ الشَّرْعِیِّ۔

اس تعریف کے مطابق اجتہاد کے معنی ہیں ادلۂ معتبرۂ شریعت سے استنباطِ حکمِ شرعی کی انتہائی کوشش کرنا۔ رہی یہ بات کہ ادلۂ معتبرۂ شرعیۃ کیا ہیں اور کیا قیاس و استحسان وغیرہ بھی ان میں شامل ہیں یہ ایک الگ معاملہ ہے۔

اس وقت سے شیعہ علماء نے بھی اجتہاد کے لفظ کو قبول کر لیا کیونکہ اجتہاد کے یہ معنی ان کے لیے بھی قابلِ قبول تھے۔ یہ اجتہادِ مشروع ہے۔ اگرچہ ابتدا میں یہ لفظ شیعوں کے لیے ناپسندیدہ تھا لیکن اس کے معنی اور مفہوم بدل جانے کے بعد انہوں نے تعصب نہیں برتا اور اس کے استعمال سے گریز نہیں

کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی صورتوں میں شیعہ اس بات کے پابند تھے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی اور اتحاد برقرار رکھیں۔ مثلاً اہل تسنن کے نزدیک اجماع حجت ہے۔ وہ اجماع کو بھی قیاس کی طرح ایک اصول اور ماخذ مانتے تھے۔ شیعوں کو یہ بات تسلیم نہیں تھی لیکن وحدت اسلوب برقرار رکھنے کے لیے وہ جس بات کے قائل تھے انہوں نے اس کا نام اجماع رکھ دیا۔ سنی کہتے تھے کہ ادلۂ شرعیہ چار ہیں: کتاب، سنت، اجماع اور اجتہاد یا قیاس۔ انہوں نے نے بھی کہا کہ ادلۂ شرعیہ چار ہیں: کتاب، سنت، اجماع اور عقل۔ فقط قیاس کی جگہ عقل کو رکھ دیا۔

بہرحال آہستہ آہستہ اجتہاد نے صحیح اور معقول معنی اختیار کر لیے۔ یعنی ادلۂ شرعیہ کو سمجھنے میں عقل اور تدبّر سے کام لینا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ادلۂ شرعیہ کو صحیح طور پر عالمانہ انداز میں سمجھنے کے لیے مختلف علوم سے واقفیت درکار ہوتی ہے۔ علمائے اسلام نے آہستہ آہستہ یہ محسوس کیا کہ ادلۂ شرعیہ سے استنباط و استخراجِ احکام کے لیے چند علوم ضروری ہیں جیسے علوم ادبیہ و منطق، قرآن و تفسیر اور حدیث و رجالِ حدیث کا علم، اصول فقہ سے واقفیت اور حتیٰ کہ دوسرے فرقوں کی فقہ کے متعلق بھی ضروری معلومات۔ مجتہد اسی کو کہتے ہیں جو ان تمام علوم کا جامع ہو۔

میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن گمان غالب یہ ہے کہ شیعوں میں سب سے پہلے اجتہاد اور مجتہد کے الفاظ ان معنوں میں علامہ حلی نے استعمال کیے۔ علامہ کی کتاب "تہذیب الاصول" میں باب القیاس کے بعد باب الاجتہاد ہے۔ اس میں اجتہاد کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس میں آج کل یہ لفظ مستعمل ہے۔ پس شیعہ نقطۂ نظر سے اجتہادِ ممنوع سے مراد قیاس ہے جس کو زمانۂ قدیم

میں اجتہاد کا نام دیا گیا تھا۔ خواہ اسے تشریع احکام کا ایک مستقل ماخذ سمجھا جائے یا احکام واقعی کے استنباط و استخراج کا ایک ذریعہ قرار دیا جائے۔ اس کے برعکس اجتہادِ مشروع سے مراد تخصصِ فنی کی بنا پر استنباطِ احکام کی پوری کوشش ہے۔

لہٰذا اب جو یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا کیا سوال ہے اور یہ ہے کیا چیز؟ تو اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آجکل اجتہاد کے معنی ہیں: اہلیت اور تخصصِ فنی۔ ظاہر ہے جو شخص قرآن و حدیث سے استفادہ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر، آیات کے معانی، ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ آیات سے واقفیت رکھتا ہو، اسی طرح معتبر اور غیر معتبر احادیث میں تمیز کر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ صحیح اور معقول قواعد کے مطابق حتی الامکان احادیث کے تعارض کو رفع کر سکتا ہو۔ جو مسائل متفق علیہ اور اجماعی ہیں ان سے واقف ہو۔ آیات قرآنیہ اور اسی طرح احادیث میں متعدد قواعدِ کلیہ کا ذکر ہے۔ ان قواعد سے استفادہ اور مختلف مسائل پران کے اطلاق کے لیے اسی طرح مشق و مہارت لازمی ہے جس طرح کہ دوسرے علوم کے قواعد سے استفادہ کے لیے ۔۔۔ مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو مواد اس کے سامنے موجود ہے اس میں سے ایک ماہر صناع کی طرح صحیح مواد کے انتخاب کی صلاحیت اور استعداد رکھتا ہو، خصوصاً احادیث میں جعلی اور وضعی حدیثیں بہت ہیں اور صحیح و سقیم باہم مخلوط ہیں۔ قرآن و حدیث کے صحیح فہم کے لیے اس قدر ابتدائی معلومات ضروری ہیں کہ فی الواقع خصوصی اہلیت و صلاحیت اور تخصصِ فنی کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

شیعوں میں اخباریت کا آغاز

اس جگہ ایک اہم اور خطرناک واقعہ کا تذکرہ ضروری ہے جو تقریباً چار صدی

پیشتر اجتہاد کے سلسلے میں پیش آیا۔ یہ واقعہ اخباریت کا آغاز ہے۔ اگر علمائے اسلام کی ایک جماعت نے جرأت سے کام لے کر اس رجحان کا مقابلہ نہ کیا ہوتا اور اس کی سرکوبی نہ کی ہوتی۔ تو معلوم نہیں آج کیا صورتِ حال ہوتی۔

اس مکتبِ خیال کی عمر چار سو برس سے زیادہ نہیں۔ اس مسلک کے بانی ایک صاحب تھے جن کا نام ملّا امین استر آبادی تھا۔ وہ بذاتِ خود ہوشیار شخص تھے اور علمائے شیعہ میں سے بہت سے ان کے پیروکار بن گئے تھے۔ خود اخباریوں کا دعویٰ یہ ہے کہ شیخ صدوق کے زمانے تک سب شیعہ اخباری مسلک ہی رکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسلک کے باقاعدہ وجود کو چار سو سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس مسلک کے خاص خاص اصول یہ ہیں: اخباری عقل کو حجت نہیں مانتے بلکہ قرآن کی حجیت کا بھی اس بہانہ سے انکار کرتے ہیں کہ چونکہ فہم قرآن اہل بیتِ پیغمبر کی خصوصیت ہے لہٰذا ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم صرف احادیث اہل بیتؑ کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح ان کے نزدیک اجماع اہل تسنن کی بدعت ہے۔ لہٰذا ان کے خیال میں ادلہ اربعہ یعنی کتاب، سنت، اجماع اور عقل میں سے صرف سنت حجت ہے۔ اسی طرح اخباریوں کا دعویٰ ہے کہ وہ روایات جو کتب اربعہ یعنی کافی، من لایحضرہ الفقیہ، تہذیب اور استبصار میں آئی ہیں، سب صحیح اور معتبر بلکہ قطعی الثبوت ہیں۔ کوئی مسلک ان خاص اصولوں کے ساتھ چار سو سال سے پہلے موجود نہیں تھا۔

شیخ طوسی اپنی کتاب عدۃ الاصول میں قدماء کے ایک گروہ کا تذکرہ کرتے ہیں اور اسے 'مقلدہ' کے نام سے یاد کرتے اور اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں، لیکن یہ کوئی باقاعدہ مکتب یا مسلک نہیں تھا۔ شیخ ان لوگوں کو 'مقلدہ' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اصولِ دین میں بھی اخبار و روایات سے استدلال کرتے تھے۔

بہرحال اخباریت کا مسلک اجتہاد و تقلید کے مسلک کی ضد ہے۔ اس مکتبِ خیال کے لوگ اس اہلیت، صلاحیت اور تخصصِ فنّی کے منکر ہیں جس کے مجتہدین قائل ہیں۔ وہ غیرِ معصوم کی تقلید کو حرام سمجھتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی رائے میں احادیث حجت ہیں اس لیے اجتہاد اور غور و فکر کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ لوگوں کا فرض ہے کہ براہِ راست کتبِ احادیث کی طرف رجوع کریں اور کسی عالم کو بحیثیت مجتہد یا مرجع تقلید واسطہ نہ بنائیں۔

ملا امین استرآبادی جو اس مکتب کے بانی تھے بہت باہوش شخص تھے ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ انہوں نے کئی سفر بھی کیے تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے: "الفوائد المدنیہ" جس میں انہوں نے سختی سے مجتہدین کی مخالفت کی ہے خصوصاً عقل کی حجیت کا قطعی انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل صرف محسوسات یا نیم محسوسات مثلاً ریاضیات وغیرہ سے متعلقہ امور میں حجت ہے۔ دینی امور میں عقل حجت نہیں ہے۔

اتفاق کی بات کہ اس اندازِ فکر کا آغاز تقریباً اس زمانے میں ہوا جب یورپ میں حسی فلسفہ وجود میں آیا۔ یورپ میں فلاسفہ نے سائنس سے متعلقہ امور میں عقل کے حجت ہونے سے انکار کیا اور ان صاحب نے دینی امور میں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ان صاحب کو یہ طرزِ فکر کہاں سے ملا۔ یہ تو ان کی اپنی ایجاد تھی یا کہیں اور سے لیا۔

مجھے یاد ہے کہ میں سال ۱۳۲۲ شمسی کی گرمیوں میں بروجرد گیا ہوا تھا۔ مرحوم آیت اللہ بروجردی اعلی اللہ مقامہ اس وقت بروجرد ہی میں تھے اور اس وقت تک قم منتقل نہیں ہوئے تھے۔ ایک روز اخباریوں کی بات چھڑ گئی۔ مرحوم نے ان پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرزِ فکر کا آغاز یورپ میں فلسفہ حسی کی

لہر پیدا ہونے کا ایک نتیجہ تھا۔ یہ بات میں نے ان سے اس وقت سنی تھی۔ بعد میں جب آپ قم آگئے تو آپ نے اپنے اصول فقہ کے درس کے دوران میں حجیت کے موضوع پر تقریر کی تو میں منتظر رہا کہ اس بات کا بھی تذکرہ آئے گا لیکن آپ نے اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا۔ اب معلوم نہیں اس وقت جو آپ نے فرمایا تھا یہ محض آپ کا اندازہ تھا یا آپ کے پاس اس کی کوئی سند بھی تھی۔ مجھے خود ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور بظاہر یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں حسی طرز فکر مغرب سے مشرق میں پہنچ گیا ہو لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ مرحوم کوئی بات بلا سند اور ثبوت کے نہیں کہتے تھے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس وقت پوچھ کیوں نہ لیا۔

اخباریت کی مزاحمت

ہر کیف اخباریت کی تحریک عقل کے خلاف ایک تحریک تھی۔ اس مسلک میں عجیب جمود اور خشکی تھی۔ وہ تو خوش قسمتی یہ ہوئی کہ کچھ قابل اور لائق افراد نے اس کی بروقت مزاحمت کی جیسے وحید بہبہانی نے جو آقا کے نام سے مشہور ہیں اور جو لوگ آل آقا کہلاتے ہیں ان کی نسل سے ہیں۔ ان کے شاگردوں نے بھی اس سلسلہ میں بڑا کام کیا۔ بعد میں مرحوم حاجی شیخ مرتضیٰ انصاری نے اس تحریک کا مقابلہ کیا۔

وحید بہبہانی کربلا میں تھے۔ اس وقت صاحب حدائق جو ایک متبحر اخباری عالم تھے وہ بھی وہیں رہتے تھے۔ دونوں کا اپنا اپنا حلقۂ درس تھا۔ وحید کا مسلک اجتہادی تھا اور صاحب حدائق کا اخباری۔ ظاہر ہے کہ مقابلہ بہت سخت تھا لیکن بالآخر وحید بہبہانی نے صاحب حدائق کو شکست دیدی۔

کہتے ہیں کہ وحید بہبہانی کے نامور شاگرد جیسے کاشف الغطاء، بحر العلوم اور سید مہدی شہرستانی، یہ سب پہلے صاحب حدائق کے شاگرد تھے لیکن پھر ان کا درس چھوڑ کر وحید بہبہانی کے شاگرد ہو گئے۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ صاحب حدائق ہلکے درجہ کے اخباری ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کا مسلک وہی ہے جو مجلسی مرحوم کا یعنی مسلکِ اخباری اور مسلکِ اصول کے بین بین۔ علاوہ ازیں صاحبِ حدائق متقی، خدا ترس اور با ایمان آدمی تھے۔ اس کے باوجود کہ وحید بہبہانی نے ان کا سختی سے معارضہ کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ صاحب حدائق کے پیچھے نماز درست نہیں۔ وہ یہی کہتے رہے کہ آغا وحید کے پیچھے نماز درست ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ وحید بہبہانی پڑھائیں۔

شیخ انصاری نے علمِ اصولِ فقہ کی مضبوط بنیاد رکھی تھی اور اسی لیے وہ اخباری مسلک کے خلاف تھے۔ خود کہا کرتے تھے کہ اگر امین استرآبادی بھی زندہ ہوتے تو وہ میرے اصول تسلیم کر لیتے۔

اس مخالفت کے نتیجہ میں اخباری مسلک شکست کھا گیا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے چند افراد کے علاوہ اب کوئی اس کا پیروکار باقی نہیں رہا لیکن اخباریت جو ملا امین کے زمانے سے بڑی سرعت کے ساتھ پھیلی تھی اور بڑی شدت کے ساتھ اذہان پر چھا گئی تھی اور دو سو سال چھائی رہی، ابھی پوری طرح اس کا اثر غائب نہیں ہوا۔ اب بھی آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو قرآن کی کوئی ایسی تشریح جائز نہیں سمجھتے جس کی سند حدیث سے نہ ملے۔ اب بھی بہت سے اخلاقی اور معاشرتی مسائل بلکہ بعض فقہی مسائل بھی اخباریت کے جمود سے متاثر ہیں۔ اس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

کی روح ہے جو اس حدیث میں آیا ہے۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ ایسے لباس سے اجتناب کریں جو شہرت کا باعث ہو۔ جن دنوں مشرکین کا خاص طریقہ دنیا میں موجود تھا اور مسلمان اس سے احتراز کرتے تھے تحت الحنک کو لٹکانا سب پر واجب تھا لیکن اب وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا ہے اور تحت الحنک کو نہ لٹکانا مشرکین کا شعار نہیں رہا بلکہ عملاً یہ صورت ہو گئی ہے کہ تحت الحنک کو کوئی بھی نہیں لٹکاتا۔ اب اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ فعل لباسِ شہرت کا مصداق اور حرام ہے۔ یہ تھا وہ ایک نمونہ جو میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی بہت ہیں۔

وحید بہبہانی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ شوال کا چاند بتواتر ثابت ہو گیا میرے پاس اتنے لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے چاند دیکھا ہے کہ مجھے یقین ہو گیا اور میں نے حکم دے دیا کہ آج عید الفطر ہے۔ ایک اخباری نے اعتراض کیا کہ نہ تم نے خود چاند دیکھا نہ اتنے لوگوں نے گواہی دی جن کا معتبر ہونا شرعاً مسلّم ہو، پھر تم نے کیسے حکم دے دیا۔ میں نے کہا تواتر کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا۔ اس نے کہا: یہ کس حدیث میں آیا ہے کہ تواتر حجت ہے؟

وحید بہبہانی کہتے ہیں کہ اخباریوں میں جمود اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ اگر بالفرض کوئی مریض ائمہ میں سے کسی کے پاس جاتا اور امام اسے فرما دیتے کہ ٹھنڈا پانی پیو، تو اخباری تمام دنیا کے مریضوں سے کہتے کہ جب بھی سخت بیمار ہو، چاہے بیماری کچھ ہی کیوں نہ ہو ٹھنڈا پانی پیو۔ یہی علاج ہے۔ وہ یہ ہرگز نہ سوچتے کہ یہ ہدایت ایک خاص مریض کو دی گئی تھی سب مریضوں کو نہیں۔

یہ بھی مشہور ہے کہ بعض اخباریوں نے یہ ہدایت کی تھی کہ میت کے کفن پر شہادتین لکھیں اور اس طرح لکھیں کہ اِسْمَاعِیلُ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یعنی اسمٰعیل شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اب

اسماعیل کا نام کیوں لکھا جائے؟ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے فرزند اسماعیل کے کفن پر اسی طرح لکھا تھا۔

اخباری یہ نہیں سوچتے کہ انہوں نے اسماعیل کے کفن پر تو اس طرح اس لیے لکھا تھا کہ میت کا نام اسماعیل تھا۔ اب اگر میت کا نام مثلاً حسن قلی ہے تو ہم اس کا نام کیوں نہ لکھیں اور اسماعیل کا نام کیوں لکھیں؟ اخباری کہتے ہیں کہ یہ اجتہاد ہے اور عقل کو دخل دینا ہے۔ ہم تو اہلِ تعبّد و تسلیم ہیں اور قال الباقرؑ اور قال الصادقؑ کے قائل ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی دخل نہیں دیتے۔

تقلیدِ ممنوع

رہی تقلید' اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ممنوع اور دوسری مشروع۔ وہ تقلید جس کا مطلب ماحول یا عادت کی بنا پر اندھی پیروی ہو وہ تو یقیناً ممنوع ہے اور اسی کی قرآن میں ان الفاظ میں مذمت کی گئی ہے: اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ تقلید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ممنوع دوسری مشروع۔ تقلیدِ ممنوع سے مراد صرف وہ اندھی تقلید ہی نہیں ہے جو ماحول' عادت یا آباء و اجداد کی پیروی میں کی جائے بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہ تقلید بھی جو جاہل عالم کی اور عامی فقیہ کی کرتا ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں' ایک ممنوع دوسری مشروع۔

حال ہی میں میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو مرجعِ تقلید کی تلاش میں تھے۔ وہ بعض دفعہ کہتے تھے کہ ہم کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جس کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دیں۔ اسلام میں کسی کے ہاتھ میں باگ ڈور دینے کا حکم نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھیں کھولنے اور آنکھیں کھلی رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ تقلید اگر کسی دوسرے

کے ہاتھ میں باگ ڈور دینے کی شکل اختیار کرلے تو اس سے ہزارہا خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مفصل حدیث ہے جو میں نے لکھی ہوئی ہے اس میں سے ایک فقرہ پڑھتا ہوں۔ یہ مشہور فقرہ ہے:

وَاَمَّا مَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِیْنِهٖ مُخَالِفًا عَلٰی هَوَاهُ مُطِیْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِّ اَنْ یُقَلِّدُوْهُ۔

یہی حدیث اجتہاد و تقلید کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے اور شیخ انصاری اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث معتبر ہے کیونکہ آثار صدق اس سے نمایاں ہیں۔

یہ حدیث اس آیت کریمہ سے متعلق ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ۔

اس آیت میں اُن ان پڑھ یہودیوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے علماء اور پیشوایانِ دین کی پیروی اور تقلید کرتے تھے۔ یہ آیت ان آیات کے بعد ہے جن میں علماءِ یہود کی ناپسندیدہ روش کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہودیوں میں بہت سے ان پڑھ اور نادان ہیں جن کو آسمانی کتاب کے متعلق سوائے اپنی چند خواہشات اور خیالات کے کچھ معلوم نہیں۔ وہ صرف خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔

تقلیدِ ممنوع کے بارے میں امام صادقؑ کی حدیث

اسی آیت کے ذیل میں یہ حدیث ہے۔ ایک شخص نے امام صادقؑ سے

عرض کیا کہ عوام اور ان پڑھ یہودیوں کے لیے اس کے سوا چارۂ کار ہی نہیں تھا کہ اپنے علماء سے جو کچھ سنیں اسے مان لیں اور اس کی پیروی کریں۔ اگر کوئی قصور ہے تو علمائے یہود کا ہے۔ قرآن کیوں بیچارے عوام الناس کی مذمت کرتا ہے جن کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہمارے عوام اور یہود کے عوام میں کیا فرق ہے؟ اگر عوام کی طرف سے علماء کی تقلید اور پیروی مذموم ہے تو ہمارے جو عوام علماء کی تقلید اور پیروی کرتے ہیں وہ بھی قابلِ مذمت ہیں۔ اگر انہیں اپنے علماء کے قول پر عمل نہیں کرنا چاہیے تو ان کو بھی نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت نے فرمایا:

بَيْنَ عَوَامِّنَا وَعُلَمَآئِنَا وَبَيْنَ عَوَامِّ الْيَهُوْدِ وَبَيْنَ عُلَمَآئِهِمْ فَرْقٌ مِّنْ جِهَةٍ وَّتَسْوِيَةٌ مِّنْ جِهَةٍ، اَمَّا مِنْ حَيْثُ اسْتَوَوْا فَاِنَّ اللهَ قَدْ ذَمَّ عَوَامَّنَا بِتَقْلِيْدِهِمْ عُلَمَآئَهُمْ كَمَا قَدْ ذَمَّ عَوَامَّهُمْ وَاَمَّا مِنْ حَيْثُ افْتَرَقُوْا فَلَا

یعنی ہمارے عوام اور علماء میں اور یہود کے عوام اور علماء میں ایک لحاظ سے فرق ہے اور ایک لحاظ سے وہ سب برابر ہیں۔ جس لحاظ سے برابر ہیں اس لحاظ سے اللہ تعالےٰ نے ہمارے عوام کو بھی اپنے علماء کی تقلید سے منع کیا ہے مگر جس لحاظ سے برابر نہیں ہیں اس لحاظ سے نہیں۔

اسی شخص نے عرض کیا کہ اے فرزندِ رسولؐ کچھ اور وضاحت فرما دیجیے۔

آپ نے فرمایا:

علمائے یہود کو معلوم تھا کہ وہ عملاً جھوٹ بولتے ہیں۔ رشوت سے

پرہیز نہیں کرتے، احکام اور فیصلوں کو لحاظ و مروت سے یا رشوت لے کر بدل دیتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کس کی طرفداری کرتے ہیں اور کس سے تعصب برتتے ہیں۔ ان کے فیصلوں میں ذاتی تعلق اور بغض و محبت کو دخل ہوتا ہے۔ وہ ایک کا حق دوسرے کو دلوا دیتے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

وَاضْطَرُّوا بِمَعَارِفِ قُلُوبِهِمْ اِلٰى اَنَّ مَنْ يَفْعَلُ مَا يَفْعَلُوْنَهٗ فَاسِقٌ لَا يَجُوزُ اَنْ يُصَدَّقَ عَلَى اللّٰهِ وَلَا عَلَى الْوَسَائِطِ بَيْنَ الْخَلْقِ وَبَيْنَ اللّٰهِ۔

ان کا ضمیر خود کہتا تھا کہ جس کے ایسے اعمال ہوں ان کی پیروی نہیں کرنی چاہیے اور اس کی زبان سے خدا اور پیغمبروں کا قول قبول نہیں کرنا چاہیے۔

یہاں امام یہ فرمارہے ہیں کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہودی عوام کو یہ مسئلہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایسے علماء کے قول پر عمل نہیں کرنا چاہیے جو خود بھی اپنے دینی احکام پر عمل نہ کرتے ہوں۔

کیونکہ یہ ایسا مسئلہ نہیں جو کسی کو معلوم نہ ہو۔ اس مسئلہ کا علم تو خدا نے ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے اور ہر شخص اپنی عقل سے اس بات کو سمجھتا ہے۔ اہل منطق کہتے ہیں، قَضَايَا قِيَاسَاتُهَا مَعَهَا۔ کچھ باتیں ایسی بدیہی الثبوت ہیں کہ خود اپنی دلیل ہیں۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب"۔ اگر کوئی شخص جو پاکی و طہارت اور ترک ہوا و ہوس کے اصول کا قائل ہو اور خود ہی ہوا و ہوس کے پیچھے دوڑنے لگے اور دنیا پرستی شروع کردے تو ہر شخص کی عقل

یہی کہے گی کہ ایسے شخص کی بات نہیں سننی چاہیے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ عَوَامُّ اُمَّتِنَا اِذَا عَرَفُوْا مِنْ فُقَهَائِهِمُ الْفِسْقَ الظَّاهِرَ وَالْعَصَبِيَّةَ الشَّدِيْدَةَ وَالتَّكَالُبَ عَلٰى حُطَامِ الدُّنْيَا وَحَرَامِهَا وَاِهْلَاكِ مَنْ يَتَعَصَّبُوْنَ عَلَيْهِ وَاِنْ كَانَ لِاِصْلَاحِ اَمْرِهٖ مُسْتَحِقًّا وَبِالتَّرَفُّقِ بِالْبِرِّ وَالْاِحْسَانِ عَلٰى مَا تَعَصَّبُوْا لَهٗ وَاِنْ كَانَ لِلْاِذْلَالِ وَالْاِهَانَةِ مُسْتَحِقًّا فَمَنْ قَلَّدَ مِنْ عَوَامِّنَا مِثْلَ هٰٓؤُلَاءِ الْفُقَهَاءِ فَهُمْ مِثْلُ الْيَهُوْدِ الَّذِيْنَ ذَمَّهُمُ اللّٰهُ بِالتَّقْلِيْدِ لِفَسَقَةِ فُقَهَائِهِمْ۔

"یہی صورت ہمارے عوام کی ہے۔ وہ بھی اگر یہ دیکھیں کہ ان کے فقہاء بد اعمال، شدید تعصب اور دنیا پرستی میں مبتلا ہیں، اپنے طرفداروں کی چاہے وہ کتنے ہی نالائق ہوں طرفداری کرتے ہیں اور مخالفین چاہے کتنے ہی احسان اور نیکی کے مستحق ہوں، ان کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر بھی آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کریں تو وہ بھی یہودیوں کی طرح مذمت اور ملامت کے مستحق ہوں گے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تقلید ممدوح و مشروع کسی کے ہاتھ میں اپنی باگ دے دینا اور خود آنکھیں بند کر لینا نہیں ہے بلکہ آنکھیں کھلی رکھنا اور چوکنا رہنا ہے ورنہ جرم میں شرکت ہوگی اور اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

عوام کے خیال میں علماء محفوظ اور مستثنیٰ ہیں

بعض لوگوں کے خیال میں گناہ کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ عوام پر تو گناہ کا اثر ہوتا ہے اور انہیں تقویٰ و عدالت سے گرا دیتا ہے مگر علماء پر کچھ اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک طرح سے محفوظ اور مستثنیٰ ہیں۔ یہ ایسا ہی فرق ہے جیسے آبِ قلیل اور آبِ کثیر میں ہے کہ اگر پانی کُر کی مقدار میں ہو تو وہ نجاست سے متاثر نہیں ہوتا حالانکہ اسلام اس بارے میں کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیتا۔ خود پیغمبرِ اکرمؐ کے متعلق قرآن کہتا ہے:

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ.

کہہ دیجیے کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ.

اگر آپ کے عمل میں کسی طرح کا شرک ہو گیا تو آپ کے اعمال بیکار ہو جائیں گے۔

یہ سب کچھ یہی تعلیم دینے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کسی کے لیے کوئی امتیاز اور استثناء نہیں ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور عبد صالحؑ کا جو قصہ قرآن میں آیا ہے وہ ایک عجیب داستان ہے۔ اس سے ایک اہم نکتہ منکشف ہوتا ہے اور وہ یہ کہ تابع اور پیرو کو اپنے متبوع اور پیشوا کی بات اس وقت تک ماننی چاہیے

جب تک اصول اور قانون کی خلاف ورزی نہ ہو لیکن اگر پیشوا اور رہنما کوئی خلاف قانون کام کرے تو اس پر سکوت جائز نہیں۔ اگرچہ اس داستان میں عبدِ صالح کا عمل خود ان کے نقطۂ نگاہ سے نہ صرف خلافِ اصول نہیں تھا بلکہ عین فرض تھا" کیونکہ وہ وسیع تر افق سے دیکھ رہے تھے اور ان کی نظر باطن پر تھی لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے صبر کیوں نہیں کیا اور انہوں نے نکتہ چینی کیوں شروع کر دی حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اعتراض نہیں کریں گے لیکن پھر بھی اعتراض کیے بغیر نہ رہ سکے۔ کمی یہ نہیں تھی کہ حضرت موسیٰؑ نے اعتراض کیوں کیا بلکہ یہ تھی کہ وہ راز سے آگاہ نہیں تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بات کی تہ تک پہنچ جائیں لیکن چونکہ ان کی نگاہ میں قانونِ الٰہی اور اصول کے خلاف کام ہوا تھا اس لیے ان کے ایمان نے اجازت نہیں دی کہ وہ خاموش رہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اگر قیامت تک عبدِ صالح ایسے ہی کام کرتے رہتے تو حضرت موسیٰؑ بھی جب تک راز سے آگاہ نہ ہو جاتے اپنی تنقید بند نہ کرتے۔

حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا تھا:

هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا۔

یعنی کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھلائی گئی ہے۔

انہوں نے جواب دیا تھا:

إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا۔

تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔

یعنی تم میں میرے ساتھ رہنے کی طاقت نہیں۔

پھر خود ہی اس کی وجہ صاف بیان کر دی:

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا۔

جب خلافِ قاعدہ کام دیکھو گے اور اس کے راز سے واقف نہیں ہو گے تو اس پر کیسے صبر کر سکو گے۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا:

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا۔

انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

حضرت موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ چاہے میں اصل راز کو سمجھوں یا نہ سمجھوں میں صبر کروں گا۔ آپ نے اتنا ہی کہا کہ مجھے امید ہے کہ میں برداشت کروں گا۔ برداشت تو اسی وقت کر سکتے تھے جب راز سے آگاہ ہوتے۔ اس پر مردِ صالح نے چاہا کہ حضرت موسیٰؑ سے زیادہ صاف الفاظ میں وعدہ لیں کہ راز کو سمجھو یا نہ سمجھو اعتراض نہیں کرو گے جب تک موقع آنے پر میں از خود وضاحت نہ کر دوں:

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا۔

یعنی اگر میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو جو کچھ دیکھو اس پر خاموش رہو۔ بعد میں میں خود تمہیں بتا دوں گا۔

اب آیتِ کریمہ میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے یہ بات منظور کر لی۔ صرف اتنا ہی تذکرہ ہے کہ وہ پھر ساتھ چل پڑے۔ اس داستان کا انجام تو آپ نے سنا ہی ہو گا۔

ہر حال میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ عالم کی تقلید جو جاہل کرتا ہے اس کا

مطلب کسی کے ہاتھ میں باگ ڈور دینا نہیں ہوتا۔ اگر ایسی صورت ہو تو وہ تقلید ممنوع ہے اور اسی صورت کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جاہل کیوں عالم کی تقلید کرے، شاید کوئی شرعی مصلحت ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے یہ قصّہ امام صادقؑ سے مروی حدیث کی تائید میں اور اس کی توضیح کے لیے عرض کیا ہے۔

تقلیدِ مشروع

میں نے تقلید ممنوع و مذموم کے بارے میں حدیث کے جو فقرے نقل کیے ہیں اُن کے بعد امام صادقؑ نے تقلیدِ مشروع و ممدوح کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِيْنِهٖ مُخَالِفًا عَلٰى هَوَاهُ مُطِيْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ يُقَلِّدُوْهُ۔

فقہاء میں سے جو شخص اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے، شیطان کے بہکاوے میں نہ آئے، اپنے دین کی محافظت کرے، یعنی دین فروشی نہ کرے (یا ممکن ہے یہ مطلب ہو کہ اپنے دین پر سختی سے قائم رہے) احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے تو ایسے شخص کی عوام تقلید کر سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ وضاحت ہے کہ جہاں تک خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت کا تعلق ہے ایک عالم روحانی کے سلسلے میں اس کا اور مطلب ہے اور ایک عامی کے سلسلے میں اور۔ کیونکہ ہر شخص کی خواہشاتِ نفسانی مختلف ہیں۔ جوان کی خواہش نفسانی کچھ اور چیز ہے اور بڈھے کی کچھ اور۔ جو شخص جس مقام، جس درجہ، جس طبقہ اور جس عمر سے تعلق رکھتا ہو اس کے مطابق اس کی خواہشات ہوں گی۔ ایک عالم روحانی کی ہوا پرستی کا معیار یہ نہیں کہ ہم یہ دیکھیں کہ مثلاً وہ شراب پیتا ہے یا نہیں، جوا کھیلتا ہے یا نہیں، تارکِ صوم وصلاۃ ہے یا نہیں؟ اس کی ہوا پرستی عزت وجاہ کی خواہش، دست بوسی اور شہرت و مقبولیت کی آرزو اور اس بات کی تمنا ہے کہ لوگ اس کی جنبشِ سر پر حرکت کریں۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ بیت المال کی رقم اپنی شان جمانے یا اپنے خاص لوگوں پر تو خرچ نہیں کرتا۔ اسی قسم کی اور باتیں ہیں۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا:

وَهُمْ بَعْضُ فُقَهَاءِ الشِّيعَةِ لَا جَمِيعُهُمْ۔

یعنی یہ فضائل اور خوبیاں صرف بعض شیعہ فقہاء میں ہیں سب میں نہیں۔

اس حدیث کے آخری فقرے مسئلہ اجتہاد وتقلید پر ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اجتہاد اور تقلید دونوں کی دو قسمیں ہیں ایک مشروع اور دوسری ممنوع۔

میت کی تقلید کیوں جائز نہیں

ہماری فقہ میں یہ مسئلہ مسلمات میں سے ہے کہ تقلیدِ میت ابتداءً جائز

نہیں۔ تقلیدِ میت صرف اس صورت میں جائز ہے جب کوئی شخص میت کے زمانۂ حیات میں اس کی تقلید کرتا رہا ہو مگر اس کے لیے بھی زندہ مجتہد کی اجازت ضروری ہے۔ مجھے اس مسئلہ کے فقہی دلائل سے تو سروکار نہیں لیکن اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ یہ خیال بہت ہی بنیادی نوعیت کا ہے بشرطیکہ اس کا مقصد واضح ہو جائے۔

اس طرزِ فکر کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ علومِ دینیہ کی بقاء کا مؤثر ذریعہ ہے اور اس طرح اسلامی علوم نہ صرف محفوظ رہتے ہیں بلکہ ان میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی ہے، اور ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے۔ نئی نئی مشکلات حل ہوتی رہتی ہیں۔

یہ بات نہیں ہے کہ ہمارے تمام مسائل اور مشکلات قدیم علماء حل کر چکے ہوں اور اب کوئی کام باقی نہ رہا ہو۔ علمِ کلام، تفسیر، فقہ اور دیگر علومِ اسلامی کے ہزاروں مسائل ہیں جن میں سے کچھ کو گزشتہ علمائے کبار نے حل کر دیا ہے اور کچھ اب بھی باقی ہیں جن کا حل آنے والے علماء کا فریضہ ہے۔ ضروری ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہر شعبہ میں بہتر اور جامع تر تصانیف تیار ہوتی رہیں اور کام برابر آگے بڑھتا رہے۔ جس طرح گزشتہ زمانے میں بتدریج علمائے تفسیر کو ترقی دی، علمِ کلام کو ترقی دی، فقہ کو ترقی دی، اسی طرح اب بھی یہ کام رکنا نہیں چاہیے اور اس میں برابر پیشرفت ہوتی رہنی چاہیے۔ غرض مجتہدینِ زندہ کی تقلید علومِ اسلامی کی بقا اور ارتقاء کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو زندگی میں نت نئے مسائل کا سامنا رہتا ہے اور انہیں علم نہیں ہوتا کہ ان مسائل سے کیسے نمٹا جائے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زندہ فقہاء اور تازہ افکار لازمی ہیں اجتہاد و تقلید سے متعلق ایک روایت میں ہے۔

وَاَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوْا فِيْهَا اِلٰى رُوَاةِ اَحَادِيْثِنَا.

حوادثِ واقعہ سے مراد وہی نئے نئے مسائل ہیں جو ہر دور میں اور ہر صدی میں پیش آتے رہتے ہیں۔

کتبِ فقہیہ کے مطالعہ اور تتبیع سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں حسبِ ضرورت فقہی مسائل میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور فقہاء نئے پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کرتے رہے ہیں اور اس طرح مسائل فقہیہ کی تعداد بڑھتی رہی ہے۔

اگر کوئی ذرا غور سے حساب لگائے تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ کون سے مسئلہ کی کس دور اور کس علاقہ میں ضرورت پیش آئی۔ اگر زندہ مجتہد سے مسائل سے عہدہ برآ نہ ہو تو پھر زندہ مجتہد اور مردہ مجتہد کی تقلید میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں یہی بہتر ہے کہ کسی ایسے مردہ مجتہد کی تقلید کی جائے جیسے شیخ انصاری جن کے متعلق خود زندہ مجتہدین کو اعتراف ہے کہ وہ بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔

بنیادی طور پر اجتہاد کا راز ہی یہ ہے کہ جو احکام کلی طور پر بیان کیے گئے ہیں انہیں جدید مسائل اور بدلتے ہوئے حالات پر منطبق کیا جائے۔ واقعی مجتہد وہی ہے جو اس راز پر گرفت پالے اور یہ سمجھے کہ حالات کیسے بدلتے ہیں اور اس کے نتیجے میں احکام کیسے بدل جاتے ہیں ورنہ پرانے مسائل پر ہی غور و فکر کرتے رہنا اور قوی کو احوط اور احوط کو علی الاقوی

میں بدل دینا تو کوئی بڑا کمال نہیں اور نہ اتنی سی بات کے لیے اس تمام جھگڑے کی ضرورت ہے۔

اجتہاد کے لیے شرائط بھی بہت ہیں۔ مجتہد کو مختلف علوم پر عبور ہونا چاہیے۔ اس کے لیے عربی ادب، منطق، اصولِ فقہ، تاریخ اسلام اور مختلف اسلامی فرقوں کی فقہ سے واقفیت لازمی ہے۔ واقعی اور مضبوط فقیہ بننے کے لیے طویل مشق کی ضرورت ہے۔ صرف ادب، صرف و نحو، معانی و بیان اور منطق کے پڑھ لینے اور سطحیات کی چند کتابیں مثلاً فرائد، مکاسب اور کفایہ کا مطالعہ کر لینے اور اس کے بعد چند سال درسِ خارج میں شرکت کر لینے سے کوئی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وسائل اور جواہر جیسی کتابیں سامنے رکھ کر کوئی شخص فتاویٰ دینا شروع کر دے۔ اس کے لیے تفسیر و حدیث کا علم اور ان ہزارہا احادیث سے واقفیت ضروری ہے جو رسولِ اکرمؐ سے لیکر امام حسن عسکریؑ کے زمانہ تک تقریباً ڈھائی سو سال کے عرصے میں وجود میں آئیں۔ اسی طرح ان سب احادیث کے ماحول یعنی تاریخ اسلامی، دوسرے اسلامی فرقوں کی فقہ اور رجال و طبقاتِ رواۃ کا علم بھی اہم ہے۔

آیت اللہ بروجردی اعلی اللہ مقامہ واقعی فقیہ تھے۔ میری عادت نہیں کہ کسی کا نام لے کر تذکرہ کروں۔ جب تک وہ زندہ تھے میں نے اپنی تقریروں میں کبھی ان کا نام نہیں لیا لیکن اب جبکہ وہ رحلت کر گئے اور مجھے کوئی لالچ نہیں ہو سکتا میں کہتا ہوں کہ وہ واقعی ایک ممتاز اور عظیم فقیہ تھے اور تفسیر، حدیث، رجال، درایت اور سب اسلامی فرقوں کی فقہ کے تمام شعبوں پر حاوی تھے۔

فقیہ کے طرز جہاں بینی کا
اس کے فتووں پر اثر

فقیہ و مجتہد کا کام استنباط و استخراجِ احکام ہے لیکن جن امور کے متعلق وہ فتویٰ دے ان سے کامل واقفیت اور اس کے طرزِ جہاں بینی کا فقیہ کے فتووں پر بہت اثر پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ فقیہ کو ان تمام موضوعات کے متعلق پوری معلومات اور واقفیت ہو جن کے متعلق وہ فتوے دے رہا ہے۔ اگر فرض کیجیے کہ ایک فقیہ گھر کے کونے یا مدرسہ کے کسی گوشے میں بیٹھا رہتا ہے اور دوسرا زندگی کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ دونوں مختلف طریقوں سے ادلۂ شرعیہ سے استنباطِ احکام کریں گے اور ان کے فتووں میں فرق ہوگا۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجیے ایک فقیہ تہران یا کسی دوسرے بڑے شہر میں پلا بڑھا ہے جہاں "کر" اور "جاری" پانی کی فراوانی ہے اور پانی کے حوض اور نہریں بھی بکثرت ہیں۔ ایسا شخص جب طہارت و نجاست کی روایات پر نظر ڈالے گا تو وہ احکام اس طرح استنباط کرے گا کہ وہ احتیاط اور بہت سی چیزوں سے اجتناب پر زور دے گا لیکن اگر یہی شخص خانۂ خدا کی زیارت کے لیے جائے اور وہاں پانی کی کمی کو دیکھے تو طہارت و نجاست کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر بدل جائیگا۔ اس سفر کے بعد اگر وہ طہارت و نجاست سے متعلق روایات کی طرف رجوع کریگا تو ان کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا۔

اگر کوئی شخص مختلف فقہاء کے فتاویٰ کا مقابلہ کرے گا اور ساتھ ہی ان کی شخصیات اور مسائل زندگی کے بارے میں ان کے طرزِ فکر کا مطالعہ کرے گا تو وہ دیکھے گا کہ کس طرح ایک فقیہ کا ذہنی پس منظر اور باہر کی دنیا کے متعلق اس کی معلومات اس کے فتاویٰ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک عرب کے فتاویٰ سے بوئے عرب آتی ہے اور ایک عجمی کے فتاویٰ سے بوئے عجم، ایک دیہاتی کے فتاویٰ سے بوئے دیہات آتی ہے تو ایک شہری کے فتاویٰ سے بوئے شہر۔

اسلام بنی نوع انسان کے لیے خدائے منان کا آخری دین ہے اور کسی مخصوص زمانے یا علاقے سے اس کا تعلق نہیں۔ یہ ہر علاقے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ یہ وہ دین ہے جو انسانی زندگی کے نظام اور اس کی ترقی کے لیے آیا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی فقیہ جو زندگی کے نظام اور اس کی قدرتی روش سے بے خبر ہو، زندگی کے ارتقاء پر یقین نہ رکھتا ہو اور اس کے باوجود وہ دین حنیف کے ان بلند اور ترقی پذیر احکام کا صحیح استنباط کر سکے جو اسی نظام زندگی سے متعلق ہیں اور جن میں ان ہی تغیرات اور ترقیات کے بارے میں ہدایت دی گئی ہے جو اس نظام میں ہوتی رہتی ہیں۔

ضرورت کا احساس

اس وقت بھی ہماری فقہ میں بعض ایسے مسائل ہیں جہاں ہمارے فقہاء نے پورے یقین سے وجوب کا فتاویٰ دیا ہے لیکن صرف ان کی اہمیت اور ضرورت کے پیشِ نظر کوئی صریح اور کافی فقہی دلیل موجود نہیں اور نہ قابلِ اعتماد اجماع کی شکل ہے۔ ان موقعوں پر فقہاء نے استنباطِ حکم کے لیے

صرف چوتھے ماخذ یعنی عقل سے استفادہ کیا ہے۔ ایسے مسائل میں ان کی اہمیت کے پیش نظر اور روح اسلام سے واقفیت کی بنا پر کہ اسلام میں کوئی اہم مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق کوئی حکم نہ ہو۔ فقہاء تعین کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حکم الٰہی ایسا ہونا چاہیے۔ اس کی نظیر وہ فتویٰ ہے جو ولایتِ حاکم اور متعلقہ مسائل کے بارے میں دیا گیا ہے۔ اگر فقہاء اس مسئلہ کی اہمیت کا ادراک نہ کرتے تو یہ فتویٰ دیا ہی نہ جاتا۔ مگر انھوں نے مسئلہ کی اہمیت کا احساس کیا اور فتویٰ دیا۔ ایسی مثالیں بھی ڈھونڈی جا سکتی ہیں جہاں اہمیت اور ضرورت کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے فتویٰ نہیں دیا گیا۔

ایک اہم تجویز

میں یہاں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے امید ہے کہ ہماری فقہ کو بہت ترقی ہوگی۔ اس سے قبل یہ تجویز آیت اللہ الحاج شیخ عبدالکریم یزدی مرحوم اعلی اللہ مقامہ پیش کر چکے ہیں اور میں اسی کو دہرا رہا ہوں۔

انھوں نے کہا تھا کیا یہ ضروری ہے کہ لوگ تمام مسائل میں ایک ہی شخص کی تقلید کریں۔ بہتر یہ ہے کہ مختلف مجتہد فقہ کی مختلف شاخوں میں خصوصی مہارت پیدا کریں یعنی علماء فقہ کی عمومی تعلیم کے بعد اپنے لیے کوئی ایک شعبہ مخصوص کر لیں اور اس میں مہارت پیدا کریں اور عوام بھی اس میں ان کی تقلید کریں مثلاً کچھ عبادات میں تخصص پیدا کریں، کچھ معاملات میں، کچھ سیاسیات میں اور کچھ احکام میں (یعنی فقہی اصطلاح میں جن کو احکام کہا جاتا ہے)۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے طب کے مختلف شعبوں میں اسپیشلسٹ ہوتے ہیں بعض امراض قلب کے ماہر ہیں، بعض امراض چشم کے، بعض ناک کان اور حلق کی

بیماریوں میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں اور بعض کسی اور شعبہ میں متخصص ہیں۔ اگر یہ کام ہو جائے تو ہر شخص اپنے مخصوص شعبہ میں بہتر تحقیقی کام کر سکے گا۔ میرا خیال ہے الکلام یجر الکلام مؤلفہ جناب سید احمد نجفانی میں آیت اللہ یزدی کی یہ تجویز چھپ چکی ہے۔

یہ تجویز بہت عمدہ ہے۔ میں اتنا اور کہوں گا کہ پچھلے سو سال سے فقہ میں تقسیم کار اور مختلف شعبوں میں تخصص کی ضرورت پیدا ہوئی ہے اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ یا تو فقہ کی مزید ترقی کو روک دیا جائے یا پھر یہ تجویز مان لی جائے۔

علوم میں تخصص اور تقسیم کار

کیونکہ ایک طرف تقسیم کار کے نتیجہ میں علوم ترقی کرتے ہیں اور دوسری طرف علوم کی ترقی کے باعث تقسیم کار ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تقسیم کار ترقی علوم کی علت بھی ہے اور اس کا معلول بھی ۔۔۔ جب کوئی علم بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے تو ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ اس کے تمام مسائل میں تحقیق کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں رہتی لہٰذا تقسیم کار اور مختلف شعبوں میں تخصص حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تقسیم کار اور خصوصی شعبوں کا وجود نتیجہ ہے علم کی ترقی کا ۔۔۔ دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ خصوصی شعبوں کے وجود تقسیم کار اور ہر شعبہ میں الگ الگ تحقیق سے علم کو مزید فروغ حاصل ہوتا ہے اور اس لحاظ سے تقسیم کار سبب ہے علوم کی ترقی کا۔

دنیا کے سب علوم کی جیسے طب، ریاضیات، قانون، ادبیات اور

فلسفہ وغیرہ۔ ان سب کی خصوصی شاخیں پیدا ہو گئی ہیں جن میں مہارت حاصل کی جاتی ہے اور اس طرح ان علوم کے سب شعبے ترقی کر رہے ہیں۔

پچھلے ایک ہزار سال میں فقہ کا ارتقاء

ایک زمانہ تھا کہ فقہ بہت محدود تھی۔ جب ہم شیخ طوسی سے پہلے کی کتابیں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم کس قدر محدود اور مختصر تھا۔ شیخ طوسی نے "مبسوط" کے نام سے کتاب لکھی تو فقہ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ علم میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس وقت سے ہر دور میں علماء اور فقہاء کی مساعی سے نئے نئے مسائل اور جدید تحقیقات کے نتیجہ میں فقہ کے حجم میں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ تقریباً سو سال قبل صاحب جواہر کو فقہ کا ایک مکمل نصاب تیار کرنے میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے یہ کام انجام دیا۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں یہ کام شروع کیا اور مسلسل محنت و کوشش اور غیر معمولی قابلیت سے آخر عمر میں اس کی تکمیل کی۔ عمر بھی انہوں نے کافی طویل پائی۔ جواہر چھ بڑی ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ شیخ طوسی کی مبسوط جو اپنے زمانہ میں فقہ کی بہت مفصل کتاب سمجھی جاتی تھی شاید جواہر کی نصف جلد سے بھی کم ہے۔ صاحب جواہر کے بعد شیخ مرتضیٰ انصاری نے ایک نئی فقہ کی بنیاد ڈالی جس کا نمونہ مرحوم کی کتاب مکاسب اور کتاب طہارت ہے۔ اس کے بعد سے کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ اس قدر تشریح و تحقیق سے فقہ کا مکمل نصاب ترتیب دے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ دنیا کے دیگر علوم کی طرح ہماری فقہ نے جو ترقی کی ہے اس کی پیشرفت گزشتہ علماء و فقہاء کی ہی مساعی کی مرہون منت ہے۔

اب یہ طے کرنا اس زمانے کے علماء کا کام ہے کہ آیا وہ فقہ کی مزید نشو و نما پر قدغن لگانا چاہتے ہیں یا وہ اس معقول تجویز پر عمل کرکے فقہ کی مختلف شاخوں میں تخصص کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ اس تجویز سے عوام فقہاء کا بھی اسی طرح انتخاب کیا کریں گے جس طرح معالجوں کا کرتے ہیں۔

فقہی شوریٰ

ایک اور تجویز بھی ہے جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس بات پر جتنا بھی زور دیا جائے بہتر ہے۔ وہ تجویز یہ ہے کہ گو آج کی دنیا میں مختلف شعبوں میں تخصص کا رواج عام ہو گیا ہے اور اس سے معیاری معقول ترقی بھی ہوئی ہے لیکن ایک اور طریقہ پر بھی عمل ہو رہا ہے اور وہ بھی ترقی اور پیشرفت کا ایک بہت اہم ذریعہ ہے۔ یہ طریقہ درجہ اول کے دانشوروں میں باہمی تعاون اور اتحادِ فکر و عمل کا ہے۔

آج کی دنیا میں فردِ واحد کی سوچ اور عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ انفرادیت اختیار کرنے اور الگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے سے کام نہیں چلتا۔ آج ہر شعبہ کے علماء اور دانشمند ایک دوسرے سے مسلسل تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں اور اپنے افکار کے نتائج سے دوسرے اہل فکر و نظر کو آگاہ کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک براعظم کے عالم دوسرے براعظم کے عالموں کے ساتھ فکری تعاون کرتے ہیں۔ درجہ اول کے عالموں کے درمیان اس تعاون اور تبادلۂ خیالات کے نتیجہ میں جو صحیح اور مفید نظریہ وجود میں آتا ہے وہ بہت جلد شہرت حاصل کر لیتا ہے۔ اگر نظریہ غلط ہو تو جلد ہی اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے اور وہ نظریہ متروک ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ

نظریہ پیش کرنے والے عالم کے شاگرد سالہا سال تک غلطی میں مبتلا رہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں نہ تقسیم کار ہے اور نہ ابھی تخصص کا رواج پیدا ہوا ہے، نہ باہمی تعاون ہے اور نہ فکری اتحاد۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں مشکلات کے حل ہونے اور علوم میں پیشرفت کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

علمی مشاورہ اور تبادلِ افکار کی اہمیت اس قدر واضح ہے کہ اس سلسلہ میں کسی استدلال کی ضرورت نہیں لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کہ خود اسلام میں یہ ترقی یافتہ خیال نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کے بارے میں حکم بھی ہے۔ میں ایک قرآنی آیت اور نہج البلاغہ کے چند جملوں کی طرف اشارہ کروں گا۔

سورۂ شوریٰ میں ارشاد باری تعالےٰ ہے:

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ.

اس آیت کریمہ میں مومنین اور پیروان اسلام کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں:

وہ اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت کے مطابق تبادلۂ خیالات اور ہم فکری اہل ایمان اور پیروان اسلام کی زندگی کا ایک اصول بتایا گیا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

وَاعْلَمُوا أَنَّ عِبَادَ اللّٰهِ الْمُسْتَحْفَظِينَ عِلْمَهُ يَصُونُونَ مَصُونَهُ وَيُفَجِّرُونَ عُيُونَهُ يَتَوَاصَلُونَ بِالْوِلَايَةِ وَ

يَتَلَاقَوْنَ بِالْمَحَبَّةِ وَيَتَسَاقَوْنَ بِكَأْسٍ رَوِيَّةٍ وَ يَصْدُرُوْنَ بِرِيَّةٍ.

یعنی یہ سمجھو کہ وہ بندگانِ خدا جن کو علمِ خدا عطا کیا گیا ہے اس کے راز کی حفاظت کرتے ہیں، اس کے چشموں کو جاری کرتے ہیں۔ یعنی چشمہ ہائے علم سے لوگوں کو سیراب کرتے ہیں، ایک دوسرے سے دوستی اور محبت کا رشتہ استوار رکھتے ہیں، محبت اور خندہ روئی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اپنے علم و فکر کے جام سے ایک دوسرے کو اس طرح سیراب کرتے ہیں کہ اس کے فیض سے سب سیراب ہو جاتے ہیں۔

اگر فقہی مسائل کے حل کے لیے کوئی شورائی قائم ہو جائے اور تبادلِ افکار کا اصول پوری طرح عملی جامہ پہن لے تو نہ صرف فقہ کو ترقی حاصل ہو بلکہ فتاویٰ کے اختلافات بھی بڑی حد تک دور ہو جائیں۔

اگر میں یہ دعویٰ کروں تو بیجا نہ ہو گا کہ ہماری فقہ بھی واقعی دنیا کے دوسرے علوم کی طرح ایک علم ہے اس لیے مناسب ہے کہ ہم علمی طریقۂ کار کی پیروی کریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "فقہ" علوم کی فہرست سے خارج ہے۔

کچھ اور بھی ضروری اور مفید تجاویز ہیں مگر وقت ختم ہو جانے کے باعث میں ان کا تذکرہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں پون گھنٹہ اور لگ جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض لوگوں کے گھر کافی دور ہیں۔

میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں اس آیتِ کریمہ کی تلاوت کی تھی:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا
فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ.

اس آیتِ کریمہ میں صریحاً ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت تفقہ پیدا کرے اور دوسروں کو تفقہ سے بہرہ ور کرے۔

تفقہ کا مادہ فقہ ہے۔ فقہ کے معنی مطلق سمجھنے کے نہیں بلکہ کامل بصیرت حاصل کرنے اور کسی شے کی حقیقت تک پہنچنے کو فقہ کہتے ہیں۔ راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتا ہے:

اَلْفِقْهُ هُوَ التَّوَصُّلُ إِلَى عِلْمٍ غَائِبٍ بِعِلْمٍ شَاهِدٍ.

یعنی فقہ کے معنی معلوم کے ذریعے نامعلوم کی دریافت کے ہیں۔

فقہ کی تعریف اس نے اس طرح کی ہے:

تَفَقَّهَ إِذَا طَلَبَهُ فَتَخَصَّصَ بِهِ.

یعنی تفقہ پیدا کرنے کا مطلب ہے کسی چیز کو دریافت کرنا اور اس میں تخصص پیدا کرنا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کا سطحی علم حاصل نہ کریں بلکہ غور و فکر سے کام لیں اور احکامِ الٰہی کی روح تک رسائی حاصل کریں۔

یہی آیت تفقہ اور اجتہاد کے لیے سندِ اعتبار ہے اور یہی آیت ہماری تجاویز کو مستند ٹھیراتی ہے۔ اس آیت کے مطابق اسلام میں اجتہاد اور تفقہ کی بساط بچھی ہوئی ہے اور اسی کے حکم کے مطابق اس بساط کو اور وسیع ہونا چاہیے۔ ضرورتوں کی طرف مزید توجہ ہونی چاہیے۔ فقہی شوریٰ کو عملاً کام

شروع کر دینا چاہیے اور انفرادی کام کا طریقہ منسوخ ہو جانا چاہیے۔ فقہ کے مختلف شعبوں میں تخصص کو رواج دینا چاہیے تاکہ ہماری فقہ ارتقاء کے راستہ پر مستقل طور پر گامزن رہے۔

احیائے فکر دینی

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ.

آج کا موضوع سخن "احیائے فکر دینی" ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ خیال آئے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیا یہ ہمارا فریضہ ہے یا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ دین کے احیاء کی کوشش کریں۔ اصل میں بات تو اس کے برعکس ہے۔ یہ تو دین کا کام ہے کہ ہمارا احیاء کرے۔ ہم کیسے دین کا احیاء کر سکتے ہیں ؟

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض لوگ شاید یہ اعتراض کریں کہ یہ عنوان تو خود اس آیت کے مضمون سے متصادم ہے۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے : ۲۳

"اے مومنین! خدا و رسول جس کام کی تمہیں دعوت دیں اس کو قبول کرو۔ رسول تمہیں ایسے کام کی دعوت دیتے ہیں یعنی

دین کی، جو تمہیں زندہ کرے گا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ دین خود ایسی چیز ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور جن کو زندگی ملتی ہے وہ ہم انسان ہیں۔ ایسی صورت میں احیائے فکرِ دینی کے کیا معنیٰ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری گفتگو کا عنوان احیائے فکرِ دینی ہے، احیائے دین نہیں اور اگر ہمارا موضوع احیائے دین ہوتا تب بھی کوئی تضاد نہیں تھا اس لیے کہ جہاں دین ہمیں زندگی بخشتا ہے وہاں ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم دین کو زندہ رکھیں۔ اس میں قطعاً کوئی منطقی مغالطہ نہیں ہے۔

پہلے یا دوسرے جلسے میں تقویٰ پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے باوجود کہ تقویٰ انسان کو قوتِ مدافعت عطا کرتا ہے اور وہ انسان کا محافظ ہے، انسان بھی اس کا مکلف ہے کہ تقویٰ کی حفاظت کرے اور اس بات میں کوئی منطقی مغالطہ نہیں ہے کیونکہ اس مسئلہ کے دو رخ ہیں۔ ایک لحاظ سے ہمیں تقویٰ کی حفاظت کرنی چاہیے اور دوسرے لحاظ سے خود تقویٰ ہماری حفاظت کرتا ہے۔

یہاں بھی یہی صورت ہے۔ دین کو زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے اور دین بھی ہمیں زندگی بخشتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جس چیز پر ہماری زندگی کا دارومدار ہو ہم اس کی حفاظت کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے پانی ہماری زندگی کے لیے ضروری ہے مگر ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ پانی کو صاف اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھیں۔ پانی کے بارے میں یہ ہماری ذمہ داری ہے لیکن پانی کی یہی بھی ایک خاصیت ہے جو خدائے تعالیٰ نے اس کے لیے قرار دی ہے۔ علاوہ ازیں خود آیات و احادیث میں دونوں باتوں کا ذکر آیا ہے۔

ابھی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں ہے کہ دین تمہیں زندگی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح صراحتاً یا اشارتاً ہمیں جا بجا یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہم دین کو زندہ کریں اور زندہ رکھیں۔ اس فرض سے غافل نہ ہوں کہ دین کو زندہ رکھنا ہے اور اس کو کبھی مرنے نہیں دینا۔

امام علیؑ نے اپنے اس مشہور خطبے میں جو غالباً آپ کا آخری خطبہ تھا اپنے مخلص رفقاء کی توصیف کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے دین کو زندہ رکھا۔ نوف بکالی نے بیان کیا ہے کہ علیؑ اس پتھر پر کھڑے ہوئے تھے جو جعدہ بن ہبیرہ نے لاکر رکھا تھا، وَ عَلَیْهِ مِدْرَعَةٌ مِنْ صُوفٍ۔ وہ اس وقت پشمینہ کا جبّہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار کی حمائل کھجور کے ریشہ کی تھی۔ ان کے نعلین بھی اسی کے تھے۔ آپ اس پتھر پر کھڑے ہوئے اور اس سے خطبہ کے لیے منبر کا کام لیا اور ایسا عجیب اور شاندار خطبہ دیا کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر میں آپ نے اپنے دوستوں کو یاد کرکے فرمایا:

> اَیْنَ اِخْوَانِیَ الَّذِیْنَ رَکِبُوا الطَّرِیْقَ وَمَضَوْا عَلَی الْحَقِّ.
>
> میرے وہ بھائی کہاں ہیں جو راہِ حق کے رہرو تھے۔ انہوں نے جادۂ حق پر قدم رکھا اور حق پر دنیا سے اُٹھ گئے۔
>
> اَیْنَ عَمَّارٌ اَیْنَ ابْنُ التَّیِّهَانِ اَیْنَ ذُو الشَّهَادَتَیْنِ.
>
> عمار بن یاسر کہاں ہیں؟ ابو الہیثم التیہان کہاں ہیں؟ خزیمہ بن ثابت ذو الشہادتین کہاں ہیں؟ یہ فرما کر آپ کی حالت متغیر ہو گئی اور شاید آپ رونے لگے۔ پھر فرمایا:

آوہ علیٰ اِخوانِی الَّذِینَ قَرَأُوا القُرآنَ فَاَحکَمُوہُ.

آہ! میرے وہ بھائی جنہوں نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا۔ وَتَدَبَّرُوا الفَرضَ فَاَقَامُوہُ. جنہوں نے اپنے دینی فرائض پر غور کیا اور ان کو ادا کیا۔ وَاَحیَوُا السُّنَّۃَ وَاَمَاتُوا البِدعَۃَ. جنہوں نے سنت نبوی کو زندہ کیا اور بدعت کو نابود کر دیا۔

امام نے عمار، ابن تیہان، ذوالشہادتین اور ان جیسے حضرات کو سنت کے زندہ کنندگان کہا۔ یعنی محی دین۔ دین قرآن و سنت ہی تو ہے کیونکہ یہی دین کے ماخذ ہیں۔

نہج البلاغہ میں حضرت حجت بن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کے وجود مقدس کے بارے میں کچھ کلمات ہیں۔ ان میں سے اس وقت مجھے یہ جملہ یاد آ رہا ہے:

وَیُحیِی مَیِّتَ الکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ.

وہ زندہ کریں گے کتاب و سنت کو جو بے جان ہو چکی ہوں گی۔

یہ الفاظ امام علیؑ کے ہیں، میرے نہیں۔ امام رضاؑ نے ایک شیعہ سے فرمایا: اَحیُوا اَمرَنَا. ہمارے امر — یعنی امر ولایت — کو زندہ کرو۔

اس نے عرض کیا: ہم اس کو کس طریقے سے زندہ کر سکتے ہیں؟

حضرت نے حکم دیا کہ ہمارے کلام کے حقائق اور اس کے محاسن اور ہماری سیرت لوگوں سے بیان کرو اور ان کی تشریح کرو۔ یہی ہمارے امر کو زندہ کرنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس میں نہ کوئی مغالطہ ہے اور نہ کوئی اشکال۔

دین کو زندہ کرنا اور زندہ رکھنا ہمارا فرض منصبی ہے۔ ساتھ ہی دین ہماری زندگی کی اساس ہے بلکہ سب سے بڑی اساس۔ یہ تو ہوئی پہلی بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اس تقریر کے آغاز میں احیائے دین نہیں کہا تھا لیکن اگر میں یہ بھی کہتا تو کوئی اشکال نہیں تھا مگر پھر بھی ہم ایسی جسارت نہیں کر سکتے۔ میں نے احیائے فکر دینی کے الفاظ استعمال کیے تھے جس کا مطلب ہے دین کے بارے میں خود اپنی سوچ اور اپنے طرز فکر کو زندہ کرنا۔

دین زندہ ہے، وہ کبھی نہیں مرے گا۔ دین مرنے والی چیز نہیں۔ کوئی اصول اس وقت مر سکتا ہے یا منسوخ ہو سکتا ہے جب کوئی دوسرا اصول ایسا ہو جو اس کی جگہ لے سکے مثلاً بطلیموس کی ہیئت کے اصول علمی اصول تھے جو ایک مدت تک دنیا میں زندہ رہے۔ اس کے بعد اور حقائق دریافت ہوئے۔ ہیئت کے نئے اصول بن گئے جنھوں نے بطلیموس کے نظریہ کو ختم کر دیا۔ اسی طرح انباذقلس کا عناصر اربعہ کا نظریہ بھی یہ ثابت ہونے کے بعد کہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی میں سے کوئی بھی عنصر نہیں ہے اپنی موت مر گیا۔

لیکن دین کے حقائق اور وہ اصول جو دین نے بیان کیے ہیں ناقابل تنسیخ ہیں۔ وہ ہرگز نہیں مریں گے۔ جس چیز کے مرنے کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں وہ دین کے متعلق لوگوں کے افکار و خیالات ہیں۔ دینی فکر مردہ ہو گئی ورنہ خود دین جو کتاب و سنت پر مشتمل ہے نہ مرتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

اسلام کچھ اور ہے اور مسلمان کچھ اور ہیں۔ اسلام زندہ ہے مگر مسلمان اس وقت مردہ ہیں۔ ایک موضوع جو آجکل عمرانیات کے ماہرین کے درمیان زیر بحث ہے وہ عملی طور پر اسلام کا زندہ ہونا ہے۔ اس وقت دنیا کے تمام براعظموں ایشیا، افریقہ، امریکہ حتی کہ آسٹریلیا میں بھی اسلام ترقی کر رہا ہے۔

شاید آپ لوگوں نے وہ مضامین پڑھے ہوں گے جو غیر ملکی اخبارات و رسائل سے ترجمہ ہو کر چھپتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی حال ہی میں پڑھے ہیں۔ میں نام نہیں لوں گا کہ کس روزنامہ یا کس رسالہ میں پڑھے ہیں۔

اس وقت یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیوں اسلام امریکہ میں خصوصاً وہاں کے پسماندہ طبقہ میں یعنی اس طبقہ میں جس طبقہ میں اسلام نے اوّل اوّل ظہور کیا تھا، روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یورپ میں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسلام دانشوروں، پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے طبقہ میں بھی فروغ پا رہا ہے۔ سیاہ براعظم یعنی افریقہ کا عجیب حال ہے۔ عیسائی مبلغین ضخیم بجٹ لے کر شاندار تنظیمیں بنا کر اور بڑے بڑے منصوبے باندھ کر آتے ہیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اسلام خود بخود ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شخص تک پہنچ رہا ہے اور اس کا دائرہ برابر وسیع ہو رہا ہے

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ دینی سوچ مر چکی ہے تو یہ ان ملکوں کا حال ہے جو صدیوں سے مسلمان ہیں۔ ان ممالک میں کچھ ایسے عوامل پیدا ہو گئے ہیں کہ لوگوں کے دماغ سے یہ سوچ نکل گئی ہے یا یوں کہیے کہ اب ان کی حالت نیم مردہ، نیم زندہ کی سی ہے۔ ہمارا ملک (ایران) بھی ان ہی ملکوں کی صف میں شامل ہے جہاں احیائے فکرِ دینی پر بحث کی ضرورت ہے[۱] یہ افریقہ یا یورپ نہیں جہاں دینی فکر ابھی پیدا کرنی ہے۔ نہ یہ مشرق بعید یا

---

[۱] استاد مطہری ۱۳۸۳ھ کی بات کر رہے ہیں یعنی ایران میں اسلامی انقلاب سے ۱۵ سال قبل۔

جاپان ہے اگرچہ وہاں بھی اس کے لیے زمین ہموار ہے۔

بہرحال احیاءِ فکر دینی کی جن کو ضرورت ہے، وہ ہم ہیں۔ ہمارے پاس دین موجود ہے فکر دینی بھی ہم میں موجود ہے لیکن اس کی حالت نیم خفتہ و نیم بیدار بلکہ نیم زندہ و نیم مردہ کی ہے۔ یہ صورت حال بہت خطرناک ہے اور اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہر سو سال بعد ایک مجددِ دین کا نظریہ

میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس خیال کی مختصر طور پر تاریخ بیان کروں کہ دین کو تجدید اور احیاء کی ضرورت ہے مگر یہ تاریخ ہے افسوسناک۔

مجھے یاد ہے کہ سابق میں اس حدیث کا مضمون متعدد بار میری نظر سے گزرا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ ہر سو سال میں ایک بار ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو دین کی تجدید اور احیاء کرتا ہے۔ حدیث کی عبارت یہ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا۔

اللہ تعالیٰ ہر صدی کی ابتداء میں ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کے دین کی تجدید کرے۔

میں نے یہ حدیث متعدد کتابوں میں دیکھی ہے حتیٰ کہ ان کتابوں میں بھی جو ہمارے علماء کی تالیف ہیں۔ لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ پہلی صدی کے بعد دوسری صدی کے اوائل میں کون مجدد ہوا اور تیسری صدی کے اوائل میں کون مجدد ہوا۔ اسی طرح موجودہ زمانے تک حساب لگایا گیا ہے۔ ہمیں اس پر

نظر ڈالنا چاہتا ہوں کہ اس حدیث کی اصلیت کیا ہے اور آیا اس کی کچھ بنیاد ہے بھی یا نہیں۔

مجھے پہلے ہی یقین نہیں آتا تھا کہ رسولِ اکرمؐ نے اس قسم کی بات فرمائی ہوگی لیکن پھر بھی میں نے تحقیق کی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ حدیث اساساً شیعہ طُرق سے مروی ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض شیعہ علماء نے اس کو موضوعِ بحث بنایا اور اس کی بنیاد پر مجددین کا حساب بھی لگایا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب میں قم میں ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا میں نے مرحوم حاجی ملا ہاشم خراسانی کی منتخب التواریخ میں یہ حدیث دیکھی تھی۔ چنانچہ میں وہاں گیا اور وہ کتاب نکالی۔ دیکھا تو انھوں نے یہ حدیث حاجی نوری کی مستدرک سے نقل کی تھی اور حاجی نوری نے اہلِ تسنن کی کسی کتاب سے ۔۔۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کتبِ شیعہ میں سے کسی میں یہ حدیث نہیں۔ اگر ہوتی تو حاجی نوری جو ایک متبحر محدث تھے وہاں سے نقل کرتے۔ بالآخر ایک دوست کی مدد سے میں نے سنن ابوداؤد میں یہ حدیث ڈھونڈ نکالی۔ سنن ابوداؤد اہلِ تسنن کی صحاحِ ستہ میں سے ایک ہے۔ یہ حدیث اہلِ تسنن کی بعض دوسری کتابوں مثلاً مستدرکِ حاکم میں بھی ہے۔ حاکم نے بھی شاید ابوداؤد ہی سے نقل کی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا۔

سند کے لحاظ سے رسولِ اکرمؐ سے اس حدیث کے راوی ابوہریرہ ہیں۔ باقی افراد جنھوں نے ابوہریرہ سے روایت کی ان کی میں تحقیق نہیں کر سکا کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں۔

سند سے قطع نظر متن کے لحاظ سے بھی اس حدیث کا مضمون تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر ہم تاریخ اسلام کی ورق گردانی کریں اور یہ دیکھیں کہ کیا واقعی ہر صدی کے اوائل میں احیائے فکر دینی یا اس حدیث کے الفاظ میں تجدید دین کا کارنامہ انجام ہوا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ حدیث تاریخی لحاظ سے درست نہیں۔ مگر بعض علمائے اہل تسنن نے اس قسم کا حساب لگایا ہے کہ قرن دوم میں فلاں شخص نے قرن سوم میں فلاں شخص نے اور قرن چہارم میں فلاں شخص نے دین کی تجدید کی۔ تعجب تو یہ ہے کہ بعض علمائے شیعہ نے بھی بجائے یہ سمجھنے کے کہ یہ حدیث پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے اس کو رد کر دینا چاہیے اور یہ کہ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اخبار اہل بیتؑ میں بھی اس کا کچھ تذکرہ ہوتا اس حدیث کو تسلیم کر کے اس کی بنیاد پر کچھ حساب گھڑ لیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس حدیث کا مضمون کیوں لوگوں کو اس قدر دلفریب نظر آیا کہ باوجود اس کے کہ اس کی سند اور اس کا متن دونوں ضعیف ہیں اس کی بنیاد پر یہ حساب تراش لیا کہ قرن دوم میں اس کا مصداق امام باقرؑ ہیں اور قرن سوم میں امام رضاؑ ہیں۔ اوائل قرن چہارم میں یعقوب کلینی، اوائل قرن پنجم میں سید مرتضیٰ یا شیخ مفید، اوائل قرن ششم میں شیخ طبرسی صاحب مجمع البیان، اوائل قرن ہفتم میں خواجہ نصیر الدین طوسی، اوائل قرن ہشتم میں علامہ حلی، اوائل قرن نہم میں شہید اول، اوائل قرن دہم میں محقق کرکی، اوائل قرن یازدہم میں شیخ بہائی، اوائل قرن دوازدہم میں علامہ مجلسی، اوائل قرن سیزدہم میں وحید بہبہانی اور اوائل قرن چہاردہم میں مرزا شیرازی۔

اولاً قران میں بہت سے ایسے نام ہیں جو کسی صدی کے اوائل سے

صحیح مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً خواجہ طوسیؒ کو اوّلِ قرنِ ہفتم کا مجدد شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خواجہ گو ساتویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے لیکن ان کے فضل وکمال کا ظہور اور شہرہ اس صدی کے وسط میں ہوا اور اسی صدی کے دوسرے وسط میں یعنی ۶۷۲ھ میں وہ وفات پا گئے۔

ثانیاً امام صادقؑ کو کیوں مجددین میں شمار نہیں کیا گیا؟ کیا ان کو مثلاً امام باقرؑ سے کم تجدیدِ دین کا موقع ملا ہے یا وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا نام بنا وفی حساب میں ٹھیک نہیں بیٹھا؟ ائمۂ اطہار علیہم السلام میں سے دو حضرات سب سے زیادہ مجدد شمار کیے جانے کے مستحق تھے۔ ایک امام حسین دوسرے امام صادق علیہما السلام ــــ ان دونوں حضرات کو تجدید و احیائے دین کا خاص موقع ملا مگر چونکہ ان کے نام خود ساختہ حساب سے میل نہیں کھاتے تھے اس لیے انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔

علاوہ ازیں بہت سے علماء کو تو مجددین میں شمار کیا گیا لیکن بہت سے دوسروں کا شمار نہیں کیا گیا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ صدی کے وسط میں ہوئے حالانکہ بعض صورتوں میں ان کی خدمات زیادہ تھیں۔ مثلاً شیخ طوسیؒ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ علمائے اسلام میں شیخ طوسیؒ کے برابر کسی نے بھی دین کی خدمت نہیں کی۔ شاید ہی ایک دو اور عالم ان کے مرتبہ کو پہنچتے ہوں۔ شیخ مرتضیٰ انصاری کا نام بھی چھوٹ گیا۔

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ بعض لوگوں نے منتخب التواریخ کی طرح کا ایک اور مجددین کا سلسلہ جس میں خلفاء و سلاطین شامل ہیں، بنا ڈالا۔ یہ سلسلہ بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔ اس کے مطابق اوائل قرنِ دوم میں عمر بن عبدالعزیز نے دین کی تجدید کی اور اوائل قرنِ سوم میں مامون الرشید نے،

اوائل قرن چہارم میں معتضد نے اوائل قرنِ پنجم میں عضد الدولہ دیلمی نے، اوائل قرن ششم میں سلطان سنجر سلجوقی نے، اوائل قرن ہفتم میں ہلاکو خاں منگول نے، اوائل قرن ہشتم میں شاہ خدابندہ نے کہ وہ بھی منگول ہی تھا۔ اوائل قرن نہم میں امیر تیمور گورگانی نے، اوائل قرن دہم میں شاہ اسماعیل صفوی نے، اوائل قرن یازدہم میں شاہ عباس صفوی نے، اوائل قرن دوازدہم میں نادر شاہ افشار نے اور اوائل قرنِ سیزدہم میں فتح علی قاچار نے۔

یہ ہیں ہر صدی میں دینِ اسلام کے مجدّدین۔ یہ الگ بات ہے کہ لَا یَرْضٰی بِہٖ شِیْعِیٌّ وَّ لَا سُنِّیٌّ، اس فہرست سے نہ کوئی شیعہ خوش ہے نہ سنی کیونکہ یہ کسی کے عقائد سے بھی میل نہیں کھاتی۔ نہ یہ تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے نہ کسی اور چیز سے۔ خدا کا شکر ہے کہ چنگیز خاں منگول کو اسلام کے مجدّدین میں شمار نہیں کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمجھ لیا گیا کہ اگر کسی نے حکومت اور طاقت پیدا کر لی، دولت حاصل کر لی تو دین کا احیاء ہو گیا۔ نہیں جناب احیائے دین اس پر موقوف نہیں۔ احیائے دین تو اس پر موقوف ہے کہ لوگ کس حد تک اس دین پر عمل کرتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالتے ہیں۔ یہی مطلب ہے دین کو زندہ کرنے اور دین کے زندہ ہونے کا۔

یہ کہنا غلط نہیں کہ مجدد کا نظریہ خود ایک طرح کا زہر ہے جو مسلمانوں کے ذہن میں گھول دیا گیا ہے۔

ہر ہزار سال کے بعد

اس نظریہ نے کہ ہر سو سال کے بعد ایک مجدد کا ظہور ضروری ہے ایک

اور نظریہ کے لیے زمین ہموار کر دی۔ اس نظریہ کے مطابق ہر ہزار سال کے بعد ایک مجدد کا ظہور ہوگا۔ بعض گمراہ فرقے اس خیال کے بھی پیرو بن گئے۔

اس خیال کی کہ ہر ہزار سال بعد ایک مجدد کا ظہور ضروری ہے اپنی الگ تاریخ ہے اور اس کی جڑیں اس قدیم ایرانی اور ہندی فلسفہ میں پیوستہ ہیں جو قدیم طبعیات پر مبنی تھا۔ اول تو وہ طبعیات ہی غلط تھی۔ دوسرے اس طبعیات سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں تھا۔ شیخ اشراق نے اس نظریہ کو اسلامی فلسفہ کا جزو بنا دیا۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس نظریہ کو 'دورِ وکور' کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق ہر چند ہزار سال بعد دنیا کی ہر چیز بدل جاتی ہے اور ہر چیز کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ پچھلے ہر فرد کے مماثل ایک نیا فرد پیدا ہوتا ہے۔ تمام واقعات از سر نو دوبارہ اسی طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں جیسے پہلے ہوئے تھے۔

کہتے ہیں کہ ہر ۲۵ ہزار دو سو سال میں واقعاتِ عالم دہرائے جاتے رہے ہیں کیونکہ فلکِ ثوابت کی ایک گردش مکمل ہونے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ یہ تو تھا قدیم فلسفہ — بعد میں بعض مسلمان خیال بافوں نے اس فلسفہ کو قرآنی آیات سے مطابقت دینے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا کہ قرآن میں آیت ہے کہ:

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ.

یعنی تمہارے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے حساب کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔

چونکہ ہر سال ۳۶۰ دن کا ہوتا ہے لہٰذا ہر الٰہی سال تین لاکھ ساٹھ ہزار

سال کا ہو۔ بالفاظ دیگر تین لاکھ ساٹھ ہزار سال میں دنیا کا ایک دور پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نیا دور شروع ہوتا ہے اور ہر چیز نئی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی محض ایک خیال ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مہمل بات ہے۔ مگر ایک غلطی سے دوسری غلطی اور ایک گمراہی سے دوسری گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ یہ سب زہر ہے جو ہمارے افکار میں سرایت کر گیا ہے۔ جب تک ہم ایسے خیالات کو اپنے دماغ سے بالکل نہیں نکال دیں گے کبھی ہمارے افکار میں تازگی کی لہر نہیں دوڑے گی۔

بعد میں کچھ اور بہکانے اور گمراہ کرنے والے آئے اور انہوں نے ایک اور آیت کی غلط تفسیر کی۔ اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ.

یہ آیت سورۂ سجدہ میں ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے' پھر اس کی روداد' ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے' اس کے حضور اوپر جاتی ہے۔ ان لوگوں نے اس کے معنی یہ لیے کہ ہر ہزار سال میں ایک بار اللہ تعالٰے لوگوں کے معاملات کی انبیا کے ذریعہ تدبیر یعنی تجدید کرتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ تدبیر کرنے کا مطلب تجدید کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ مثلاً ہزار سال میں ایک پیغمبر آئے لہٰذا ثابت ہوا کہ ہر ہزار سال میں ایک بار کوئی ایک شخص آئے گا۔

اس کے بعد اور اس کے نتیجہ میں کیسی کیسی گمراہی عالم تشیع میں پھیلی۔ ان ہی لغو خیالات کی وجہ سے لوگوں کی ایک خاصی تعداد دین سے بیگانہ ہو گئی۔

نہیں جناب! ہمارے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں کہ ہر سو سال یا ہر ہزار سال میں کسی ایک شخص کا ظہور ہونا چاہیے۔ صرف ایک ایسے شخص کے بارے میں پیشین گوئی ہے لیکن وہ بھی دوسرا معاملہ ہے جس کا تعلق عالمی سطح سے ہے۔ وہ قائم آلِ محمد حضرت امام مہدیؑ کا وجود مقدس ہے جو عالم تشیع سے مخصوص نہیں۔ آپ پوری دنیا کے لیے ہیں[۱]۔ وہ جو بعض ذاکر یہ کہتے ہیں کہ حضرت صرف ہم شیعوں کو نجات دلانے کے لیے آئیں گے۔ یہ بھی بعض شیعوں کی بات دروغ محض ہے۔ شیعہ جو دنیا کی قلیت ہیں امام زمان فقط ان کے حامی نہیں ہیں بلکہ وہ ساری دنیا کے مصلح ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کے ظہور کا کوئی وقت معین کریں یا کوئی حساب لگائیں کہ وہ اتنے سال بعد آئیں گے۔ جو لوگ کبھی اس آیت سے ازروئے قاعدۂ ابجد حساب لگاتے ہیں: إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ اور کبھی اس آیت وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ سے حساب لگاتے ہیں: کہ حضرت فلاں سال میں ظہور کریں گے" وہ سب جھوٹے ہیں۔ ان سے ڈریں اور ان کی تکذیب کریں کہ كَذَبَ الْوَقَّاتُونَ (جو وقت مقرر کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں) حضرت حجت

---

[۱] حضرت قائم آلِ محمدؑ کی امامت اور غیبت کے موضوع پر آیت اللہ باقر صدر کی کتاب "انتظارِ امام" اور فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں امامؑ کے قیام اور انقلاب کے موضوع پر آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کی کتاب "آخری فتح" ملاحظہ فرمائیں۔

کا جو کام ہے اس کے انجام دینے کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ نہ ہم نہ آپ نہ کوئی دوسرا مبلغ — ان کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

بقول ایک دانشور کے کبھی تو ہم صرف اپنا گھر روشن کرنا چاہتے ہیں اور کبھی یہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا میں اجالا ہو جائے لیکن دنیا میں اجالا ہونا ہمارے اور آپ کے بس میں نہیں۔ وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ اس کے لیے سورج نکلنا چاہیے تاکہ پوری دنیا میں روشنی پھیل جائے۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے مکان کو روشن کریں، اپنی دکان کو روشن کریں، اپنی گلی کو روشن کریں، اپنے شہر کو روشن کریں۔ دنیا کو منور کرنا بالکل الگ بات ہے۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

مذکورہ بالا غلطیاں اسی وجہ سے ہوئیں کہ ہم نے اپنے حساب کی بنیاد صرف چند شخصیات کو بنایا اور عوام کو نظر انداز کر گئے۔

آئیے اب بیٹھ کر سوچیں اور یہ دیکھیں کہ آیا واقعی ہمارا انداز فکر اسلامی ہے؟ آیا اسلامی سوچ ہمارے ذہنوں میں زندہ ہے؟ اس وقت اس بات کی زیادہ ضرورت نہیں کہ ہم غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوششیں کریں، گو ہماری آرزو یہی ہے، مگر جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم دیندار مسلمانوں میں جو نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں اور زیارت اور حج کے لیے بھی جاتے ہیں اسلامی فکر کو زندہ کریں جو اس وقت نیم مردہ حالت میں ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا کچھ کام نہیں بنے گا (اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر لوگ دیندار ہوں مگر دین شناس نہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں) فرض کیجیے کہ یورپ میں کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں اور ہمیں موجودہ حالت میں دیکھیں تو ممکن ہے کہ پشیمان ہو کر اسلام ہی سے برگشتہ ہو جائیں۔

عصرِ حاضر میں مسلمانوں کا انحطاط

چند ممالک کو چھوڑ کر دنیا میں پسماندہ ترین اور بے حیثیت ترین ملک اسلامی ممالک ہیں۔ یہ نہ صرف علم و ہنر میں، صنعت اور ٹیکنالوجی میں اور اخلاق میں پیچھے ہیں بلکہ انسانیت اور روحانیت میں بھی پسماندہ ہی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یا تو ہم اعتراف کر لیں کہ اسلام (یعنی اسلام کی وہ حقیقت جو ہمارے ذہنوں میں ہے) اس کی خاصیت یہی ہے کہ وہ قوموں کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ دشمنانِ اسلام کے پروپیگنڈے کا سب سے بڑا حربہ یہی مسلمانوں کی یہی حالتِ زار ہے یا پھر یہ تسلیم کر لیں کہ ہمارے ذہن اور ہماری روح میں اسلام کی اصل صورت موجود ہی نہیں۔ جو کچھ ہمارے ذہن میں موجود ہے وہ محض اسلام کی مسخ شدہ صورت ہے۔ ہماری توحید مسخ شدہ ہے۔ ہمارا نبوت کا تصور مسخ شدہ ہے۔ ہمارا ولایت و امامت کے بارے میں اعتقاد اور ہمارا قیامت سے متعلق عقیدہ سب مسخ شدہ ہیں۔ اسلام کے تمام اصول ہمارے ذہن میں محض ایک بدلی ہوئی شکل میں موجود ہیں۔ دین میں صبر ہے، زہد ہے، تقویٰ ہے، توکل ہے لیکن بلا استثناء ہمارے ذہن میں ان سب کی شکل مسخ ہو چکی ہے۔ ان جلسوں میں اب تک جو تقریریں ہوئی ہیں ان سے آپ نے کسی حد تک موجودہ صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ مثلاً تقویٰ کے بارے میں ہم نے جو بحث کی تھی اس سے آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہوگی کہ اب تک ہمارے ذہن میں تقویٰ کی جو صورت رہی ہے وہ مسخ شدہ ہے اور دوسرے جن موضوعات پر بحث ہوئی ہے ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی صورت بدل گئی ہے۔

ایک حکایت ہے کہ چند دیہاتی اپنے گاؤں سے شہر گئے۔ انہوں نے

اس سے پہلے شہر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں انہیں دور سے ایک خاص قسم کے درخت جو نظر آئے تو انہیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیسے درخت ہیں کہ ان درختوں میں نہ شاخیں ہیں نہ پتے۔ دراصل وہ مسجد کے مینار تھے جن کو وہ درخت سمجھے۔ وہ سوچنے لگے کہ یہ کس قسم کے درخت ہیں جو ہم نے آج تک نہیں دیکھے۔ شہریوں کو بھی درختوں کی خوب واقفیت ہے۔ غرض انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان درختوں کا نام کیا ہے؟ کچھ ہوشیار شہری سمجھ گئے کہ یہ دیہاتی ہیں۔ ان کو ذرا بنانا چاہیے۔ کہنے لگے کہ یہ ایسے درخت ہیں جو دیہات میں نہیں ہوتے۔

دیہاتیوں نے پوچھا کہ پھر انہیں کیسے لگاتے ہو؟

کہنے لگے کہ ان کے خاص طرح کے بیج ہوتے ہیں جو ہم بو دیتے ہیں اور درخت اگ آتے ہیں۔

انہوں نے کہا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ بیج ہمیں بھی دے دو؟

انہوں نے گاجر کے تھوڑے سے بیج ان کو دے دیے۔

انہوں نے واپس جا کر وہ سب بو دیے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی گاجر کی کاشت نہیں کی تھی۔ کچھ دن بعد دیکھا تو کچھ بھی نہیں اگا۔ انہوں نے انتظار کیا، خوب پانی دیا لیکن کچھ نہ نکلا۔ جب ایک مدت گزر گئی تو آپس میں کہنے لگے کہ کیا بات ہے جو آج تک درخت نہ نکلے۔ آخر کھودا تو دیکھا کہ مینار کی شکل تو ہے لیکن وہ مینار بجائے اوپر آنے کے زمین کے اندر چلے گئے۔ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے بیج الٹے بو دیے۔ ہمارے اسلام اور مسلمانی کا قصہ بھی ان ہی دیہاتیوں کا سا ہے جنہوں نے میناروں کی کاشت کی تھی۔

مسئلہ ولایت و امامت میں بھی ہمارے اندازِ فکر نے عجیب معکوس صورت اختیار کر لی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے پیشوا تو اہل بیت پیغمبر ہیں۔ ہمارے پاس علی ابن ابی طالبؑ ہیں، حسنؑ ابن علیؑ ہیں، حسینؑ ابن علیؑ ہیں، زین العابدینؑ ہیں۔ اسی طرح اور باقی آئمہ ہیں لیکن بجائے اس کے کہ ان آئمہ کا وجود ہمیں عمل کی ترغیب دیتا وہ ہمارے لیے ایک طرح کا نشہ اور سستی اور عمل سے گریز کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ہم نے تشیع اور ولائے اہل بیتؑ کو اپنی اسلامی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے ایک بہانہ بنا لیا۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ خیال کس قدر مسخ شدہ ہے اور ایک بلند پایہ حقیقت کی بگڑی ہوئی شکل نے ہمارے ذہن پر کیسا الٹا اثر کیا ہے۔ ہم خود کچھ نہیں کرتے بس اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مولا خود ہر بگڑی بنا دیں گے۔ میں اسلام کی ابتدائی تاریخ سے ایک قصہ نقل کرتا ہوں۔

شیعہ اور مرجئہ کا فرق

متکلمین کا ایک گروہ مرجئہ کہلاتا تھا۔ بحمد اللہ اب یہ فرقہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اس کے قائل تھے کہ اگر ایمان سلامت ہو تو کسی عمل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل ان کے اس عقیدہ کا محرک سیاسی مصلحت تھی۔ یہ لوگ بنی امیہ کے زمانے میں تھے اور انہیں ان کی تائید حاصل تھی۔ یہ لوگ اس طرح امراء و سلاطینِ بنی امیہ کے اعمال کے لیے ایک وجہِ جواز مہیا کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں تاریخ کہتی ہے۔ یہ کہتے تھے: جناب اگر آپ کا ایمان درست ہے تو پھر عمل کی کوئی اہمیت نہیں۔ عمل کرو تو کرو۔ نہ کرو تو نہ کرو۔ عمل کوئی چیز نہیں۔ جب بنی امیہ کو زوال آ گیا تو بنی عباس

نے اس دشمنی کی بنا پر جو انہیں بنی امیہ سے تھی مرجئہ کی بیخ کنی کر دی لیکن افسوس کی بات ہے کہ اب مرجئہ کی سوچ نے شیعوں کے دماغ میں جڑ پکڑ لی ہے حالانکہ جو قصہ میں نقل کرنا چاہتا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاً شیعہ عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ احمد امین مصری نے "ضحی الاسلام" میں ابو الفرج اصفہانی کی "اغانی" سے ایک روایت نقل کی ہے۔ خود احمد امین کا رجحان شیعوں کے خلاف ہے لیکن بہرکیف انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے۔ ایک شخص جس کا انہوں نے نام بھی لیا ہے، وہ کہتا تھا کہ ایک شیعی اور ایک مرجئی اپنے عقائد کے بارے میں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا مرجئہ کے اصول زیادہ صحیح ہیں دوسرا کہتا تھا شیعہ کے ۔۔۔ مرجئی کہہ رہا تھا کہ عمل کوئی چیز نہیں، اصل چیز صرف ایمان ہے شیعی کہہ رہا تھا کہ عمل ضروری ہے۔ اسی اثناء میں وہاں ایک گویا آ نکلا (میں گویا اس قرینہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ یہ اغانی کی روایت ہے)۔ دونوں نے کہا آؤ اس سے پوچھ لیں۔ یہ آدمی سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ کہنے لگے: اس سے یہ پوچھتے ہیں کہ شیعہ حق پر ہیں یا مرجئہ۔ آخر اس سے پوچھا گیا کہ میاں تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ آیا شیعہ حق پر ہیں یا مرجئہ؟ اس نے جواب دیا۔ کہنے لگا أَعْلَايَ شِيعِيٌّ وَأَسْفَلِي مُرْجِئٌ میرا اوپر کا حصہ شیعی اور نچلا حصہ مرجئی ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں فکر اور عقیدہ میں شیعہ ہوں مگر عمل کے لحاظ سے مرجئی یعنی میں شیعہ عقائد کو تسلیم تو کرتا ہوں مگر ان کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ اب ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم ایسی قوم بن گئے ہیں کہ فکر کے لحاظ سے بھی مرجئی ہیں اور عمل کے لحاظ سے بھی۔ یہی وہ مسئلہ ہے کہ جس کے مطابق کہنا چاہیے کہ ہماری دینی سوچ نیم مردہ ہو چکی ہے یا یوں کہوں کہ مر گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہماری سوچ ہی مرجئہ کی سی

ہو گئی تو اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ جب سوچ یہ ہو کہ عمل کی ضرورت ہی نہیں تو پھر کیا دنیا رہ سکتی ہے؟ آخرت رہ سکتی ہے؟ عزت رہ سکتی ہے؟ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ[1] کا استحقاق رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ہماری دینی فکر کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ دین کے بارے میں ہمارا اندازِ فکر غلط ہے۔ میں کہنے کی جسارت کروں گا کہ چند عبادات کے فروعی مسائل اور چند معاملات کو چھوڑ کر دین کے بارے میں ہماری سوچ قطعاً درست نہیں۔ ہم نہ اپنے خطبوں اور وعظوں میں صحیح بات کہتے ہیں، نہ کتابوں، اخباروں اور رسالوں میں صحیح بات لکھتے ہیں اور نہ ہی صحیح طریقے سے سوچتے ہیں۔ اس سے قبل کہ ہم دوسروں کو مسلمان بنانے کی فکر کریں ہمیں خود اپنی خبر لینی چاہیے۔ مسجد میں چراغ جلانے سے پہلے اپنے گھر کا دیا روشن کرنا چاہیے۔

میں اس بات پر کسی کو الزام نہیں دیتا کہ باہر روپیہ کیوں بھیجا جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح کام ہے۔ بہت اچھا کام ہے۔ شاید وہاں واقعی صحیح مسلمان بن جائیں اور بعد میں وہ ہمارے لیے نمونہ ثابت ہوں لیکن اس بات کی طرف توجہ اور اس کا احساس زیادہ ضروری ہے کہ ہم ایسے مسلمان ہیں کہ اسلام کے بارے میں ہماری سوچ غلط ہے۔ جو لوگ دنیا پر یا آدھی دنیا پر حکومت کر رہے ہیں ان کی سیاسیات کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام نہ مرے اور نہ زندہ رہے۔ اسی کی حالت بین بین رہے ___ نیم مردہ و نیم زندہ ___ آج دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک مشرقی بلاک اور ایک مغربی بلاک۔ ان دونوں میں صرف دو مسئلوں پر اتفاق رائے ہے ___ ایک جرمنی کا مسئلہ اور دوسرے اسلام کا مسئلہ ___

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت ۳۹

بظاہر جرمنی کے مسئلہ پر دونوں بلاک آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں لیکن اندرونی طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قوم دوبارہ زندہ نہ ہونے پائے اور اس کو آزاد نہ چھوڑا جائے۔ بالکل یہی صورت اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ ہے کہ مشرقی بلاک تو یہ چاہتا ہے کہ اسلام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور مغربی بلاک کی سوچ یہ ہے کہ اسلام کو نیم زندہ اور نیم مردہ حالت میں باقی رہنے دیا جائے۔ یعنی موجودہ صورتِ حال کو قائم رکھا جائے۔ نہ اسلام کو ختم کیا جائے اور نہ ہی اسے صحیح طریقے سے زندہ ہونے دیا جائے۔

یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کہ حشریات یا کیڑے مکوڑوں کی نفسیات سے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک کیڑا جو بھڑ سے چھوٹا اور مکھی سے بڑا ہوتا ہے اس کی فطرت ایسی عجیب ہے کہ مادہ پرست حیران ہیں کہ اس کی توجیہ کیسے کی جائے۔ کہتے ہیں کہ جب اس جانور کے انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو یہ ایک کیڑا تلاش کرتا ہے جس کی پیٹھ پر ایک بہت ہی نازک پٹھا ہوتا ہے۔ یہ اس کیڑے کی پشت پر سوار ہو جاتا ہے اور اس پٹھے کو تلاش کرکے ایک خاص مقام پر ڈنک مارتا ہے لیکن اس طرح آہستہ سے ڈنک مارتا ہے کہ وہ کیڑا مرنے نہ پائے بلکہ بے حس ہو کر اپنی جگہ پر پڑا رہے۔ اس کے بعد اس کیڑے کی پشت پر اسی جگہ انڈے دیتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انڈے دینے کے بعد بچے نکلنے سے پہلے ہی خود مر جاتا ہے۔ اس طرح نہ یہ اپنی نسل کو دیکھتا ہے نہ بچے اس کو دیکھتے ہیں۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو وہ اسی کیڑے کے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں یہاں تک کہ کیڑا ختم ہو جاتا ہے اور بچے بڑے ہو کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اب یہ جانور اس کیڑے پر اس قدر ڈنک کیوں نہیں مارتا کہ وہ مر جائے؟

اس لیے کہ اگر وہ مرجائے تو جلد ہی گل سڑ کر ختم ہو جائے گا۔ ڈنک کیوں مارتا ہے؟ اس لیے کہ وہ بے ہوش ہو جائے اور حرکت نہ کر سکے کیونکہ حرکت کرنے کی صورت میں یہ اس پر انڈے نہیں دے سکتا اور بچے اس کے گوشت سے غذا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لیے وہ اس کو نیم مردہ و نیم زندہ حالت میں چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ مرے بھی نہیں اور اس میں اس قدر زندگی بھی باقی نہ رہے کہ وہ حرکت کر سکے۔ اس جانور کی یہ فطرت عجیب ہے کہ وہ خود مرجاتا ہے اور بعد کی نسل پہلی نسل کو نہیں دیکھ سکتی اس کے باوجود جب یہ دوسری نسل بڑی ہو جاتی ہے اور اس کے انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو یہ بھی اسی مہارت سے وہی ٹیکہ لگانے کا عمل انجام دیتی ہے حالانکہ نہ اس نے پہلی نسل کو دیکھا تھا اور نہ یہ عمل اس سے سیکھا تھا۔ یہ صورت ہوتی ہے نیم مردہ و نیم زندہ کی۔

میں آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی استعماری طاقت نے ہماری یہ حالت کر دی ہے۔ یہ بات نہیں۔ یہ حالت تو ہماری پہلے سے ہی تھی البتہ اب وہ لوگ ہمیں اسی حال میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے اس حالت سے چھٹکارا نہ پا سکنے کی وجہ وہ ضرور ہیں، مگر وہ خیالات جنہوں نے ہمیں اس حالت کو پہنچایا بعض اسباب کی بنا پر بتدریج استعمار و استثمار کے آنے سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔

لینن نے کہا تھا کہ مذہب سوسائٹی کے لیے افیون ہے۔ ایک عرب نے ایک دوسرے مادہ پرست فلسفی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مذہب کمزوروں کا زبردستوں کے خلاف انقلاب ہے۔ یہ عرب مصنف پوچھتا ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی بات صحیح ہے۔ مذہب افیون اور بے حسی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے یا انقلاب اور تحریک ہے۔ عرب مصنف کہتا ہے کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ مذہب زندگی

ہے، حرکت ہے، بیداری ہے۔ مگر کونسا مذہب؟ وہ مذہب جو پیغمبر لائے ہیں۔ ساتھ ہی مذہب معاشرے کے لیے افیون بھی ہے مگر کون سا مذہب؟ وہ معجون مرکب جو ہم نے خود تیار کی ہے۔

اب میں ایک حدیث سنا کر اپنی معروضات ختم کرتا ہوں۔ ایک مشہور حدیث ہے:

اِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فَعَلَى الْعَالِمِ اَنْ يُّظْهِرَ عِلْمَهٗ وَاِلَّا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ۔

اگر لوگوں میں بدعات پھیل جائیں تو عالم کا فرض ہے کہ اپنے علم کا اظہار کرے ورنہ وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہوگا۔

بدعت وہ کام ہے جو مذہب کے نام پر کیا جائے۔ لوگ اسے دین کا جزو سمجھیں حالانکہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس حدیث شریف کے مطابق احیائے دین درجہ اول میں علماء کی ذمہ داری ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ بگاڑ اور بدعات کا مقابلہ کریں۔

مجھے امید ہے کہ اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکیں گے کہ ہمیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے ایک اسلامی انقلاب، اسلامی انداز فکر کا احیاء اور اسلامی بیداری — مجھے امید ہے کہ میں کسی مناسب موقع پر اسلامی اندازِ فکر کی خصوصیات، اس کے پیدا کرنے کا طریقہ اور اس کا پروگرام بیان کرسکوں گا۔

آج کی بحث محض احیائے تفکر اسلامی کا مقدمہ اور تمہید تھی۔

فریضۂ علم

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ.

آج ہمارا موضوعِ سخن "فریضۂ علم" ہے۔ شاید آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ عنوان رسولِ اکرمؐ کی اس مشہور حدیث سے ماخوذ ہے جو آپ نے ضرور سنی ہوگی اور کم از کم بعض اسکولوں کے کتبوں پر لکھی دیکھی ہوگی۔ وہ حدیث جو ہم سب کو یاد ہے، یہ ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ.

تحصیلِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔

یہ ان احادیث میں سے ہے جو شیعہ اور سنی دونوں نے اپنے اپنے اسناد سے رسولِ اکرمؐ سے روایت کی ہیں۔ اگرچہ حدیثیں ایسی ہیں جو فریقین میں متفق علیہ ہیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

فریضہ کے معنی ہیں واجب اور اس کا مادہ "فرض" ہے جس کے معنی قطعیت اور وجوب کے ہیں جس کو ہم اب واجب اور مستحب کہتے ہیں۔ اس کو صدرِ اوّل یعنی اسلام کے ابتدائی دور میں مفروض اور مسنون سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

البتہ مستحب کا لفظ جس معنی میں آجکل استعمال ہوتا ہے' بادی النظر میں یہ فقہاء کی جدید اصطلاح ہے۔ علاوہ اس کے کہ قرآن میں یہ لفظ خاص اس معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کسی حدیث میں بھی یہ لفظ نہیں آیا' بلکہ قدیم فقہاء کی بھی یہ اصطلاح نہیں تھی۔ اس لفظ نے بعد میں رواج پایا ہے' جسے ہم آجکل مستحب کہتے ہیں' اسے قدماء مسنون یا مندوب کہتے تھے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے اسلامی فرائض وواجبات کی طرح ایک اسلامی فرض طلب علم اور تحصیل علم ہے۔ تحصیلِ علم ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس میں کسی طبقہ یا گروہ کی کوئی تخصیص نہیں۔

تاریخ میں ہے کہ ظہور اسلام سے قبل اس زمانے کے بعض متمدن معاشروں میں حصولِ علم بعض طبقوں کا امتیازی حق سمجھا جاتا تھا اور معاشرے کے باقی طبقوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔ اسلام میں علم کسی کا امتیازی حق نہیں' دوسرے فرائض وواجبات کی طرح تحصیلِ علم بھی ہر شخص پر فرض ہے۔

جس طرح نماز فرض ہے' روزہ فرض ہے' زکات فرض ہے' حج فرض ہے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے اسی طرح اس حدیث کے مطابق حصولِ علم بھی فرض ہے۔

مجموعی طور پر اس حدیث کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ صدرِ اسلام سے آج تک سب فرقوں اور سب عالموں کے نزدیک یہ متفق علیہ

رہی ہے اور حدیث کی کتابوں میں ہمیشہ سے ایک مخصوص باب کا عنوان 'باب وجوب طلب العلم' یا اسی طرح کا کوئی اور عنوان رہا ہے۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ اس حدیث کی تشریح و توضیح میں ہے کہ مثلاً علم سے کیا مراد ہے اور اس کی کتنی مقدار کا حصول واجب ہے۔

مسلمان قوموں کی موجودہ حالت

میں اس وقت فریضۂ علم کے عنوان کے تحت اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کہ اسلام نے تحصیلِ علم کی کس قدر ترغیب دی ہے۔ نہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ ائمہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں اور نہ اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ سے چیدہ چیدہ واقعات سنانا چاہتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں دادِ سخن دینا نہیں چاہتا' نہ اسلام کے حق میں کوئی پرچار کرنا چاہتا ہوں' نہ واہ واہ چاہتا ہوں کہ دیکھو اسلام نے کس طرح علم کی طرفداری کی ہے اور کیسے نوعِ انسانی کو علم حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔

کیونکہ اس قسم کی باتیں بہت کی جا چکی ہیں اور کی جا رہی ہیں لیکن میرے نزدیک ان باتوں سے چنداں فائدہ مرتب نہیں ہوا۔ باتیں ہم کتنی بھی سنائیں لیکن جب ہم آنکھ کھول کر دیکھتے ہیں تو یہی نظر آتا ہے کہ عصرِ حاضر میں مسلمان قومیں دنیا کی جاہل ترین قومیں ہیں اور بے علمی دنیا میں کہیں اس قدر موجود نہیں جتنی مسلمان ممالک میں ہے۔ یہ دیکھ کر ہماری سب باتوں کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور کم از کم ایک الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے کہ اسلام نے علم کی اتنی تاکید کی ہے اور اسے فرض قرار دیا ہے تو پھر مسلمان علم و دانش سے اس قدر دور کیوں ہیں؟

میں تو اس کا قائل ہوں کہ بجائے اس طرح کے بے نتیجہ پروپیگنڈے کے جس سے زیادہ سے زیادہ وقتی طور پر ہمارا دل خوش ہو سکتا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اسلامی معاشرے کے نقائص کی طرف توجہ دیں اور یہ سوچیں کہ اس کی علمی پسماندگی کے اسباب کیا ہیں اور پھر ان کا کوئی حل نکالیں۔

سید موسیٰ صدر جنہوں نے اس مجمع میں تقریر کی ہے اور علامہ شرف الدین عاملی (لبنان کے مشہور شیعہ رہنما) کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے' فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ مرحوم شرف الدین نے نہایت بلند پایہ اور قیمتی کتابیں تشیع اور اہل بیت کا تعارف کرانے کے لیے لکھیں' مگر جب انہوں نے لبنان میں شیعوں کی حالت دیکھی تو یہی پایا کہ لبنان کے شیعہ غریب ترین' جاہل ترین اور پسماندہ ترین ہیں اور ان میں نہ کوئی پروفیسر ہے' نہ ڈاکٹر اور نہ انجینئر۔ اس کی بجائے جتنے حمال' حمامی' ماشیے اور جاروب کش تھے سب شیعہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ اس حالت میں میری کتابیں کیا اثر پیدا کر سکتی ہیں۔ لوگ یہی کہیں گے کہ اگر شیعہ مذہب اچھا اور نجات دہندہ ہوتا تو شیعوں کی حالت بہتر ہونی چاہیے تھی۔ یہ سوچ کر مرحوم نے عملی کام کرنے کی ٹھانی اور مدرسوں' تربیت گاہوں اور فلاحی انجمنوں کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ آخر کار ایسا وقت آیا کہ شیعہ بیدار ہو گئے اور ایک مبارک تحریک وجود میں آ گئی جس سے لبنان میں شیعوں کی کایا پلٹ گئی۔

مجموعی طور پر دنیا کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں آج مسلمانوں کی وہی حالت ہے جو لبنان کے شیعوں کی لبنان کے دوسرے باشندوں کے مقابلہ میں اس وقت تھی جب علامہ شرف الدین نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ ہم چاہے کتنی بھی بحث کریں کہ اسلام علم کا طرفدار ہے' علم حاصل کرنے

کی ترغیب دیتا ہے مسلمان اقوام کی زبوں حالی کے پیش نظر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ الجھن پیدا ہو جائے گی کہ اگر یہ سب سچ ہے تو مسلمان کیوں اس بدبختی کا شکار ہیں؟

میں یہاں ایک حکایت نقل کرتا ہوں اور یہ حکایت سنانے سے پہلے رسولِ اکرمؐ کی چار احادیث بیان کرتا ہوں اور ان کی کچھ وضاحت کرتا ہوں۔ ان احادیث کا تعلق بھی اسی حکایت سے ہے۔ بعد میں اصل حکایت بیان کروں گا۔

ایک تو وہی حدیث ہے جو میں نے ابتدا میں سنائی تھی طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ جس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی جستجو اور تحصیل ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس میں کوئی استثنا نہیں۔ عورت مرد کا بھی کوئی فرق نہیں۔ بعض شیعہ روایات میں جو بحار الانوار میں موجود ہیں صراحتاً وَمُسْلِمَةٍ کا اضافہ بھی موجود ہے۔ اس کے متعلق میں بعد میں وضاحت کروں گا۔

اس حدیث کے مطابق طلبِ علم سب پر بلا کسی امتیاز کے فرض ہے۔ اس میں کسی طبقہ یا صنف یا جنس کی کوئی قید نہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ کوئی چیز مثلاً جوانوں پر فرض ہو بوڑھوں پر نہ ہو، حاکم پر فرض ہو رعایا پر نہ ہو یا رعایا پر فرض ہو حاکم پر نہ ہو، مردوں پر فرض ہو عورتوں پر نہ ہو جیسے جہاد اور نماز جمعہ صرف مردوں پر فرض ہے عورتوں پر نہیں ہے، مگر فریضۂ علم ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

دوسری حدیث ہے:

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ۔

یعنی تمام عمر گہوارہ سے قبر تک علم کی طلب جاری رکھو۔

علم کے حصول کا کوئی وقت، کوئی زمانہ اور کوئی موسم مقرر نہیں ہے۔ ہر وقت اور ہر دور میں موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ فردوسی نے اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

بگفت پیغمبر راست گوی
زگہوارہ تا گور دانش بجوی

جس طرح پہلی حدیث میں جنس و طبقہ کی کوئی قید نہیں لگائی گئی تھی اسی طرح دوسری حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حصولِ علم کا کوئی خاص وقت اور کوئی خاص زمانہ بھی نہیں۔ یہ فریضہ وقت و زمان کی قید سے بھی آزاد ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی فرض کسی خاص وقت تک محدود ہو اور دوسرے زمانہ میں ادا نہ کیا جا سکتا ہو مثلاً واجب روزوں کا ایک خاص وقت معین ہے جو رمضان کا مبارک مہینہ ہے۔ دن رات میں نمازوں کے اوقات بھی مقررہ ہیں۔ نمازیں صرف معیّن اوقات ہی میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ حج واجب ہے مگر ہر وقت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا خاص موسم ہے جو ماہ ذی الحجہ ہے لیکن فریضۂ علم کے لیے نہ کوئی خاص وقت ہے نہ کوئی خاص زمانہ اور نہ کسی سن و سال کی تحدید ہے۔ اگر روزے کا موسم ماہِ رمضان، حج کا موقع ماہ ذی الحجہ میں اور نمازِ ظہر کا وقت ظہر سے عصر تک ہے تو تحصیلِ علم کا دور مہد سے لحد تک ہے۔

ایک اور حدیث سنیے۔

تیسری حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا:

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ.

یعنی علم حاصل کرو چاہے اس مقصد کے لیے تمہیں دنیا کے کسی دور ترین مقام مثلاً چین کا سفر کرنا پڑے۔

بادی النظر میں چین کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ ان دنوں چین ہی وہ بعید ترین جگہ تھی جہاں لوگ جا سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں چین ایک علمی اور صنعتی مرکز کے طور پر مشہور ہو۔

یہ حدیث کہتی ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے کوئی جگہ اور کوئی مقام بھی مقرر نہیں جیسے کوئی وقت اور کوئی زمانہ معین نہیں۔

یہ ممکن ہے کہ کسی فرض کی ادائیگی کے لیے کوئی جگہ اور مقام مقرر ہو اور ہر جگہ اسے ادا نہ کیا جا سکتا ہو، جیسے مثلاً مناسکِ حج کی ادائیگی کے لیے جگہ مقرر ہے۔ مراسمِ حج صرف مکہ ہی میں ادا کیے جا سکتے ہیں یعنی صرف اس سرزمین پر جہاں سے آفتابِ توحید و اسلام طلوع ہوا اور جہاں سے اس کی روشنی ساری دنیا میں پھیلی اور جہاں وہ گھر ہے جس کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے تعمیر کیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ مسلمان باہمی اتفاقِ رائے سے مراسمِ حج کے لیے کسی اور جگہ کا انتخاب کر لیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس فرض کی ادائیگی پر کچھ پابندیاں ہیں لیکن فریضۂ علم کی ادائیگی کے لیے کسی جگہ کی پابندی نہیں۔ جہاں بھی ہو سکے وہاں علم حاصل کیا جائے چاہے وہ مکہ ہو یا مدینہ، مصر ہو، شام ہو یا عراق یا اور کوئی بعید ترین مقام ہو، مشرق میں ہو یا مغرب میں۔

ہمارے ہاں بہت سی احادیث ہیں جن میں حصولِ علم کے لیے سفر کرنے اور وطن سے دور جا کر علم حاصل کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے حتیٰ کہ آیتِ کریمہ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ کی تفسیر بھی علم کے لیے وطن سے باہر جانے سے کی گئی ہے۔ ہماری ایک معتبر حدیث میں ہے: لَوْ عَلِمْتُمْ مَا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ لَطَلَبْتُمُوْهُ وَلَوْ بِسَفْكِ الْمُهَجِ وَخَوْضِ اللُّجَجِ یعنی اگر

تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ حصولِ علم کی کیا برکات ہیں تو تم اس کے لیے اپنی جانیں وار دیتے اور سمندر میں کود پڑتے۔

چوتھی حدیث رسول کریمؐ سے بایں الفاظ مروی ہے: اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ یَاْخُذُھَا اَیْنَمَا وَجَدَھَا ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: کَلِمَۃُ الْحِکْمَۃِ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا۔ یعنی حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے جہاں بھی ملے لے لے۔ ظاہر ہے جس کی کوئی چیز کھو جاتی ہے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھتا بلکہ اسے تلاش کرتا ہے اور جہاں بھی ملتی ہے اسے اٹھا لیتا ہے۔ حکمت سے مراد صحیح، سچی اور پکی بات ہے۔ ہر وہ قاعدہ و قانون جو حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے اور زائیدۂ تخیل اور پروردۂ اوہام نہیں حکمت ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَاطْلُبُوْھَا وَلَوْ عِنْدَ الْمُشْرِکِ تَکُوْنُوْا اَحَقَّ بِھَا وَ اَھْلَھَا۔ حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے اگر مشرک کے پاس ملے تب بھی لے لو کیونکہ تم بحیثیت مومن کے علم و حکمت کے زیادہ مستحق ہو۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَخُذِ الْحِکْمَۃَ وَلَوْ مِنْ اَھْلِ النِّفَاقِ

اسی طرح کی بہت سی روایات ہیں۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ حصولِ علم کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ علم درست صحیح اور واقع کے مطابق ہو۔ اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کس سے اور کہاں سے حاصل کیا جائے۔

یہ ضرور ہے کہ ایسا بھی وقت آتا ہے کہ آدمی کو کسی مضمون کی صحت میں تردد ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر ان لوگوں کو جو صحیح و غلط میں امتیاز نہیں کر سکتے

انہیں ہر کس و ناکس کی بات نہیں سننی چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کسی ایسے ویسے سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اگر انہوں نے اس پر غور نہ کیا تو بسا اوقات گمراہی کا احتمال ہے لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ بات صحیح ہے۔ مثلاً کوئی طب یا طبیعیات سے متعلق دریافت یا اور کوئی ایسی ہی بات جس کی صحت کا یقین ہو تو حضرت علیؑ کے فرمانے کے مطابق اس کو ضرور سیکھنا چاہیے۔ ہماری احادیث کی کتابوں میں حضرت عیسیٰؑ بن مریم کا یہ قول منقول ہے۔ خُذُوا الْحَقَّ مِنْ اَهْلِ الْبَاطِلِ وَلَا تَأْخُذُوا الْبَاطِلَ مِنْ اَهْلِ الْحَقِّ كُونُوا نُقَّادَ الْكَلَامِ۔ اہلِ باطل بھی اگر حق بات کہیں تو اسے قبول کرو لیکن اہل حق کوئی باطل بات کہیں تو اسے مت مانو۔ خود بات کو پرکھو۔ بہرحال ان احادیث سے یہ ظاہر ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں کہ کوئی مسلمان کس سے علم حاصل کرے۔ بعض صورتوں میں یہ ممکن ہے کہ کسی فرض کی ادائیگی پر اس لحاظ سے بھی پابندی ہو مثلاً نماز باجماعت میں اقتداء کے لیے شرط ہے کہ امام مسلمان ہو، مومن ہو، عادل ہو، مگر تعلیم و تعلّم میں اس قسم کی کوئی قید نہیں۔

یہ وہ چار احادیث تھیں جو میں عرض کرنا چاہتا تھا۔ اب میں وہ حکایت بیان کرتا ہوں جس کے عرض کرنے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ اسی حکایت سے میں نے یہ چار احادیث انتخاب کی تھیں۔

ہمارے فاضل دوست جناب سید محمد فرزان بیان کرتے تھے کہ تحریک مشروطیت کے اوائل میں آقا سید ہبۃ الدین شہرستانی سلمہ اللہ عراق سے عربی میں "العلم" کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے۔ یہ رسالہ دو تین سال تک نکلتا رہا اگرچہ میں نے خود اس کا کوئی شمارہ نہیں دیکھا۔ اس رسالہ کی پشت پر بیچ صفحہ میں لفظ "العلم" خطِ نستعلیق میں بلاک کے ذریعہ چھپتا تھا اور اس کے اردگرد

چاروں گوشوں کو ان ہی چار احادیث سے جو میں نے ابھی سنائیں مزین کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ خود اسی رسالہ نے لکھا تھا کہ ایک دن ایک جرمن مستشرق اس رسالہ کے دفتر میں یا کسی اور جگہ شہرستانی صاحب سے ملاقات کے لیے آیا۔ سید محمد فرزان صاحب نے جگہ کا نام لیا تھا مگر اب بہت دن کی بات ہوگئی۔ اس نے رسالہ کی پشت پر بھی سب کچھ لکھا ہوا دیکھا۔ اس نے پوچھا یہ رسالہ کی پشت پر کیا لکھا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ چار احکام ہیں جو علم کے بارے میں ہمارے پیغمبر نے دیے ہیں۔ پھر ان احادیث کا ترجمہ اس کو سنایا گیا کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ علم کا حصول ہر مسلمان پر خواہ وہ مرد ہو یا عورت فرض ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے مہد سے لحد تک علم حاصل کرو۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرو چاہے اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ علم و حکمت مسلمان کی گمشدہ متاع ہے جہاں ملے لے لے اور اس بات کو کوئی اہمیت نہ دے کہ کس سے لے رہا ہے۔

اس مستشرق نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگا:

> ارے! آپ کے پاس تو ایسی قیمتی ہدایات موجود ہیں کہ آپ کے پیغمبر نے آپ پر علم فرض قرار دیا۔ اس میں نہ تو جنس کا امتیاز ہے نہ زمان و مکان کا۔ نہ معلم کے لحاظ سے کوئی پابندی ہے پھر بھی آپ لوگوں میں اس قدر جہالت ہے اور اتنے غیر تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں!!

واقعی یہ ایک معما ہے کہ یہ فرض جو سب کے لیے تھا کیسے متروک ہوگیا اور اس فرض کو فرض کیوں نہیں سمجھا گیا؟ ان احکام پر عمل کیوں نہیں ہوا؟ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ان احکام پر کبھی عمل نہیں ہوا کیونکہ اسلام نے دنیا میں ایک

نادر الوجود علمی اور ثقافتی تحریک پیدا کی تھی اور اسلام صدیوں علم، ثقافت اور تہذیب و تمدن کا علمبردار رہا۔ یہ تحریک علم کے بارے میں اسلامی احکام ہی کا ثمرہ تھی۔ دین اسلام وہ دین ہے جس کی پہلی ہی آیت میں جو اس کے پیغمبر پر نازل ہوئی لکھنے پڑھنے، علم، قلم اور تعلیم کا ذکر ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ
مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ
بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ.

وہ دین جس کا پہلا اصول توحید ہے، جو اس اصول کی بنا پر تقلید و تعبد کی کسی طرح اجازت نہیں دیتا تحقیق اور جستجو کو لازمی قرار دیتا ہے کیسے ممکن ہے کہ ایسا دین تہذیب و ثقافت اور علمی بیداری پیدا نہ کرے؟ لیکن جب آدمی ایک طرف تو یہ احکام دیکھتا ہے اور دوسری طرف ساتھ ہی یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان احکام پر خصوصاً آخری چند صدیوں میں عمل نہیں ہوا جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس کی وجہ کیا ہوئی؟

اسلام کے حکم پر عملدرآمد نہ ہونے کے اسباب

اس کی ایک وجہ تو یقینی طور پر وہ واقعات تھے جو اسلامی معاشرے میں پہلے تو نظام خلافت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے اور بعد میں ان کا سلسلہ جاری رہا۔ مسلمانوں کی زندگی میں عدم مساوات اور اونچ نیچ کا دخل ہو گیا اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جس میں طبقاتی امتیاز تھا جو اسلامی تعلیمات کے قطعاً خلاف ہے۔ معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا ایک طبقہ تو ان بدقسمت غریبوں پر مشتمل تھا جن کو روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی اور دوسرا طبقہ مسرف

فضول خرچ اور مغرور امیروں کا تھا جن کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا تھا کہ جو دولت ان کے قبضہ میں ہے اس کا کیا کریں۔ جب عام زندگی میں ایسا رخنہ پیدا ہو جائے تو نہ ایسے احکام کی طرف توجہ باقی رہتی ہے، نہ ان پر عمل درآمد کے لیے حالات سازگار رہتے ہیں بلکہ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس قسم کے احکام پر عمل ہی نہ ہو سکے۔

کچھ لوگ اس کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ علم کے بارے میں اسلامی احکام پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بجائے علم کے ایک دوسری بات کو فوقیت دے دی گئی اور علم کی ساکھ باقی نہ رہی جیسے کوئی بنک میں حساب کھولے اور اس کی ساکھ ہو، بعد میں حکومت ساکھ کسی اور حساب کی طرف منتقل کر دے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ علم کے بارے میں اسلامی احکام کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے علم کے بارے میں جو ترغیب دی تھی اور علم حاصل کرنے کی جو فضیلت بیان کی تھی اس کی جگہ علماء کے احترام، ان کی دست بوسی کی ترغیب اور علماء کے فضائل کے بیان نے لے لی۔ لوگ بجائے اس کے کہ خود تعلیم حاصل کرتے اور حتی المقدور اپنی اولاد کو پڑھاتے لکھاتے اور عالم بناتے، ان کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی کہ علماء کا احترام اور ان کی اطاعت کرکے ثواب کمائیں۔ نتیجہ وہی نکلا جو سب کے سامنے ہے۔

یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ اگرچہ بلند پایہ علماء و محققین ایسی بے راہ روی کے مرتکب نہیں ہوئے لیکن جو علمی اور سادہ تحریریں عوام تک پہنچیں اور جو معمولی درجے کے وعظ انھوں نے سنے ان کا طرز فکر یہی تھا۔ عوام کو عموماً ایسی ہی تحریروں اور ایسے ہی مواعظ سے سابقہ پڑتا تھا۔

محققین نے اس موضوع پر اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا تھا اس سے انہیں واقفیت نہیں تھی۔ اگرچہ علماء اس بے راہ روی کے مرتکب نہیں ہوئے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے تاہم خود بعض علماء کی تحریروں اور تقریروں میں ایک اور طرح کا جمود اور انحراف کم و بیش دیکھنے میں آتا ہے جس نے علم کے بارے میں اسلامی احکام کی دھار ضرور کند کر دی ہے۔ وہ انحراف یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کے علماء نے اس پر زور دیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے جس علم کو فریضہ قرار دیا ہے وہ فقط وہی علم ہے جو ہمارے پاس ہے۔

کون سا علم؟

حال ہی میں مجھے مرحوم فیض کاشانی کی کتاب "محجۃ البیضاء" دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں انہوں نے اس موضوع پر جامعیت سے بحث کی ہے۔ بظاہر انہوں نے یہ بات غزالی سے نقل کی ہے۔ غزالی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی تفسیر میں علمائے اسلام تقریباً بیس گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ہر گروہ کا تعلق کسی خاص علم و فن سے ہے اور ہر گروہ کا دعویٰ ہے کہ اس حدیث سے مراد ہمارا ہی علم و فن ہے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ حدیث طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ میں علم سے رسول اکرمؐ کی مراد علم کلام ہے کیونکہ علم کلام ہی اصول دین کا علم ہے۔ علمائے اخلاق کہتے ہیں کہ دراصل علم سے مراد علم اخلاق ہے کیونکہ اسی علم کے ذریعے سے آدمی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیا باتیں اس کے لیے باعث نجات ہیں اور کیا باتیں موجب ہلاکت۔ اسی طرح فقہاء کہتے ہیں کہ علم سے مقصود احکام دین کا علم ہے کیونکہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ یا تو وہ خود مجتہد ہو یا کسی مجتہد کی تقلید کرے۔ مفسرین

کہتے ہیں کہ علمِ تفسیر مقصود ہے کیونکہ تفسیر درحقیقت کتاب اللہ کا علم ہے۔ محدثین کہتے ہیں کہ علمِ حدیث و روایت مراد ہے کیونکہ ہر چیز حتیٰ کہ قرآن کو بھی احادیث ہی کے ذریعے سے سمجھنا ضروری ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ علم سے مراد سیر و سلوک اور مقاماتِ نفس کا علم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر گروہ کا دعویٰ یہی ہے کہ اسی کا علم مراد ہے۔ اس کے بعد انہوں نے خود اپنی توضیح بیان کی ہے جو پورے طور پر تو جامع نہیں لیکن نسبتاً جامع ضرور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا مقصود کوئی مخصوص علم نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ضرور اس کی تصریح فرما دیتے اور واضح طور پر مثلاً علمِ کلام یا علمِ اخلاق یا تفسیر یا فقہ یا حدیث کا نام لیتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ اور کونسی چیزیں واجب عینی یا واجب کفائی ہیں۔ ان واجبات کی بجا آوری کے لیے جس علم کا حصول بھی ضروری ہو، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خود اس علم کی تحصیل واجب و لازم ہے۔

فریضۂ تہیئوئی

فقہاء کی اصطلاح میں علم حاصل کرنا واجب نفسی تہیئوئی ہے۔ یعنی یہ ایسا واجب نہیں ہے جو بالاستقلال واجب نہ ہو بلکہ صرف اس لیے واجب ہو کہ دوسرے اصل واجبات کی بجا آوری اس پر موقوف ہے۔ علم خود بھی ایک جداگانہ واجب ہے۔ ساتھ ہی اس لیے بھی واجب ہے کیونکہ یہ آدمی کو باقی فرائض اور واجبات کی بجا آوری کے لیے تیار کرتا ہے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ فقہاء نے علم کے وجوب کو بعض شرعی احکام سے واقفیت تک محدود سمجھ لیا ہے۔ غالباً یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اسلامی فرائض کی بجا آوری

صرف اس پر موقوف ہے کہ مسلمان یہ معلوم کرلیں اور سمجھ لیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ خود بخود اپنے فرائض کی بجا آوری کے قابل ہو جائیں گے۔ اسی بنا پر جس علم کو فریضہ کہا گیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان دینی احکام سے واقفیت کے لیے یا تو مجتہد ہو یا مقلد۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح دینی تعلیم ضروری ہے اسی طرح مذہب نے اور بھی بہت سے کاموں کو فرض اور واجب قرار دیا ہے۔ ان کاموں کی تعلیم حاصل کرنا اور ان میں مہارت پیدا کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے مثلاً علاج معالجہ واجب کفائی ہے مگر اس فرض کی بجا آوری طبی علوم کی باقاعدہ تحصیل کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا ان علوم کا حصول اور ان کی تعلیم بھی بجائے خود واجب ہے۔ یہی حال اور بہت سی چیزوں کا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے کام ہیں جن کی انجام دہی اسلامی معاشرہ کے لیے ضروری ہے اور وہ کام تعلیم و تعلم کے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے۔ ان سب کاموں کا علم حاصل کرنا واجب ہے۔

فریضۂ علم ہر لحاظ سے معاشرہ کی مجموعی ضرورت کے تابع ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کھیتی باڑی اور دست کاری کی ضرورت تھی لیکن تجارت اور سیاست کا علم حاصل کرنا ضروری نہیں تھا۔ لوگ تھوڑے دن کسی لوہار یا بڑھئی کی شاگردی کرکے اور کچھ دن کسی سیاست داں، صنّاع یا تاجر کے ماتحت کام کرکے سیاستداں، صنّاع اور تاجر بن جاتے تھے لیکن آج دنیا کی حالت بدل گئی ہے۔ اب کوئی کام بھی تعلیم حاصل کیے بغیر مناسب طور پر اور اس طرح کہ اس سے موجودہ زندگی کی ضروریات پوری ہو سکیں، نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ زراعت کے لیے بھی ضروری ہے کہ علمی و فنی اصولوں کی بنیاد پر ہو۔ ایک سوداگر اگر معاشیات سے واقف نہیں تو وہ اونچے درجہ کا تاجر نہیں بن سکتا۔ کوئی سیاستداں اگر تعلیم یافتہ نہ ہو تو وہ

ایک اچھا سیاستداں نہیں بن سکتا۔ آجکل ایسے بہت سے پیشے ہیں جن کے لیے تعلیم اور اپنے فن میں مہارت ضروری ہے۔ وہ کام جو پرانے زمانے میں تھوڑی سی مشق یا کسی استاد کی چند روزہ شاگردی سے آجاتے تھے اب اس قدر بدل گئے ہیں کہ پیشہ ورانہ اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ لیے بغیر ان کا سیکھنا بھی ممکن نہیں۔ اکثر کاموں کے لیے ٹیکنیشین اور فنی ماہرین درکار ہیں۔

اسلامی معاشرہ کی آزادی اور عزت کا اصول

ہمیں چند اصول ذہن نشین کر لینے ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کس قسم کا معاشرہ چاہتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جس کی دنیا میں عزت ہو، جو آزادی و استقلال سے بہرہ ور ہو اور جس کو خود اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ اسلام ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان کسی غیر مسلم قوم کے دست نگر یا محکوم ہوں لَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ اللہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کافروں کا مسلمانوں پر تسلط ہو۔ اسلام نہیں چاہتا کہ مسلمان ہمیشہ کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے دوسری قوموں سے قرض یا امداد کی بھیک مانگتے پھریں۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اسلامی معاشرے کو معاشی اور معاشرتی آزادی حاصل نہ ہو۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے پاس کافی معالج اور دوسرے وسائل نہ ہوں اور جب بیمار کی حالت نازک ہو جائے تو وہ اسے علاج کے لیے غیر مسلموں کے پاس بیرون ملک لے جائیں۔ یہ تو ہوا ایک اصول۔

عزت اور استقلال کی بنیاد علم ہے

دوسرا اصول یہ ہے کہ اب دنیا اس قدر بدل گئی ہے کہ سب کام علم ہی سے چلتے ہیں۔ علم کے بغیر زندگی کی مشین نہیں چل سکتی۔ انسانی زندگی کے تمام معاملات علم سے اس طرح وابستہ ہو گئے ہیں کہ کوئی کام اور زندگی کا کوئی معاملہ علم کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

فریضۂ علم سارے فرائض کی کنجی ہے

ایک اور اصول یہ ہے کہ اسلام کے سارے فرائض و واجبات کی ادائیگی کا تعلق فریضۂ علم سے ہے۔ باقی سب فرائض و مقاصد کی بجا آوری کے لیے فریضۂ علم کو ایک ذریعہ اور کنجی قرار دیا گیا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں حصول علم واجب تمہیدی ہے۔ لہٰذا اگر مسلمانوں کے معاملاتِ زندگی کوئی ایسی شکل اختیار کر لیں جس کا پہلے کی نسبت علم سے زیادہ تعلق ہو تو علم کی ضرورت، اہمیت اور وسعت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

نتیجہ

ان اصولوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب مسلمانوں کا یہ شرعی اور عمومی فرض ہے کہ وہ علم کے حصول کی طرف توجہ دیں اور عام تعلیم حاصل کرنے کو ہر شخص پر واجب سمجھیں۔

فریضۂ علم کے مسئلہ کا فقہاء عموماً دو جگہ تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک تو اصول فقہ میں اس جگہ جہاں اصل براءت کی بحث میں دلیل کی تلاش کے وجوب

کا ہی یاد کرنا کیوں نہ ہو۔

بنیادی طور پر تو یہ تقسیم ہی درست نہیں جس کے ذریعے سے ہم نے علوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک دینی دوسرے غیر دینی اور جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو یہ وہم پیدا ہو گیا ہے کہ جو علوم اصطلاحاً غیر دینی کہلاتے ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی جامعیت اور خاتمیت کا تقاضا ہے کہ جو علم بھی مفید ہو اور اسلامی معاشرے کے لیے لازمی اور ضروری ہو اسے دینی علم کہا جائے۔

عورتوں کی تعلیم

چونکہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ اور مُسْلِم کا لفظ مذکر کا صیغہ ہے اس لیے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید تعلیم مردوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

سب سے پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ بعض روایات میں جو شیعہ کتب میں بھی موجود ہیں مُسْلِمٍ کے بعد وَ مُسْلِمَةٍ بھی مذکور ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کی عبارت سے اختصاص کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا مسلم کے معنی ہیں مسلمان قطع نظر اس سے کہ وہ مرد ہو یا عورت جہاں کہیں بھی اس قسم کے الفاظ آئے ہیں عام حکم ہے۔ مثلاً ایک حدیث ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَیَدِهٖ

یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ مرد کو تو ایسا ہونا چاہیے اور عورت کو نہیں

یا ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے: اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' یعنی ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ بھائی کا سا برتاؤ کرنا چاہیے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم مردوں سے مخصوص ہے کیونکہ یہ تو نہیں فرمایا کہ اَلْمُسْلِمَۃُ اُخْتُ الْمُسْلِمَۃِ

مُسْلِم کے لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں ایک مسلمان ہونے کا' دوسرے مرد ہونے کا ۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر جنس کا کوئی سوال نہیں ہوتا صرف اسلام کا سوال ہوتا ہے لیکن اگر مُسْلِم کے لفظ کے بجائے رَجُل (مرد) کا لفظ بھی ہوتا جب بھی فقہا کی اصطلاح میں خصوصیت کا الغاء ہو جاتا۔ فقہی مسائل کے بارے میں بعض احادیث میں یہ لفظ ہے مثلاً امام سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی مرد ایسا کرے' تو کیا ہو؟ امام نے اس مسئلہ کا جواب دیا۔ فقہاء کہتے ہیں کہ ہر چند حدیث کے متن میں مرد کا لفظ آیا ہے لیکن حکم عام ہے کیونکہ ایسی صورتوں میں جنسی خصوصیت کا الغاء ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس موقع پر جنس کا کوئی سوال نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ فقہاء ایک اور اصول بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض قواعد کلیہ قابل تخصیص نہیں ہوتے۔ ان کا لب ولہجہ ہی بتلاتا ہے کہ تخصیص کی کوئی گنجائش نہیں۔ خود معاملہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں عقلی لحاظ سے بھی امتیاز روا نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً قرآن مجید میں علم اور تقویٰ کے بارے میں ایک ہی قسم کا مضمون ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ.

"کیا وہ جن کو علم ہے اور جن کو علم نہیں ہے' برابر ہیں؟ صرف

اہل عقل ہی اس بات کو سمجھتے ہیں۔"

تقویٰ کے متعلق ارشاد ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ.

"کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان لوگوں کے برابر کر دیں جو دنیا میں فساد پھیلاتے ہیں؟ کیا ہم متقیوں اور فاجروں کو برابر کر دیں؟"

اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (سورۂ حجرات۔ آیت ۱۳)

ان تمام موقعوں پر مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ وَالْمُتَّقِيَاتِ نہیں کہا گیا۔ اسی طرح اِنَّ اَكْرَمَكُنَّ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُنَّ بھی نہیں فرمایا گیا۔ اب کیا اس بنا پر کہ مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں تقویٰ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف مردوں سے مخصوص ہے۔ عورتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اسلام علم کو روشنی قرار دیتا ہے اور جہل کو تاریکی۔ علم کو بینائی کہتا ہے اور جہل کو اندھاپن۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ـــــــ ساتھ ہی اس علم کے بارے میں جو نور بینائی ہے رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ صرف مردوں کا فرض ہے کہ وہ تاریکی سے نکل کر روشن فضا میں داخل ہوں اور عورتیں بدستور اندھیرے میں ہی بھٹکتی رہیں اور صرف مرد بینائی حاصل کریں اور عورتیں اندھے پن پر ہی

تلاوت کریں؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ

اس بات کو صرف اہل عقل ہی سمجھتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ یہ بات بالکل واضح ہے اور جس کو ذرا بھی عقل ہے وہ اس کو آسانی سمجھ سکتا ہے۔ ایک اور آیت میں رسول اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

یعنی آنحضرتؐ اس لیے آئے ہیں کہ قرآن کی آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ ان کی روح کو پاک کریں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیں۔ (سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

اس آیت میں تقویٰ اور تعلیم کا تذکرہ ایک ساتھ کیا گیا ہے اور سب جگہ مذکر ہی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اگر يُزَكِّيهِمْ کو مردوں سے مخصوص مان لیا جائے تو يُعَلِّمُهُمْ کو بھی مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے۔

غلطی کس کی ہے؟

کچھ لوگ اس موقع پر فوراً کہہ اٹھیں گے کہ جناب آپ یہ چاہتے ہیں کہ لڑکیاں بھی ان ہی مدرسوں میں تعلیم پائیں اور یہی تعلیم حاصل کریں۔

ایسے لوگوں سے کہنا چاہیے کہ اگر مدرسوں میں اور تعلیم میں کچھ خرابی ہے تو یہ بھی تو لوگوں ہی کا قصور ہے۔ اسلام نے تو علم کو فریضہ قرار دیا ہے اور ان طریقوں پر بھی زور دیا ہے جن سے معاملات کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ہم گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور اس وقت کا

انتظار کریں جب نظام تعلیم درست ہو اور سو فیصد اچھے اسکول قائم ہوں تاکہ ہم اپنے بچوں کو وہاں بھیج سکیں اور اگر محکمۂ تعلیم اس میں کوتاہی کرے تو منہ بھر کر اس پر تنقید کرتے رہیں۔ یہ خود ہمارا اپنا فرض ہے کہ اچھے مدرسے قائم کریں اور عمدہ اور مناسب تعلیم کا انتظام کریں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے تعلیم کے لیے عمر بھر میں چھوٹے سے چھوٹا اقدام بھی نہیں کیا، نہ کسی تعلیمی ادارے کے قیام میں کوئی حصہ لیا، نہ اس دینی فریضہ کی بجا آوری کے لیے کچھ کیا جسے فریضۂ علم کہا جاتا ہے انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بیٹھ کر تنقید کریں! تعلیم میں خرابی پیدا ہی اس لیے ہوئی ہے کہ ان محترم ناقدین نے اپنا مذہبی فریضہ انجام دینے کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔

البتہ ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے، جس وقت یہ فیصلہ کیا جائے کہ کن طلبا کو کن مضامین میں مہارت حاصل کرنی چاہیے تو اس وقت لڑکیوں کے لیے وہ مضامین تجویز کیے جائیں جو ان کے ذوق اور صلاحیت اور ان کی اور معاشرے کی ضرورت کے مطابق ہوں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ معاشرے کو لیڈی ڈاکٹر، لیڈی سرجن، مڈوائف اور نرس کی ضرورت نہیں۔ کونسا گھرانہ ہے جہاں عورتوں کی مخصوص بیماریوں کی صورت میں بھی ان کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ جب تعلیم نسواں کا ذکر آتا ہے تو کچھ لوگ سخت چراغ پا ہوتے ہیں لیکن جونہی ضرورت پیش آتی ہے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو علاج کے لیے غیر مردوں حتیٰ کہ غیر مسلموں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

جہادِ مقدس

اب وقت آگیا ہے کہ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے نتیجہ اخذ کریں۔ نتیجہ ان سب باتوں کا یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ تعلیم کو عام کیا جائے۔ یہ فرض صرف اربابِ تعلیم پر ہی عائد نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص کے لیے جو مسلمان ہے اور جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ چاہے وہ حکومت کا رکن ہو یا ملت کا ایک فرد — یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں جہاد شروع کرے۔ دین کے حکم پر عمل کرے اور دینی رنگ اختیار کرے۔ علمائے دین کو چاہیے کہ وہ پیش قدمی کا اعزاز حاصل کریں اور مومنین کو چاہیے کہ وہ علم اور مدرسے سے خوف نہ کھائیں۔ یہ سمجھنا کہ تعلیم عام ہونے سے دین ختم ہو جائے گا اسلام سے بدگمانی ہے۔ اسلام تو ایسا مذہب ہے جو علمی ماحول میں پھلتا پھولتا ہے۔ اگر ہمیں یہ احساس ہوتا کہ جہالت کی وجہ سے ہمارے اوپر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے اور اس سے اسلام کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے تو ہم علم کی بجائے جہالت و نادانی اور ناخواندگی سے گھبراتے اور خوف کھاتے۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد

کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ تعلیم سے اپنی وحشت چھپانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ناخواندہ لوگوں سے ملک کو جتنا نقصان پہنچتا ہے تعلیم یافتہ لوگوں سے اس سے سو گنا زیادہ پہنچتا ہے۔ اَن پڑھ تو محض ایک ٹھیا چراتا ہے مگر پڑھے لکھے لاکھوں ہضم کر جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف تعلیم معاشرے کی خوش بختی کی ضامن

نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے دین و ایمان بھی ضروری ہیں۔ اسی طرح اگر ایمان کے ساتھ علم نہ ہو تو وہ بھی مفید ہونے کی بجائے وبال بن جاتا ہے۔

قَطَعَ ظَهْرِي اثْنَانِ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ وَجَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ.

اسلام کو نہ بے دین عالم چاہیے نہ دیندار جاہل۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر چور چراغ ہاتھ میں لے کر آئے گا تو وہ نفیس اور قیمتی مال چھانٹ کر لے جائے گا۔ اس فقرے کو تعلیم یافتہ بے ایمانوں پر منطبق کرنا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جہالت کی نسبت علم سے زیادہ خطرہ ہے ایک طرح کا مغالطہ ہے کیونکہ جو چور چراغ لے کر آتا ہے وہ رات کو آتا ہے دن کو نہیں اور رات کو بھی اس وقت آتا ہے جب گھر والے غافل سو رہے ہوتے ہیں۔ دن کی روشنی میں یا جب گھر کے آدمی جاگ رہے ہوں چور ہاتھ نہیں ڈال سکتا تعلیم یافتہ بے ایمان بھی دوسروں کی جہالت، غفلت اور بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہیں لہٰذا ان کی چوری میں بھی ناخواندگی کا دخل ہے۔ آپ اپنے ملک کو علم کی روشنی سے منور کیجیے اور ہر گھر میں دن کا اجالا پھیلا دیجیے۔ سب لوگوں کو بیدار، ہوشیار اور باخبر کر دیجیے۔ اس کے ساتھ ہی ایمان کی بنیاد مضبوط کرنے کی کوشش کیجیے۔ پھر کوئی چور چوری نہیں کر سکے گا۔ اس قسم کی چوریوں میں بیک وقت کئی چیزوں کا دخل ہے چور کا علم، اس کی بے ایمانی اور عوام کی جہالت۔ لہٰذا یہاں جہالت بھی شریک جرم ہے۔

بہر حال اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا دین صحیح ہو، غربت ختم ہو، بیماریوں سے نجات ملے، انصاف کا بول بالا ہو، آزادی اور جمہوریت نصیب ہو اور معاشرہ بیدار اور ہوشیار ہو تو اس کا واحد ذریعہ تعلیم اور صرف تعلیم ہے۔ تعلیم بھی وہ جو عام ہو اور دین کے ذریعے مقدس جہاد کی صورت میں حاصل ہو۔

اگر ہم یہ مقدس جہاد شروع نہیں کریں گے تو دنیا شروع کرے گی اور اس کا فائدہ بھی وہی اٹھائے گی۔ یعنی جہالت کے چنگل سے ہمیں نجات دلانے کے لیے دوسرے آئیں گے اور پھر خدا ہی جانتا ہے کہ ہماری اس کوتاہی سے اسلام کو کیسی زک پہنچے گی۔

جہالت کے خلاف جدوجہد

ان ہی دنوں میں نے ایک کتاب پڑھی ہے جس کا نام ہے "جہالت کے خلاف جدوجہد" یہ کتاب یونیسکو نے شائع کی ہے۔ یونیسکو ایک ثقافتی ادارہ ہے جو اقوام متحدہ کی تنظیم سے وابستہ ہے۔ اس کتاب میں ان سرگرمیوں کا تذکرہ ہے جو یہ ادارہ پسماندہ ملکوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے کر رہا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ خوش آئند بات ہے کہ آخر کار مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں اور توقع ہے کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ناخواندگی دور ہو جائے گی لیکن ایک دوسرے لحاظ سے یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہم مسلمان اپنے فرائض سے اس قدر غافل ہیں کہ اس فرض کو پورا کرنے کے لیے بھی دوسرے لوگ سمندر پار سے آئیں، زحمت اٹھائیں اور روپیہ خرچ کریں اور نہ صرف ہماری تعلیم کا انتظام کریں بلکہ ہر لحاظ سے ہماری مدد بھی کریں۔ صحت کے ادارے قائم کریں، بیماریوں کے خلاف جدوجہد کریں اور شہروں اور آبادیوں کو بہتر بنائیں۔

پاکستان اور افغانستان جیسے ممالک کے بعض ایسے دور افتادہ مقامات پر یونیسکو نے سماجی خدمات انجام دی ہیں اور تعلیم و صحت سے متعلق فلاحی کام کیے ہیں جہاں ہم میں سے کبھی کوئی نہیں گیا اور اگر کوئی گیا بھی تھا تو بعض

وجوہات شرعیہ (زکات و خمس وغیرہ) وصول کرنے کے لیے۔

اس کتاب میں جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں ان کے مطابق چند سال پیشتر تک بعض اسلامی ممالک میں ناخواندگی کی شرح ۹۶ فیصد تک تھی۔ یہ شرح تدریجی طور پر کچھ کم ہوئی ہے مگر اب بھی بعض جگہ ۸۰ فیصد ہے۔ غالباً سنہ ۱۹۶۲ء میں ایشیا میں یونیسکو کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کراچی میں ہوئی تھی۔ اس میں ایشیا میں خواندگی عام کرنے کے لیے ایک بیس سالہ منصوبہ پیش کیا گیا جو باقاعدہ اور صحیح اعداد و شمار کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے اور جس میں تمام امکانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یونیسکو نے عوام میں تعلیم کی رغبت اور اس کا شوق بھی پیدا کیا ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی افغانستان میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایسا بڈھا جس کی گھنی داڑھی اس کے سینہ پر پھیلی ہوئی ہے ناخواندگی دور کرنے کی کلاس میں اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کام کس نیت اور کس مقصد کے تحت کیے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پس پشت بھی کچھ سامراجی مقاصد کارفرما ہوں۔ اگر سامراجیت نے ہماری خدمت کے بہانے یہ بھی کوئی کھیل کھیلا ہے تو افسوس ہے ہماری حالت پر ـــــ جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی نیت اور غرض کیا ہے تو واقعی مجھے معلوم نہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ میں بدگمانی کا اظہار کر کے ان کوتاہیوں کی پردہ پوشی کروں جو خود ہماری اپنی ہیں کیونکہ یہ ہم لوگوں کی عادت ہے کہ دوسروں کے کاموں میں کیڑے نکال کر ہم اپنے عیب اور کوتاہیاں چھپاتے ہیں۔ اسی کتاب میں لکھا تھا کہ افریقہ کے کسی ملک میں ان لاکھوں اشخاص میں سے جو یورپ والوں سے تعصب رکھتے ہیں ایک شخص نے کسی یورپین سے کہا تھا کہ چونکہ اب تم یورپ والوں نے محسوس کر لیا ہے کہ تمہاری

استعماری قوت کمزور ہو گئی ہے اور تمہاری سیاسی طاقت ختم ہو گئی ہے اس لیے تم خدمت خلق اور نیکی کے پردہ میں اپنا منہ چھپانا چاہتے ہو۔

ان کاموں میں ان کی نیت کچھ بھی ہو اس سے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے اور اگلے بیس سال میں ان کی کوشش سے اسلامی ملکوں میں سب لوگ تعلیم یافتہ ہو گئے اور انہوں نے بیماریوں سے نجات پالی تو آئندہ نسلوں کے خیالات اسلام اور مسلمانوں کی نسبت کیا ہوں گے۔ کیا آنے والی نسلیں یہ نہیں کہیں گی کہ ہم چودہ سو برس تک مسلمان اور دین محمدی کے پیرو رہے لیکن جہالت اور بدبختی ہی میں زندگی گزارتے رہے۔ بالآخر پیروان دین مسیح نے سات سمندر پار سے آکر ہماری مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ہمیں جہالت سے نجات دلائی۔ اس وقت اسلام کی کیا آبرو رہ جائیگی؟ ہم رسول اکرمؐ کو کیا جواب دیں گے اگر انہوں نے پوچھا کہ میں نے تمہیں جو حکم دیا تھا کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ اس پر تم نے کیا عمل کیا؟

ایک قدرتی، فطری اور نفسیاتی قاعدہ ہے: اَلْاِنْسَانُ رَهِیْنُ الْاِحْسَانِ یعنی انسان احسان کا بندہ ہے۔

رسول خداؐ نے بھی فرمایا ہے:

مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَوَاتًا فَهُوَ لَهٗ۔

جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے۔

اگرچہ یہ شرعی قانون ہے اور اس کا تعلق محض زمین سے ہے لیکن یہ قاعدہ فطری امور پر بھی صادق آتا ہے۔

جو گروہ باہر سے آکر کسی قوم کا احیا کرے گا اور اس قوم کو جہالت، غربت

اور بدبختی سے نجات دلائے گا وہ ضرور اس کے دل جیت لے گا اور اس کی روح اور عقیدے کا مالک بن جائے گا۔ موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر ہمیں اچھی طرح اس خطرہ کا احساس کر لینا چاہیے کہ آئندہ نسلوں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔ ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ مسلمان ہرگز عیسائیت اختیار نہیں کر سکتا خصوصاً اگر تعلیم عام ہو جائے تو کوئی توحید چھوڑ کر تثلیث کی طرف مائل نہیں ہوگا۔

میں عرض کرتا ہوں، شاید یہ بات صحیح ہو لیکن یہ مسلّم ہے کہ اگر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے تو اسلام سے بھی ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا اور ممکن ہے کہ اس کا فائدہ کمیونسٹوں کو پہنچے۔ اگر اسلامی ملکوں میں کسی وجہ سے بھی نوجوان دین سے بیگانہ ہو گئے تو کمیونزم کو نفع پہنچنا یقینی ہے۔

لہٰذا اس خطرے کے خلاف جدوجہد ضروری ہے لیکن اس جدوجہد کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ کیا حسب معمول منفی طریقے اختیار کرنے چاہئیں؟ کیا ہم یہ واویلا مچائیں کہ یونیسکو کو کوئی حق نہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کرے اور اس مقصد کے لیے کوئی کوشش کرے اور روپیہ خرچ کرے؟ عالمی خیراتی اداروں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلامی ملکوں میں بیماریوں کے خلاف جدوجہد کریں۔ ان سے کیا مطلب؟ وہ خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتے ہیں!

آپ خود سوچیں کیا اس طرح کی بات صحیح ہوگی؟ کیا یہ بات دنیا کے دل کو لگے گی؟ کیا خود مسلمان ملک ہماری بات کو تسلیم کریں گے؟

یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کمر ہمت باندھ کر مقدس جہاد شروع کریں اور اپنے فرض کو خود عملاً پورا کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا طریقہ ہی صحیح ہے۔

اسی کتاب میں لکھا تھا کہ انڈونیشیا میں جو ایک اسلامی ملک ہے بلکہ

سب سے بڑا اسلامی ملک ہے تعلیم نے ایک مقدس جہاد کی شکل اختیار کرلی ہے جس پر لوگ مذہبی فرض کی طرح عمل کرتے ہیں جو شخص کچھ جانتا ہے چاہے اس کا تعلق کسی پیشہ سے ہو وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ مدرسہ میں جاکر تعلیم دے کیونکہ سرکاری معلم تمام مدارس کے لیے کافی نہیں ہیں۔

یہی اسلام کا بھی حکم ہے جس نے تعلیم حاصل کرنا ہر شخص پر واجب قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں اس حکم پر عمل کی وہی صورت ہے جس پر اس کتاب کے مطابق انڈونیشیا میں عملدرآمد ہو رہا ہے۔

خدمت اور نیکی میں مقابلہ

سورۂ مائدہ کی ۴۸ ویں آیت میں قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کے تذکرہ کے بعد ادیان گزشتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ

"ہم نے تم میں سے ہر قوم کے لیے ایک خاص راستہ اور طریقہ مقرر کیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ملت بنا دیتا لیکن جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس کے بارے میں تمہیں آزمانے کے لیے (ایسا نہیں کیا گیا) پس نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں بعض دوسری قرآنی آیات کی طرح ملتوں کے اختلاف کی حکمت اور مصلحت بیان کی گئی ہے اور شاید حکمت و مصلحت

جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ مختلف ملتیں نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں تا کہ جو ملت زیادہ لائق و قابل ہو وہ اس مقابلہ میں کامیاب ہو۔ اس کے بعد مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم کوشش کرو کہ اس مقابلہ میں کامیابی تمہیں نصیب ہو۔

لہٰذا اس خطرے کا مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ہم یونیسکو کی سرگرمیوں میں رکاوٹ ڈالیں بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم خود اس کام میں پیش قدمی کریں اور اس میں کامیابی کا تمغہ اپنے سینہ پر سجائیں۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ جب تک اس مقصد کے لیے مقدس جہاد شروع نہیں کیا جائے گا اور مذہبی علماء اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیں گے اور اس کام کو سب کاموں پر ترجیح نہیں دیں گے اور اس کو واجب نہیں سمجھیں گے کوئی کامیابی نہیں ہوگی۔

تین چار روز ہوئے میں نے اتفاقاً وہ منصوبہ ایک دوست کے ہاتھ میں دیکھا جو یونیسکو نے کراچی میں منعقد ہونے والی کانفرنس کی قرارداد کے مطابق ایران کے لیے تیار کر کے ایرانی وزارت تعلیم کو بھیجا ہے اور وزارت تعلیم نے اس کی تقریباً سو یا اس سے زائد نقول تیار کرا کے ماہرین تعلیم میں اظہار رائے کے لیے تقسیم کی ہیں۔ یہ منصوبہ بڑی جامعیت کے ساتھ ایران کے حالات اور اس کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور اس میں اعداد و شمار کی بنیاد پر انتہائی صحت کے ساتھ ضروریات کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس میں یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ بیس سال کے عرصے میں جو عوام کو خواندہ بنانے کی انتہائی مدت ہے ایران کی آبادی میں کس قدر اضافہ متوقع ہے۔ ایران کی آبادی میں طلباء و طالبات کی شرح کیا ہے؟ اگر مقصد یہ ہو کہ اس مدت میں سب ایرانی بچے اسکول جانے لگیں تو کتنے اضافی مدرسے درکار ہوں گے؟ اس کام کے لیے

اور کیا ضروریات ہیں؟ کتنے اضافی مدرسین کی ضرورت ہو گی یہ ٹیچرز ٹریننگ کے لیے کتنے انسٹیٹیوٹ درکار ہوں گے، کتنے غیر تدریسی عملے مثلاً انسپکٹروں وغیرہ کی ضرورت ہو گی؟ ان سب باتوں کا حساب لگایا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس مدت میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ اضافی معلموں کی علاوہ ان کے جو اس وقت وزارت تعلیم کے پاس موجود ہیں ضرورت ہو گی۔

یہ حساب لگاتے وقت اس بات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اس مدت میں کتنے معلم ملازمت سے سبکدوش یا فوت ہو جائیں گے اور کتنے مستعفی ہو جائیں گے۔ اس منصوبہ پر مجموعی خرچ کا اندازہ بیس ارب تومان ہے جس میں سکولوں کی تعمیر، معلموں کی تنخواہیں اور دوسرے ضروری اخراجات شامل ہیں۔ اخراجات واقعی بہت ہیں لیکن وہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے الل ٹپ نہیں ہانکتے۔ جب انہوں نے اس کام کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تو وہ کر کے رہیں گے۔

لیکن اگر ہم مقدس اور دینی جہاد کے طور پر اس کام کو شروع کر دیں تو ہم اس رقم کے دسویں حصے سے بھی کم میں اس کو پورا کر سکتے ہیں۔

دین و ایمان روپیہ کی جگہ لے لیتا ہے۔

یہ سب اقدامات بنیادی اور ابتدائی تعلیم کے لیے ہیں۔ جب مسلمان اس مرحلہ کو مکمل کر لیں گے تو پھر متوسط اور اعلیٰ تعلیم کی نوبت آئے گی اور پھر کہیں مسلمان اس قابل ہوں گے کہ عالمی سطح کے ماہرین اور مفکرین باہر بھیج سکیں۔

بات طویل ہو گئی۔ اگر میں چاہتا تو اس دوران میں وہ سب کچھ بیان کر دیتا جو اسلام نے علم کے بارے میں کہا ہے اور آپ کو بتلاتا کہ اسلام نے یہ کہا ہے اور وہ کہا ہے بالفاظ دیگر اسلام کی تبلیغ اور پروپیگنڈا کرتا لیکن جیسا کہ میں نے آغاز سخن میں عرض کیا تھا میں اس قسم کے پروپیگنڈے کا قائل نہیں اور

میرے خیال میں اس کا اثر بھی نہیں ہوتا۔ میں اس کو ترجیح دیتا ہوں کہ بجائے اس قسم کے پروپیگنڈے کے ہم اپنی موجودہ حالت اور اس کی اصلاح کے لیے اپنے فرض کی بات کریں۔ جب ہم سنجیدگی سے واقعی کام شروع کردیں گے اور اس مقدس جہاد میں شریک ہو کر اس میں پیشرفت کریں گے اس وقت سر اٹھا کر فخر سے کہہ سکیں گے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ۔

❋

یہ لکچر ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۸۰ ہجری کو دیا گیا تھا۔ اس کے اختتام کے چند لمحے بعد سامعین میں سے ایک صاحب نے جن کے نام سے میں واقف نہیں، مجھے ایک پرچہ دیا جس میں لکھا تھا:

اسلامی نقطۂ نظر سے علم وجہل کی بحث محض اصولی طور پر کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مقصد کے لیے مقدس جہاد شروع کرنا واجب ہے اور اس کا آغاز ابتدائی تعلیم سے ہونا چاہیے لیکن اس کا کوئی آسان اور عملی طریقہ نہیں بتلایا گیا۔ اس ساری بحث کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ ہم سب افسوس کریں کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ ہم مانتے ہیں کہ اس مسئلہ پر غور وفکر کی ضرورت ہے، لیکن پھر بھی افسوس ہے کہ بات گفتند وبرخاستند ہی تک رہتی ہے۔

لکچر میں کہا گیا ہے کہ مختلف افراد کی وساطت سے یونیسکو نے جو کوشش شروع کی ہے یہ قدرتی بات ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر پیغمبر نہ بھی آتے تو انسان خود ہی ان تمام باتوں کو سمجھ لیتا جن کی پیغمبروں نے تعلیم دی ہے اور شاید خدا شناس بھی ہو جاتا لیکن پھر بھی دین اس لیے آیا کہ اس ترقی کی رفتار تیز ہو جائے۔ ہمارا بھی فرض یہی ہے کہ موجودہ سست روی سے

نجات حاصل کریں۔ اس کے لیے مؤثر تنظیم، صحیح طریقہ کار اور معین ہدف کی ضرورت ہے۔ ہمیں جمال الدین افغانی کے طریقہ کار پر عمل کرنا چاہیے۔

میں نقادِ محترم کا شکر گزار ہوں اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کی ضرورت تسلیم کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ دینی مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کی ہے وہ ہے عوام کا ایمان ــــ یعنی وہ یہ دل سے تسلیم کریں کہ یہ ایک دینی فریضہ ہے اور دوسرے فرائض کی طرح اس کی بجا آوری کے لیے کوشاں ہوں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جن فرائض پر عوام کو اعتقاد ہے' ان کے سلسلے میں وہ کتنے خلوص سے کوشش کرتے ہیں۔ روپیہ خرچ کرتے ہیں اور ان کے لیے زحمتیں برداشت کرتے ہیں۔ ابھی پچاس سال پہلے تک وسائل کے فقدان اور امن و امان کی کمی کے باعث حج بھی ایک طرح کا جہاد سمجھا جاتا تھا۔ حاجی کو بخیریت واپسی کی کچھ زیادہ امید نہیں ہوتی تھی' اس کے باوجود کم ہی لوگ اس فرض کو ترک کرتے تھے۔ ہم نے خود دیہاتیوں میں بہت لوگ دیکھے ہیں جو شدید ترین گرمی میں روزہ بھی رکھتے تھے اور روزہ ہی کی حالت میں فصل کاٹنے اور گاہنے کے لیے بھی جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پیاس اور گرمی کی شدت سے بدحواس بلکہ بے ہوش ہو جاتے تھے لیکن اگلے دن بڑی خوشی سے اور بالکل ہشاش بشاش پھر روزہ رکھ لیتے تھے۔

صدرِ اوّل کے بعد ہم نے اسلامی تاریخ میں کہیں یہ نہیں دیکھا کہ عوام نے علم کی طلب میں اس طرح کے مجاہدے کیے ہوں اور اگر کسی نے ایسا مجاہدہ کیا بھی ہے تو اس وقت جب وہ علم کے راستہ پر چل کر علم کی لذت سے آشنا ہو چکا تھا۔ اب آپ خود سوچیے کہ اگر لوگ اس شیریں اور خوشگوار کام کو مذہبی

فریضہ سمجھنے لگیں اور طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ محض سکولوں کے کتبوں پر ایک ماٹو (MOTTO) ہونے کی بجائے واقعی حکمِ شرعی کی صورت اختیار کرے تو کیسی پرجوش تحریک وجود میں آئے گی اور کس طرح اس اصول پر عمل کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔

وہ بڑی رکاوٹ جسے دور کرنا ہے یہی ہے کہ لوگ اس شرعی حکم کی طرف متوجہ ہوں اور اسے بھی ایسا ہی فرض سمجھیں جیسے اور فرائض ہیں۔

نوجوان نسل کی رہنمائی

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ. (سورۃ نحل۔ آیت ۱۲۵)

جس مسئلہ کا بیان آج "نوجوان نسل کی رہنمائی" کے عنوان سے تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ مسلمانوں کی ایک عام ذمہ داری ہے لیکن یہ ذمہ داری اس طبقہ پر خاص طور پر عائد ہوتی ہے جس کا فرض معاشرہ کی دینی رہنمائی ہے۔ یہ اصول تو ہم سب کو معلوم ہے کہ مذہب اسلام میں ذمہ داری مشترک ہے یعنی سب افراد ایک دوسرے کے متعلق ذمہ داری میں شریک ہیں۔

کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ۔

تم میں سے ہر شخص ایک دوسرے کا محافظ اور نگہبان ہے

اور ہر ایک پر اس کے ماتحت افراد کی ذمہ داری ہے۔

ہر نسل ذمہ دار ہے کہ جو دین اس تک پہنچا ہے اور جو ہدایت اُسے ملی ہے اس کی حفاظت کرے اور بعد میں آنے والی نسلوں تک اسے پہنچائے اور بعد میں آنے والوں کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اسے قبول کریں اور اس سے مستفید ہوں۔ اس لیے نوجوان نسل کی رہنمائی ایک ایسا فرض اور ایک ایسی ذمہ داری ہے جو سب پر عاید ہوتی ہے۔

جس بات نے اس بحث کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیا ہے کہ جس پر غور و فکر کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی نسل کی رہنمائی کا ہر حال میں ایک ہی طریقہ نہیں بلکہ یہ طریقے بدلتے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے جو وسائل کام میں لائے جاتے ہیں وہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی ایسا نسخہ نہیں جو ہر نسل اور ہر زمانے میں ایک ہی طرح تجویز کر دیا جائے اس لیے ہر زمانے میں اور مختلف حالات میں غور کرنا پڑتا ہے کہ کیا صورت اختیار کرنی چاہیے اور کونسا نسخہ استعمال کرنا چاہیے۔

دو قسم کی ذمہ داری

میں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موضوع پر یہاں جو کچھ دیا تھا اس میں بھی ارشارتاً کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ دینی ذمہ داری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو کسی مخصوص کام کے مخصوص شکل میں کرنے کی اس طرح کی ذمہ داری ہے کہ اس کام کی تمام خصوصیات اور شرائط وغیرہ سب اسلام نے متعین کر دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ تم اس کو اس طریقے سے اور اس صورت میں انجام دو۔ ایسے کام اگرچہ کسی خاص مقصد سے ہی فرض ہوئے ہیں لیکن ہم

ان کے نتیجے اور اس مقصد کے ذمہ دار نہیں۔ اس قسم کے کاموں کو تعبدیات کہتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ہماری ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ ان کاموں کی جو صورت تجویز کی گئی ہے اس کے مطابق ان کو پورا کر دیں۔ مثلاً نماز ہے۔ نماز ادا کرنے سے پہلے کچھ مقدمات بھی ضروری ہیں۔ نماز کی خاص شرائط ہیں۔ اس کے کچھ اجزا ہیں۔ کچھ ایسی باتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے نماز نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کے مطابق نماز ادا کریں۔ یہ تعبدی حکم ہے۔ نماز کا کچھ فائدہ اور نتیجہ بھی ضرور ہے لیکن اس نتیجہ کا تعلق صرف اللہ تعالےٰ سے ہے۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔

نماز فحش باتوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

ہم فقط مقررہ طریقے کے مطابق نماز ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ نتیجہ ہماری ذمہ داری نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر ہم اس عمل کو بالکل صحیح طریقے سے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے، انجام دیں گے تو نتیجہ خود بخود مرتب ہوگا۔

ذمہ داری کی ایک اور قسم وہ ہے جس کو ہم نتیجہ کی ذمہ داری کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں انسان کو نتیجہ حاصل کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ اس عمل کو بہترین طریقے سے انجام دے۔ بالفاظ دیگر اس کی کوئی شرائط اور کوئی صورت معین نہیں۔ موقع اور وقت کے لحاظ سے اس کا طریقہ بدل سکتا ہے۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجیے آپ کو ایک مشکل درپیش ہے۔ مثلاً آپ کا کوئی خاص آدمی جیل میں ہے اور اس سلسلہ میں آپ کسی شخص سے کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں۔ مثلاً آپ اسے کوئی چٹھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چٹھی فلاں شخص کو فلاں وقت پہنچا دو۔

اور ہر ایک پر اس کے ماتحت افراد کی ذمہ داری ہے۔

ہر نسل ذمہ دار ہے کہ جو دین اس تک پہنچا ہے اور جو ہدایت اُسے ملی ہے اس کی حفاظت کرے اور بعد میں آنے والی نسلوں تک لے پہنچے اور بعد میں آنے والوں کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اسے قبول کریں اور اس سے مستفید ہوں۔ اس لیے نوجوان نسل کی رہنمائی ایک ایسا فرض اور ایک ایسی ذمہ داری ہے جو سب پر عاید ہوتی ہے۔

جس بات نے اس بحث کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیا ہے کہ جس پر غور و فکر کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی نسل کی رہنمائی کا ہر حال میں ایک ہی طریقہ نہیں بلکہ یہ طریقے بدلتے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے جو وسائل کام میں لائے جاتے ہیں وہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی ایسا نسخہ نہیں جو ہر نسل اور ہر زمانے میں ایک ہی طرح تجویز کر دیا جائے اس لیے ہر زمانے میں اور مختلف حالات میں غور کرنا پڑتا ہے کہ کیا صورت اختیار کرنی چاہیے اور کونسا نسخہ استعمال کرنا چاہیے۔

دو قسم کی ذمہ داری

میں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موضوع پر یہاں جو کچھ دیا تھا اس میں بھی اشارتاً کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ دینی ذمہ داری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو کسی مخصوص کام کے مخصوص شکل میں کرنے کی اس طرح کی ذمہ داری ہے کہ اس کام کی تمام خصوصیات اور شرائط وغیرہ سب اسلام نے متعین کر دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ تم اس کو اس طریقے سے اور اس صورت میں انجام دو۔ ایسے کام اگرچہ کسی خاص مقصد سے ہی فرض ہوتے ہیں لیکن ہم

ان کے نتیجے اور اس مقصد کے ذمہ دار نہیں۔ اس قسم کے کاموں کو تعبدیات کہتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ہماری ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ ان کاموں کی جو صورت تجویز کی گئی ہے اس کے مطابق ان کو پورا کریں۔ مثلاً نماز ہے۔ نماز ادا کرنے سے پہلے کچھ مقدمات بھی ضروری ہیں۔ نماز کی خاص شرائط ہیں۔ اس کے کچھ اجزا ہیں۔ کچھ ایسی باتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے نماز نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کے مطابق نماز ادا کریں۔ یہ تعبدی حکم ہے۔ نماز کا کچھ فائدہ اور نتیجہ بھی ضرور ہے لیکن اس نتیجہ کا تعلق صرف اللہ تعالے سے ہے۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

نماز فحش باتوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

ہم فقط مقررہ طریقے کے مطابق نماز ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ نتیجہ ہماری ذمہ داری نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر ہم اس عمل کو بالکل صحیح طریقے سے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے، انجام دیں گے تو نتیجہ خود بخود مرتب ہو گا۔

ذمہ داری کی ایک اور قسم وہ ہے جس کو ہم نتیجہ کی ذمہ داری کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں انسان کو نتیجہ حاصل کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ اس عمل کو بہترین طریقے سے انجام دے۔ بالفاظ دیگر اسکی کوئی شرائط اور کوئی صورت معین نہیں۔ موقع اور وقت کے لحاظ سے اس کا طریقہ بدل سکتا ہے۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجیے آپ کو ایک مشکل درپیش ہے۔ مثلاً آپ کا کوئی خاص آدمی جیل میں ہے اور اس سلسلہ میں آپ کسی شخص سے کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں۔ مثلاً آپ اسے کوئی چٹھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چٹھی فلاں شخص کو فلاں وقت پہنچا دو۔

ظاہر ہے کہ یہ چٹھی کسی خاص مقصد کے لیے لکھی گئی ہوگی لیکن پیغام رساں کی ذمہ داری صرف چٹھی پہنچانا ہے، مقصد سے اسے کوئی مطلب نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس سے براہ راست نتیجہ کے خواہاں ہیں۔ طریقہ کار سے آپ کو مطلب نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ قیدی چھوٹ جائے۔ اس صورت میں آپ طریقۂ کار کا تعین نہیں کرتے۔ یہ اس کا کام ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ اقدام کرے جو بہتر ہو۔

عام طور پر اس کام کی ذمہ داری ان معاملات سے متعلق ہوتی ہے جن کا طریقۂ کار متعین نہیں ہوتا۔ کبھی ایک طریقہ استعمال ہوتا ہے کبھی دوسرا۔ زمان و مکان کے لحاظ سے طریقہ بدلتا رہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر سوچنا ہوتا ہے کہ کون سا طریقہ مناسب رہے گا۔

اسلام میں دونوں قسم کی ذمہ داریاں موجود ہیں۔ نماز، روزہ اور دوسرے تعبدی امور میں ذمہ داری پہلی قسم کی ہے، جہاد میں دوسری قسم کی۔ جہاد میں مسلمان اس کے پابند ہیں کہ اسلامی علاقے کا دفاع کریں اور مسلمانوں کی آزادی کا تحفظ کریں۔ مگر کس طرح؟ تلوار سے، بندوق سے یا کسی اور ہتھیار سے اس کا تعین نہیں کیا گیا اور اس کا تعین بھی نہیں ہو سکتا۔ مسلمان اس کے پابند ہیں کہ ہر زمانے میں بہترین وسائل کو بروئے کار لائیں۔

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ۔ (سورۂ انفال۔ آیت ۶۰)

یہ کام مسلمانوں کا ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ کس زمانے میں کون سے ہتھیار استعمال کرنا بہتر ہے۔

ہدایت اور رہبری کا مسئلہ بھی دوسری قسم میں داخل ہے۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی رہنمائی کریں۔ ہر نسل آئندہ آنے والی نسل کی ہدایت کی

ذمہ دار ہے۔ یہ ذمہ داری خاص طور پر ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جن کے ہاتھ میں قیادت ہے۔ بہرحال ہدایت تو ضروری ہے لیکن اس کا طریقہ کار ہر جگہ اور ہمیشہ کے لیے معین نہیں اور نہ اس کا تعین ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ (سورۂ تحریم - آیت ۶)

یعنی اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اس آیت میں صرف نتیجہ یعنی آگ سے بچانے کا ذکر ہے طریقے اور ذریعے کا تذکرہ نہیں۔

اسلام میں ہدایت اور رہبری کی کوئی ایک بالکل معین شکل بیان نہیں کی گئی اور نہ اس کے طریقہ کار اور اس کی شرائط کی مکمل تفصیل دی گئی ہے بنیادی طور پر ایسی تفصیل دی بھی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ حالات کے لحاظ سے اس میں فرق ہوتا رہتا ہے۔ ہدایت و رہبری نماز کی طرح تعبدی نہیں کہ اس کی کوئی ایک ہی شکل مقرر ہو۔ یہ کوئی وظیفہ یا منتر بھی نہیں کہ ہر سانپ کے ڈسے یا بچھو کے کاٹے پر پڑھ کر پھونک دیا جائے۔

طریقے اور ذریعے اضافی اور وقتی ہوتے ہیں

ایک جگہ رہنمائی کا ایک طریقہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہی

طریقہ کسی دوسری جگہ گمراہی کا سبب بن جائے۔ جن دلائل سے ایک بڑھیا کو مومن بنایا جا سکتا ہے وہی دلائل اگر ایک تعلیم یافتہ آدمی کے سامنے پیش کیے جائیں تو اس کو گمراہ کر دیں گے۔ ایک کتاب جو کسی زمانے میں اس زمانے کے لوگوں کے مذاق اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہو، دوسرے زمانے میں گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ ہمارے پاس بہت سی کتابیں ہیں جنہوں نے زمانۂ قدیم میں خوب کام دیا اور سیکڑوں، ہزاروں کو راہِ ہدایت دکھائی لیکن ان کتابوں سے ہمارے زمانے میں کسی کو ہدایت نہیں مل سکتی بلکہ ممکن ہے کہ گمراہی، شک اور تذبذب کا سبب بن جائیں۔ اب ان کا شمار ان کتابوں میں کرنا چاہیے جو لوگوں کو گمراہ کرتی ہیں حتیٰ کہ ان کی خرید و فروخت اور طباعت و اشاعت بھی خالی از اشکال نہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ وہی کتاب جس نے پہلے ہزارہا لوگوں کو راہِ ہدایت دکھلائی تھی اب وہ گمراہ کن ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ سوائے آسمانی کتاب اور کلامِ معصومینؑ کے ہم جس کتاب کو بھی لیں، وہ ایک محدود مدت کے لیے مفید ہوتی ہے اور وہ مدت گزر جانے کے بعد اس کا فائدہ اور مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

یہ نکتہ جو میں نے بیان کیا، ایک اہم معاشرتی مسئلہ ہے اور ایک ایسا معما ہے جس کے حل کی ضرورت ہے۔ ابھی تک اس پر کوئی غور و خوض نہیں ہوا۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس جلسہ میں بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ در اصل اس بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ہمارے ذہن نشین ہو جائے کہ ہر زمانے کے ذرائع ہدایت اسی زمانے سے مخصوص ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس کے کچھ شواہد اسلام کی بنیادی کتابوں سے پیش کیے جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام نے خود اس نکتہ کی طرف توجہ دی ہے۔

میں نے تقریر کے آغاز میں یہ آیت پڑھی تھی:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ۔ (سورۂ نحل ۔ آیت ۱۲۵)

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں رہنمائی کے تین طریقے تجویز کیے گئے ہیں اور ان میں سے ہر طریقہ ایک خاص موقع سے مخصوص ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ۔ یاد رکھیے کہ جہاں بھی رب کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے مفہوم میں ایک خاص پہلو شامل ہے جس سے مراد ہے تربیت ــــــ چونکہ یہاں بھی دعوت اور تربیت کا ذکر ہے اس لیے رب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ یعنی اس راہ کی طرف جس سے لوگوں کی پرورش اور تربیت ہو۔ کس طرح بلاؤ؟ حکمت سے یعنی ایسے پختہ دلائل پیش کرو کہ جن میں شک کی گنجائش نہ ہو۔ بقول منطقیوں کے ایسی بات کہو جس کے مقدمات سو فیصد یقینی ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف لوگوں کو خالص علمی و عقلی دلائل و براہین کے ذریعے سے بلاؤ۔

مفسرین کہتے ہیں کہ علمی و عقلی دلائل سے صرف ان لوگوں کو دعوت دی جانی چاہیے جو اس کی استعداد اور صلاحیت رکھتے ہوں۔

وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ یعنی لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ دل خوش کن وعظ و نصیحت کے ذریعے سے ــــــ کچھ لوگ علمی و عقلی دلائل سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کی رہنمائی کا طریقہ وعظ و نصیحت ہے۔ ان کی ہدایت کے لیے مثالوں، قصوں، کہانیوں اور ہر اس چیز سے کام لینا چاہیے جس

سے وہ متاثر ہو سکیں۔ وعظ و نصیحت کا تعلق دل سے ہے۔ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دل زیادہ آسانی سے متاثر ہو سکتے ہیں بمقابلہ دماغ کے۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔

یعنی اگر آپ کا کسی ایسے شخص سے واسطہ پڑے جس کا مقصد حقیقت معلوم کرنا اور اس بات کو سمجھنا نہیں بلکہ صرف بحث کرنا ہو اور جو اس انتظار میں رہتا ہو کہ مخالف کی کوئی ایک بات پکڑ کر اس پر جھگڑنا شروع کر دے تو آپ ایسے شخص سے بحث کیجیے لیکن عمدگی اور شائستگی سے ـــــ لیکن بحث میں حق و صداقت کو نظر انداز مت کیجیے، انصاف سے کنارہ کشی اختیار نہ کیجیے، غلط بات مت کیجیے، جھوٹ اور فریب سے کام مت لیجیے وغیرہ وغیرہ۔

اس آیت میں رہنمائی کے تین مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں۔ ہر طریقہ ایک خاص موقع کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مقصد کے لیے ہر موقع پر یکساں اور ایک ہی طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

انبیاء کے معجزات میں اختلاف کا سبب

اس مضمون کی تائید ایک نسبتاً مشہور روایت سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ وہ روایت پیغمبروں کے معجزات کے بارے میں ہے جو ہر دور میں ایک ہی طرح کے نہیں تھے لیکن بہر حال اس روایت سے ہمارے قول کی تائید ضرور ہوتی ہے۔ یہ روایت ایک سوال کا جواب ہے اور اسے ابن سکیت نے امام محمد تقی علیہ السلام سے روایت کیا ہے۔

ابن سکیت ایک مشہور ادیب گزرا ہے جس کا ذکر ادبی کتابوں میں بکثرت ہے۔ یہ امام ہادیؑ کا ہم عصر تھا یعنی متوکل کے عہد خلافت میں زندہ تھا اور

اسی کے ہاتھ سے مارا گیا' مذہباً شیعہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے قتل کا سبب یہ ہوا کہ یہ متوکل کے دو بیٹوں المعتز اور المؤید کا استاد تھا۔ متوکل کو معلوم تھا کہ ابن سکیت علویوں کا ہوا خواہ ہے۔ ایک دن جب یہ دربار میں موجود تھا متوکل کے بیٹے بھی وہاں آ گئے۔ متوکل ـــ جس کے لیے مشہور تھا کہ اس کی تلوار سے خون ٹپکتا تھا ـــ نے ابن سکیت کو مخاطب کر کے پوچھا کہ میرے بیٹے بہتر ہیں یا علیؑ کے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ ـــ ابن سکیت جو بڑا عالم تھا متوکل کی اس گستاخی پر بہت برہم ہوا اور کہا میری نظر میں علیؑ کا غلام قنبر بھی ان دونوں لڑکوں اور ان کے باپ سے بہتر ہے۔ متوکل نے ترک غلاموں کو حکم دیا کہ ابن سکیت کی زبان گدی سے کھینچ کر نکال دیں۔ اس طرح ابن سکیت کو قتل کیا گیا۔

بہر حال اس شخص نے امام ہادیؑ سے پوچھا: فرزندِ رسولؐ! جب حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے تو انھوں نے لوگوں کی تبلیغ و ہدایت کے لیے جن معجزات سے کام لیا وہ تو اس نوعیت کے تھے جیسے عصا کا اژدھا بن جانا یا یدِ بیضا وغیرہ اور جب حضرت عیسیٰ مبعوث ہوئے تو ان کے معجزات کی نوعیت مختلف تھی جیسے مادر زاد اندھوں اور برصوں کا علاج ـــ انھوں نے مردوں کو زندہ کیا اور اسی طرح کے دوسرے کام کیے مگر جب ہمارے پیغمبر مبعوث ہوئے تو انھوں نے ایسا کوئی معجزہ نہیں دکھلایا۔ ان کا معجزہ فصاحت و بلاغتِ کلام اور قرآن ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

امام نے فرمایا کہ اس کی وجہ زمانے کا اختلاف ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگری اور اسی نوع کی چیزیں لوگوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کے معجزات بھی ان ہی چیزوں کے مشابہ تھے جب کہ وہ لوگ صرف جادو اور نظر بندی سے کام لیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ وہ تھا جب متعدد اطبا

حیرت انگیز علاج کرتے تھے۔ دشمنوں کی گردنیں ان ہی کمالات کے سامنے جھکتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بھی اسی نوع کا معجزہ عطا کیا مگر خاتم الانبیاء کا زمانہ قادر الکلامی کا زمانہ تھا۔ بلند پایہ کلام کی قدر تھی اس لیے اسلام کے معارف عالیہ بلند پایہ اور فصیح و بلیغ عبارت میں ادا کیے گئے (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب "فلسفۂ معجزہ" مؤلفہ آیت اللہ العظمیٰ الخوئیؒ)

ابن سکیت کو امام کا جواب بہت پسند آیا۔ کہنے لگا اب میں اس بات کا راز سمجھ گیا۔ پھر عرض کیا، فرزند رسولؐ! اس زمانے میں خدا کے وجود اور وحدانیت کو کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے: فرمایا عقل سے۔ ابن سکیت نے کہا: هٰذَا وَاللّٰهِ هُوَ الْجَوَابُ۔

معلوم ہوا کہ پیغمبروں کے معجزات کے اختلاف کی علت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ مختلف ہے ورنہ ممکن تھا کہ آدمؑ سے خاتمؐ تک ایک ہی قسم کا معجزہ ہوتا بشرطیکہ یہ مان لیا جائے کہ آدمؑ بھی پیغمبر تھے اور ان کا بھی کوئی معجزہ تھا کیونکہ بعض کا خیال ہے کہ آدمؑ پیغمبر نہیں تھے۔ بہر حال ہر پیغمبر نے اسی معجزہ سے کام لیا جو ان کے دور اور زمانے کے مناسب حال تھا۔

انبیاء کا طریقہ

کافی میں ایک مشہور حدیث نبوی ہے اور حال ہی میں بعض دوستوں نے جن کے پاس اہلِ تسنن کی حدیث کی کتابیں موجود ہیں تحقیق کر کے بتلایا ہے کہ یہ حدیث اہل تسنن کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اس کے مطابق حضرت رسولِ کریمؐ نے فرمایا ہے:

اِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ اُمِرْنَا اَنْ نُکَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ۔

ہم پیغمبر مامور ہیں کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کریں۔ ہم جس سے بات کرتے ہیں اس کی ذہنی اور فکری سطح کا خیال رکھتے ہیں اور اس کی عقل اور سوجھ کے مطابق بات کرتے ہیں۔ جس کی فکری سطح بلند ہوتی ہے اس سے اس کی سطح کے مطابق اور جس کی فکری سطح پست ہوتی ہے اس سے اس کی سطح کے مناسب گفتگو کرتے ہیں۔ ایک عام آدمی سے ایسی اونچی بات نہیں کہتے جس سے اس کا سر ہی چکرا جائے اور نہ کسی ہوشیار آدمی کو وہ جواب دیتے ہیں جو ایک بڑھیا کو دیتے ہیں۔ اپنی مثنوی میں مولانا رومی نے اسی حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

پست میگوییم باندازۂ عقول
عیب نبود، ایں، بود کارِ رسول

نبیوں کی روش اور فلسفیوں کی روش میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ فلسفی ہمیشہ ایک مقررہ سطح کے دلائل سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اسٹور میں ایک سے زیادہ قسم کا مال ہی نہیں ہوتا لہذا جو گاہک ان کے پاس آتے ہیں وہ بھی ایک ہی طبقہ کے ہوتے ہیں۔ فلسفی مخصوص اصطلاحات استعمال کیے بغیر اپنا مطلب بیان نہیں کر سکتے، اس لیے صرف وہی لوگ ان کی بات سمجھتے ہیں جو ان کی زبان جانتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ افلاطون کے مشہور مدرسہ کے دروازہ پر جو ایتھنز کے باہر ایک باغ میں واقع تھا اور جس کا نام اکاڈیمیا تھا اور اسی کی مناسبت سے اب علم اور فن کی بڑی درسگاہ کو اکیڈمی کہتے ہیں، ایک شعر لکھا ہوا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ جو شخص جیومیٹری نہ جانتا ہو وہ اس مدرسہ میں نہ آئے۔

لیکن انبیاء کی روش یہ ہے کہ ان کی درسگاہ سے ہر قسم کے شاگرد استفادہ

کر سکتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کا مال ہے' اتنا اونچا بھی کہ افلاطون کو چاہیے کہ اگر شاگردی کرے اور اتنا معمولی بھی کہ جس سے ایک بڑھیا کا بھی کام چل جاتے۔ کسی پیغمبر کے دروازے پر یہ لکھا ہوا نہیں تھا کہ جو یہاں استفادہ کرنا چاہے اس کی تعلیم اتنی ہونی چاہیے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جس کی جتنی زیادہ استعداد تھی وہ اتنا ہی زیادہ استفادہ کر سکتا تھا لیکن جس کی استعداد کم تھی وہ بھی اپنی لیاقت کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا تھا کیونکہ اِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ اُمِرْنَا اَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ۔

بہترین شاگرد

یہاں سے ایک بات اور بھی مستفاد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ فلاسفر کے بہترین شاگرد وہ ہیں جنہوں نے ان سے براہِ راست تعلیم حاصل کی لیکن انبیاء اور اولیاء کی یہ بات نہیں۔ افلاطون، ارسطو یا بو علی سینا کے بہترین شاگرد وہی ہیں جنہوں نے بلاواسطہ ان سے کسبِ فیض کیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بو علی سینا کے کلام کو بہترین طور پر سمجھنے والے بہمنیار یا ابو عُبید جوزجانی تھے لیکن رسولِ اکرمؐ یا امیر المومنینؑ یا امام صادقؑ کے شاگرد کون تھے؟ کیا ان کے بھی بہترین شاگرد وہی تھے جو ان کے زمانے میں موجود تھے؟ نہیں یہ بات نہیں۔

اس نکتہ کی طرف رسولِ اکرمؐ نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا ہے۔ شاید یہ بات ان لوگوں نے جو اس وقت موجود تھے، پورے طور پر نہ سمجھی ہو۔ معدودے چند ایسے افراد کی بات چھوڑیے جیسے سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ۔ باقی لوگ نہیں سمجھتے تھے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: نَصَرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا وَبَلَّغَهَا مَنْ لَمْ يَبْلُغْهُ اللہ مدد کرے ان کی جنہوں نے

میری بات سنی یاد رکھی اور ان تک پہنچائی جن تک نہیں پہنچی تھی۔
ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ: اللہ کرے وہ پھلیں پھولیں جنہوں نے میری بات سنی... اس کے بعد آپ نے فرمایا: رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرِ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ. کیونکہ بہت سے لوگ جن کو "فقہ" کی کوئی بات معلوم ہوتی ہے خود "فقیہ" نہیں ہوتے اور بہت سے لوگ جن کو "فقہ" کی کوئی بات معلوم ہوتی ہے، اس بات کو ایسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ "فقیہ" ہوتے ہیں۔

ابتدائی دور میں فقہ کی اصطلاح ایسی دینی حقیقت کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو غور و فکر کی محتاج ہو۔ یہاں مقصود وہ حقائق و معارف اور کلمات ہیں جو لوگ خود آنحضرتؐ کی زبان سے سنتے تھے اور یاد رکھتے تھے۔ وہ خود ان کو نہیں سمجھتے تھے اور نہ ان کا تجزیہ و تحلیل کر سکتے تھے لیکن ان میں سے بہت سے ان کلمات اور حقائق کو ایسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دیتے تھے جو ان سے بہتر سمجھتے اور حقائق کا ادراک کر سکتے تھے۔

مثلاً کسی شخص نے رسول اکرمؐ سے سنا لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ لیکن وہ شخص اس جملہ کے معانی کی وسعت کا احاطہ نہیں کر سکا لیکن اس نے یہ جملہ اگلی نسل تک پہنچا دیا جو اس کے معنی کچھ سمجھتی تھی۔ اس کے بعد یہ جملہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہا۔ ممکن ہے کہ بیسویں نسل اس کو پہلی، دوسری اور تیسری نسل سے زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کی قابلیت رکھتی ہو۔

قرآن کے ساتھ بھی یہی صورت ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے وقتوں کے

لوگ قرآن کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کی جتنی تفاسیر لکھی گئی ہیں اس کے معانی و مطالب ان سب سے بلند تر ہیں یعنی ہر زمانہ میں قرآن کی تفسیر کی گئی ہے لیکن جب بھی بعد کے زمانے میں جب علم و فہم میں ترقی ہو گئی تھی قرآن کو اس کی تفسیر سے جانچا گیا تو یہی معلوم ہوا کہ قرآن اس سے بہت برتر اور بلند تر ہے۔

ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی علم فقہ کو لیجیے۔ اصحاب رسولؐ اصحاب امیر المومنینؑ اور اصحاب صادقؑ یہاں تک کہ زرارہ اور ہشام بن الحکم جیسے حضرات بھی فقہی قواعد کو جو رسول اکرمؐ یا ائمہؑ سے ان تک پہنچے تھے اس طرح نہیں سمجھ سکتے تھے اور نہ ان کا اس طرح تجزیہ کر سکتے تھے جیسے مثلاً محقق حلی، علامہ حلی اور شیخ مرتضیٰ انصاری ان کو سمجھتے تھے اور ان کا تجزیہ کرتے تھے۔

پس معلوم ہوا کہ فلسفیانہ طریقے میں استاد کے کلام کا مفہوم سب سے بہتر وہ سمجھتا ہے جو سب سے قدیم ہو لیکن انبیاء اور اولیاء کے مکتب میں ان کے کلام کے معنی و مفہوم کو سب سے بہتر وہ سمجھتا ہے جو آتا تو ہے بعد میں لیکن علم و فہم میں اس کا درجہ اگلوں کی نسبت بلند ہوتا ہے۔ یہ بجائے خود نبوت کا ایک معجزہ ہے۔

باب توحید کی بعض روایات میں آیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالےٰ کے علم میں تھا کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جن کی سوچ گہری ہوگی اور جن کو غور و فکر کی عادت ہوگی اس لیے اللہ نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید کی ابتدائی آیتیں نازل فرمائیں جو توحید کے عالی ترین اور دقیق ترین مسائل پر مشتمل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے کے لوگوں میں ان آیات کو پورے طور پر سمجھنے کی لیاقت نہیں تھی۔ اس لیے آئندہ ایسے لوگ آنے ضروری ہوئے جو ان آیات کو کما حقہ

سمجھ سکیں۔ یہ آیات ان ہی ماننے والوں کی روحانی غذا ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ چونکہ ان آیات میں آخری حد بیان کردی گئی ہے اس لیے اگر کوئی اس حد سے تجاوز کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ یہ ہے معجزہ نبوت کا اور یہ ہے معجزہ اس قرآن کا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لا تنقضی عجائبہ ولا تفنی غرائبہ۔

میں نے یہ سب کچھ اس لیے کہا کہ جب میں نوجوان نسل کی رہنمائی کی بات کروں تو کوئی یہ نہ کہنے لگے، کیوں جناب کیا نئی نسل کی رہنمائی اور پرانی نسل کی رہنمائی میں کچھ فرق ہے۔ کیا ان کی اوران کی نماز الگ الگ ہے جو دونوں کو تبلیغ کے طریقے مختلف ہوں۔ جیسا پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے اب بھی اسی طرح ہونا چاہیے۔ ہمارے دادا دادی تو کسی طرح ایک مجلس میں شریک ہو گئے تھے اور وہیں خدا شناس ہو گئے اور انہوں نے ہدایت پالی۔ کم بخت نئی نسل کو بھی چاہیے کہ وہیں جا کر بیٹھے اور کچھ سیکھے۔

جوان نسل یا جوان فکر

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب ہم نوجوان نسل کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مقصد نوجوان افراد نہیں بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم اور جدید تمدن سے واقفیت کی بنا پر ایک مخصوص طرز فکر کے مالک ہیں، وہ چاہے بڈھے ہوں یا جوان۔ اس طبقہ کی اکثریت ضرور جوانوں پر مشتمل ہے اسی لیے ہم اسے نوجوان نسل کہتے ہیں ورنہ بہت سے بڈھوں کا طرز فکر بھی جدید ہے۔ ایسے ہی بہت سے نوجوان ہیں جن کی سوچ پرانی اور بڈھوں کی سی ہے۔ بہر حال ہماری مراد اس طبقہ سے ہے جو مخصوص طرز فکر رکھتا ہے اور جس کی تعداد روبہ افزائش ہے اور آئندہ چل کر بڈھوں اور جوانوں سب کا طرز فکر یہی ہو جائے گا اور اگر خدا نخواستہ اس

نسل کی رہنمائی اور ہدایت کی فکر نہ کی گئی تو نسل آگے چل کر مکمل طور پر ہاتھ سے نکل جائے گی۔ یہ مسئلہ ہمارے ملک میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ گو یہ مسئلہ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی تھا اور ہے لیکن وہ ہم سے پہلے اس کی فکر میں پڑ گئے ہیں، اور انہوں نے سنجیدگی سے اس پر غور شروع کر دیا ہے لیکن ہم نے ابھی تک اس مسئلہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہے۔ ہماری نظر میں نوجوان نسل محض ہوا پرست اور شہوت پرست نسل ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم بدزبانی سے کام لیں، منبر سے انہیں سخت سست کہیں اور ان کا مذاق اڑا کر سامعین کو ہنسائیں تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا اور جیسے ہی ہم نے فریاد کی کہ اسکول کالج کے لڑکے ایسے ہیں اور لڑکیاں ایسی ہیں، پورا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دراصل ایسی باتیں تو آپ کو سلانے کے لیے ایک لوری ہیں تاکہ آپ غفلت میں رہیں، مسئلہ کے حل کی کوئی تدبیر نہ کریں اور صرف اس وقت بیدار ہوں جب پانی سر سے گزر چکا ہو۔

اپنے زمانے کے حالات اور ضروریات کو سمجھو

امام صادقؑ کا ایک قول بہت ہی پر عظمت ہے۔ تحف العقول کی پہلی جلد میں ایک حدیث آئی ہے جس کا ایک فقرہ ہے: اَلْعَالِمُ بِزَمَانِهِ لَا تَهْجُمُ عَلَيْهِ اللَّوَابِسُ یعنی جو شخص اپنے زمانے کے حالات سے آگاہ ہے، انہیں سمجھتا ہے اور اسے ان کا احساس ہے، مشتبہ اور غلط فہمی پیدا کرنے والی باتیں اس پر حملہ آور نہیں ہو سکتیں۔ تَهْجُمُ — عربی میں ہجوم کے معنی اچانک حملہ کرنے اور بے خبری میں آلینے کے ہیں۔ امام فرماتے ہیں جو اپنے

زمانے کے حالات سے واقف ہے وہ مشتبہ امور کا اس طرح شکار نہیں ہوتا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور ان کا حل دریافت نہ کر سکے کتنی عظیم بات ہے!

اس حدیث میں کچھ اور جملے بھی ہیں۔ سب تو مجھے یاد نہیں۔ ایک جملے میں فرماتے ہیں: لَا يُفْلِحُ مَنْ لَا يَعْقِلُ وَلَا يَعْقِلُ مَنْ لَا يَعْلَمُ جو سمجھتا نہیں اور جس کی سوچ صحیح نہیں وہ کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا اور جو جانتا نہیں وہ کبھی صحیح سمجھ نہیں سکتا۔ یعنی علم، عقل کو صیقل کرتا ہے۔ عقل سے مراد ہے مختلف امور کا صحیح تجزیہ کرنے اور مقدمات کو ترتیب دے کر ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی قوت۔ عقل کا دارومدار علم پر ہے۔ عقل چراغ ہے اور علم اس کا تیل۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: وَسَوْفَ يَنْجُبُ مَنْ يَفْهَمُ، جو سمجھتا ہے آخر کار اسے ضرور کامیابی ہوگی۔ اس کی محنت ضرور ٹھکانے لگے گی۔ مطلب یہ ہے کہ علم سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اس سے خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارا طرزِ عمل اَلْعَالِمُ بِزَمَانِهِ لَا تَهْجُمُ عَلَيْهِ اللَّوَابِسُ کی تعلیم کے بالکل اُلٹ ہے۔ ہم اول تا آخر اور من الباب الی المحراب اپنے زمانہ سے بے خبر ہیں۔ ہم یونہی بیٹھے بے خبری کے عالم میں اونگھتے رہتے ہیں۔ جب کوئی مسئلہ پیش آتا ہے مثلاً یہ کہ کیا زمینوں کو کسانوں میں تقسیم کر دیا جائے؟ کیا قانونِ اصلاحِ اراضی مناسب ہے؟ تو یہ مسئلہ بے خبری میں ہم پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہم اپنے زمانہ کے حالات اور ضروریات سے قطعی "نابلد" ہیں، ہم نہ ان باتوں کی پیش بینی کرتے ہیں، نہ یہ حساب لگاتے ہیں کہ کیا بات ضروری ہے اور کن حالات میں کیا کرنا چاہیے۔

چونکہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے ہم اس سے بالکل بے خبر ہیں، اس لیے جب عورت کے سماجی حقوق کا مسئلہ اٹھتا ہے تو

ہمیں یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ ہم اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ اپنی ذہنی قوتوں کو مجتمع کر کے یہ سمجھیں کہ کیا یہ واقعی کوئی سنجیدہ مسئلہ ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کو سماجی حقوق دیے جائیں۔ کیا واقعی وہ اپنی بات میں سنجیدہ ہیں کیا واقعی وہ اپنی زیادتیوں کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ اس سارے قضیے کا مقصد ہی کچھ اور ہو اور یہ اس سے کچھ اور ہی فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ آئندہ بھی ایسے مشتبہ مسائل اٹھتے ہی رہیں گے لیکن ہم ہنوز غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔

اب سے ساٹھ سال یا سو سال پہلے بھی اسی طرح کے مسائل تمام اسلامی ممالک میں اٹھے تھے اور نوجوان نسل کی ذہنی رہنمائی کا سوال پیدا ہوا تھا لیکن ان لوگوں نے ہم سے پہلے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔

اب کیا کرنا چاہیے؟

نئی نسل کی رہنمائی کے لیے کوئی پروگرام وضع کرنے سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ یہ خیال ہمارے ذہنوں میں پوری طرح جاگزیں ہو جائے کہ مختلف ادوار میں رہنمائی اور ہدایت کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور ان تدابیر پر عمل کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مختلف مزاج رکھنے والے افراد کے معاملے میں بھی مختلف حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ خیال تو ہمیں اپنے دماغ سے بالکل نکال دینا چاہیے کہ ہم جدید نسل کی رہنمائی قدیم اور فرسودہ طریقوں سے کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ اس نئی نسل کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ عام طور پر اس نسل کے بارے میں دو قسم کا طرز فکر پایا جاتا ہے۔

اور ان کے بارے میں دو ہی قسم کی رائے قائم کی جاتی ہے۔

ایک طبقہ کی رائے میں تو یہ لوگ خام خیالی میں مبتلا ہیں، مغرور ہیں، ہوا و ہوس میں گرفتار اور شہوت پرست ہیں۔ غرض ان میں ہزاروں عیب ہیں۔ یہ طبقہ ہمیشہ اس نسل کو برا بھلا کہتا اور مطعون کرتا ہے۔

مگر خود نوجوان نسل کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ انہیں اپنے آپ میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ وہ خود کو مجسمۂ عقل و ہوش، نہایت ذہین اور بلند خیال سمجھتا ہے۔ پرانی نسل نئی نسل کو کافر اور فاسق کہتی ہے اور نئی نسل پرانی کو جاہل اور احمق ـــــ یہ انہیں کہتے ہیں کہ تم کافر ہو، شہوت پرست ہو اور وہ انہیں کہتے ہیں کہ تم نادان ہو، سمجھتے نہیں۔

البتہ اصولی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر اگلی نسل پچھلی نسل سے بہتر ہو سکتی ہے اور بدتر بھی۔

تقریر کے آغاز سے پہلے سورۂ احقاف کی جو آیات میں نے تلاوت کی تھیں، وہ میری رائے میں دونوں نسلوں کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ایک نسل اچھی ہے دوسری بگڑی ہوئی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد میں آنے والی ہر نسل پہلی نسل سے خراب ہی ہوتی ہے اور دنیا روز بروز زیادہ بگاڑ کی طرف جا رہی ہے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہر بعد میں آنے والی نسل پہلی نسل سے بہتر ہوتی ہے اور اسکے انحطاط کا کوئی سوال ہی نہیں۔

آیات یہ ہیں:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّى إِذَا بَلَغَ

أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ. (سورۂ احقاف، آیت ۱۵)

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ سے بھلائی کی تلقین کی۔ اس کی ماں نے تکلیف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور تکلیف اٹھا کر اسے جنا۔ اس کے حمل سے دودھ چھڑائی تک کی مدّت تیس مہینے ہے۔ جب وہ پختہ عمر کو پہنچ گیا اور چالیس سال کا ہو گیا تو کہنے لگا اے میرے پروردگار! مجھے توفیق عطا کر میں اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے، شکر ادا کروں اور ایسے نیک کام کروں جس سے تو راضی ہو۔ پروردگار! تو مجھے نیک اولاد دے۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور تیرے امر کو تسلیم کرتا ہوں۔

اس آیت میں نسلِ صالح کے طرزِ فکر کا بیان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت سید الشہداءؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ آپ اس آیت کا مصداقِ کامل ہیں تاہم آیت عام ہے۔ اس آیت میں صالح نسل کی پانچ چھ خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تو ہے اللہ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کی قدر شناسی اور ان پر شکر گزاری رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ خدا کا نیک بندہ ان نعمتوں اور ان احسانات کے پیشِ نظر جو اللہ نے اس پر اور اس کی گزشتہ نسل پر کیے ہیں۔ کہتا ہے: خدایا مجھے

طاقت دے کہ میں تیرے احسانات کی قدر کروں اور تیری نعمتوں سے تیری مرضی کے مطابق استفادہ کروں۔ ہر نعمت کا اصل شکر یہی ہے کہ اس سے وہ فائدہ اٹھایا جائے جس کی وہ مستحق ہے۔

صالح نسل کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالے سے عمل کی توفیق مانگتی ہے اور ایسے عمل کی کوشش کرتی ہے جو مفید ہو اور جس سے خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل ہو۔ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ آنے والی نسل کی صلاح و فلاح اور اصلاح کی طرف بھی توجہ دیتی ہے۔ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں سے توبہ کرتی اور خدا کی طرف رجوع کرتی ہے۔ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالے کے تکوینی اور تشریعی تمام احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے کیونکہ ان احکام سے سرتابی ہلاکت اور بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔

اس نسل کے بارے میں اللہ تعالے فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ۔ (سورۃ احقاف۔ آیت ۱۶)

یہاں پر جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک مخصوص فرد مراد نہیں۔ اللہ تعالے فرماتا ہے کہ یہ نسل اور یہ افراد ایسے ہیں کہ ہم ان کے نیک اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں۔ وہ جنتی

ہیں جن سے سچا وعدہ کیا گیا ہے۔
اس کے بعد کی آیت بگڑی ہوئی نسل کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ۔ (سورۃ احقاف۔ آیت ۱۷)

یہ نسل مغرور ہے، اس کے خیالات ناپختہ و خام ہیں۔ دو لفظ کیا اس کے کان میں پڑ گئے۔ اب وہ کسی بات کی پابند نہیں رہی۔ خدا کی بندگی اسے قبول نہیں۔ ماں باپ کو وہ ڈانٹتی اور ان کی تحقیر کرتی ہے۔ ان کے خیالات اور ان کے عقائد پر ہنستی ہے۔ نئی نسل کا بگڑا ہوا جوان اپنے والدین سے کہتا ہے:

اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ کیا تم مجھے اس خرافات سے ڈراتے ہو کہ قیامت آئے گی اور ایک دوسری دنیا اور ایک دوسری زندگی ہوگی حالانکہ ماضی میں کتنی ہی نسلیں اس دنیا میں آئیں، اپنی زندگی کے دن پورے کر کے چلی گئیں اور رفت گزشت ہو گئیں۔ دیندار والدین اپنے عقیدے اور دین و ایمان کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ اپنے عزیز بیٹے کی ایسی باتیں سن کر وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں وَیْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ "کم بخت ایمان لے آ۔ خدا کا وعدہ سچا ہے۔" یہ ایک بڑا دردناک منظر ہے کہ دیندار والدین اپنی آنکھوں سے یہ دیکھیں کہ ان کا چہیتا بیٹا بے دین اور کافر ہو گیا۔ وہ خدا سے فریاد کرتے

ہیں وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ مگر بیٹا کہتا ہے مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ
یہ سب قصے کہانیاں ہیں جو اگلے وقتوں کے لوگوں نے گھڑی تھیں۔

یہ آیات دو مختلف نسلوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک صالح نسل کا نقشہ پیش کرتی ہے جبکہ دوسری بگڑی ہوئی نسل کا ـــ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری نئی نوجوان نسل کا کیا حال ہے ؟

آج کی نوجوان نسل

ہماری نوجوان نسل میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ چونکہ یہ نسل ایسے احساسات رکھتی ہے جن کا قدیم زمانے میں وجود نہیں تھا" اس لیے اس کا ایک خاص حق ہے لیکن چونکہ یہ فکری اور اخلاقی کجروی میں بھی مبتلا ہے اس لیے اس کجروی کا علاج بھی ہونا چاہیے لیکن یہ علاج اس نسل کی خوبیوں کو پیش نظر رکھے بغیر اور اس کے احساسات اور خواہشات کا احترام کیے بغیر ممکن نہیں۔ پرانی نسل کے خیالات اتنے وسیع اور اس کے احساسات اور اس کی آرزوئیں اتنی بلند نہیں تھیں اس لیے نئی نسل کی آرزوؤں کا احترام ضروری ہے۔ خود اسلام نے ان چیزوں کا احترام روا رکھا ہے۔ اگر ہم نے ان امور کی طرف توجہ نہ دی تو پھر آنے والی نسل کے فکری و اخلاقی بگاڑ کا سدباب محال ہے۔ فی الحال ہم نے اس نسل کے بارے میں جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ صرف عیب جوئی، مذمت اور تنقیص کی روش ہے۔ ہم ہمیشہ نالاں رہتے ہیں کہ سینما ایسا ہے اور تھیٹر ویسا ہے۔ بڑے ہوٹلوں میں یہ خرابیاں ہیں، ناچ میں وہ خرابی ہے اور سوئمنگ پول میں یہ برائی۔ یہ جو ہم ہر وقت واویلا مچاتے رہتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ اس بگاڑ کو دور کرنے کے لیے بنیادی غور و فکر کی ضرورت ہے۔

اس نسل کی شکایات کا

احساس کرنا چاہیے

بنیادی غور و فکر کے سلسلے میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہم اس نسل کو سمجھیں۔ اس کی ذہنی اور فکری شکایتوں پر جو در حقیقت بیداری کا نشان ہیں غور کریں یعنی ان شکایتوں کو سمجھیں جن کو یہ محسوس کرتی ہے اور پچھلی نسل محسوس نہیں کرتی تھی۔

پرانے زمانے میں لوگوں کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ سب دروازے بند تھے اور دروازے کیا کھڑکیاں تک بند تھیں۔ کسی کو باہر کی خبر نہیں تھی۔ ایک شہر کے لوگوں کو دوسرے شہر والوں کی نسبت کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک ملک کو دوسرے ملک کے بارے میں خبر نہیں تھی۔ آج یہ سب دروازے اور کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ علوم پھیل رہے ہیں۔ وہ دنیا کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی طاقتوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں طاقتوں کے مرکزوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں مساوات دیکھتے ہیں انہیں دنیا کی مختلف تحریکوں، بغاوتوں اور انقلابوں سے واقفیت ہے۔ جوانوں کو ان باتوں کا شدید احساس ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ آج کا نوجوان پوچھتا ہے: ہم کیوں سب سے پسماندہ ہیں؟

بقول شاعر:

سخن درست بگویم، نمی توانم دید\
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم

دنیا کیوں اس طرح گھوڑے پر سوار سیاسی، معاشی اور سماجی آزادی اور

شرکت و عظمت کی طرف دوڑ رہی ہے؟ ہم یا تو بدستور سو رہے ہیں یا زیادہ سے زیادہ دور سے تماشا دیکھ رہے اور انگڑائیاں لے رہے ہیں۔

پرانی نسل ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی اور نہ اسے ان کا احساس تھا۔ نئی نسل کو حق ہے کہ وہ پوچھے کہ بت پرست جاپان اور مسلمان ایران نے ایک ہی سال اور ایک ہی وقت میں کوشش شروع کی تھی کہ نئے تمدن اور جدید صنعت کی برکت سے مالا مال ہوں۔ جاپان تو وہاں پہنچ گیا جہاں وہ خود یورپ پر چشمک زن ہے اور ایران کی جو حالت ہے وہ ہم دیکھ رہے ہیں۔

ما و لیلیٰ ہم سفر بودیم اندر راہِ عشق

او بہ مطلب ہا رسید و ما ہنوز آوارہ ایم

آپ کے خیال میں نئی نسل کو حق ہے یا نہیں کہ وہ یہ سوال کرے؟

پرانی نسل اجنبی تسلط کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتی۔ نئی نسل اسے محسوس کرتی ہے تو کیا یہ کوئی گناہ ہے؟ اگر یہ احساس نہ ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ عذاب و بدبختی ہی ہمارا مقدر ہے مگر جب یہ احساس پیدا ہو گیا تو معلوم ہوا کہ خداوند تبارک و تعالیٰ اس بدبختی سے ہمیں نجات دینا چاہتا ہے۔

پرانے زمانے میں لوگوں کی سوچ کی سطح پست تھی۔ وہ بہت کم شک اور تردد میں مبتلا ہوتے تھے اور بہت کم کسی بات کے متعلق سوال پوچھتے تھے۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ جب ذہنی سطح بلند ہو جاتی ہے تو وہ سوالات ذہن میں آنے لگتے ہیں جو پہلے نہیں آتے تھے۔ ہمیں ان کا شک دور کرنا چاہیے اور ان کے سوالوں کا ایسا جواب دینا چاہیے جو ان کی ذہنی و فکری سطح سے ہم آہنگ ہو۔ ہم ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی عوام کی سطح پر آجاؤ بلکہ یہ تو لوگوں کو حقائق اور معارف اسلامی سے آگاہ کرنے کا نہایت ہی مناسب موقع ہے۔ کسی ان پڑھ

جاہل سے حقیقت بیان نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ پرانی نسل کی ذہنی سطح پست تھی۔ اس لیے اس کو سمجھانے اور تبلیغ کرنے کے لیے ایک خاص طرزِ بیان اور خاص قسم کی کتابوں کی ضرورت تھی لیکن اب وہ طرزِ بیان اور وہ کتابیں بیکار ہیں۔ اس سلسلے میں بڑی اصلاح درکار ہے۔ آج کے طرزِ استدلال، آج کی زبان اور موجودہ خیالات سے آگاہی حاصل کیے بغیر اس نسل کی ہدایت و رہبری کا فریضہ انجام نہیں دیا جاسکتا۔

پرانی نسل کی ذہنی سطح اس قدر پست تھی کہ اگر کوئی شخص ایک ہی مجلس میں متضاد باتیں کرتا تو کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا اور کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا لیکن آج جیسے ہی کوئی واعظ منبر پر پہنچتا ہے، دس بارہ جماعت پڑھے ہوئے بچے کے ذہن میں بھی دس اعتراضات آجاتے ہیں۔ اس کے خیالات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چپ رہو فضول باتیں مت کرو۔

پرانے زمانے میں یہ بات نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص ایک ہی مجلس میں نظم یا نثر میں ہزار متضاد باتیں کہہ جاتا تھا اور کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں ایک دوسری کی ضد اور نقیض ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب تاج نیشاپوری تہران آئے تھے، چونکہ بہت خوش آواز تھے، جب وہ تقریر کرتے تھے تو لوگوں کا بڑا مجمع ہوتا تھا۔ بڑے بڑے اجتماع ہو جاتے تھے۔ ایک دن اس وقت کے صدرِ اعظم نے ان سے کہا کہ اب اتنے آدمی آپ کا وعظ سننے کے لیے جمع ہو گئے ہیں تو آپ دو چار کام کی باتیں ان سے کیوں نہیں کہتے، لوگوں کا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟

تاج نے جواب دیا کہ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کوئی کام کی بات کہی جائے۔ کام کی بات تو ان سے کہی جاتی ہے جن کو کچھ سمجھ ہو۔ ان کو بالکل

سمجھ نہیں۔

صدرِ اعظم نے کہا: خیر ایسا بھی نہیں ہے۔

تاج نے جواب دیا: ایسا ہی ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں اور کسی دن ثابت کرکے دکھا دوں گا۔

ایک دن جب صدرِ اعظم موجود تھے تاج نے مجلس شروع کی اور کوفہ میں داخلۂ اہلبیت کا قصہ بیان کرنے لگے۔ خوش الحانی سے دردناک اور دل دوز اشعار پڑھے۔ خوب گریہ وبکا ہوا۔ یکایک تاج نے کہا:

ٹھیرو ذرا ٹھیرو! لوگ خاموش ہو گئے۔ تاج کہنے لگے میں تمہارے سامنے وہ منظر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ابو عبداللہ کے بچوں پر کوفہ میں کیا گزری۔ جب اہل بیت کوفہ پہنچے تو سخت لو چل رہی تھی۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی پیاس کے مارے بچوں کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں اونٹ کی ننگی پیٹھ پر سوار کیا گیا تھا۔ چونکہ زمین پر برف پڑی ہوئی تھی' اونٹ پھسل پھسل کر گر رہے تھے۔ بچے اونٹوں پر سے زمین پر گرتے تھے اور پکارتے تھے ہائے پیاس! ہائے پیاس!

تاج نے اس جملہ کو ایک بار پھر دہرایا۔ لوگ ماتم کر رہے تھے اور رو رہے تھے۔ آخر جب تاج منبر سے نیچے آئے تو کہنے لگے: میں نہیں کہتا تھا کہ ان لوگوں کو کچھ سمجھ نہیں۔ میں ایک طرف تو کہتا ہوں کہ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ ساتھ ہی دوسری طرف میں یہ بھی کہتا ہوں کہ زمین یخ زدہ تھی۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہوا تو اتنی گرم ہو اور زمین یخ زدہ ہو۔

(یہ قصہ میں نے مرحوم آیت اللہ سید صدر الدین سے سنا تھا)۔

ملحدانہ مکاتبِ فکر کی طرف رجحان کے اسباب

دوسروں نے جو اس نسل کو انحراف پر آمادہ کیا ہے وہ بھی اسی طرح کہ انہوں نے ان کی ضرورتوں کو سمجھا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ مادہ پرست مکاتبِ فکر جو ہمارے ملک میں وجود میں آئے اور انہوں نے اپنے ملحدانہ مقاصد کے لیے فدائی جمع کر لیے تو یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس نسل کو ایک ایسے مکتبِ فکر کی ضرورت ہے جو اس کے سوالات کا جواب دے سکے۔ لہٰذا ایک مکتبِ فکر اسے پیش کر دیا گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس نسل کی بڑی سماجی آرزوئیں ہیں اور وہ انہیں پورا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے بڑی محنت اور کوشش کی اور اس کے نتیجہ میں بالآخر اپنے گرد کافی افراد جمع کر لیے۔ آدمی جب کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو پھر وہ اس کے اچھے برے ہونے کی فکر نہیں کرتا۔ معدے کو جب غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر اس بات کی اہمیت نہیں رہتی کہ غذا کیسی ہے۔ جو کچھ مل جائے اس سے پیٹ بھر لیا جاتا ہے۔ روح بھی جب یہ تشنگی محسوس کرتی ہے کہ کوئی ایسا مکتبِ فکر ملے جو اس کے سوالوں کا معین اصولوں کے مطابق جواب دے سکے اور عالمی اور سماجی مسائل یکساں طور پر حل کر سکے تو وہ پھر اس بات کو اہمیت نہیں دیتی کہ اس مکتبِ فکر کا استدلال قوی ہے یا ضعیف۔ آدمی کو استدلال کے قوی یا ضعیف ہونے کی اتنی فکر نہیں جتنی اس کی ہے کہ کوئی ایسا باقاعدہ نظریہ ہو جو اس کے ہر سوال کا یکساں طور پر جواب دے سکے۔ ہمارا چونکہ فلسفے سے تعلق ہے ہمیں

معلوم ہے کہ ان کی باتیں کس قدر لغو ہیں لیکن انہوں نے اپنا فلسفہ اس وقت پیش کیا جب نئی ضرورتوں کی وجہ سے ایک خلا موجود تھا۔ یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ اس خلا کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ذہنی نشوونما کی علامت

بچہ شیر خوارگی کے دوران ہی جب اس کی دماغی اور ذہنی قوتیں ایک حد تک نشوونما پا لیتی ہیں' اپنے اردگرد کی چیزوں کے متعلق سوال شروع کر دیتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے سوالوں کے جواب اس کی سمجھ کے مطابق دیئے جائیں۔ یہ ہرگز نہیں کہنا چاہیے کہ فضول بات مت کرو۔ تمہیں اس سے کیا؟ اس کا سوال خود اس کی ذہنی صحت کی علامت اور اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی ذہنی قوتیں نشوونما پا رہی ہیں۔ اس کے سوالات نیچر کی طرف سے ایک اعلان ہیں کہ ایک نئی ضرورت پیدا ہوئی ہے لہٰذا اس کی طرف دھیان دینا چاہیے۔

یہی حال معاشرے کا ہے۔ اگر معاشرے میں ایک نیا احساس پیدا ہو تو یہ اس کی ترقی اور نشوونما کی علامت ہے۔ یہ بھی نیچر کی طرف سے نئی ضرورت کا اعلان ہے۔ ان باتوں کو ہوا و ہوس اور شہوت سے الگ رکھنا چاہیے اور یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے کہ ان باتوں کو بھی ہوا و ہوس سمجھ لیا جائے اور فوراً اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات پڑھنی شروع کر دی جائیں جیسے:

إِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

یا

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ

قرآن کیسے متروک ہوگیا

ہمیں اس نئی نسل سے شکایت ہے کہ یہ قرآن سے ناآشنا ہے۔ اسکولوں میں قرآن کیوں نہیں پڑھتی؟ یونیورسٹی تک پہنچ جاتی ہے مگر قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ واقعی افسوس کی بات ہے کہ یہ حالت ہے لیکن ہمیں چاہیے کہ خود اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہم نے اس سلسلے میں اب تک کیا کیا ہے؟ کیا جو قرآن اور اسلامیات اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے کیا اس کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ نوجوان نسل قرآن سے پوری واقفیت حاصل کرے گی؟

تعجب تو یہ ہے کہ خود پرانی نسل نے بھی قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ پھر نئی نسل سے کیا گلہ کہ وہ قرآن سے ناآشنا ہے؟ ہم نے خود تو قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ نئی نسل قرآن سے وابستہ رہے۔ اب میں ثابت کرتا ہوں کہ کس طرح ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

اگر کسی کا علم قرآنی علم ہے یعنی وہ قرآن میں زیادہ تدبر کرتا ہے اور قرآن کی تفسیر سے پوری طرح واقف ہے تو ایسے شخص کا ہمارے معاشرے میں کتنا احترام ہوگا؟ کتنا نہیں۔

اس کے برخلاف اگر کسی کو آخوند ملا کاظم خراسانی کی کتاب "کفایہ" پر عبور حاصل ہے تو اسے ایک محترم ہستی سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہم نے خود قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ قرآن سے اسی اعراض کا نتیجہ ہے کہ ہم اس بدبختی اور نکبت میں گرفتار ہیں۔ ہم ان لوگوں میں شامل ہیں جن کی رسولِ اکرمؐ خدا سے شکایت کرتے تھے:

یَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۔

ہمارے ایک عالم جو کچھ عرصہ قبل عتباتِ عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے، بیان کرتے تھے کہ میں آیت اللہ العظمیٰ آقائے خوئی مدظلہ العالی کی خدمت میں پہنچا تو میں نے کہا کہ آپ نے تفسیر کا درس جو آپ پہلے دیتے تھے، کیوں ترک کر دیا (آپ سات آٹھ سال پہلے نجف میں درس دیتے تھے۔ اس کا کچھ حصہ البیان فی تفسیر القرآن کے نام سے چھپ بھی گیا ہے)۔

آپ نے جواب دیا: تفسیر کے درس میں موانع اور مشکلات ہیں۔

میں نے ان سے کہا: علامہ محمد حسین طباطبائی (رضوان اللہ علیہ) تو قم میں درس جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنا بیشتر وقت اسی میں صرف کرتے ہیں۔

آیت اللہ خوئی نے کہا کہ آقائے طباطبائی نے "تضحیہ" کیا ہے یعنی انہوں نے خود کو قربان کر دیا ہے۔ اپنی سماجی شخصیت کو مٹا دیا ہے۔ بات صحیح تھی۔

عجیب تر بات یہ ہے کہ ہمارے اہم ترین مراکز میں اگر کوئی شخص اپنی عمر قرآن کے درس و تدریس میں صرف کرتا ہے تو اس کو ہزاروں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اسے روزی نہیں ملتی۔ اس کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ غرض وہ ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے لیکن اگر وہ اپنی عمر "کفایہ" جیسی کتابوں پر صرف کرتا ہے تو وہ سب کچھ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو ہر چہار سمت سے کفایہ سے واقفیت ہے۔ یعنی کفایہ سے بھی واقفیت ہے۔ اس کے ردّ سے بھی واقفیت ہے اور اس کے ردّ کے ردّ سے بھی واقفیت ہے ـــــ مگر دو آدمی بھی ایسے نہیں ملتے جو قرآن

سے صحیح معنی میں واقف ہوں۔ جب کسی سے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، وہ یہی کہتا ہے کہ تفسیر دیکھنی چاہیے۔ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جو نسل جو قرآن سے یہ سلوک کر رہی ہے یہ توقع رکھتی ہے کہ نئی نسل قرآن کو پڑھے اسے سمجھے اور اس پر عمل کرے۔

اگر پرانی نسل قرآن سے منحرف نہ ہو گئی ہوتی تو نئی نسل ہرگز منحرف نہ ہوتی۔ رسول اللہ نے قرآن کے بارے میں فرمایا ہے: اِنَّہٗ شَافِعٌ مُّشَفَّعٌ وَمَاحِلٌ مُّصَدَّقٌ یعنی قرآن دربار خداوندی میں سفارش کرتا ہے اور اس کی سفارش قبول کی جاتی ہے اور جن لوگوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے ان کی شکایت کرتا ہے اور اس کی شکایت بھی منظور ہوتی ہے۔

پرانی نسل اور نئی نسل دونوں نے قرآن پر ظلم کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ پہلے پرانی نسل نے ظلم کیا اور اب نئی نسل ظلم کر رہی ہے۔

نوجوان نسل کی رہنمائی کے لیے سب سے پہلے دو کام انجام دینے کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ اس نسل سے آگاہی حاصل کی جائے اور پھر علاج کی فکر کی جائے اس کی ضرورتوں اور شکایتوں کو سمجھے بغیر جو قدم بھی اٹھایا جائے گا وہ غلط ہوگا۔ دوسرے یہ کہ پرانی نسل کو پہلے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ پرانی نسل کو اپنے سب سے بڑے گناہ سے توبہ کرنی چاہیے اور قرآن کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ہم قرآن کے زیر سایہ ترقی و کمال کی طرف آگے بڑھ سکتے ہیں۔

خُطبہ اور منبرؑ

(۱)

اَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیعِ العَلِیمِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیمِ
بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ
اَلرَّحمٰنُ عَلَّمَ القُراٰنَ
خَلَقَ الاِنسَانَ
عَلَّمَہُ البَیَانَ

آج کی گفتگو کا موضوع ہے "خطبہ اور منبر" چونکہ خطبہ کے معنی بھی تقریر ہیں اس لیے اس تقریر کا موضوع "تقریر" ہے یعنی یہ آپ اپنا موضوع ہے۔ تقریر کرنے کو علمی زبان میں خطابت کہتے ہیں۔ منطقیوں نے کلام کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں جن کو "صناعاتِ خمسہ" یعنی پانچ ہنر کہا جاتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک خطابت ہے۔

یہ تقسیم ارسطو کی قائم کی ہوئی ہے۔ اس وقت موقع نہیں کہ خطابت کی تاریخ بیان کی جائے یا خطابت کی فنی اقسام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر گفتگو کی جائے۔ بعض منطقیوں نے خاص طور پر اس کی خوب تفصیل بیان کی ہے۔ اگر ہم صرف اس تفصیل کو پیشِ نظر رکھیں جو بوعلی سینا کی کتاب "شفا" میں بیان کی گئی ہے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مگر ان باتوں پر

بحث مقصود نہیں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ صرف نظری پہلو سے گفتگو نہ کی جائے۔ چونکہ ہماری گفتگو کا موضوع ہے "خطبہ اور منبر" اور منبر سے مراد ہے دینی موضوعات پر تقریر — اس لیے ہماری آج کی گفتگو دینی خطابت کے بارے میں ہے خطابت اور کلام کی دوسری اقسام سے غرض نہیں۔ آج میں اسلام سے خطابت کے تعلق پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

خطابت کا اسلام سے تعلق

خطابت کا اسلام سے تعلق کئی پہلو سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خطابت ایک فن اور ایک ہنر ہے اور کسی بھی فن یا صنعت کو کسی نظریے یا عقیدے کی تقویت کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اسے کمزور کرنے کے لیے بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ فن اور صنعت میں کیا فرق ہے۔

اگر آپ اصفہان میں مسجد شاہ جائیں اور گنبد شیخ لطف اللہ کو دیکھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ کس طرح علم و ہنر اور صنعت نے دین کی اعانت کی ہے۔ یعنی مذہبی احساسات اور ذوقی ہنر نے کس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور ایک مذہبی شعار نے کس طرح ہنر اور صنعت کا روپ دھارا ہے۔ خطاطی بھی ایک ہنر ہے۔ نفیس قرآنی کتبے، مثلاً وہ کتبہ جو مقصورۂ مشہد کے ایوان میں بایسنقر نے لکھا ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہنر اور صنعت کس طرح مذہبی احساسات کی تقویت کا باعث بن سکتے ہیں۔

خطابت بھی چونکہ ایک ہنر اور فن ہے اور ہنر اور فن معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا شمار معاشرتی عوامل میں ہوتا ہے اس لیے خطابت بھی معاشرتی عوامل میں سے ایک ہے بلکہ اس کا جتنا اثر معاشرے پر ہوتا

ہے کسی اور فن کا نصیب ہوتا۔ اس لحاظ سے اگر آپ فن خطابت پر نظر ڈالیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس فن کا تعلق بھی اسلام سے ایسا ہی ہے جیسا اور بہت سے فنون کا۔ جس طرح اسلام میں سنگتراش پیدا ہوئے اور سنگتراشی نے ترقی کی' آئینہ بند پیدا ہوئے اور آئینہ بندی نے ترقی کی' گل کار پیدا ہوئے اور پچی کاری اور گل کاری نے ترقی کی اسی طرح اسلام نے اپنے دامنِ عاطفت میں بڑے بڑے خطیبوں کی بھی پرورش کی ہے۔ بہت سے تو خطیب ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اسمائے رجال اور تراجم کی کتابوں میں متعدد ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے خطیب کے نام سے شہرت پائی ہے۔ ایک صاحب خطیب رازی تھے' دوسرے خطیب مصری — ایک خطیب دمشقی کہلاتے تھے' ایک خطیب تبریزی' ایک خطیب حصکفی — یہ سب وہ لوگ تھے جن کی ان کے اور مابعد کے زمانے میں بحیثیت خطیب کے شہرت ہوئی۔ خوش قسمتی سے آج بھی ہمارے یہاں بڑے بڑے مذہبی خطیب موجود ہیں۔ مرحوم سید جمال الدین افغانی علاوہ اور خوبیوں کے ایک زبردست خطیب بھی تھے۔ انہوں نے مصر میں اپنے خطبوں کے ذریعے سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ وہ لوگوں کو رلاتے تھے' ان کی اپنی حالت پر کسی اور چیز پر نہیں۔ اسلام نے اپنے دامن میں بڑے بڑے خطیبوں کی پرورش کی ہے۔ اس کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ میں صرف اس قدر اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

بہرحال اس نقطۂ نگاہ سے خطابت کا بھی اسلام سے وہی تعلق ہے جو دوسرے فنون کا — اسلام نے مختلف اقسام کے ہنرمند اور صناع پیدا کیے ہیں۔ ان ہی میں ایک طبقہ خطیبوں اور شاعروں کا بھی ہے۔

خطابت کی ترقی میں اسلام کا اثر

خطابت کی پیشرفت اور ترقی پر اسلام نے براہ راست جو اثر ڈالا ہے وہ خطابت اور اسلام کے تعلق کا ایک دوسرا رخ ہے۔ اسلام نے نہ صرف فن خطابت کو متاثر کیا بلکہ اسے ایک بلند مقام بھی عطا کیا۔ جن فنون کا تعلق زبان سے ہے یعنی شعر گوئی، تحریر اور تقریر۔۔۔ ان میں سے عربوں کو شعر گوئی میں کافی کمال حاصل تھا۔ عرب فطری طور پر شاعر ہیں۔ قبل از اسلام بھی ان میں ممتاز شعراء موجود تھے۔ مگر اپنی محدود معلومات کی وجہ سے وہ محدود خیالات ہی کا اظہار اپنے اشعار میں کر سکتے تھے، پھر بھی جن افکار تک ان کی رسائی تھی ان کی حدود میں رہتے ہوئے وہ بہت عمدہ شعر کہتے تھے لیکن خطابت کے میدان میں عربوں کو وہ کمال حاصل نہیں تھا۔ باوجود اس کے کہ زمانۂ جاہلیت کے اشعار کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے، خطابت کے بہت کم نمونے ملتے ہیں۔ پھر بھی کچھ نمونے موجود ہیں تیسرے فن یعنی تحریر کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ زمانۂ جاہلیت کی کوئی تصنیف ہمارے پاس نہیں جو اس زمانے کے طرز تحریر کی یادگار ہو۔

اسلام نے آکر ان تینوں فنون کو متاثر کیا۔ شعر کے معانی میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اگر زمانۂ اسلام کے اشعار کا موازنہ زمانۂ جاہلیت کے اشعار سے کیا جائے تو خیالات میں وسعت کے لحاظ سے نمایاں فرق محسوس ہو گا۔ خطابت میں اسلام نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اسلام ہی کی بدولت تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا۔

ایک کتاب ہے جس کا نام "جمہرة خطب العرب" ہے۔ اس مجموعہ میں

زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام دونوں ادوار کے وہ خطبے شامل ہیں جو عربوں نے دیے۔ اگر آپ ان خطبوں پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ خیالات کے لحاظ سے بہت سادہ اور سطحی ہیں لیکن جب آپ اسلامی دور کے خطبے دیکھیں گے تو آپ کو ایک انقلاب سا محسوس ہوگا۔ زمانۂ جاہلیت کے خطبوں میں سے کچھ فقرے اکثم بن صیفی اور مشہور عرب خطیب قس بن ساعدہ ایادی کے نقل ہوئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ بہت سادہ اور سطحی ہیں۔ جیسے ہی آپ اسلامی دور میں داخل ہوں گے اور آپ کی نظر رسولِ اکرمؐ کے خطبوں پر پڑے گی تو آپ کو ایک اور ہی انداز نظر آئے گا۔ ان میں خیالات مختلف ہیں۔ معارف کا بیان ہے، روحانیت ہے، اجتماعی اور اخلاقی مسائل ہیں، عقل و دانش ہے جبکہ زمانۂ جاہلیت کے خطبوں میں ان سب باتوں کا وجود نہیں تھا۔ اسلام نے زبان سے متعلق تینوں فنون کو متاثر کیا ہے۔ قرآن مجید خود اعجاز بیان اور فصاحتِ لسان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور بیان کو اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت قرار دیتا ہے: اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ.

پیغمبرِ اسلامؐ پر سب سے پہلے جو آیات نازل ہوئیں ان میں قلم اور تحریر کا ذکر ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ.

اس تعلیم کے نتیجے میں نہ صرف فنِ خطابت میں انقلاب آیا بلکہ فنِ کتابت کو بھی رواج حاصل ہوا۔ یہ بات بلا سبب نہیں تھی کہ مسلمانوں نے زبان

سے متعلق علوم اور علمِ فصاحت و بلاغت کے قواعد ایجاد کیے۔

اس کے علاوہ خود رسولِ اکرمؐ اور امیر المؤمنینؑ اولین خطیب مانے جاتے ہیں۔ اس وقت موقع نہیں کہ میں ان حضرات کی تقریروں کے کچھ اقتباسات سناؤں اور ان کا موازنہ جاہل عربوں کی تقریروں کے فقروں سے کروں۔

خطابت بحیثیت ایک مذہبی فرض

جس نکتہ کے متعلق میں آج گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور خطابت کے درمیان ایک بہت مضبوط رشتہ ہے اور وہ رشتہ یہ ہے کہ ایک خاص موقع پر خطابت کو دین کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ سے سوال کیا جائے تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں وہ کونسا موقع ہے؟ جی ہاں ایک موقع ایسا ہے کہ خطابت بھی اسی طرح فرائض میں داخل ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکات، خمس وغیرہ۔ وہ موقع نمازِ جمعہ کا ہے۔

اسلام میں ایک ہفتہ وار نماز ہے جس کا نام نمازِ جمعہ ہے۔ خود قرآن مجید کی سورۂ جمعہ میں اس نماز کا خصوصی تذکرہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔

شیعہ اور سنی تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں ذکر سے نمازِ جمعہ مراد ہے۔ نمازِ جمعہ کیا ہے؟ وہی ظہر کی نماز جو جمعہ کے دن پڑھی جاتی ہے لیکن یہ نماز اور نمازوں سے مختلف ہے۔ پہلے تو یہ کہ ہر روز نمازِ ظہر کی چار رکعتیں ہوتی ہیں لیکن نمازِ جمعہ کی صرف دو۔ رہی اس کی وجہ کہ نمازِ جمعہ صرف دو

رکعت کیوں ہے۔ یہ بعد میں عرض کروں گا۔ بہر حال نماز جمعہ دو رکعت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نماز کو جماعت سے پڑھنا واجب ہے۔ باقی نمازوں یعنی نماز فجر، نماز ظہر، نماز عصر اور مغرب و عشاء کا جماعت سے پڑھنا واجب نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ جہاں نماز جمعہ ہوتی ہے اس کے ہر چہار جانب دو فرسخ تک کے لوگوں پر واجب ہے کہ اس نماز میں شرکت کریں سوائے اس کے کہ کسی عذر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جس جگہ نماز جمعہ کا اہتمام ہو اس کے ایک فرسخ تک حرام ہے کہ کسی دوسری جگہ نماز جمعہ قائم کی جائے۔ صرف وہی ایک نماز ہونی چاہیے۔

اب دیکھیے کہ اگر واقعی ایسی نماز ہونے لگے تو وہ کیسی نماز ہوگی۔ مثلاً تہران میں جس جگہ ہم اس وقت اکٹھے ہیں اگر یہاں نماز جمعہ تشکیل دی جائے اور یہاں سے شمال میں شمیران تک اور جنوب میں شہر رے تک اور اسی طرح مشرق اور مغرب میں بارہ کیلومیٹر کے فاصلے تک کے لوگ، کیونکہ دو فرسخ تقریباً بارہ کیلومیٹر بنتے ہیں، اس نماز میں شرکت کریں اور چھ کیلومیٹر کے فاصلے تک کسی اور جگہ نماز جمعہ نہ ہو تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کس قدر عظیم اجتماع ہوگا۔

یہ نماز چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے کیونکہ بکثرت احادیث و اخبار میں آیا ہے اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ:

إِنَّمَا جُعِلَتِ الْجُمُعَةُ رَكْعَتَيْنِ لِمَكَانِ الْخُطْبَتَيْنِ۔

یعنی اس نماز میں جو کمی ادا کی جاتی ہے فرض ہے کہ دو خطبے پڑھے جائیں اور یہی دو خطبے دو رکعت کے قائم مقام ہیں۔

یہی وہ بات ہے جو میں نے عرض کی تھی کہ خود دین اسلام میں ایک موقع

ایسا ہے کہ جہاں تقریر یا خطبہ جزو دین ہے، جزو نماز ہے۔
امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خطبہ خود نماز ہے۔
جب تک امام خطبہ پڑھتا رہے اور منبر سے نیچے نہ اترے
لوگوں کو خاموشی سے اس کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ سننا چاہیے
گویا کہ وہ حالتِ نماز میں ہیں۔ البتہ کچھ فرق بھی ہیں۔ مثلاً
قبلہ رو ہو کر بیٹھنا یا خود امام کا جب وہ خطبہ پڑھ رہا ہو قبلہ رو
ہونا واجب نہیں ہے۔ بہرحال اس موقع پر جو دو خطبے فرض ہیں
وہ نمازِ ظہر کی دو رکعتوں کی جگہ پر ہیں۔

جمعہ کے اجتماع کا اصل مقصد

آپ ان اسلامی احکام پر جو آپ نے پہلے نہیں سنے یا بہت کم سنے
ہیں تعجب کریں گے اور پوچھیں گے کہ جمعہ کے اس اجتماع اور اس کے ان سب
آداب کا مقصد کیا ہے۔ آپ کو اور زیادہ تعجب ہوگا جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ
اس اجتماع کا بڑا مقصد ان ہی خطبوں کا سننا ہے۔ اس سے سمجھ لیجیے کہ یہ خطبے
کس قدر اہم اور کیسے ضروری ہیں۔ ان کی اس قدر اہمیت ہے کہ جیسے ہی مؤذن
تکبیر کی صدا بلند کرے، جو شخص جہاں بھی ہو اور جو کام بھی کر رہا ہو اس کام کو چھوڑ
کر نمازِ جمعہ کے لیے نکلے اور پہلے ان دونوں خطبوں کو سنے اور پھر دو رکعت نماز
باجماعت پڑھے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہے۔ سورۂ جمعہ میں اس کا بیان ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ

خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ
فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ۔

یہ بھی بتاتا چلوں کہ ظہر کی نماز میں پہلے ظہر کے وقت اذان ہوتی ہے اور پھر نماز پڑھی جاتی ہے لیکن جمعہ کے دن اگر نماز جمعہ پڑھنی ہو تو اذان ظہر کے وقت سے پہلے دی جاتی ہے ہوتا یہ چاہیے کہ اذان اس طرح دی جائے کہ زوال آفتاب شروع ہونے تک دونوں خطبے پورے ہو جائیں۔

جیسے ہی نماز جمعہ کے لیے مؤذن کی صدا بلند ہو اس کے بعد خرید و فروخت حرام ہے۔ نص قرآنی ہے وَذَرُوا الْبَيْعَ یہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔ اس بارے میں شیعہ اور سنی کا کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کہیں صحیح طریقے سے جمعہ کی نماز ہوتی ہو اور اذان ہو جائے تو مثلاً اگر کوئی دکاندار ترازو کے پاس بیٹھا یا کھڑا ہے اور گاہک مثلاً اس سے چیز خرید رہا ہے اور وہ چھری لیے ہوئے چیز کاٹ رہا ہے تو جیسے ہی اللہ اکبر کی آواز بلند ہو، دکاندار اور گاہک دونوں پر واجب ہے کہ ہاتھ روک لیں اور فوراً نماز کے لیے چلیں۔

فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ۔

یعنی دوڑو نماز کی طرف اور چھوڑ دو خرید و فروخت۔

اس وقت خرید و فروخت حرام ہے۔ لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ فوراً جا کر خطبہ سنیں۔

جمعہ کی نماز میں ایک نہیں دو خطبے ہوتے ہیں — اس طرح کہ امام ایک خطبہ پڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور ذرا سی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اٹھ کر دوسرا خطبہ پڑھتا ہے۔

جمعہ کے خطبوں کا موضوع

یہ تو معلوم ہو گیا کہ جمعہ کے خطبہ کی کتنی اہمیت ہے کہ اس اجتماع کا خاص مقصد ہی ان خطبوں کو سننا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان خطبوں یا تقریروں میں کیا کہا جائے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اول حمد و ثنائے الٰہی، اس کے بعد خاتم الانبیاء اور ائمۂ دین پر درود و سلام، پھر وعظ اور وہ ضروری مضامین جن کی تشریح میں بعد میں کروں گا اور اس کے بعد قرآن کی ایک سورت کی تلاوت۔ یہ وہ مواد ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ اس اجتماع میں حاضری کس قدر اہم ہے، اس روایت پر غور کیجیے جس کے مطابق یہ واجب ہے کہ قیدیوں کو بھی پولیس اور جیل کے اہل کار اپنے ساتھ لائیں اور انہیں اس ہفتہ وار عام اجتماع میں شرکت کا موقع دیں۔ قیدیوں کو اپنے ساتھ حراست میں لائیں اور ان کو نگرانی میں رکھیں تاکہ انہیں فرار ہونے کا موقع نہ مل سکے یعنی یہ ضروری ہے کہ قیدی کو جیل سے باہر لایا جائے تاکہ وہ نماز جمعہ جماعت کے ساتھ ادا کرے، خطبہ سنے اور پھر اپنی جگہ واپس چلا جائے۔

امام جمعہ و جماعت کے لیے بھی کچھ آداب مقرر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ سر پر عمامہ باندھے مطلب یہ ہے کہ کوئی مختصر سی شال وغیرہ جس کے دو تین پیچ ہوں، سر پر رسولؐ اللہ کے عمامہ کی طرح لپیٹ لے۔

اللہ جناب حاجی رحیم ارباب اصفہانی کو زندہ و سلامت رکھے۔ شاید آپ میں سے بہت سے ان کو جانتے بھی ہوں۔ وہ فقہ، اصول، فلسفہ اور قدیم ریاضیات کے بڑے علماء میں سے ہیں اور مرحوم جہانگیر خان قشقائی

کے شاگرد رہے ہیں۔ مرحوم جہانگیر خاں ہی کی طرح وہ ابھی تک کھال کی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ باقی سب لحاظ سے ان کا لباس دیگر علماء ہی کی طرح ہے۔ وہی عبا قبا وہی حلیہ۔ صرف ٹوپی کھال کی اوڑھتے ہیں۔ وہ نمازِ جمعہ کے بڑے معتقد ہیں اور اصفہان میں خود نمازِ جمعہ پڑھاتے ہیں لیکن لوگ چونکہ عموماً نمازِ جمعہ میں دلچسپی نہیں رکھتے اس لیے جس شان سے ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی۔ وہ جب جمعہ کی نماز کے لیے آتے ہیں تو ایک مختصر سا عمامہ یعنی دو تین پیچ کی ایک شال سر پر باندھ کر آتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں فروردین ۱۳۳۹ھ میں اصفہان میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو جمعہ کی نماز کا تذکرہ آ گیا۔ فرمانے لگے معلوم نہیں کہ شیعہ کب نمازِ جمعہ کے ترک کا الزام اپنے اوپر سے دور کریں گے۔ سب اسلامی فرقے ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور ہمارا مذہبی مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم نے جمعہ کی نماز ترک کر رکھی ہے۔ وہ اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ کاش قم کی سب سے بڑی مسجد میں چند ملین تومان خرچ کر کے شاندار طریقے سے نمازِ جمعہ ادا کی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام کھڑے ہو کر خطبہ پڑھے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ. (سورۂ جمعہ۔ آیت ۱۱)

یعنی ان غیر تربیت یافتہ لوگوں میں ابھی تک جاہلانہ عادات اور رسوم باقی ہیں۔ جیسے ہی ان کی نظر مالِ تجارت پر پڑتی ہے یا ڈھول کی آواز ان کے کان میں آتی ہے یہ آپ کو کھڑا ہوا

چھوڑ کر ان چیزوں کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

اس آیت میں درج ذیل قصے کی طرف اشارہ ہے:

ایک روز رسولِ خدا کھڑے ہوئے جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ ڈھول کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ سامانِ تجارت آگیا ہے۔ لوگ اس ڈر سے کہ کہیں سامان ختم نہ ہو جائے، پیغمبرؐ کو کھڑا ہوا چھوڑ کر چلے آئے۔

مقصد اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ وَتَرَكُوكَ قَائِمًا یعنی "آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا" سے ظاہر ہے کہ آپ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ بیٹھ کر خطبہ پڑھنے کی بدعت معاویہ کی ایجاد ہے۔

رہی یہ بات کہ جمعہ کی نماز کا امام اور خطیب ایک ہی شخص ہونا چاہیے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خطیب کوئی اور ہو اور امامِ جماعت کوئی اور؟ تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اکثریت اسی کی قائل ہے کہ خطیب اور امامِ جماعت ایک ہی ہونا چاہیے بلکہ بعض کے نزدیک امامِ جمعہ کی اولین شرط یہی ہے کہ وہ خطبہ دینے کے قابل ہو۔ اکثر روایات میں اس بات کو اَلْاِمَامُ يَخْطُبُ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ جب امام خطبہ کے لیے کھڑا ہو تو تلوار، نیزہ یا عصا پر ٹیک لگائے اور اسی حالت میں خطبہ دے۔

جمعہ کے خطبہ کے بارے میں

امام ہشتمؑ کی روایت

جمعہ کے خطبہ میں حمد و ثنائے الٰہی، ذکرِ رسولِ اکرمؐ، ائمۂ اطہارؑ اور

قرآن کی ایک سورت کی تلاوت کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ خطیب وعظ و نصیحت کرے اور جو باتیں مسلمانوں کے لیے ضروری ہوں ان کو بیان کرے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ جمعہ کے خطبہ میں کن مضامین کا بیان ضروری ہے ہمیں ایک روایت سے ہدایت ملتی ہے۔

وسائل الشیعہ جلد اول میں ان احادیث کے ضمن میں جو خطبۂ جمعہ سے متعلق ہیں ایک حدیث علل الشرائع اور عیون اخبار الرضا کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔ اس حدیث کو فضل بن شاذان نیشاپوری نے جو ہمارے اکابر اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں امام علی رضا علیہ السلام سے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے:

إِنَّمَا جُعِلَتِ الْخُطْبَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لِأَنَّ الْجُمُعَةَ مَشْهَدٌ عَامٌّ یعنی جمعہ کے دن خطبہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ جمعہ عام اجتماع کا دن ہے اور اس دن سب لوگوں کو اس اجتماع میں شرکت کرنی چاہیے۔

فَأَرَادَ أَنْ يَكُونَ لِلْأَمِيرِ سَبَبٌ إِلَى مَوْعِظَتِهِمْ وَتَرْغِيبِهِمْ فِي الطَّاعَةِ وَتَرْهِيبِهِمْ مِنَ الْمَعْصِيَةِ.

اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ اس لیے مقرر کیا ہے تاکہ قوم کا امیر اپنی جماعت کے سامنے وعظ کہہ سکے، انہیں طاعت کی ترغیب دے سکے اور گناہوں کے برے نتائج سے ڈرا سکے۔

وَتَوْقِيفِهِمْ عَلَى مَا أَرَادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَدُنْيَاهُمْ.

اور ساتھ ہی انہیں آگاہ کر سکے کہ ان کے دینی اور دنیاوی مفاد کا تقاضا کیا ہے اور انہیں بتا سکے کہ درحقیقت ان کی

وعظ نیک کاموں کی یاد دہانی ہے ایسے طریقے سے کہ دل نرم پڑ جائے۔ لہٰذا وعظ وہ تقریر ہے جو رقتِ قلب پیدا کرے۔

لوگوں کو ہوا پرستی، شہوت رانی، سود خوری، ریاکاری سے روکنا اور موت، قیامت اور دنیا و آخرت میں اعمال کے اچھے برے نتائج کی یاد دلانا وعظ ہے۔

اس کے برخلاف خطابت کی مختلف اقسام ہیں۔ کبھی اس کا مقصد جوش دلانا اور جنگ پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی اس کا مقصد سیاسی ہوتا ہے۔ کبھی عدالت کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ کبھی اس کا استعمال دینی اور اخلاقی مقاصد کے لیے ہوتا ہے۔ کبھی میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لیے، کبھی لوگوں کو ان کے سیاسی اور سماجی حقوق سے آگاہ کرنے کے لیے، کبھی رحم کے جذبات ابھارنے کے لیے، جیسے مثلاً وہ تقریریں جو وکیل عدالت میں مجرم کی سزا میں تخفیف کرانے یا رحم کی درخواست کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی اس کا مقصد دینی و اخلاقی شعور کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں خطابت سے زیادہ وعظ کا رواج ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا خطابت کی بہت سی اقسام موجود ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں وعظ کا زیادہ رواج ہے۔ ہماری مجالس زیادہ تر وعظ کا رنگ رکھتی ہیں اور نمازِ جمعہ جس کے خطبوں میں مختلف رنگ ہو سکتے تھے ہمارے یہاں متروک ہے۔

مجالسِ وعظ کے نام سے جو چیز ہمارے یہاں باقی ہے وہ ان مجالس کی یادگار ہے جو صوفیوں نے ایجاد کی تھیں یعنی یہ کہ باقاعدہ مجلس تشکیل دی جائے۔ کچھ لوگ سننے کے لیے جمع ہوں اور ایک شخص باقاعدہ واعظ و ناصح

کی حیثیت سے گفتگو کرے۔ بظاہر یہ صوفیوں کی ایجاد ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی اس لیے بعد میں دوسروں نے بھی ایسی مجالس منعقد کیں۔ ہمارے یہاں صدیوں سے ایسی کتابیں موجود ہیں جو مجالسِ وعظ کے نام سے ترتیب دی گئی تھیں، جیسے مجالسِ سعدی اور مجالسِ رومی وغیرہ۔ یہ ایک اچھا کام تھا۔ بعد میں دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شیعوں نے سیدالشہداء کی عزاداری اور مرثیہ خوانی کی مجالس کو رواج دیا۔ یہ بھی بہت اچھا کام کیا۔

میرا خیال ہے کہ مجالسِ وعظ چونکہ ابتداء میں صوفیوں کی تقلید میں شروع ہوئی تھیں اور تصوف کی بنیاد چونکہ نفسانی خواہشات کو دبانے اور تہذیب و تزکیۂ نفس پر ہے اس لیے یہ موضوع وعظ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ ہمارے خطیب اگرچہ صوفی نہیں ہیں تاہم وہ بھی زہد اور ترکِ ہوا و ہوس ہی کے پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے وعظ اور خطبے

نہج البلاغہ میں جو امیر المومنین کے کچھ خطبات کا مجموعہ ہے، مختلف اقسام کے خطبے شامل ہیں۔ اس میں مؤثر مواعظ بھی ہیں اور پرجوش خطبات بھی۔ مفتی اعظم مصر شیخ محمد عبدہٗ نے نہج البلاغہ کی ایک مختصر شرح اور اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ وہ اپنے مقدمے میں یوں رقمطراز ہیں:

> "جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے ایسی انواع و اقسام کی عبارت ملی جس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر میری آنکھوں کے سامنے آرہا ہے۔

کبھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ لوگ شیر اور چیتے کی کھالیں پہنے حملے کے لیے تیار ہیں۔ میں خود اس قدر متاثر تھا کہ میرا دل چاہنے لگتا تھا کہ میں بھی میدانِ جنگ میں جا کر دشمنوں کا خون بہاؤں اور خود بھی جیسے پرچم کا کھاؤں۔ پھر دیکھتا تھا کہ منظر بدل گیا۔ میں ایک واعظ کے روبرو ہوں جو اپنی باتوں سے دلوں کو نرمی اور لطافت بخش رہا ہے، انہیں پاکیزگی اور صفائی عطا کر رہا ہے۔ پھر اچانک ایک اور منظر آتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ایک سیاست داں اور سماجی مصلح کھڑا ہوا عوام کے مفاد کی بات کر رہا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فرشتہ عالمِ بالا سے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے اور چاہتا ہے کہ لوگوں کو عالمِ بالا کی طرف کھینچ لے۔"

یہ واقعہ ہے کہ نہج البلاغہ میں انواع و اقسام کے خطبے ملتے ہیں۔ ان میں وعظ و نصیحت بھی ہے، توحید و معرفت کا بیان بھی۔ ان میں سیاسی خطبے بھی ہیں اور رزمیہ خطبے بھی۔ یہاں میں نمونہ کے طور پر ایک رزمیہ خطبے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نقل کرتا ہوں۔

جنگِ صفین میں لشکرِ علی اور لشکرِ معاویہ ایک دوسرے کے مقابل پہنچتے ہیں۔ حضرت علیؑ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ لشکرِ معاویہ نے پیش قدمی کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہمارا پانی روک دیا ہے۔ ہمیں اجازت دی جائے کہ فوراً جنگ شروع کر دیں تاکہ گھاٹ پر دوبارہ قبضہ کر سکیں۔

آپ نے فرمایا: ٹھیرو! ممکن ہے ہم بات چیت کے ذریعہ اس قضیے کا حل نکال لیں۔ آپ نے خط لکھ کر قاصد کے ہاتھ بھیجا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں

لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ہتھیار استعمال کرنے کی بجائے مذاکرات کے ذریعہ سے اختلافات کو دور کیا جائے۔ تم نے سب سے پہلے بڑھ کر ہمارے لشکریوں کا پانی بند کر دیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اپنے آدمیوں کو فوراً حکم دو کہ پانی کھول دیں۔ معاویہ نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ گھاٹ پر قبضہ کو اپنے لیے کامیابی تصور کیا۔ عمرو بن عاص نے جو معاویہ کا وزیر و مشیر تھا کہا بھی کہ آپ حکم جاری کر دیجیے کہ مزاحمت نہ کریں۔ علیؑ ایسے آدمی نہیں کہ پیاسے رہیں اور گھاٹ کا قبضہ نہ لے سکیں۔ مگر معاویہ نہیں مانا۔ بالآخر چند بار قاصدوں کی آمد و رفت کے بعد علیؑ مجبور ہو گئے کہ حکم دیں کہ حملہ کر کے معاویہ کے لشکریوں کو پیچھے دھکیل دیا جائے۔

یہاں موقع تھا جوش دلانے اور غیرت و حمیت کو ابھارنے کا۔ حضرت علیؑ کے تین چار ہی جملوں نے وہ جوش و خروش پیدا کیا کہ ذرا سی دیر میں معاویہ کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب بھی میں یہ جملے پڑھتا ہوں میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جملے یہ ہیں:

قَدِ اسْتَطْعَمُوكُمُ الْقِتَالَ یعنی ان لوگوں نے پیش قدمی کی ہے اور جس طرح کوئی بھوکا غذا تلاش کرتا ہے، یہ تم سے جنگ کے خواہاں ہیں۔

فَاَقِرُّوا عَلٰی مَذَلَّةٍ وَتَاْخِيرِ مَحَلَّةٍ اَوْ رَوُّوا السُّيُوفَ مِنَ الدِّمَاءِ تَرْوَوْا مِنَ الْمَاءِ۔ اس لیے اب صرف دو راستے ہیں یا تو ذلت، پستی اور عقب نشینی برداشت کرو یا ان نابکاروں کے خون سے اپنی تلواروں کو سیراب کرو تاکہ تم پانی سے سیراب ہو سکو۔

فَاِنَّ الْحَيٰوةَ فِي مَوْتِكُمْ قَاهِرِينَ وَالْمَوْتَ فِي

حَیَاتُکُمۡ مَقۡهُورِیۡنَ. زندگی اس میں ہے کہ تم جان دیدو اور کامیاب و کامران ہو کر غالب آؤ اور موت اس میں ہے کہ تم زندہ رہو مگر مغلوب و مقہور ہو کر۔

ان چند جملوں سے لشکریانِ امام کی غیرت و حمیت کو وہ جوش آیا کہ انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں معاویہ کے ساتھیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

اب میں ایک دو فقرے علیؑ کے فرزندِ عزیز حسینؑ بن علیؑ کے خطبوں میں سے بھی بطور نمونہ پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ گو آجکل ہمارے یہاں جمعہ کے خطبہ کا رواج نہیں لیکن امام حسینؑ کی برکت سے خطبے اور منبر باقی ہیں۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی خطبے ہیں لیکن ہمارے ملک میں دینی خطبوں کی بنیاد عزاداریٔ حسینؑ بن علیؑ پر قائم ہے۔

حسینی خطبے

ابو عبداللہ ہر معاملے میں اپنے والدِ بزرگوار کے قدم بہ قدم تھے۔ یہی صورت ان کی خطابت کی بھی تھی لیکن ابو عبداللہ کو اتنا موقع بھی نہیں ملا جتنا امیرالمؤمنینؑ کو اپنے دورِ خلافت میں ملا تھا۔ تھوڑا سا موقع جو ابو عبداللہ کو علاوہ اس سفر کے دوران میں تھا جو آپ نے مکّہ سے کربلا تک فرمایا یا پھر ان آٹھ دنوں میں جب آپ کا قیام کربلا میں رہا۔ اس تھوڑی سی مدت ہی میں آپ کے جوہر کھلے۔ جو خطبے آپ کے اس وقت موجود ہیں، وہ بیشتر اسی مدت میں دیے گئے تھے۔ امام حسینؑ کے خطبے اپنے والدِ بزرگوار کے خطبوں کا بعینہٖ نمونہ ہیں۔ ان کی روح وہی ہے اور وہی معانی ان میں موجزن ہیں۔

خود امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ زبان روح کا آلہ ہے۔ اگر معانی زبان پر نازل نہ ہوں تو زبان کیا کام دے سکتی ہے لیکن اگر معانی روح میں موجزن ہوں تو پھر زبان ان کو نہیں روک سکتی۔ آپ نے فرمایا ہے: وَاِنَّا لَاُمَرَاءُ الْکَلَامِ وَفِیْنَا تَنَشَّبَتْ عُرُوْقُہٗ وَعَلَیْنَا تَھَدَّلَتْ غُصُوْنُہٗ.

ہم امیر سخن ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے وجود میں پیوست ہیں اور اس کی شاخیں ہمارے سر پہ سایہ فگن ہیں۔

حسین بن علی علیہما السلام کا پہلا خطبہ جو کمالِ فصاحت و بلاغت کا مظہر اور ذکاوت و شجاعت اور بلند نظری اور ایمان بالغیب سے مالامال ہے۔ وہ خطبہ ہے جو آپ نے مکہ میں اس وقت دیا جب آپ کربلا کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اس میں آپ نے اپنے مصمم عزم کا اعلان کیا اور ضمناً یہ بھی فرمایا کہ جو شخص ہمارا ہم فکر و ہم عقیدہ ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔

خُطَّ الْمَوْتُ عَلٰی وُلْدِ اٰدَمَ مَخَطَّ الْقِلَادَةِ عَلٰی جِیْدِ الْفَتَاةِ وَمَا اَوْلَھَنِیْ اِلٰی اَسْلَافِیْ اشْتِیَاقَ یَعْقُوْبَ اِلٰی یُوْسُفَ

موت نے فرزندانِ آدم کو اس طرح نشان زدہ کر دیا ہے جس طرح گلوبند کا نشان جوان عورت کی گردن پر پڑ جاتا ہے۔

میں اپنے اسلاف سے ملاقات کا اسی طرح مشتاق ہوں جس طرح یعقوب یوسف سے ملاقات کے مشتاق تھے۔

مَنْ کَانَ بَاذِلًا فِیْنَا مُھْجَتَہٗ مُوَطِّنًا عَلٰی لِقَاءِ اللّٰہِ نَفْسَہٗ فَلْیَرْحَلْ مَعَنَا فَاِنِّیْ رَاحِلٌ مُصْبِحًا، اِنْ شَاءَ اللّٰہُ.

جو شخص ہمارے لیے جاں نثاری پر آمادہ ہو اور اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے تیار ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں انشاءاللہ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

خُطبہ اور منبرؒ

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔

میں نے پچھلے لیکچر میں خطابت اور اسلام کے تعلق اور اس تغیر کے بارے میں گفتگو کی تھی جو اسلام نے خطابت میں پیدا کیا۔ میں نے اس ضمن میں اس اسلامی حکم کا بھی تذکرہ کیا تھا جس کے مطابق اسلام نے ایک خاص طرز کے خطبہ کو اسلامی تعلیمات کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ گو ہمارے ملک میں خطبہ اور منبر کا وجود واقعۂ کربلا کی وجہ سے ہے لیکن چونکہ میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتا تھا اس لیے اس ضمن میں نماز جمعہ کی بحث ناگزیر تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ان آداب و قواعد کا بھی تذکرہ کیا تھا جو خطبۂ جمعہ کے باب میں وارد ہوئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں دوبارہ خطبہ کے بارے میں گفتگو کروں تو یہ بھی تجویز پیش کر سکوں کہ ہمیں آج بھی ان احکام پر عمل کرنا چاہیے۔

دنیائے شیعیت میں خطابت

کا واقعۂ کربلا سے رشتہ

میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ملک میں خطبہ و منبر کا وجود شہادت حسینؑ کا رہین منت ہے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے اپنے زمانے میں مروجہ نظام کے خلاف تحریک چلائی اور شہید ہوئے۔ سید الشہداء کی عزاداری کے بارے میں ایسی روایات آئی ہیں کہ کوئی شیعہ ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ عزاداری شیعہ مذہب کے مسلمات میں سے ہے۔ ائمۂ اطہار علیہم السلام نے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے کہ عاشورے کی یاد کو قائم رکھا جائے۔ شعراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس موضوع پر شعر کہیں اور لوگوں کے احساسات کو جھنجھوڑیں۔ جو لوگ عاشورے کی یاد سے متاثر ہو کر آنسو بہاتے ہیں ان کے اس فعل کو مقدس قرار دیا گیا ہے۔ بکثرت احادیث میں گریہ و بکا کی فضیلت آئی ہے۔ آج میں یہ احادیث سنانا نہیں چاہتا لیکن اجمالاً اتنا عرض کرتا ہوں کہ کسی شیعہ کے لیے انکار کی گنجائش نہیں کہ ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے۔

یہاں دو امور پر گفتگو ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ کیا تھا؟ امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا؟ ان کے قیام کا محرک کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ ائمۂ دین نے یہ تاکید کیوں کی ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کی یاد ہمیشہ یاد رکھی جائے اور بھلائی نہ جائے۔ آخر عاشورے کے موضوع کو زندہ رکھنے کا فلسفہ کیا ہے؟

ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق دین کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی بھی حکمت معلوم ہونی چاہیے۔ اگر یہ حکمت معلوم ہو جائے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ان احکام کی کیا اہمیت ہے اور واقعۂ کربلا سے متعلق احکام سے ہمیں کس قدر زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا؟ اس کی تین طرح سے توجیہ کی جا سکتی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ امام حسینؑ کا قیام ایک معمولی واقعہ تھا جس کا مقصد معاذ اللہ محض ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش تھا مگر یہ ایسی توجیہ ہے جس کو کوئی مسلمان ہرگز پسند نہیں کر سکتا اور نہ تاریخی واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری توجیہ وہ ہے جو اکثر عوام الناس کے ذہن میں آتی ہے کہ اس اُمت کے گناہوں کو بخشوانے کے لیے امام حسینؑ نے جان دی اور شہید ہوئے یعنی آپ کی شہادت دراصل اس امت کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسی کہ عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں گھڑ لی ہے اور اپنا عقیدہ بنا لیا ہے کہ اپنی امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ صلیب پر چڑھ گئے۔ بالفاظ دیگر امام حسینؑ اس لیے شہید ہوئے کہ گنہگاروں کو آخرت میں جو سزا ملنی تھی وہ نہ ملے تاکہ لوگ آزادی سے گناہ کر سکیں۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہوا کہ امام حسینؑ نے دیکھا کہ کچھ یزید، ابن زیاد، شمر اور سنان ہیں تو سہی لیکن ان کی تعداد کم ہے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کوئی کام ایسا کیا جائے کہ ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے یزید سازی اور ابن زیاد سازی کا کارخانہ قائم کر دیا تاکہ یہ آئندہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو سکیں۔ یہ طرزِ فکر اور یہ توجیہ انتہائی خطرناک

ہے۔ امام حسینؑ کی تحریک کے اثر کو زائل کرنے، ان کے مقاصد کے خلاف نبرد آزما ہونے اور عزاداریٔ امام حسینؑ کے متعلق جو احکام ہمیں ملے ہیں ان کو بے اثر بنانے اور غیر معقول ثابت کرنے کا اس طرزِ فکر سے زیادہ موثر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین کریں کہ ہم جو اعمال کی بجا آوری میں اتنے بے پروا اور لاابالی واقع ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ امام حسینؑ کی تحریک کی اتنی غلط توجیہ کی گئی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ایک وجہ کہا کیونکہ اور بھی وجوہات ہیں جن کا تعلق قومی اور نسلی پہلو سے ہے۔

مرجئہ کا عقیدہ تھا کہ ایمان اور اعتقاد کافی ہے۔ نجات کے لیے عمل کی کوئی قید نہیں۔ اگر عقیدہ درست ہے تو خداوند بے نیاز ہر بدعملی کو معاف کر دے گا۔ اس فرقے کے بارے میں جناب زید بن علی بن الحسینؑ نے کہا تھا کہ هٰؤُلَاءِ اَطْمَعُوا الْفُسَّاقَ فِيْ عَفْوِ اللّٰهِ۔ یعنی ان لوگوں کی حرکت سے اس بھروسے پر کہ اللہ معاف کر دے گا فساق کی جرأت بڑھ گئی ہے کہ وہ جتنے چاہیں گناہ کریں۔ یہ اس وقت مرجئہ کا عقیدہ تھا۔ شیعوں کا عقیدہ اس زمانے میں اس کے بالکل برعکس تھا لیکن آج شیعہ بھی وہی کہتے ہیں جو زمانۂ قدیم میں مرجئہ کہتے تھے۔ اس وقت تو شیعوں کا عقیدہ اس نصِ قرآنی کے مطابق تھا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی ایمان بھی ضروری ہے اور عمل صالح بھی۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ امام حسینؑ نے اٹھ کھڑے ہونا اپنا فرض سمجھا۔ ان کی رائے میں اسلام کی بقاء کے لیے ان کا اپنا قیام ضروری

اور ان کا فرض تھا خلیفۂ وقت سے ان کا اختلاف اور نزاع اس بات پر نہیں تھا کہ تم خلیفہ ہو یا میں خلیفہ ہوں یا تو جس منصب پر فائز ہے وہ مجھے ملنا چاہیے۔ اختلاف بنیادی اور اصولی تھا۔ اگر یزید کی بجائے کوئی اور شخص بھی یہی کام کرتا اور یہی روش اختیار کرتا تو امام حسینؑ اس کے خلاف بھی اسی طرح قیام کرتے چاہے اس شخص کا سلوک خود امام حسینؑ کے ساتھ اچھا ہوتا یا برا ہوتا۔ یزید اور اس کے اعوان و انصار بھی امام حسینؑ کی ہر قسم کی اعانت کے لیے تیار رہتے بشرطیکہ امام عالیمقام ان کے کاموں سے تعرض نہ کریں اور ان کی روش پر صاد کردیں۔ اگر امام کوئی علاقہ مانگتے مثلاً یہ کہتے کہ حجاز و یمن کی حکومت مجھے دیدو یا عراق کی یا خراسان کی حکومت میرے حوالے کردو تو وہ یہ علاقہ ضرور دے دیتے۔ بلکہ اگر امام چاہتے تو اس علاقے میں حکومت کا کلی اختیار بھی انہیں مل جاتا۔ جتنی چاہے وصول کرتے اور جس طرح چاہتے خرچ کرتے۔ اگر دل چاہتا تو کچھ رقم مرکزی حکومت کو بھیج دیتے اور نہ چاہتے تو نہ بھیجتے۔ مگر درحقیقت امام حسینؑ کی جنگ مسلک و عقیدہ کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی اور حق و باطل کی اس جنگ میں خود امام حسینؑ کی اپنی ذات کی حیثیت ثانوی تھی۔ آپ نے خود چند مختصر الفاظ میں یہ بات اپنے اصحاب پر واضح کردی تھی۔ ایک خطبہ میں آپ نے فرمایا تھا اور غالباً اس وقت فرمایا تھا جب حُر اور ان کے ساتھی پہنچ گئے تھے۔ اسی بنا پر یہ خطاب عام تھا۔

آپ نے فرمایا تھا:۔

اَلَا تَرَوْنَ اَنَّ الْحَقَّ لَا یُعْمَلُ بِهٖ وَالْبَاطِلَ لَا یُتَنَاهٰی عَنْهُ لِیَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِیْ لِقَاءِ اللّٰهِ مُحِقًّا۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے اجتناب

نہیں کیا جاتا؟ ان حالات میں ہر مومن کا فرض ہے کہ شہادت کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا لِیَرْغَبِ الْاِمَامُ یعنی امام کا فرض ہے کہ شہادت کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ لِیَرْغَبِ الْحُسَیْنُ یعنی حسین کا ذاتی فرض ہے۔ آپ نے فرمایا لِیَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ مطلب یہ ہے کہ ان حالات میں مومن کا یہ کام ہے کہ موت کو زندگی پر ترجیح دے۔ جب حق پر عمل نہ ہو رہا ہو اور باطل پر کوئی روک ٹوک نہ ہو تو ہر مسلمان پر بحیثیت مسلمان کے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور جامِ شہادت نوش کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ان تین توجیہات میں سے ایک توجیہ تو وہ ہے جو کوئی دشمنِ حسینؑ ہی کر سکتا ہے۔ ایک توجیہ وہ ہے جو خود حسینؑ نے کی ہے یعنی یہ کہ وہ راہِ حق میں اٹھے تھے۔ ایک اور توجیہ وہ ہے جو ان کے نادان دوست کرتے ہیں اور جو ان کے دشمنوں کی توجیہ سے بھی زیادہ خطرناک، گمراہ کن اور حسینؑ کے مقصد و منشا سے بعید ترین ہے۔

رہا سوال کا دوسرا حصہ کہ ائمۂ دین نے مجالسِ غم برپا کرنے کی وصیت فرمائی تو اس کی بھی وجہ وہی ہے جو ابھی میں نے عرض کی۔ امام حسینؑ نہ اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے شہید ہوئے، نہ امت کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر انہوں نے اپنی جانِ عزیز قربان کی۔ انہوں نے تو راہِ حق میں اپنی جان دی اور باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے، اس لیے ائمۂ اہلبیتؑ نے یہ چاہا کہ امام حسینؑ کا مکتبِ شہادت باقی اور ان کی تحریک زندہ رہے۔ شہادتِ حسینؑ چونکہ حق و باطل کے مقابلہ کی تحریک ہے اس لیے اسے ہمیشہ قائم و دائم رہنا چاہیے ورنہ امام حسینؑ کو اس سے کیا فائدہ کہ ہم روئیں یا نہ روئیں اور ہمیں

خود بھی اس سے کیا فائدہ کہ پہلے تو بیٹھ کر روئیں اور پھر کپڑے جھاڑ کر چل دیں۔ ائمہؑ تو یہ چاہتے تھے کہ قیام امام حسینؑ ایک تحریک اور ایک مشعل راہ کے طور پر ہمیشہ باقی رہے کیونکہ یہ حقیقت دوستی اور حقیقت طلبی کا ایک چراغ ہے اور حق طلبی، حریت اور آزادی کی پکار۔ اس حریت و آزادی کی تحریک اور ظلم و استبداد کے مقابلہ کی تعلیم کو باقی اور زندہ رہنا چاہیے[1]۔ اس حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ائمہ اطہار کے زمانے ہی میں انقلاب برپا ہو گیا اور خود امام حسینؑ کا نام ظلم کے خلاف انقلاب کا نعرہ بن گیا۔ بہت سے انقلابی شاعر پیدا ہو گئے۔ کمیت اسدی پیدا ہو گیا۔ دعبل خزاعی وجود میں آ گیا۔ جانتے ہو کمیت اسدی کون تھا؟ دعبل خزاعی کون تھا؟ یہ دونوں روضہ خواں تھے لیکن میری طرح کے روضہ خواں نہیں۔ یہ مرثیہ گو شاعر تھے لیکن محتشم کاشانی وغیرہ کی طرح کے مرثیہ گو نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کو کمیت اسدی، دعبل خزاعی، ابن الرومی اور ابو فراس ہمدانی کے عربی اشعار سناؤں تاکہ آپ ان کا موازنہ محتشم کے اشعار سے کر سکیں جس کی تعریف و توصیف میں ہزاروں داستانیں زبان زد ہیں۔ مگر کہاں یہ اور کہاں وہ ــــ خاک کو آسمان سے کیا نسبت؟ ان شعراء کے اشعار حسینی تعلیمات کی عکاسی کرتے ہیں۔ صرف کمیت اسدی کے اشعار بنی امیہ کے لیے پورے ایک لشکر سے زیادہ ضرر رساں تھے۔ یہ شخص کون

---

[1] رہبر کبیر حضرت آیت اللہ خمینی نے فرمایا: "امام حسینؑ کی مجلس عزا منعقد کرنا اسلام کی بقا کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ سید الشہداءؑ کی مجالس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسلام کی حقیقت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ عزاداری سید الشہداءؑ ہی نے آج تک اسلام کا تحفظ کیا ہے۔

تھا ؟ ایک مرثیہ گو تھا۔ مگر ایسا مرثیہ گو نہیں کہ آ کر چند اپنے سید سے اشعار سنائے اور کچھ روپے جیب میں ڈال کر چل دیا۔ وہ شعر کہتا تھا تو دنیا کو ہلا دیتا تھا۔ دربار خلافت پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔

عبداللہ بن حسن بن علی المعروف بہ عبداللہ محض، کمیت کے جاندار اشعار سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے کھیت کا قبالہ لا کر اسے پیش کر دیا۔ کمیت نے کہا یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ میں اسے قبول کر لوں۔ میں تو سید الشہداء کا مرثیہ خواں ہوں اور صرف رضائے الٰہی کی نیت سے مرثیہ کہتا ہوں۔ میں پیسے کمانے کے لیے شعر نہیں کہتا۔ عبداللہ کے بے حد اصرار پر اسے ماننا پڑا اور اس نے قبالہ لے لیا۔ کچھ دن بعد کمیت عبداللہ بن حسن بن علی کے پاس آیا اور کہنے لگا میری آپ سے ایک درخواست ہے اگر آپ منظور کریں۔ عبداللہ نے کہا ضرور منظور کر لوں گا۔ مگر بتاؤ تو سہی بات کیا ہے ؟ کمیت نے کہا پہلے آپ پختہ وعدہ کیجیے پھر بتاؤں گا۔ غرض عبداللہ نے وعدہ کر لیا اور شاید قسم بھی کھالی۔ جیسے ہی انہوں نے وعدہ کیا، کمیت نے قبالہ واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ میں قبالہ نہیں لے سکتا۔

ایک اور موقع پر بنی ہاشم نے کچھ روپے جمع کر کے اسے دینے چاہے۔ ہر ممکن تدبیر کی مگر اسے نہ لینے تھے نہ لیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں آپ سے روپے لوں۔

اس شخص نے اپنے اشعار اور اس نوع کی مرثیہ خوانی کی بدولت کیا کیا سختیاں نہیں جھیلیں، کیسی کیسی تکلیفیں نہیں اٹھائیں مگر اسکے پائے استقامت کو ذرا جنبش نہیں ہوئی۔ آخر کار اسے پکڑ کر حاکم کوفہ یوسف بن عمر ثقفی کے گھر لے گئے۔ اس نے آٹھ آدمی اس کے بدن پر چھرے لگانے کے لیے مقرر کیے۔

جب اس کا دم آخر ہوا تو آخری الفاظ جو اس نے کہے یہ تھے :

اَللّٰھُمَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ! اَللّٰھُمَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ! خدایا اہل بیت پیغمبر، خدایا اہل بیت پیغمبر!

دعبل بن علی خزاعی کو آپ جانتے ہیں؟ وہ کہتا تھا کہ میں پچاس سال سے خانہ بدوش ہوں۔ ان مرثیہ گو شعراء کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کیونکر لگایا جا سکتا ہے کہ جن کی تربیت خود ائمہ علیہم السلام نے کی ہو۔ یہ صرف مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں۔ یہ مرثیہ کہتے تھے لیکن ان کے مرثیوں میں نوحہ اور بین نہیں تھا۔ وہ رزمیہ مرثیے کہتے تھے۔ ان کے قصیدے ایک انقلابی مفکر کے مقالات کی طرح پر اثر تھے۔ انہوں نے سید الشہداء امام حسینؑ کے زیر سایہ بنی امیہ اور بنی عباس پر ایسی سخت اور کڑی تنقید کی کہ انہیں خون کے آنسو رُلوا دیے۔

آپ نے ضرور سنا ہو گا کہ متوکل نے حکم دیا تھا کہ امام حسینؑ کی قبر کو زیر آب کر دیا جائے اور کسی کو ان کی قبر پر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر کوئی وہاں جائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور اگر کوئی حسینؑ بن علیؑ کا نام لے تو اسے سزا دی جائے۔ آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ متوکل کسی نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھا اور اس وجہ سے نام حسینؑ سے غیر معقول دشمنی اور بے سبب کینہ رکھتا تھا۔ نہیں جناب! یہ بات نہیں تھی۔ ائمہ اہلبیتؑ نے عزاداری حسینؑ کے بارے میں جو تاکید کی تھی اس کے اثر اور کمیت اور دعبل جیسے شاعروں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے امام حسینؑ کے نام میں وہ تاثیر پیدا ہو گئی تھی کہ ان کا نام ہی متوکل کے باپ کے زوال کا سبب بن گیا تھا۔ متوکل صاف دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ہر شاعر اس پر ایک لشکر سے زیادہ بھاری ہے اور حسینؑ

شہادت کے بعد بھی اس جیسے لوگوں کے منصوبے خاک میں ملانے کے لیے اتنے ہی کافی ہیں جتنے اپنی زندگی میں تھے۔ چونکہ ائمہ اہلبیتؑ کی اس ہدایت اور اس حکم نے کہ سید الشہداءؑ کی یاد کو قائم رکھا جائے ان کے نام کو ظلم کے خلاف ایک نظریے اور ایک عقیدے کی شکل دے دی تھی اس لیے متوکل خوب سوچ سمجھ کر اس کے درپے تھا کہ اس نظریے اور اس عقیدے کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امامؑ کی یاد کسی طرح باقی رہے۔ ورنہ بہ لحاظ دیگر متوکل کافی ہوشیار آدمی تھا۔ تقدس کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھا اور ذاتی طور پر وہ امام حسینؑ کے بارے میں کسی نفسیاتی الجھاؤ کا بھی شکار نہیں تھا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ مرثیہ خوانی نے ایک ایسے نظریے کی شکل اختیار کر لی ہے کہ اب متوکل، متوکل نہیں رہ سکتا۔

اور بھی بہت سے قصے ہیں۔ اگر ان کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سید الشہداء کے مرثیہ گو جب تک تعلیمات ائمہ کی پیروی کرتے رہے، معاشرے میں ان کا کردار لائق صد تحسین رہا۔ ان باتوں کو اگر سمجھ لیا جائے اور ان کا سمجھنا بے حد ضروری، تو پھر عزاداری حسینؑ سے صحیح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ باوجود تمام کوتاہیوں کے سید الشہداءؑ کی نسبت آج بھی لوگوں کے جذبات و احساسات حقیقی اور پاک ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ جن کی نیت بری نہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ عزاداری کا مطلب غلط سمجھ لیا گیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بہتر ہے کہ اب اس قصے کو ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ لوگ محض اس لیے گریہ و بکا کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے یہ سن رکھا ہے کہ اس طرح گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر یہ بات نہ ہو تو وہ قطعاً نہ روئیں لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ نہیں۔ کسی کو لالچ دے کر رُلایا نہیں جا سکتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو کچھ لوگوں کو جمع کرکے ان سے کہیے کہ کسی اور شخص کے لیے مثلاً خالد بن ولید کے لیے

ذرا آدھ گھنٹہ بیٹھ کر رو دیں تو ہم ہر ایک کو ایک ہزار تومان دیں گے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ رونے کے لیے احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک آدمی متاثر نہ ہو اسے رونا نہیں آتا۔ آدمی اسی وقت رو سکتا ہے جب وہ غمگین ہو یا اس کے دل میں تڑپ ہو۔ سید الشہداءؑ کی نسبت لوگوں کے جذبات واقعی ایک طرح سے حقیقی ہیں۔ لوگوں کو امام حسینؑ سے سچی محبت اور عقیدت ہے اور وہ دل سے ان کے لیے آنسو بہاتے ہیں۔ محرم اور صفر کے مہینوں میں ڈھیروں آنسو بہائے جاتے ہیں۔ جب تک غم و اندوہ نہ ہو، عشق و محبت نہ ہو، احساسات و جذبات نہ ہوں رونا نہیں آتا۔ یہ جذبات قیمتی اور بڑے قیمتی ہیں۔ مگر ابھی تک ہم نے ان جذبات سے جیسا کہ چاہیے ویسا فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم کیوں ان جذبات سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے، یہ ایک الگ بات ہے۔

ہمارے پاس بہت سی چیزیں ہیں جن سے ہم فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہمارے یہاں دریائے کارون ہے جس سے ہم نے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریائے کارون کسی کام کا نہیں۔ صدیوں سے ہمارے یہاں زیر زمین تیل کے ذخائر تھے جن سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ ہمارے ملک میں ہزاروں معدنی ذخائر تھے اور ہیں جن سے ہم فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

اگر ہمارا ملک چاہتا ہے کہ وہ خوشحال ہو اور جادۂ ترقی پر آگے بڑھے، یہاں تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے پیشرفت ہو، حریت و آزادی کی راہ ہموار ہو تو بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ واحد طریقہ یہ ہے کہ سید الشہداءؑ کے بارے میں لوگوں کے سچے جذبات سے استفادہ

کیا جائے۔ یہ جذبات حقیقی ہیں اور ایک ہستی کے بارے میں ہیں جو قرار واقعی ان کی مستحق ہے اور جس کا پیش کردہ نظریہ بہت بلند اور عظیم ہے۔

ہم اپنے دین و مذہب کی ہدایت پر کیوں عمل نہ کریں۔ یہ تو بڑی اچھی ہدایت ہے جس پر ضرور عمل کرنا چاہیے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

بہرحال خطیبہ منبر کا جو ہمارے یہاں رواج ہے وہ نتیجہ ہے کربلا کے اندوہناک واقعہ کا اور اس کا کہ ائمۂ اطہار نے عزاداری سید الشہداءؑ کی تاکید فرمائی ہے۔ یہ عزاداری ہی کی برکت ہے کہ مجالس میں فہمیدہ اور متدین اشخاص تقریریں کرتے ہیں۔ اب چونکہ سید الشہداءؑ کے نام پر مجالس ترتیب دی جاتی ہیں اور انہی کے نام پر لوگ جمع ہوتے ہیں تو کیوں نہ ہم اس موقع سے ایک اور فائدہ اٹھائیں اور کیوں نہ ضمناً ایک اور اصول پر بھی عمل پیرا ہوں؟ وہ اصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے۔ اس طرح امام حسینؑ کے دو منبر ہوں گے۔ ایک منبر تو مرثیہ خوانی اور مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت میں اظہار جذبات کا، جس کا اگر صحیح استعمال ہو تو وہ تمام عظیم آثار مرتب ہوں گے جن کا میں نے پیشتر ذکر کیا اور دوسرا منبر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ ہمارے ملک میں رشد و ہدایت کا جو سلسلہ جاری ہے اور جو کچھ زبانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے وہ سب حسینؑ بن علیؑ ہی کے مقدس نام کے طفیل سے ہے۔ یہ نہایت مناسب طریقہ اور بہت مستحسن رواج ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ منبر حسینؑ سے ضمناً کچھ امر بالمعروف

؎ ایران میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے یہی نعرہ بلند کیا گیا تھا:
نہضت ما حسینی، رہبر ما خمینی۔

اور اصول و فروع دین کی تعلیم کا کام لیا جاتا ہے اور حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں لوگوں کے جو حقیقی جذبات ہیں ان سے قدرے استفادہ کیا جاتا ہے۔

جس قدر لوگ حسینؑ بن علیؑ کے نام پر جمع ہو جاتے ہیں، اتنے کسی اور کے نام پر جمع نہیں ہوتے اس لیے یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اس طرح کا دستور موجود ہے۔ اب یہ کہ اس پر کس طرح عمل ہوتا ہے، یہ موقوف ہے ذاکر کی اپنی لیاقت اور قابلیت پر، اور اس پر کہ وہ عقائد اور اصولِ دین بیان کر سکتا ہے، لوگوں کو پند و نصیحت کر سکتا ہے، حرام و حلال سمجھا سکتا ہے اور لوگوں کو ان کے دینی و دنیاوی مفاد سے آگاہ کر سکتا ہے۔ لوگ بہرحال حسینؑ بن علیؑ کی برکت سے سننے کے لیے تیار ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ان حقائق کو بیان کرنے کی قابلیت ہے یا نہیں۔

جب یہ صورت ہے تو پھر یہ ضروری ہوا کہ اس معاملے پر مناسب غور و فکر کر کے ہر دو پہلو سے اس کی اصلاح کی تدبیر کی جائے، مرثیہ خوانی کے پہلو سے بھی اور لوگوں کی ہدایت و ارشاد کے پہلو سے بھی۔

مرثیہ خوانی میں اصلاح کی ضرورت

جہاں تک مرثیہ خوانی کا تعلق ہے مرثیہ خواں حضرات کو چاہیے کہ سید الشہداءؑ کی تحریک کی حقیقی روح اور اس کے مقصد کی طرف توجہ دیں اور ان احکامات و ہدایات کی علتِ غائی کو ذہن میں رکھیں جو ائمہؑ اطہار نے عزاداری کے بارے میں دی ہیں۔ چونکہ یہ ہدایات بلا وجہ نہیں دی گئیں اس لیے ان حضرات کو چاہیے کہ تحریک کربلا کے مقصد اور عزاداریٔ سید الشہداءؑ کے فلسفے سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ یہ بات ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار بلکہ

ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں پڑتی رہنی چاہیے اس لیے ضروری ہے کہ ذاکرین خود صاحب بصیرت ہوں۔ ان کی معلومات چند پیش پا افتادہ جنگ ناموں تک محدود نہ ہوں اور وہ خود ساختہ لسان الذاکرین اور صدر الواعظین نہ ہوں۔ یہ لوگ بہت سی باتیں ایک دوسرے سے سن کر نقل کرتے رہتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ فلاں بات کہاں سے معلوم ہوئی تو جواب ملتا ہے کہ فلاں لسان الذاکرین نے بیان کی تھی مطلب یہ کہ کسی کتاب میں نہیں دیکھی، محض ادھر اُدھر سے سنی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے لطیفے ہیں۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں آج ان میں سے کچھ آپ کو سناتا جس سے آپ کو معلوم ہوتا کہ جھوٹ جو کوئی ایک شخص گھڑتا ہے کس تیزی سے پھیلتا ہے اور کس طرح ایک دوسرے سے ہوتا ہوا ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا پہنچتا ہے۔ ضروری ہے کہ تاریخی واقعات صرف معتبر تاریخی کتابوں سے معتبر مورخین کے قول کے مطابق نقل کیے جائیں۔

ہمارے یہاں ایک مورخ ڈاکٹر آیتی ہیں (جامعہ تعلیمات اسلامی کی شائع کردہ کتاب "تاریخ عاشورا" کے مصنف ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی مرحوم) جن کو صدرِ اسلام کی تاریخ پر عبور ہے۔ میں جرأت کر کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاید پورے تہران بلکہ تمام ملک میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو صدر اسلام کی تاریخ پر ایسا عبور ہو جیسا انہیں ہے۔ کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جسے تاریخ کے اس دور کے متعلق ایسی تفصیلی معلومات ہوں جیسی انہیں ہیں۔ ان صاحب کو اس دور سے متعلق تمام تاریخی کتابوں اور تاریخی جزئیات پر ایسا کامل عبور ہے کہ باید و شاید۔ مثلاً اگر آپ جنگ بدر کے بارے میں ان سے کچھ پوچھیں تو وہ اس جنگ میں شریک ایک ایک آدمی کے

بارے میں تفصیل بتا سکتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ یہ بھی بتا دیں گے کہ فلاں شخص جو جنگِ بدر میں شریک تھا اس کا باپ کون تھا، ماں کون تھی، اعزہ اور اقربا کون تھے وغیرہ۔ جو بات یہ صاحب کہتے ہیں سند ہوتی ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ آپ اہلِ تہران کو تحقیقی بات سننے کی عادت ہی نہیں۔ ان صاحب کی تازہ ترین تصنیف جس کو یونیورسٹی نے شائع کیا ہے اندلس کی تاریخ کے بارے میں ہے اور اس کا نام بھی تاریخ اندلس ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کے ایک ایسے حادثۂ فاجعہ کا ذکر ہے۔ جس کے بارے میں ہم مسلمانوں اور خصوصاً ایرانیوں نے بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کی ہے، ضرور پڑھیے۔

بہرحال! ذکر یہ تھا کہ قیامِ حسینی کا مقصد اور عزاداری کا فلسفہ منبروں سے بار بار بیان ہوتے رہنا چاہیے تاکہ وہ فائدہ مرتب ہو اور وہ مقصد حاصل ہو جس کے لیے امام زین العابدینؑ، امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام کاظمؑ عزاداری کی تلقین کرتے رہے تھے تاکہ کمیت اور دعبل جیسے شاعر پیدا ہوں اور ان کے مرثیوں سے وہی پہلے جیسے نتائج برآمد ہوں۔ کوئی ایسا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے جس سے جذبات سرد پڑ جائیں بلکہ وہ کام کرنا چاہیے جس سے جذبات میں اور بھی شدت پیدا ہو، حق و صداقت سے لوگوں کی محبت اور باطل سے نفرت میں اضافہ ہو۔

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہہ رہا ہے یہ ادب کون بہ اندازِ سروش
کہ بس امروز ہے امروز نہ فردا ہے نہ دوش

کس کی یارب یہ صدا ہے کہ فضا ہے خاموش
میں حسینؑ ابن علیؑ بول رہا ہوں اے جوش
بخش دے آگ مرے سرد عزاداروں کو
ہاں! جگا داب میں سوئی ہوئی تلواروں کو

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے؟ اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابنِ علیؑ ہو[1]

حق و باطل کا معرکہ دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ موسیٰؑ اور فرعون ہمیشہ دنیا میں رہے ہیں، ابراہیمؑ اور نمرود ہمیشہ دنیا میں رہے ہیں۔ محمدؐ اور ابوجہل ہمیشہ رہے ہیں۔ علیؑ اور معاویہ دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں۔ حسینؑ اور یزید ہمیشہ رہے ہیں۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید
اقبالؔ

مقصد یہ نہیں ہے کہ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، محمدؐ، علیؑ اور حسینؑ کے مرتبے کے

---

[1] زیر بحث مضمون کی مناسبت سے ان اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

رگ ہمیشہ رہے ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ حق اور باطل ہمیشہ برسرِپیکار رہے ہیں۔ معاشرے کے سامنے ہمیشہ دو راستے رہے ہیں' ایک حق کا اور دوسرا باطل کا۔ یہ مجلس و مرثیہ کا ایک رُخ ہے۔

دوسرا رُخ ہے ارشاد و ہدایت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا۔ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے اور اس پر عمل کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟

میرا خیال ہے کہ اس طریقۂ کار پر عمل کرنا چاہیے جو خطبۂ جمعہ کے بارے میں ہمارے لیے تجویز کیا گیا ہے اور جس کے متعلق میں نے کل رات ایک روایت امام رضاؑ سے نقل کی تھی۔ یہ فرمان بہت جامع ہے لیکن ہمارے یہاں جمعہ کی نماز تو ہوتی نہیں کہ اس ہدایت پر جمعہ کے خطبہ میں عمل کیا جائے[1] اس لیے ان ہی خطبوں اور تقریروں میں اس پر عمل کیا جائے جو حسین بن علیؑ کی برکت سے ہمارے یہاں رائج ہیں۔

واعظ کے فرائض

امام ثامن حضرت رضاؑ کی جو روایت میں نے کل رات بیان کی تھی'

---

[1] الحمد للہ شاہِ ایران کی طاغوتی حکومت کے خاتمے کے بعد ایران کے ہر شہر میں نماز جمعہ کے فقید المثال اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ صرف تہران میں چالیس سے پچاس لاکھ افراد بیک وقت ایک جگہ جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ آج کے ایران میں دیواروں پر امام خمینی کا یہ جملہ لکھا نظر آتا ہے:

"نماز جمعہ یک نماز عادی نیست"

اس میں خطیب کے فرائض کو تین حقوق میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّمَا جُعِلَتِ الْخُطْبَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لِأَنَّ الْجُمُعَةَ مَشْهَدٌ عَامٌّ فَأَرَادَ أَنْ يَكُونَ لِلْأَمِيرِ سَبَبٌ إِلَى مَوْعِظَتِهِمْ وَتَرْغِيبِهِمْ فِي الطَّاعَةِ وَتَرْهِيبِهِمْ مِنَ الْمَعْصِيَةِ یعنی جمعہ کا دن ایسا ہے کہ سب لوگ جمع ہوتے ہیں اور مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ترتیب پاتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کا رہنما وعظ کرے' اطاعت خداوندی کی ترغیب دے اور گناہوں سے متنبہ کرے۔

کوئی فرد واحد بھی ایسا نہیں جسے وعظ و نصیحت کی حاجت نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو کسی دوسرے سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ مگر وعظ و نصیحت سے کوئی بے نیاز نہیں کیونکہ کسی بات کا جاننا اور ہے' اور کسی مومن و متقی واعظ کی تلقین سے اثر پذیر ہونا اور بات ہے۔ کہتے ہیں امام علیؑ اپنے اصحاب میں سے کسی سے فرماتے تھے کہ مجھے نصیحت کرو اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ سننے میں جو اثر ہے وہ جاننے میں نہیں۔

ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ لوگ جو اس کام کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہوں' لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہیں' ان کو خدا کی یاد دلاتے رہیں' موت سے غافل نہ ہونے دیں اور انہیں گناہوں کے نتائج و عواقب سے ڈراتے رہیں۔ قبر و قیامت کا تذکرہ کرتے رہیں' لوگوں کو عدلِ الٰہی کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔ یہ ضروری باتیں ہیں۔ معاشرہ کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ زمانے میں ہمارے یہاں اچھے واعظ ہوتے ہیں اور بحمد اللہ

اب بھی ہیں۔ جتنے زیادہ باصلاحیت اور جامع الشرائط واعظ ہوں بہتر ہے۔ خطبہ ومنبر کے سلسلے میں اس کام کا ہونا بھی ضروری ہے۔

مفاد سے آگاہ کرنا

خطیب کے فرائض کا دوسرا حصّہ وہ ہے جس کے متعلق امام رضاؑ نے فرمایا:

وَتَوْقِيفُهُمْ عَلَىٰ مَا أَرَادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَدُنْيَاهُمْ.

یعنی خطیب کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کرے جو ان کے دینی اور دنیاوی مفاد میں ہوں اور یہ بتائے کہ موجودہ حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے اور ان کی دینی اور دنیاوی مصلحتوں کا اقتضاء کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا کام ہے اور پند ونصیحت اور عام وعظ سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ عام وعظ کی تو یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص اہلِ ایمان ہے، باعمل ہے، پُرخلوص ہے تو اگر اسے وعظ کے چند کلمات بھی کہنے آتے ہیں تو وہ وعظ کر سکتا ہے اور ایک حد تک اس کا وعظ مفید بھی ہوگا۔ اگر آدمی باعمل اور پُرخلوص ہو تو یہ بھی کافی ہے کہ بزرگوں کے کچھ اقوال ہی بیان کر دے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ دینی اور دنیاوی مصالحِ عالیہ بیان کرے اور ان سے لوگوں کو آگاہ کرے تو یہ بڑا کٹھن کام ہے۔

اس کام میں دو دشواریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے لیے بڑی وسیع معلومات درکار ہیں۔ دوسرے خلوص بہت ضروری ہے تاکہ دین ودنیا کی جو مصلحتیں وہ سمجھتا ہے وہ صاف صاف دوسروں کو بتلا سکے۔

دینی اور معاشرتی معلومات

جہاں تک معلومات کا تعلق ہے تو دین کے اصول و مبانی سے کافی واقفیت ہونی چاہیے۔ اسلامی تعلیمات کی روح سے آگاہی ہونی چاہیے۔ اسلام کے ظاہر و باطن اور پوست و مغز میں تمیز کی صلاحیت ہونی چاہیے تاکہ وہ دینی معلومات کو سمجھ سکے اور بیان کر سکے۔ صرف عام دینی معلومات اس مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے لیے معاشرے کو سمجھنا بھی ضروری ہے اور یہ جاننا بھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور موجودہ حالات میں اسلامی معاشرے کی مصلحت کا تقاضا کیا ہے تاکہ وہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور اسلامی معاشرے کے مفاد سے لوگوں کو روشناس کرا سکے۔

مقام افسوس ہے کہ وعظ کا یہ پہلو ہمارے ہاں کمزور ہے۔ واعظ بہت ہیں اور وعظ کے دوسرے پہلو کمزور نہیں یا کم از کم بہت کمزور نہیں۔ مگر یہ پہلو بہت کمزور ہے کیونکہ مطالعہ کی بہت کمی ہے۔ امام رضاؑ کا ارشاد بہت زیادہ ارزش رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو دین و دنیا کی مصلحت سے آگاہ کرو۔ جس شخص کو صرف کسی خاص علم مثلاً فقہ، ادب یا فلسفہ کی چند کتابوں سے سروکار رہا ہو اور جس نے مدرسہ کے ایک کونے میں زندگی گزاری ہو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ معاشرہ کی کیا حالت اور کیا ضرورت ہے۔ مدرسہ کے کونے میں بیٹھ کر کوئی معاشرے کے مفاد پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا علم بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے اور معاشرے کو ان سے کس طرح نبٹنا چاہیے تاکہ کسی خطرہ کا سامنا نہ کرنا پڑے بڑی تیز حسی کی ضرورت ہے۔ پیش بینی کی صلاحیت کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا کام ممکن نہیں۔

ہدایت کا کیا مطلب ؟

ہدایت کا کیا مطلب ہے ؟ ہدایت کے معنی ہیں رہنمائی۔ کوئی قافلہ کسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہو تو راستے میں کسی سے پوچھتے ہیں کہ فلاں منزل کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرف سے جاؤ، یہ رہنمائی ہے۔ قافلہ کا رہنما کون ہو سکتا ہے ؟ صرف وہی جو سمجھتا ہو کہ قافلہ کس راستے پر ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ معاشرہ بھی ایک قافلہ ہی کی طرح ہے جو ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ قافلہ رواں دواں ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس قافلہ کو کس سمت میں لے جایا جائے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ موٹر ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہے۔ اس حالت میں اسٹیرنگ وہیل اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ کہیں اسے گاڑی بند کرنے یا ٹھیرانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں گاڑی کی رفتار تیز کرنے اور بڑھانے کی۔ کسی جگہ اسٹیرنگ وہیل گھمانا پڑتا ہے، کہیں گیئر بدلنا ہوتا ہے اور کہیں بریک لگانا۔ یہ سب باتیں گاڑی کو صحیح چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔ اسے بھی صحیح سمت میں چلانے کے لیے یہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی اس کا رخ موڑنے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی تیز چلانے کی اور کبھی ٹھیرانے کی۔ ہر کام وقت معین پر کرنا ہوتا ہے۔ اسے ہی معاشرے کی مصلحت کو سمجھنا کہتے ہیں۔ جو شخص یہ بات نہیں سمجھتا، وہ معاشرے کا ہادی اور رہبر نہیں بن سکتا اور نہ معاشرے کی مصلحت اور مفاد کے بارے میں گفتگو کر سکتا ہے۔

ہم معاشرے کے ہادی و رہبر اسی وقت بن سکتے ہیں جب ان سب باتوں کو سمجھیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ کہاں معاشرے کو

بریک لگانا چاہیے اور کہاں اس کا رُخ موڑنا چاہیے۔ معاشرہ زوال و عروج کے پیچ و خم آتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی معاشرتی موڑ آجاتے ہیں اور معاشرہ ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں بہت احتیاط سے گھومنا پڑتا ہے۔ ہمارا معاشرہ بھی اس وقت کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہے۔ ایک نیا تمدن ابھر رہا ہے۔ نئے نئے نظریے اور نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہمارے سامنے رکاوٹیں ہیں اور ہمیں بہت احتیاط سے چلنا ہے تاکہ ہم سہولت سے اور بے خطر اس موڑ سے گزر جائیں۔ اسٹیرنگ بہت آہستہ گھمانے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا نہ ہو۔ سامنے دیوار ہے۔ اس دیوار سے بچ کر اپنے راستے پر جانا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آنکھیں بند کرکے اسی طرح چلتے رہیں جیسے پہلے چل رہے تھے۔ پہلے دیوار نہیں تھی، اب دیوار ہے۔ پہلے رکاوٹ نہیں تھی، اب رکاوٹ ہے۔ دریا آگیا ہے۔ ہم پہاڑ کے درّہ پر پہنچ گئے ہیں۔ بہرحال یہ معاشرے کے رہنما کا کام ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے معاشرے کو کہاں مڑنا ہے اور کس نئے راستے پر چلنا ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رفتار کہاں بڑھانی ہے۔ آج دنیا ریس کورس بن گئی ہے سب کوشش کر رہے ہیں کہ دوڑ جیت لیں اور آگے نکل جائیں۔ اس لیے رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ آج علم اور صنعت کی دوڑ ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ معاشرے کو حرکت میں لایا جائے تاکہ وہ دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ بیٹھے بیٹھے نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کا نام رہنمائی اور ہدایت نہیں۔

ایک روز میں نے مدرسۂ مروی میں چند طلبہ سے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہادی قوم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہم لوگوں کو منع کرنے

ہی کا کام اختیار کریں۔ جب بھی کوئی بات ہو یہی کیے جائیں یہ مت کرو، وہ مت کرو اور اسی طرح لوگوں کو ایک مصیبت میں مبتلا کردیں۔ کبھی کبھی لوگوں کی ہمت افزائی بھی کرنی چاہیے اور روکوں کو کام پر آمادہ کرنا چاہیے۔ میں نے یہی موٹرگاڑی کی مثال دی اور کہا کہ جیسے موٹرڈرائیور کی طرح کبھی رفتار تیز کرنی چاہیے، کبھی اسٹیرنگ وہیل گھمانا چاہیے، کبھی بریک لگانا چاہیے اور کبھی تیز روشنی جلانی چاہیے۔ ہر موقع کا اپنا ایک اقتضا ہوتا ہے۔ پھر میں نے مذاقاً کہا کہ ہمیں ہمیشہ مسٹر بریک نہیں بنے رہنا چاہیے کہ ہر جگہ بس بریک ہی لگاتے رہیں۔ محض بریک لگانا کافی نہیں ہے۔ کبھی سٹیرنگ اور کبھی مسٹر گیئر بھی بن جانا چاہیے۔ اس پر ایک طالب علم نے کہا ہم تو کچھ بھی نہیں، صرف ریورس گیئر ہیں۔

بہرحال مختلف مواقع کو سمجھنے کے لیے وسیع علم اور زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ یہ سمجھے کہ مورچہ کہاں ہے، مورچہ پر قبضہ کرنا چاہیے۔ جو موقع ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي أَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٌ أَلَا فَتَعَرَّضُوا لَهَا۔ یعنی اللہ کی رحمت کی ہوائیں کبھی کبھی چلتی ہیں۔ اللہ کی رحمت کی مثال اس نسیمِ خوشگوار کی سی ہے جس کے متعلق معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی۔ چوکنے رہو تاکہ اس بادِ بہاری کے جھونکے جب بھی آئیں ان سے فائدہ اٹھا سکو۔ اچھے اور مناسب موقع کی مثال زود گزر ہوا کے جھونکے کی سی ہے جو آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ اگر ہاتھ سے نکل جائے تو پھر اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ افسوس ہماری حالت پر کہ ہم موقع گنواتے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں مادہ پرست اور وہ گمراہ لوگ جنہوں نے اپنے مسلک پر مذہب کا لیبل لگا رکھا ہے کس قدر چالاک ہیں اور وہ ایک معاشرتی چوکی کے بعد دوسری چوکی اور ایک مورچہ کے بعد دوسرا مورچہ ہمارے ہاتھ سے چھینتے اور حساس مراکز پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنا مقصد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ مت کرو، وہ مت کرو، بریک لگاؤ بریک اور اس کارنامے پر بہت خوش اور مطمئن بھی ہیں۔

اس فقرہ سے وَتَوْقِيفِهِمْ عَلَىٰ مَا أَرَادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَدُنْيَاهُمْ مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی دینی اور دنیاوی مصلحتوں سے آگاہ کیا جائے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اس کے لیے دو شرطیں ہیں: علم اور خلوص۔ دین کے لیے بھی علم کی ضرورت ہے اور دنیا کے لیے بھی۔ واعظ کو دین شناس بھی ہونا چاہیے اور دنیا کے حالات حاضرہ اور معاشرتی واقعات تغیرات اور موجودہ رجحانات سے بھی باخبر ہونا چاہیے۔

تا راہ بین نباشی تو کے راہبر شوی!

خلوص

جہاں تک خلوص کا تعلق ہے حاجی نوری علیہ الرحمہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "لؤلؤ و مرجان" ہے۔ میں نے اس کتاب کا نام تو سنا تھا مگر پڑھی اسی سال ہے۔ یہ کتاب مرثیہ خوانی اور مرثیہ خواں حضرات کے بارے میں ہے۔ اس کا وعظ و خطبہ اور واعظ و خطیب حضرات سے کوئی تعلق نہیں

انھوں نے مرثیہ خوانی کے لیے دو شرطیں بیان کی ہیں۔ ایک اخلاص اور دوسرے صدق وراستگوئی۔ ان دونوں نکتوں پر بلند پایہ بحث کی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ کتاب پڑھی تو مجھے بہت پسند آئی اور حاجی نوری سے میری عقیدت میں اضافہ ہو گیا۔ حاجی نوری محدث، بڑے پابندِ شریعت اور متقی شخص تھے اور مرحوم حاجی شیخ عباس قمی اعلی اللہ مقامہ کے استاد تھے۔ خود شیخ عباس اور کئی دوسروں نے اعتراف کیا ہے کہ اتباعِ شریعت میں وہ اس درجہ تک نہیں پہنچ سکے جس درجہ پر ان کے استاد تھے۔ میں حاجی نوری کی اہم کتابیں پہلے پڑھ چکا تھا اور پہلے سے ان کا عقیدت مند تھا۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب کو پڑھنے کے بعد ان سے میری عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں وہ ایک ہندوستانی عالم کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان صاحب نے مجھے خط لکھا اور اس میں ہندوستان میں مجلس و منبر کی جو صورت ہے اس کی شکایت کی اور لکھا کہ یہاں کے مرثیہ خواں زیادہ تر جھوٹے قصے بیان کرتے ہیں۔ حاجی نوری کہتے ہیں کہ ان ہندوستانی عالم نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس سلسلے میں ایک کتاب لکھوں تاکہ ان لوگوں کی دروغ گوئی کا سدِباب ہو سکے۔ حاجی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ شاید ان ہندوستانی عالم کا خیال تھا کہ صرف ہندوستان ہی کے روضہ خواں جھوٹے قصے سناتے ہیں۔ عراق و ایران میں ایسی دروغ گوئی نہیں ہوتی ہوگی اور وہاں صحیح و معتبر روایات ہی بیان ہوتی ہوں گی۔ انہیں معلوم نہیں کہ جھوٹ کی اشاعت کا مرکز تو یہیں ہے اور یہیں سے جھوٹے قصے ہندوستان پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد حاجی نوری کہتے ہیں کہ یہ سب قصور

علماء کا ہے جو تنقید اور اعتراض نہیں کرتے۔ اگر اہلِ علم سہل انگاری سے کام نہ لیتے، ان لوگوں کے صدق و کذب پر نگاہ رکھتے اور انہیں اکاذیب بیان کرنے سے روکتے تو خرابی اس حد تک نہ پہنچتی، یہ لوگ اس قدر جری اور بیباک نہ ہو سکتے۔ اس طرح کے واضح جھوٹ نہ پھیلا سکتے۔ مذہب حقہ امامیہ اس قدر تضحیک و استہزاء کا ہدف نہ بنتا، مجالس اتنی بے رونق اور بے برکت نہ ہوتیں۔

بہرحال اپنے موضوع پر کتاب نہایت عمدہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس کتاب کو وہ مقبولیت کیوں حاصل نہیں ہوئی جس کی یہ مستحق ہے۔ اس کتاب میں حاجی نوری نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی دو شرطیں بیان کی ہیں — اخلاص اور صدق — دونوں پر خوب بحث کی ہے۔ خصوصاً صدق و راستی اور جھوٹ کے اقسام پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اخبار اور احادیث پر کس قدر عبور ہے۔ میں نے اس موضوع پر اس قدر مفصل بحث اب تک کہیں اور نہیں دیکھی۔

اخلاص پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اجرت اور معاوضہ لے کر روضہ خوانی پر گفتگو کی ہے۔ اخلاص سے مراد یہ ہے کہ کوئی عمل محض خدا کی رضا کے لیے کیا جائے۔ دوسری کوئی غرض شامل نہ ہو۔ غیر از خدا کے لیے عمل کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہی کہ روپیہ کمانا مقصود ہو۔ اور بھی چند اقسام ایسی ہیں جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میری نظر میں ان کی اہمیت اجرت اور معاوضہ لینے سے بھی زیادہ ہے اور یہ بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

کسی شخصیت کی دلالی

ان اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص خطابت کی کرسی یا حسینؑ ابن علیؑ کے منبر پر بیٹھ کر دین کی تبلیغ کی بجائے کسی شخصیت کی دلالی شروع کر دے اور منبر کو شخصیتوں کی دلالی کا ذریعہ بنالے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی چیز ہمارے معاشرے میں موجود ہے اور منبروں کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جس شخصیت کی دلالی کی جارہی ہے وہ کوئی سیاسی شخصیت ہے یا روحانی شخصیت یا کوئی اور ــــ دلال بانی مجلس ہے، پیش نماز ہے یا پیش نماز سے اونچے درجہ کا کوئی شخص۔

ایسی حرکتیں منبر کی حیثیت اور مرتبہ سے فروتر اور اس کے خلاف ہیں۔ ویسے ظاہر ہے کہ جو شخص کوئی کام کرتا ہے وہ اس کی کوئی توجیہ اور تاویل تو گھڑ ہی لیتا ہے لیکن اس میں شک نہیں جن چیزوں نے منبرِ خطابت کو بے وقعت اور خراب کیا ہے ان میں سے ایک یہی دلالی ہے۔ اس کی وجہ سے منبر دلالی کی کرسی بن گیا ہے جسے اس آلودگی سے پاک کرنا ضروری ہے۔

لطیفہ گوئی

ایک اور بات یہ ہے کہ اگر وَ تَوَقُّفِهِمْ عَلَىٰ مَا أَرَادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَ دُنْيَاهُمْ کے مصداق دینی اور دنیاوی مصالح کا بیان مقصود ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مصلحت گوئی اور بات ہے اور دلچسپ باتیں کرنا اور چیز۔ مصلحت گوئی کے یہ معنی نہیں کہ ہم وہ کچھ کہیں جو لوگوں کو پسند آئے اور وہ ہماری واہ واہ کریں۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ لوگ اپنے زمانے کے پیغمبروں کے مخالف کیوں تھے؟ جو پیغمبر بھی آیا اس کی اتنے زیادہ لوگوں نے مخالفت کیوں کی؟ خود پیغمبروں کے زمانے میں ان کے معتقدین کی تعداد کم کیوں رہی؟ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ انبیاء لوگوں کی کمزوریوں اور خرابیوں کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور ہم لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کمزوریوں اور برائیوں کی اصلاح کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان برائیوں اور کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ ہم ان کے نفع کی بات نہیں کرتے بلکہ بانیٔ مجلس اور سامعین کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کی مصلحت کے مطابق بات نہیں کرتے بلکہ ان کے رجحان کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں قصہ محض جھوٹ ہے اور علاوہ ازیں لوگوں کو گمراہ کرے گا، مگر سامعین کو لبھانے کے لیے اس کو بیان کرتے ہیں۔

مثلاً باوجود اس کے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ حکایت من گھڑت ہے اور افسانہ طرازوں کے تخیل کی ایجاد ہے، پھر بھی نقل کرتے رہتے ہیں کہ ایک عیسائی جو بہت گنہگار تھا اور جس میں تمام عیب شرعی موجود تھے، اسے ایسا اتفاق ہوا کہ زائرین کربلا کے ساتھ ہو لیا۔ جب سب شہر کے دروازے پر پہنچے تو اور لوگ تو سواریوں سے اتر کر زیارت کے لیے روانہ ہو گئے البتہ عیسائی چونکہ غیر مسلم تھا دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گیا اور سامان پر پڑ کر سو گیا۔ زائرین کے قافلے آتے جاتے رہے اور قافلوں کا غبار اڑ اڑ کر عیسائی کے بدن پر گرتا رہا۔ عیسائی نے خواب میں دیکھا کہ قیامت کا دن ہے اور لوگ گروہ در گروہ سید الشہداءؑ سے نجات کا پروانہ لے رہے ہیں۔ فرشتے آتے ہیں اور ہر گروہ کا تعارف کراتے ہیں کہ یہ اشک افشانی کرتے تھے، یہ سینہ زنی کرتے تھے،

یہ زنجیروں سے ماتم کرتے تھے' یہ مجالس میں نیاز تقسیم کرتے تھے۔ یہ سبیلیں لگاتے تھے اور یہ فلاں کام کرتے تھے اور یہ فلاں کام۔

سید الشہداء ہر گروہ کو پروانۂ نجات دیتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب رگ بٹ گئے اور فرشتوں کے سامنے کوئی شخص باقی نہ رہا۔ حضرت نے فرمایا' ایک شخص رہ گیا ہے' تم نے اسے پیش نہیں کیا۔ فرشتوں نے عرض کیا اب تو کوئی باقی نہیں۔ ہم فرشتے غلطی نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا واقعی تم سے غلطی ہو گئی۔ ایک عیسائی دروازے پر سو رہا تھا۔ جب زائروں کے قافلے گزرتے تھے۔ اس کے کپڑوں پر میرے زوار کی گرد راہ جم جاتی تھی۔ جس کے کپڑوں یا بدن پر یہ غبار گرے وہ جہنم میں نہیں جا سکتا۔ ایک پروانۂ آزادی اس عیسائی کو بھی دے دیا جائے۔ اسی طرح کے اور قصے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ سب عوام کی نادانی اور کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور لوگوں کی گمراہی اور بیجا افتخار میں اضافہ کرنا ہے۔ پیغمبر ایسا نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگوں کی کمزوریوں کے خلاف جنگ کرتے تھے۔ لوگوں کے مفاد کا لحاظ رکھتے تھے لیکن ان کے رجحانات اور خوشنودی کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے میں بہت تھوڑے آدمیوں کو ان سے عقیدت پیدا ہوتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ وَ تَوْقِيْفِهِمْ عَلٰى مَا اَرَادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِيْنِهِمْ وَ دُنْيَاهُمْ کے فرمان کی تعمیل کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے: ایک علم اور معلومات کی اور دوسرے اخلاص کی۔

معلومات بھی دو طرح کی ضروری ہیں: ایک دین کے متعلق مکمل

معلومات، دوسرے دنیا کے حالات اور معاشرتی واقعات سے واقفیت۔
اخلاص کے سلسلے میں بھی میں نے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ پہلی تو یہ کہ منبر کو دلالی کی کرسی نہ بننے دیا جائے اور دوسری یہ کہ معاشرے کی کمزوریوں کا مقابلہ کیا جائے، ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

خطیب کو چاہیے کہ لوگوں کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کرے

امام رضاؑ کے فرمان کا تیسرا حصہ یہ تھا:

وَيُخْبِرُهُمْ بِمَا وَرَدَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْآفَاقِ مِنَ الْأَحْوَالِ الَّتِي فِيهَا الْمَضَرَّةُ وَالْمَنْفَعَةُ۔

یعنی دور دراز کے مسلمان علاقوں سے جو اطلاعات ملیں اور وہاں جو اچھے برے واقعات پیش آئیں ان سے لوگوں کو آگاہ کرے۔

آفاق جمع ہے افق کی اور اس سے مراد ہیں دور دراز کے مقامات، یعنی دور دراز کے مقامات پر اسلامی معاشرے کو جو واقعات پیش آئیں اور جن سے لوگ بے خبر ہوں خطیب کا فرض ہے کہ لوگوں کو ان کی اطلاع دے۔
خلاصہ یہ ہے کہ داخلی اور خارجی حالات بیان کرے۔ کیا آپ کو علم ہے کہ دنیا میں مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا آپ عالمِ اسلام کی خارجی سیاست سے واقف ہیں؟ یہ سب خطیب کو بتلانا چاہیے۔

مثلاً الجزائر[1] کا حادثہ جو پیش آیا ہے، اسی کو لیجیے۔ ہمارے خطیبوں کو چاہیے کہ اس حادثہ کی تازہ ترین خبریں لوگوں تک پہنچائیں۔ یہ نہیں کہ خطیب یا تو بالکل خاموش رہیں یا کچھ کہیں بھی تو اس وقت جب وہ بات ساری دنیا میں پھیل چکی ہو یا وہی باتیں دہرائیں جو ہر روز اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کو چاہیے کہ اپنا خصوصی نمائندہ الجزائر بھیجیں اور تازہ ترین خبریں حاصل کریں، یا کم از کم تازہ ترین خبریں نیوز ایجنسیوں ہی سے حاصل کریں۔ فرانس کی سیکرٹ سروس کے گھناؤنے جرائم کو منظر عام پر لائیں۔ واضح رہے کہ فرانس کی سیکرٹ سروس یزید کی فوج کی مثل ہے۔ جب یزیدی لشکر کے مظالم کو بیان کیا جاتا ہے تو ان کے مظالم کو کیوں نہ بیان کیا جائے۔ دونوں میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی شقاوت میں ان سے کچھ کم نہیں۔ انھوں نے بھی کچھ کسر نہیں چھوڑی۔ عورتوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑا۔ کتابوں اور کتب خانوں کو انھوں نے آگ لگا دی۔ آبادیوں کو ویران کر دیا، کھیتوں کو تباہ کر دیا۔ نسل کشی کے یہ مرتکب ہوئے[2]۔ ان کا بھی وہی حال ہے جیسا کہ قرآن میں بعض لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۰۵)

---

[1] یہ تقریر اس وقت کی گئی جب الجزائر میں جنگِ آزادی جاری تھی۔

[2] یہی کچھ حال میں اسرائیل نے صابرہ اور شتیلا کے فلسطینی کیمپوں میں کیا اور یہی کچھ روس افغانستان میں کر رہا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں امریکی امپیریلزم بھی ایسے ہی گھناؤنے جرائم کی مرتکب ہو رہی ہے۔

امام حسینؓ کا واقعہ جس کی یاد قائم رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے درحقیقت ہمارے لیے ایک تنبیہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام پر کیا آفت آئی تھی۔ اس سانحہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم ہمیشہ ہوشیار رہیں کہ مبادا اسلام پر کوئی اور ایسی مصیبت نہ آجائے لیکن اس کے برعکس ہم نے کوئی ایسا سبق نہیں سیکھا۔ الجزائر کے حادثہ سے بھی بڑی مصیبتیں اسلام پر گزر گئیں لیکن ہم میں سے کسی نے اُف تک نہ کی۔

فاجعۂ اندلس

کچھ مدت قبل میں نے ایک بڑے عالم سے بحوم مرجع تقلید بھی ہیں سانحۂ اندلس کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اثنائے گفتگو میں میں نے ان سے کہا کہ پانچ سو سال قبل اسلام اور مسلمانوں پر ایک بہت بڑا سانحہ گزر گیا۔ (اس سانحہ کا اختتام ۸۹۸ھ میں ہوا) اسلامی تمدن کا ایک جام کرتن ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ سب آدمی مارے گئے یا جلا دیے گئے۔ ایک جگہ عیسائیوں نے تین ہزار آدمیوں کو زندہ جلا دیا۔ دو لاکھ مسلمان جو ملک سے ہجرت کر جانا چاہتے تھے اور خود عیسائیوں نے انہیں ملک چھوڑنے کی اجازت دی تھی ان میں سے ایک لاکھ راستے ہی میں مارے گئے (سترھویں صدی کا مشہور فرانسیسی مؤرخ) گستاولو بون خود عیسائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عیسائیوں نے جو مظالم اسپین میں مسلمانوں پر کیے ان کی دنیا کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اتنے بڑے مظالم واقع ہوئے لیکن دوسری طرف آپ دیکھیں گے کہ اس وقت سے لے کر آج تک جتنی کتابیں ایرانیوں نے لکھیں، خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، کسی فردِ واحد نے بھی کسی کتاب میں اس

حادثہ کا جو عالم اسلام پر گزر گیا، نام تک نہیں لیا۔ کسی ہمدردی یا اظہار افسوس کا تو ذکر ہی کیا کوئی نہیں تھا جو اس حادثہ کی اطلاع عوام تک پہنچاتا۔ بظاہر پہلی کتاب جو ایران میں تاریخ آندلس پر لکھی گئی وہ حال ہی میں آقائے آیتی نے تالیف کی ہے اور یونیورسٹی نے اسے شائع کیا ہے۔

دنیا کے مختلف حصّوں میں

برادرانِ اسلام

اس طرح کے واقعات کا تذکرہ منبروں سے ہونا اور ان کی اطلاع عوام تک پہنچانا ضروری ہے۔ آیا اب بھی آپ جانتے ہیں کہ ان شہروں میں جو پہلے ایران کا حصہ تھے اور اب کمیونسٹ ملکوں میں شامل ہیں، وہاں مسلمان بھائیوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ مشرقی ترکستان کے مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ کیا آپ کو فلسطینی مہاجرین کے متعلق کچھ معلوم ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ آج اسرائیل عالم اسلام کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے؟

آجکل عالم اسلام دو بڑے خطروں سے دوچار ہے۔ الجزائر کا قضیہ اپنی اہمیت کے باوجود مقامی نوعیت کا ہے لیکن ان دو خطروں کی نوعیت عمومی ہے اور عالم اسلام کی خارجی سیاست میں ان کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ ان دو خطروں میں سے ایک کمیونزم ہے، دوسرا صیہونزم۔ ایک کفر صریح ہے، دوسرا کفر نفاق۔ ان دونوں نے تمام اسلامی ملکوں میں اپنا جاسوسی کا جال پھیلا رکھا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہر سال کتنے ملین ڈالر اس کام پر صرف کیے

جاتے ہیں۔ یہ دونوں اسلام کی شہ رگ کو منقطع کرنے کے درپے ہیں اور قینچی کے دو پھلوں کی طرح اسلام کی جڑ کاٹنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان دونوں خطروں سے پوری طرح ہوشیار اور چوکنا رہیں۔ آپ سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عرب ملک کے فلاں عرب ملک کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں۔ شام اور مصر میں کشیدگی ہے۔ اردن کے شام کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں۔ سعودی عرب کے حالات ٹھیک نہیں۔ یاد رکھیے کہ ان سب جھگڑوں میں اسرائیل کا ہاتھ ہے۔

اس خطرے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے لیکن کون آگاہ کرے؟ حکومت؟ حکومت کو تو اپنے فرائض کا ہی ہوش نہیں۔ سیاسی پارٹیاں؟ سیاسی پارٹیوں کے آئین میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں۔ اس خطرے عوام کو آگاہ کرنا خطیبوں کا فرض ہے۔ انہیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کیونکہ وہ اسلام کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

خطیب اسلام کا ترجمان ہے

ہر حکومت اور ہر بڑے ادارے کا ایک ترجمان ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سرکاری ترجمان نے یہ کہا ہے اور وہ کہا ہے۔ دین اسلام کا بھی ترجمان ہونا چاہیے۔ اسلام کے ترجمان خطیب اور اہل منبر ہیں۔ امام رضاؑ نے فرمایا:

وَيُخْبِرُهُمْ بِمَا وَرَدَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْآفَاقِ مِنَ الْاَحْوَالِ

الَّتِیْ فِیْہَا الْمَضَرَّۃُ وَالْمَنْفَعَۃُ

دور دراز کے علاقوں کے وہ حالات جو عوام کو معلوم نہ ہوں ان کو بتلائے جائیں۔ امام رضاؑ نے یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ امپیریلسٹوں، کمیونسٹوں اور یہودیوں کی سرگرمیاں کیا ہیں اور ان سرگرمیوں کا بیان کرنا واجب ہے۔

منبرِ حسینؑ سے اگر یہ سب باتیں بیان کی جائیں تو اسے واقعی محافظِ اسلام کہا جا سکتا ہے۔ یہی عزاداریِ حسینؑ کا فلسفہ ہے۔ ورنہ امام عالیمقام کو ہمارے رونے سے کیا فائدہ؟ انہیں ہمارے اور آپ کے رونے کی کیا ضرورت؟ امام حسینؑ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کا نام اور ان کا نظریہ زندہ رہے۔ ان کے نظریہ کے تحت ہم باطل سے نبرد آزما ہوں۔ کمیونزم کے خلاف جنگ کریں، سامراجی اور صیہونی سازشوں کا قلع قمع کریں اور بے انصافی، بدعنوانی، قمار بازی اور مسکرات کے خلاف جدوجہد کریں۔

اَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتَ الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرْتَ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَیْتَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَجَاهَدْتَ فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ کاش ایک بار پھر حسینؑ کا ذکر ان کا نام اور ان کی یاد ہمیں جنبش میں لائے یَا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزاً عَظِیْماً۔ ایک ایسے سانحہ میں شرکت کی آرزو کہ جس کو اب چودہ سو سال گزر چکے ہیں بظاہر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ ہم مستعد اور متعہد رہیں اور سید الشہداء کو ایک نظریے کی صورت میں زندہ رکھیں۔ شہید کربلا نہیں رہے مگر ان کا مکتب زندہ ہے اور ہمیں حسینی پرچم تلے ہی جدوجہد کرنی ہے اور راہِ حق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔

اے حاملانِ آتشِ سوزاں، بڑھے چلو

اے پیروانِ شاہِ شہیداں، بڑھے چلو

اے فاتحانِ صرصر و طوفاں، بڑھے چلو

اے صاحبانِ ہمتِ یزداں، بڑھے چلو

تلوار شمرِ عصر کے سینے میں بھونک دو

ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو

دینی رہبری کے نظام کی بنیادی شکل

جن لوگوں کے دل میں اسلامی نظام کی سربلندی کی آرزو ہے اور جو ماضی قریب و بعید میں مسلمانوں کی ترقی اور انحطاط کے بارے میں سوچتے ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ روحانیت کے مقدس نظام یعنی اس ادارہ کی ترقی اور سربلندی کے بارے میں نہ سوچیں جو مسلمانوں کی دینی رہبری کا ذمہ دار ہے۔

اتنا تو مسلّم ہے کہ مسلمانوں کے جملہ امور کی اصلاح براہِ راست اسی ادارہ کے ذریعے سے ہونی چاہیے جس کے ہاتھ میں ان کی دینی رہنمائی کی باقاعدہ ذمہ داری ہے یا کم از کم تمام اصلاحات اس ادارہ کے خیالات سے مطابقت اور ہم آہنگی ضرور رکھتی ہوں۔

اگر بالفرض کسی اصلاحی یا دینی تحریک کا آغاز کسی فرد یا افراد کی طرف سے ہو لیکن اسے علماء و مجتہدین کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو تو اس کی

کامیابی کی زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔

مقدس دینِ اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذمہ داری مشترک ہے یعنی سب ایک دوسرے کی ہدایت، رہنمائی اور ایک دوسرے کے مفاد کی حفاظت اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ جس شخص کو یقین ہے کہ اس پر اسلام کی طرف سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ ضرور رہنمائی کے اس نظام سے متعلق بھی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔

چونکہ ہمارے کچھ سماجی دانشوروں کو دینی امور میں دلچسپی اور اعتقاد نہیں ہے اس لیے وہ تو ممکن ہے کہ روحانیت کے نظام، اس کی مشکلات اور ان کے حل کے بارے میں نہ سوچتے ہوں۔ اسی طرح جو لوگ دلچسپی تو رکھتے ہیں اور سادہ لوح اور بے خبر ہیں، ان کے بھی چھوٹے سے دماغ میں اس طرح کے خیالات نہیں آتے لیکن جو لوگ اسلامی فکر بھی رکھتے ہیں اور وسیع النظر ہیں، ان کی سوچ کا اہم ترین موضوع یہی ہے۔

چونکہ اس عاجز کا بھی سرمایہ افتخار صرف یہی ہے کہ وہ بھی اسی طبقہ سے منسلک اور اسی طبقہ کے خرمن کا خوشہ چیں سمجھا جاتا ہے اس نے ایک مذہبی و علمی خاندان میں نشوونما پائی ہے اور علوم دینیہ کے مراکز میں تربیت کی ہے اس لیے جہاں تک یاد ہے جب سے معاشرتی مسائل پر کچھ سوچنے کے قابل ہوا ہے، اسی موضوع پر غور و فکر کرتا رہا ہے۔

مسئلہ کی اصل جڑ

تقریباً تیرہ سال قبل ایک روز رات کے وقت قم[1] میں ایک دوستانہ

---

[1] ایران کے اسلامی انقلاب کا مرکز

محفل میں متعدد اساتذہ اور فضلاء جمع تھے اور مجھے بھی اس محفل میں شرکت کا فخر حاصل تھا کہ نظام روحانیت اور اس کے مسائل اور خامیوں کا تذکرہ آگیا۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ ماضی میں ہمارے علمی و روحانی مراکز تعلیمی لحاظ سے متنوع اور جامع ہوتے تھے۔ ان میں مختلف علوم مثلاً تفسیر، حدیث، تاریخ، فقہ، اصول، فلسفہ، کلام، ادبیات، حتیٰ کہ طب اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی مگر آہستہ آہستہ ان کا رجحان محدودیت کی طرف ہوتا چلا گیا۔ یوں کہیے کہ پہلے اگر یونیورسٹیاں تھیں تو اب صرف کالج رہ گئے بلکہ کچھ دن سے تو کالج بھی صرف فقہ ہی کے رہ گئے ہیں۔ باقی علوم کی باقاعدہ تعلیم نصاب سے خارج ہوتی چلی گئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ پھر یہ کیا بات ہے کہ روحانیت کے مقدس ماحول میں زیادہ تعداد بیکار، لغو اور رکاوٹ ڈالنے والے لوگوں کی ہے یہاں تک کہ ایک روحانی پیشوا مجبور ہے کہ ایک پھول کو سینچنے کے لیے سینکڑوں کانٹوں اور گھاس پھوس کو بھی پانی دے۔ ہمارے یہاں جمود، سکوت اور بے حسی کو آزادئ رائے، حریت اور زندہ صفتی پر کیوں ترجیح حاصل ہے؟ چونکہ ہر شخص اس فکر میں ہے کہ اپنے درجہ اور منصب اور حیثیت اور مقام کا تحفظ کرے، ناچار منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھا رہتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نصاب ہماری ضروریات کے مطابق مرتب نہیں کیا جاتا؟ ہمارے یہاں تصنیف و تالیف اور اخبار و رسائل کی اشاعت اس قدر کیوں نہیں جس قدر ضروری ہے؟ ہمارے یہاں ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے اور بیجا القاب لگانے کا رواج کیوں ہے اور بدقسمتی سے یہ رواج روز بروز کیوں بڑھ رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے صالح اور روشن فکر اور دیانت دین کو جوں ہی کچھ اختیار حاصل ہوتا ہے، اصلاح کی طاقت ان سے سلب ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے افکار و خیالات

سب بھول گئے۔

کچھ گفتگو کے بعد ان مسائل کی بنیادی وجہ کی بات آگئی اور طے پایا کہ ہر شخص اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنی رائے پیش کی۔ بندہ نے بھی اپنی رائے ظاہر کی لیکن ایک اور دوست نے جس رائے کا اظہار کیا وہ مجھے اپنی اور دوسرے دوستوں کی رائے کے مقابلے میں مرجح معلوم ہوئی اور اب میرا بھی وہی خیال ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام مشکلات اور خامیوں کی اصل اور بنیادی وجہ مالی نظام اور علماء کا روزی حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ انھوں نے جو الفاظ استعمال کیے وہ کچھ یوں تھے کہ تمام خرابیوں کی علت العلل سہم امام ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نہ یہ ان کا مطلب تھا اور نہ میرا یہ مطلب ہے کہ ہماری خرابیوں اور خامیوں کا اصل سبب سہم امام کی تشریع ہے بلکہ میرے عقیدے میں تو یہ قانون اس مقصد کے لیے جس کے لیے اس کی تشریع ہوئی ہے یعنی احیاء و بقائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ، نہایت ہی مناسب اور حکیمانہ ہے۔ جیسا کہ میں بعد میں عرض کروں گا یہ قانون نظام روحانیت کے استقلال و آزادی کا بہترین ضامن ہے۔ یہ بھی مقصد نہیں کہ منتظمین اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس قانون سے استفادہ کا جو طریقہ ہمارے یہاں آہستہ آہستہ رائج ہو گیا ہے اس نے اس نظام کو ایک خاص شکل دے دی ہے جس کی وجہ سے بہت سی مشکلات اور خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

نظام صالح

بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے بننے یا بگڑنے کا

دارومدار صرف اس معاشرے کے افراد خصوصاً زعماء پر ہے یعنی لیڈر اگر اچھے ہوں گے تو معاشرہ بھی اچھا ہوگا اور اگر لیڈر برے ہوں گے تو معاشرہ بھی صالح نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر ساری ذمہ داری صرف سربرآوردہ افراد کی ہے اور فقط وہی معاشرے کی درستگی یا عدم درستگی کے لیے جوابدہ ہیں۔ بہت سے لوگ اسی طرح سوچتے ہیں اور اسی سوچ کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی نگاہ جب بھی معاشرتی برائیوں کی طرف جاتی ہے تو وہ اس کا علاج یہی تجویز کرتے ہیں کہ سربراہ نیک اور صالح ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اصل اہمیت فرد کی ہے لیکن جن لوگوں نے اس مسئلہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ معاشرتی نظام اور اس کے تحت قائم ہونے والی تنظیموں اور اداروں کی اہمیت لیڈروں کی اہمیت سے بہت زیادہ ہے۔ ہمیں پہلے صالح نظام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اچھے لیڈروں کی اہمیت دوسرے نمبر پر آتی ہے۔

افلاطون کا ایک معاشرتی نظریہ ہے جو افلاطون کے مدینۂ فاضلہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمان فلاسفہ میں سے بھی ابو نصر فارابی نے افلاطون کی پیروی کی ہے اور اس کے قائم کردہ خطوط پر اپنے نظریات کو ترتیب دیا ہے۔ ان دونوں فلسفیوں کے خیالات کی بنیاد افراد کی صلاحیتوں پر ہے اور ان کے نزدیک اصل اہمیت فرد کی ہے۔ ان دونوں نے اپنی تمام تر توجہ اس نکتہ پر مرکوز کی ہے کہ معاشرتی امور کی باگ ڈور کس قسم کے افراد کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے اور ان افراد میں کیا علمی اور عملی صفات ہونی ضروری ہیں لیکن انہوں نے اس بات پر چنداں توجہ نہیں دی کہ کون سی معاشرتی تنظیم اور کون سے معاشرتی ادارے قائم کیے جائیں اور ان کے مثالی افراد کس نظام کے تحت انتظامی

باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔

ان فلسفیوں کے پیش کردہ نظریہ پر جو تنقید ہوئی ہے اس میں ایک خاص نکتہ یہی ہے کہ کسی نظام کا لوگوں کے — جن میں لیڈر بھی شامل ہیں — افکار اور کردار پر جو گہرا اور دور رس اثر مرتب ہوتا ہے اس کی طرف ان دونوں فلسفیوں نے توجہ نہیں دی۔ اگر نظام صحیح ہو تو برا آدمی بھی اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا بلکہ بعض صورتوں میں تو خود اس کے اپنے خیالات بھی بدل جاتے ہیں اور وہ ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد کا مصداق بن جاتا ہے۔

ایک دانشور افلاطون کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

"افلاطون نے یہ نازک مسئلہ چھیڑ کر کہ معاشرے میں کس کو حکومت کرنی چاہیے، ایک غلط اور خطرناک سیاسی فلسفہ ایجاد کیا ہے۔ اس سے زیادہ عاقلانہ اور مثبت بات یہ ہوتی کہ وہ یہ بتلاتا کہ ہم کس طرح ایسا معاشرتی نظام قائم کریں کہ غیر صالح لیڈر معاشرے کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔"

زعمائے صالح کی اہمیت فقط اس طرزِ فکر کے لحاظ سے ہے جو وہ معاشرتی اداروں کی اصلاح اور بہبود و ترقی کے بارے میں رکھتے ہیں ورنہ اگر ان کا طرزِ فکر بھی وہی ہو جو غیر صالح زعما کا ہے اور سب ایک ہی طرح کام کریں تو پھر ان میں صرف شخصی اور اخلاقی لحاظ سے فرق رہ جاتا ہے اور چونکہ صالح زعما کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی وہ کوئی قابلِ ذکر معاشرتی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

ہم افلاطون اور فارابی کے نظریہ کی اگر توجیہ کرنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے صرف ان صالح افراد کی اہمیت بیان کی ہے جن کا معاشرتی اداروں پر تسلط اور غلبہ ہو۔ دوسرے بے اثر لوگوں کے صالح

ہونے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

معاشرتی اداروں اور معاشرے کے افراد کا آپس میں وہی تعلق ہے جو کسی شہر کی سڑکوں، گلیوں اور مکانوں کا وہاں کے باشندوں اور ذرائع آمدورفت کے ساتھ ہے۔ جس شہر میں جس طرح سڑکیں اور گلیاں بنائی گئی ہوں، اس شہر کے باشندے مجبور ہوں گے کہ انہی سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں سے گزریں۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتے ہیں کہ جس راستے کو زیادہ صاف، آسان اور قریبی سمجھیں، اسے اختیار کر لیں۔

فرض کیجیے کہ اگر کوئی شہر بغیر نقشہ اور منصوبہ بندی کے آہستہ آہستہ پھیلتا اور بڑھتا رہا ہو تو اس شہر کے باشندے مجبور ہوں گے کہ شہر کی موجودہ وضع کے مطابق ہی اپنی زندگی ڈھال لیں اور اسی کے مطابق اپنی آمدورفت رکھیں۔ ایسے شہر میں آمدورفت، گاڑی چلانے اور شہر کے انتظام میں دشواری ضرور ہوگی، مگر اہل شہر کے لیے اس دشواری کے ازالہ کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ شہر کی سڑکوں، گلیوں اور مکانوں کی وضع بدل دیں۔

اگر بالفرض صالح لیڈر برسراقتدار آ بھی جائیں تب بھی ان کے کام میں خامیاں رہیں گی۔ ان کے کام میں اور دوسرے کام میں اتنا ہی فرق ہوگا کہ جیسے کوئی ایک شخص بے ترتیب اور پرپیچ راستوں سے گزرتے ہوئے اس راستے کا انتخاب کرے جو ان میں سے بہترین ہو۔

ہمارے علوم دینیہ کے مراکز کی خصوصیات

ہمارے علوم دینیہ کے مراکز کے کچھ ایسے اوصاف اور ایسی امتیازی

خصوصیات ہیں جن کی نظیر کسی دوسرے تدریسی ماحول میں نہیں مل سکتی۔

اس ماحول میں پاکیزگی ہے، سچائی ہے، خلوص اور روحانیت ہے۔ یہی وہ روح ہے جو اس ماحول میں رچی بسی ہوئی ہے۔ چند اشخاص جن میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے، ان کا شمار مستثنیات میں ہے۔ کسی طالب علم کو دوسرے طلبہ پر اگر کوئی فوقیت حاصل ہوتی ہے تو اس کی بنیاد صرف علم تقدس اور تقویٰ پر ہوتی ہے۔ طلبہ میں امیر بھی ہوتے ہیں غریب بھی۔ شہری بھی ہوتے ہیں دیہاتی بھی۔ مزدوروں کے بچے بھی ہوتے ہیں اور تاجروں اور افسروں کے بھی۔ ماضی میں امراء اور شہزادے بھی ہوتے تھے مگر وہاں کسی بات کا کوئی فرق نہیں رہتا۔ اگر طلبہ کسی کی عزت کرتے ہیں اور کسی کو وقعت دیتے ہیں تو صرف تعلیمی اور روحانی امتیاز کی بنا پر۔

علوم دینیہ کے مراکز کا ماحول زہد اور قناعت کا ماحول ہے۔ اسراف عیاشی اور رت جگے کی محفلیں جو باقی سب طبقوں میں عام ہیں اور جن میں کبھی کبھی علوم دینیہ کے طلبہ کے علاوہ دوسرے طلبہ بھی شرکت کرتے ہیں وہاں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر کسی کا ان باتوں کی طرف ذرا بھی میلان ہوتا ہے تو اس کی ناکامی یقینی ہے۔ مجموعی طور پر طلبہ قانع اور کفایت شعار ہوتے ہیں اور انہیں دوسروں پر بوجھ نہیں سمجھا جاتا۔

استاد اور شاگرد کے تعلقات مخلصانہ اور احترام آمیز ہوتے ہیں۔ شاگرد اپنے اساتذہ کے احترام کا حاضر و غائب پورے ادب سے خیال رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کو ہمیشہ نیکی اور دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ استاد کے احترام کا اس قدر خیال صرف علوم دینیہ کے طلبہ سے مخصوص ہے اور ان تعلیمات کا نتیجہ ہے جو ائمۂ دین سے علم کی فضیلت اور معلم کے احترام

کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں۔ دوسرے تعلیمی حلقوں میں، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، ان باتوں کا وجود شاذ و نادر ہی ہے۔

دینی طلبہ کی عادت یہ ہے کہ جو سبق وہ استاد سے پڑھتے ہیں، بعد میں خود اس پر غور کرتے ہیں۔ کتاب سے مطالعہ دیکھتے ہیں اور کسی ہم سبق کے ساتھ تکرار کرتے ہیں۔ اونچے درجے کے دروس میں جو کچھ استاد سے سنتے ہیں، اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں اور رات کو اسے لکھ لیتے ہیں۔ جیسا کہ علوم جدیدہ کے طلبہ کی عادت ہے، علوم دینیہ کے طلبہ طوطے کی طرح رٹتے نہیں بلکہ غور و فکر اور تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔ چونکہ کسی کتاب کو پڑھانے کا حق کسی استاد سے مخصوص نہیں اور ہر شاگرد کو اپنا استاد منتخب کرنے کا حق ہے اس لیے اگر کسی طالب علم میں استعداد ہو تو جو کتابیں وہ خود پڑھتا ہے ان سے نچلے درجے کی کتابیں پڑھا بھی سکتا ہے۔ اس طرح ایک دینی طالب علم تحصیل کے ساتھ ساتھ تدریس کے فرائض بھی انجام دے سکتا ہے۔

علوم دینیہ کی تعلیم کا مخصوص طریقہ یہ ہے کہ طلبہ استاد سے جو سبق پڑھتے ہیں اس کا اچھی طرح مطالعہ کرتے ہیں، اس کے بعد بحث و تکرار کرتے ہیں اور پھر اس کو لکھ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی دوسرے سبق خود بھی پڑھاتے ہیں۔ اس طرح ان کی تعلیم میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

طلبہ کا مقصد محض نصاب کی تکمیل نہیں۔ استاد شاگرد کو جو نمبر دیتا ہے ان سے ان کے درجے اور مقام کا اندازہ نہیں لگایا جاتا بلکہ مباحثہ کی مجالس، سبق کے دوران میں شاگرد کے اعتراضات، اس کے اپنے پڑھانے کا طریقہ اور استادوں اور اپنے نچلے درجہ کے طلبہ کی توجہ جذب کرنے کی صلاحیت، یہ وہ باتیں ہیں جن سے علوم دینیہ کے طلبہ کی

استعداد کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔

علوم دینیہ کے طلبہ اپنی تعلیم اور تدریس کے مراحل بلا کسی تکلف کے بالکل قدرتی طور پر طے کرتے ہیں۔ کوئی استاد مقرر نہیں۔ وہ خود اپنی صوابدید سے جس استاد کو بہتر سمجھتے ہیں اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان مراکز میں ایک طرح کی ایسی آزادی اور ڈیموکریسی پائی جاتی ہے جس کا کسی دوسری جگہ وجود نہیں۔ اس لحاظ سے وہاں انتخاب اصلح کا قانون رائج ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں حکام بالا کلاس ٹیچر کا تقرر کرتے ہیں اور اس وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیچر اس کلاس کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ وہ کسی اونچی یا نیچی کلاس کے قابل ہوتا ہے اس لیے بسا اوقات شاگرد اس سے مطمئن نہیں ہوتے اور نہ اس کا مناسب احترام کرتے ہیں۔ نہ صرف نمبر نہ ملنے اور فیل ہو جانے کے ڈر سے برداشت کرتے ہیں۔ اس قسم کی بدنظمی اور بے ضابطگی کلاسیکی تعلیم میں عام ہے۔ علوم دینیہ کی تعلیم میں ایسی بے قاعدگیوں کا وجود نہیں۔

اسی وجہ سے علوم دینیہ کے مراکز میں افراد انتخاب اصلح کے قدرتی قانون کے مطابق آگے آتے ہیں۔ جیسا کہ علمائے الٰہی کے بارے میں خود امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

فَكَانُوا كَتَفَاضُلِ الْبَذْرِ يُنْتَقَى مِنْهُ وَيُلْقَى قَدْ مَيَّزَهُ التَّخْلِيصُ وَهَذَّبَهُ التَّمْحِيصُ.

یعنی ان کی مثال اس صاف بیج کی سی ہے جسے کاشت کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔

اسی قانون کے مطابق طلبہ درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ اس سیڑھی پر پہنچ جاتے ہیں جو مرجعیت سے ایک سیڑھی نیچے ہے۔ اس

سیڑھی تک تو طلبہ میں مقبولیت اور ان کی عقیدت مندی ہی اساتذہ کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے لیکن آخری سیڑھی تک پہنچتے ہی سہم ابہام اس کی تقسیم اور مشاہرہ وغیرہ کے سوال درمیان میں آ جاتے ہیں اور قانونِ انتخاب اصلح کی کارفرمائی باقی نہیں رہتی۔

یہ تو تھیں علوم دینیہ کے مراکز کے طلبہ کے طرز زندگی اور ان کے طریقہ تعلیم کی خوبیاں۔ کچھ خامیاں بھی ہیں ان کے بارے میں بھی گفتگو ضروری ہے۔

علوم دینیہ کے مراکز کی خامیاں

علوم دینیہ کے طلبہ کے لیے داخلہ کی کوئی شرائط نہیں اس لیے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص جو اس مقدس دینی ادارے میں داخل ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ بھی اس میں داخل ہو جائے۔ چونکہ کوئی امتحان نہیں لیا جاتا اس لیے طلبہ چھوٹی کتابیں چھوڑ کر بڑی کتابیں پڑھنے میں آزاد ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نچلا درجہ طے کیے بغیر ہی اوپر کے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمی ترقی رک جاتی ہے اور وہ خود بھی بددل ہو جاتے ہیں۔

چونکہ طلبہ کے قدرتی رجحان کا اندازہ لگانے کا کوئی طریقہ رائج نہیں ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا طالب علم جس میں فقہ یا کلام، یا ادبیات یا تاریخ یا تفسیر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے، کسی ایسے شعبے میں چلا جائے جس کی طرف اس کا قدرتی رجحان نہ ہو اور اس طرح وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔

کچھ عرصے سے علوم دینیہ کے تعلیمی شعبے محدود سے محدود تر ہوتے چلے گئے ہیں اور رفتہ رفتہ سب فقہ میں ضم ہو گئے۔ خود فقہ کا شعبہ بھی کچھ ایسے راستہ پر

جاتا ہے کہ پچھلے ایک سو سال سے اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

لباس روحانیت کے استعمال میں غیر محدود آزادی ادارۂ روحانیت کی ایک خامی ہے۔ رفتہ رفتہ علماء نے دوسروں سے مختلف لباس کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور جس طرح فوجی سپاہیوں اور بعض دوسرے لوگوں کی ایک خاص وردی ہوتی ہے اسی طرح علماء نے بھی ایک مخصوص لباس اختیار کر لیا ہے۔

مگر علماء کے حلقوں میں دوسرے حلقوں کے برعکس جس کا دل چاہے بلا کسی روک ٹوک کے یہ لباس استعمال کر سکتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے افراد بھی جو علم رکھتے ہیں نہ ایمان "اس لباس کی مراعات سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے علماء کی صورت بنا لیتے ہیں اور بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔

علوم دینیہ کے مراکز میں عربی ادبیات کی تعلیم ضرور ہوتی ہے مگر غلط طریقے سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو برسوں عربی ادب کی تعلیم حاصل کرنے اور عربی زبان کے قواعد یاد کرنے کے باوجود عربی زبان نہیں آتی۔ نہ وہ صحیح عربی بول سکتے ہیں اور نہ فصیح عربی لکھ سکتے ہیں۔

سب سے بڑی خرابی جو دینی رہبری کے نظام میں بالفعل موجود ہے' اس کا تعلق مالی نظام اور علماء کے ذریعہ معاش سے ہے۔

مالی بجٹ کا مسئلہ

اس بارے میں کہ علماء کی معاش کا کس طرح انتظام کیا جائے کئی آراء ہو سکتی ہیں:

(الف) بعض لوگوں کو یقین ہے کہ روحانیت کے لیے کسی بجٹ یعنی کسی

مالی انتظام کی ضرورت نہیں اور دوسرے لوگوں کی طرح علماء کو بھی کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے جو ان کے لیے مالی آمدنی کا ذریعہ ہو۔ دوسروں کی طرح انہیں بھی ذاتی محنت سے روزی کمانی چاہیے۔ وہ اپنا کچھ وقت روزی کمانے میں اور باقی وقت روحانی امور میں جیسے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، افتاء و تبلیغ وغیرہ میں صرف کریں۔

ان لوگوں کی رائے میں روحانیت سے متعلق امور اسلام میں کوئی ایسا مخصوص مشغلہ یا پیشہ نہیں ہیں کہ ان کے لیے الگ بجٹ بنایا جائے اور مالی انتظام کیا جائے۔ جو شخص اپنی معاش کا خود انتظام کر سکے صرف اس کو حق ہے کہ ان کاموں کو اختیار کرے۔ اگر کوئی شخص ان کاموں میں مشغول ہو کر معاشرے پر بوجھ بننا چاہتا ہے تو بہتر ہے کہ شروع ہی سے ایسی تکلیف نہ کرے۔

ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ رسول اکرمؐ اور ائمۂ طاہرینؑ کے زمانے میں بہت سے لوگ دینی وظائف انجام دیتے تھے، حرام و حلال کی تعلیم دیتے تھے، پند و نصیحت اور وعظ و تبلیغ کرتے تھے۔ درس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے اپنے تدریسی حلقے بھی تھے مگر اسکے باوجود معاش کیلئے ان کا کوئی نہ کوئی پیشہ اور حرفہ تھا۔ ان میں سے بہت سے اپنے پیشہ ہی کی نسبت سے مشہور ہو گئے جیسے تمار، عطار، تمار، خراز، طحان، سمان، حذاء، وشاء وغیرہ۔ ان لوگوں کا نام حدیث و فقہ اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

ایسی کوئی روایت موجود نہیں کہ رسولِ خدا یا ائمۂ طاہرینؑ نے کسی ایک یا چند اشخاص کو یہ حکم دیا ہو کہ اور سب کام چھوڑ کر صرف ان مشاغل میں مصروف ہو جائیں جن کو آجکل روحانی مشاغل کہا جاتا ہے جیسے افتاء و تدریس، امامت اور وعظ و تبلیغ وغیرہ۔ یہ ہے ان لوگوں کا خیال۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ اپنی معاش کا کچھ اور انتظام کر سکتے ہوں اور ساتھ ہی روحانی امور کی ذمہ داری بھی لے سکیں تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے لیکن ایسے افراد ہمیشہ کم ہی رہے ہیں اور آج بھی بہت کم ہیں اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سب کو ایسا کرنا چاہیے اور جو ایسا نہ کر سکے' اس میدان میں داخل نہ ہو کیونکہ صدرِ اسلام کے زمانے سے آج کا طرز زندگی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ علوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور علماء کی ضرورت روز افزوں ہے۔ اب ضروری ہے کہ علماء کی ایک جماعت اپنی پوری عمر صرف تحصیل علوم اور دینی امور کے انتظام و انصرام کے لیے وقف کر دے۔ اس لیے اس مقصد کے لیے خاص مالی انتظام اور ایسے بجٹ کی ضرورت ہے جس کو صحیح طریقے سے اس کام پر خرچ کیا جائے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ضرورت اس قدر وسیع نہیں تھی نہ اسلام کے اتنے معاند اور دشمن تھے اور نہ اتنے شبہات تھے اور نہ اتنی پیچیدگیاں تھیں۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایک گروہ محض اسلام کے دفاع اور لوگوں کی دینی ضروریات پوری کرنے کے لیے مخصوص رہے۔ ہاں البتہ یہ صحیح ہے کہ بعض روحانی امور جو آجکل رائج ہیں جیسے امامتِ جماعت نہ ان کی کوئی مخصوص روحانی شان ہے اور نہ کسی کو یہ حق ہے کہ ان کو بہانہ بنا کر اور سب کاموں سے دستبردار ہو جائے اور صرف نماز کے وقت کا انتظار کرتا رہے۔ مسجد میں جائے اور واپس چلا آئے اور ختم اور فاتحہ کی زینت بنا رہے' ان باتوں کو اپنا کل وقتی کام بنا لے اور تمام عمر معاشرے پر بوجھ بنا رہے۔

بہرحال یہ کہنا فکری جمود ہے کہ صرف اس لیے کہ کوئی بات صدرِ اسلام میں نہیں تھی اب جب کہ اس کی ضرورت ہے پھر بھی نہ ہو۔

(ب) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ علماء اپنی ضروریات اوقاف اور صدقاتِ جاریہ سے پوری کریں۔

شاید شیعوں کو چھوڑ کر دنیا کے اور سب روحانی ادارے اوقاف اور صدقاتِ جاریہ ہی پر انحصار کرتے ہیں۔

ایران کے اکثر شہروں میں علوم دینیہ کے مدارس موجود ہیں اور کثیر آمدنی کی جائیداد ان کے لیے وقف ہے۔ ماضی میں ان مدارس کے اوقاف سے تہران، اصفہان، مشہد، تبریز، شیراز اور دوسرے سب شہروں میں علوم دینیہ کی تعلیم میں بڑی مدد ملتی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے ایسے اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی، ان میں سے اکثر اوقاف نے آجکل ذاتی ملکیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر بھی کچھ اوقاف باقی ہیں۔ ان میں سے کچھ ممتاز علماء کے قبضہ میں ہیں لیکن ان سے ایسے اداروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے جن کی سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں نہیں۔ کچھ اوقاف محکمۂ اوقاف کی تحویل میں ہیں۔ وہ کسی اور طرح ضائع ہو رہے ہیں۔ بہت کم آمدنی ایسی ہے جو صحیح اور شرعی طور پر خرچ ہوتی ہے۔

نہ صرف مدارس کے اوقاف نظامِ روحانیت کے تصرف میں ہونے چاہئیں بلکہ اور بھی منقولہ اور غیر منقولہ اموال کی ایسی بڑی بڑی مدیں ہیں جن کے لیے یہ شرعاً لازمی پایا جاتا ہے کہ انہیں نظامِ روحانیت کی تحویل میں دیا جائے۔ حکومت کے اربابِ اختیار اور عالی مرتبہ علماء کے درمیان اس سلسلے میں متعدد بار گفت و شنید ہو چکی ہے مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اگر اوقاف کا کوئی صحیح انتظام ہو جائے اور اس مقصد کے لیے کوئی معقول اور منظم ادارہ قائم ہو جائے تو اس سے نہ صرف نظامِ روحانیت کے عام اخراجات پورے ہو سکیں گے بلکہ یہ مذہب، تعلیم اور اخلاق کی ایک بڑی خدمت ہو گی لیکن اگر اوقاف کی موجودہ شکل برقرار رہی تو نہ صرف موجودہ خرابیاں باقی رہیں گی بلکہ ایسے افراد کو مزید تقویت ملے گی جو ہر اصلاح اور اسلامی معاشرہ کی ہرگونہ ترقی میں سدِ راہ رہے ہیں۔

(ج) ایک اور صورت یہ ہے کہ سہمِ امام علیہ السلام سے استفادہ کیا جائے۔ مجھے دیگر ادیان کے متعلق تو علم نہیں کہ آیا ان میں کوئی ایسا مالی قانون موجود ہے یا نہیں جس کو علماء کی زندگی اور دینی رہبری کے نظام پر منطبق کیا جا سکے۔ البتہ اسلام میں شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق خمس کی آیت سے ایسا قانون اخذ کیا جا سکتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

خمس کا تعلق لڑائی میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اس سے، معدنیات سے، سالانہ خالص آمدنی سے اور بعض دوسری چیزوں سے ہے جن کے بارے میں ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ذاتی اخراجات وضع کرنے کے بعد ان کا پانچواں حصہ دینی رہبری کے ادارہ کی تحویل میں دے دے۔ خمس کا نصف سہمِ امام کہلاتا ہے جس کا مصرف شیعہ فقہاء کی رائے کے مطابق تحفظ و بقائے دین ہے۔

بحالاتِ موجودہ صرف یہی تنہا مالی انتظام ہے جس پر عملاً ہمارا روحانی نظام چل رہا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے روحانی اداروں نے ایک خاص طرز اور روش اختیار کی ہے۔ ہمارے جملہ دینی امور پر سہمِ امام کا گہرا اثر ہے۔

علماء اور مجتہدین اس رقم کو وصول کرنے کے لیے جو ایک قسم کا ٹیکس ہے کوئی جبر نہیں کرتے۔ مومنین از خود اپنی خوشی سے ان علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں جن پر انہیں اعتماد اور اطمینان ہوتا ہے اور یہ شرعی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ علماء کے پاس اس ٹیکس کو جمع کرنے کے لیے کوئی خاص ادارہ نہیں ہے۔ رعیت خود اپنے ایمان اور وجدان کی بنا پر چھوٹی بڑی رقمیں، چھوٹی سے چھوٹی رقم سے کر لاکھوں تک ادا کرتے ہیں۔

سہم امام کی وہ خصوصیت جو اسے اوقاف سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس کے ساتھ ادا کنندگان کے جذبات اور عقیدت کا اظہار بھی شامل ہوتا ہے۔ عوام کس کو سہم امام ادا کرتے ہیں یہ ان کے اپنے اندازہ اور حسنِ ظن پر موقوف ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ شخص واقعی اس کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں یہ اس پر موقوف ہے کہ عوام کا اندازہ کس حد تک صحیح ہے اور یہ کہ صلاحیت کے علاوہ کسی اور عامل کو تو اس میں دخل نہیں۔ بہرحال سہم امام کی وصولی میں علت و معلول کا ایک منظم سلسلہ کارفرما ہوتا ہے۔ کسی شخص کو کسی وجہ سے شہرت حاصل ہو جاتی ہے، لوگوں کو اس سے حسنِ ظن ہو جاتا ہے، اس کے بعد سہم امام اس کے پاس پہنچنے لگتا ہے اور اس طرح وہ دینی زعامت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

مرکزیت اور طاقت

اب سے سو سال پہلے تک جب جدید تمدن کی روشنی ایران تک نہیں پہنچی تھی اور مختلف شہروں کے درمیان ذرائع مواصلات کم تھے، ہر شہر کے باشندے عموماً واجب الادا رقم خود اپنے شہر کے علماء کو ہی ادا کرتے تھے

اور عموماً وہ رقم وہاں ہی خرچ ہوتی تھی۔ لیکن پچھلی ایک صدی میں مواصلات کے جدید نظام اور فاصلوں کے کم ہو جانے کے نتیجہ میں طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ رقوم صرف ان حضرات کو ادا کی جاتی ہیں جو مرجع تقلید ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ لوگوں کو جذباتی لگاؤ تھا اور ان کی بات سنی اور مانی جاتی تھی۔ ان تک سہم امام پہنچنے سے علمی مراکز کی ترقی اور توسیع کے نئے امکانات پیدا ہو گئے۔ مجموعی طور پر مواصلات اور ذرائع آمد و رفت میں توسیع، مراجع تقلید سے لوگوں کے قریبی رابطہ، دینی تعلیم کے مراکز میں توسیع، طلبہ اور فارغ التحصیل افراد کی تعداد میں اضافہ اور ان افراد کے جملہ شہروں اور دیہاتوں میں پھیل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے دینی زعماء وجود میں آ گئے جن کے ہاتھ میں بڑی طاقت تھی اور جن کا زبردست اثر و رسوخ تھا۔

وہ شخصیت جسے پچھلی صدی میں پہلی بار ایسا اثر و رسوخ حاصل ہوا اور جدید مواصلاتی ذرائع نے جس کی قیادت کا دائرہ وسیع کرنے میں بڑی مدد دی، وہ شخصیت تھی مجتہد بزرگ مرحوم آیت اللہ حاجی مرزا محمد حسن شیرازی اعلی اللہ مقامہ کی جن کے ہاتھ میں پورے ملک کی دینی قیادت تھی۔ ان کی قیادت اور ان کے اثر کا پہلا مظہر وہ مشہور فتویٰ تھا جو انہوں نے تمباکو کی حرمت کے بارے میں دیا تھا[1]۔ ان کے بعد بھی ان کے اخلاف کے ہاتھ میں کم و بیش ایسی ہی قیادت رہی۔

سہم امام کی وصولیابی کا طریقہ وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا۔ رہا اس کا

---

[1] ۱۳۰۹ھ ہجری میں آیت اللہ نے ایران میں توسیع پسندانہ عزائم رکھنے والی ایک برطانوی کمپنی کی اقتصادی ناکہ بندی کے لیے تمباکو کے عارضی امتناع کا فتویٰ جاری کیا تھا۔

سنت کے مطابق صرف، تو یہ سو فیصد اس شخص کی ذاتی رائے پر منحصر ہے جس کے پاس سہم امام پہنچے۔ ابھی تک یہ دستور نہیں کہ آمد و خرچ کا کوئی حساب رکھا جائے یا کوئی گوشوارہ بنایا جائے۔ سہم امام کے صحیح مصرف میں خرچ کا زیادہ تر تعلق اس بات سے ہے کہ جس کو رقوم ادا کی جا رہی ہیں وہ کس حد تک زہد و تقویٰ اور خدا ترسی کے اوصاف سے متصف ہے اور لوگوں نے اس کو پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی اور کچھ اس بات سے کہ اس میں انتظامی قابلیت کس قدر ہے۔

خوبیاں اور خامیاں

سہم امام کا جو طریقہ اس وقت رائج ہے اس میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ خوبیاں تو یہ ہیں کہ اس کا دارومدار فقط لوگوں کے ایمان اور عقیدے پر ہے۔ شیعہ مجتہدین حکومت کے تنخواہ دار یا وظیفہ خوار نہیں ہیں اور نہ ان کا عزل و نصب ارباب اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی آزادی محفوظ اور برقرار ہے اور حکومت کے پہلو بہ پہلو وہ بھی ایک طاقت شمار ہوتے ہیں اور بعض موقعوں پر انہوں نے سختی سے حکومت کی مزاحمت کی ہے۔

اسی آزادانہ مالی انتظام کی وجہ سے جس کا انحصار لوگوں کے عقیدے پر ہے وہ اکثر موقعوں پر حکومت کی بے راہ روی کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور کئی حکومتوں کو گرا سکتے ہیں لیکن دوسری طرف یہی سہم امام شیعہ روحانیت کی کمزوری بھی ہے۔ شیعہ علماء حکومت کی اطاعت پر تو مجبور نہیں لیکن انہیں عوام کے عقیدے اور ان کے طور طریقوں کی رعایت کرنی پڑتی ہے تاکہ عوام کو ان سے عقیدت اور حسن ظن باقی رہے۔ شیعہ روحانیت کی زیادہ تر خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔

شیعہ علماء اور سنّی علماء

اگر ہم شیعہ دینی قیادت کا مصر میں جامع ازہر کی قیادت سے موازنہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ دونوں کو بلحاظ نظم ایک دوسرے پر ایک طرح کی فوقیت حاصل ہے۔

مصر میں خاص وجوہات کی بنا پر جن میں سب سے اہم دو باتیں ہیں ایک تو آزاد ذریعۂ آمدنی کا ہونا اور دوسرے اولی الامر کے بارے میں ان لوگوں کا طرز فکر۔ شیخ الازہر کا انتخاب اور تقرر رئیس جمہوریہ خود کرتا ہے۔ مصر میں شیخ الازہر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہمارے ملک میں سپریم کورٹ کے ججوں کا تقرر سربراہ مملکت کے فرمان کے ذریعے سے ہوتا ہے لیکن ایران کے روحانی نظام میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہو کہ دینی قیادت کو حکومت کی حمایت حاصل ہے تو یہ بات اس کی ناکامی کا سبب بن جائے گی۔

تقریباً تین سال ہوئے میں نے ایک اخبار میں شیخ الازہر و مفتی اعظم مصر علامہ شیخ محمود شلتوت کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سر کے اوپر جمال عبدالناصر کا فوٹو آویزاں تھا۔ ایران میں یہ ممکن نہیں کہ کسی معمولی طالب علم کے کمرے میں بھی حکومت کے کسی رکن کا فوٹو دیکھا جا سکے۔ مصر کا روحانی رہنما کبھی اتنی طاقت حاصل نہیں کر سکتا کہ کسی ایسے معاملے میں جیسا یہاں تمباکو کا قضیہ تھی حکومتِ وقت کو جھکنے پر مجبور کر سکے کیونکہ خود اس کا انحصار حکومت پر ہے۔

لیکن دوسری طرف چونکہ مصری علماء اپنی زندگی اور معاش کے لیے

عوام کے محتاج نہیں، اس لیے انہیں عقیدے کی آزادی حاصل ہے اور وہ اس پر مجبور نہیں کہ عوام کو خوش کرنے کے لیے حقائق کو چھپائیں۔ بحالات موجودہ کسی شیعہ دینی رہنما سے یہ امید نہیں کی جا سکتی چاہے وہ کتنا ہی وسیع النظر، مخلص اور اصلاح کا خواہشمند ہو کہ وہ کوئی ایسا فتویٰ دے سکے گا جیسا شیخ شلتوت نے دو سال قبل دیا تھا جس نے ہزار سالہ طلسم توڑ دیا۔ کوئی شیعہ دینی رہنما اتنا بڑا قدم تو کجا اس سے بہت چھوٹا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب ایران اور مصر کے دینی علماء کی حالت معاشی لحاظ سے تقریباً یکساں تھی، ایرانی علماء وسیع النظری، تصانیف کے تنوع اور مختلف علوم میں ایجاد و اختراع کے لحاظ سے کسی طرح مصری علماء سے پیچھے نہیں تھے بلکہ خود مصری علماء کو اعتراف ہے کہ ایرانی تمام علوم میں آگے تھے، لیکن آجکل معاملہ برعکس ہے۔ ایران کے روشن فکر مسلمانوں کی نگاہیں مصر کے دانشوروں پر لگی رہتی ہیں جو مسلمانوں کے ان معاشرتی مسائل پر جن کی اس وقت اشد ضرورت ہے نئی نئی تصانیف شائع کرتے رہتے ہیں۔ ایرانی اپنے مذہبی علماء سے مایوس ہیں اس لیے کہ ان سے بحالات موجودہ سوائے عوام کے کام آنے والے رسائل عملیہ یا دوسری ایسی سطحی تصانیف کے جو صرف عوام کو مطمئن کر سکتی ہیں، اور کسی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

صرف پچھلے تیس چالیس سال کی مدت میں کچھ چیدہ و مخلص افراد نے خود کو روحانیت کے تمام مالی نظام سے علیحدہ کر کے اسلامی معاشرے کی موجودہ ضروریات کے مطابق تحقیق و تالیف کا کام شروع کیا ہے۔

اہل نظر اعتراف کرتے ہیں کہ شیعہ مراکز علمی کے فارغ التحصیل حضرات کی جو کتابیں پچھلے چند سال میں شائع ہوئی ہیں وہ مصری دانشوروں کی تصنیفات

سے زیادہ محققانہ اور بلند پایہ ہیں۔

طاقت اور آزادی

اگر کوئی عالم معاش کے لیے لوگوں پر بھروسہ کرتا ہے تو اسکا اثر ونفوذ بڑھتا ہے مگر وہ آزادی کھو دیتا ہے اور اگر حکومت پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اپنی قدر ومنزلت کھو دیتا ہے لیکن آزادئی رائے محفوظ رہتی ہے کیونکہ عام طور پر عقیدت مند مخلص تو ہوتے ہیں لیکن بے خبر ہوتے ہیں اور ان کی سوچ بھی سطحی ہوتی ہے اس لیے وہ اصلاحات کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ علماء جو لوگوں پر بھروسہ کرتے ہیں، وہ حکومت کے مظالم اور زیادتیوں کے خلاف تو جدوجہد کرسکتے ہیں لیکن عوام کے جاہلانہ عقائد وافکار کے مقابلے میں بے بس ہوجاتے ہیں لیکن جو حکومت پر بھروسہ کرتے ہیں وہ عوام کے جاہلانہ خیالات کا تو کامیابی سے مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن حکومت کے مظالم کے سامنے بے دست وپا نظر آتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ایرانی علماء کا صرف عوام کے عقیدے پر بھروسہ ان کی کمزوری کا اصل سبب نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب موجودہ مالی نظام میں تنظیم کا فقدان ہے۔ اگر اس نظام کو باقاعدہ اور منظم شکل دے دی جائے تو یہ نقص دور ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں علماء کی قدر ومنزلت بھی باقی رہے گی اور انہیں آزادی بھی حاصل ہوجائے گی۔ اس گفتگو کی اصل غرض اسی کی تلقین ہے اور ہمارے نزدیک علماء کے لیے یہی معیاری صورت ہے۔ طریقۂ اصلاح کے عنوان سے ہم اس بات کی مزید وضاحت کریں گے۔

عوام زدگی

بہت سی صورتوں میں معاشرے کی مثال ایک فرد کی سی ہے۔ جس طرح فرد آفات ارضی وسماوی سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح معاشرہ بھی بعض آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے اگرچہ ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہر معاشرے پر کچھ مخصوص آفات آتی ہیں۔ جس آفت نے ہمارے معاشرے کو مفلوج اور بے دست و پا کر رکھا ہے وہ "عوام زدگی" ہے۔ عوام زدگی کی مصیبت سیلاب اور زلزلے کی مصیبت سے بھی بڑھ کر ہے اور اس کا بڑا سبب ہمارا اجتماعی نظام ہے۔

اسی آفت کی وجہ سے ہمارے علماء پیشرو اور قائد ہونے کی بجائے عوام کے قافلے کے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں اور صحیح معنوں میں رہبر نہیں بن سکتے۔ عوام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ماضی سے اور پرانی عادات سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے اور موجودہ حالات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ عوام الناس ایسے سنجیدہ مسائل جیسے دولت کی منصفانہ تقسیم، سماجی انصاف، لازمی تعلیم، قومی حاکمیت وغیرہ کو بچوں کی بیکار باتیں سمجھتے ہیں حالانکہ ان مسائل کا اسلام سے اٹوٹ اور شکست ناپذیر تعلق ہے اور ان حقائق کو اسلام ہی نے آشکارا کیا ہے اور وہ خود ان کا حامی اور مؤید ہے۔

ان حالات میں ہمارے عوام زدہ علماء کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب بھی کوئی معاشرتی مسئلہ اٹھے، وہ غیر اصولی اور سطحی باتوں کے

پیچھے دوڑنے لگیں اور اصولی باتوں سے کٹ کٹ جائیں یا ان مسائل پر اس طرح اظہار رائے کریں کہ اسلام غیر ترقی پسند اور پسماندہ نظر آئے اور دشمن اس کا مذاق اڑائیں۔ افسوس کہ اس عظیم آفت نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ اسلام ہر زمانے اور ہر دور کے لیے موزوں نظام ہے۔ لَا یَفْنیٰ عَجَآئِبُہٗ وَلَا یَنْقَضِیْ غَرَآئِبُہٗ اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا کہ اس صدی کے ترقی یافتہ ترین سماجی نظام بھی اسلامی نظام کی برابری نہیں کر سکتے۔

ہمارے عوام زدہ علماء مجبور ہیں کہ سکوت کو کلام پر، سکون کو حرکت پر اور نفی کو اثبات پر ترجیح دیں، اس لیے کہ عوام کا مزاج یہی ہے۔

عوام کے تسلط کے نتیجہ میں ہمارے روحانی معاشرے میں ظاہر داری، تصنع، بناوٹ اور بلند و بالا القاب و آداب کی وہ گرم بازاری ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ عوام کے تسلط نے ہمارے آزاد منش اور اصلاح پسند علماء کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

جن ایام میں میرا قیام قم کے علمی مرکز میں تھا مجھے مرحوم آیت اللہ بروجردی اعلی اللہ مقامہٗ کے درس میں شرکت کا فخر حاصل تھا۔ ایک دن فقہ کے درس میں ایک حدیث آ گئی جس کا مضمون یہ تھا کہ کسی نے امام صادقؑ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت کے جواب پر اس شخص نے کہا کہ اس سے پہلے یہی مسئلہ میں نے آپ کے والد ماجد امام باقر علیہ السلام سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کچھ اور طرح جواب دیا تھا۔ کونسی بات صحیح ہے؟ امام صادقؑ نے فرمایا: جو میرے والد نے کہا تھا وہی درست ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

إِنَّ الشِّيعَةَ أَتَوْا أَبِي مُسْتَرْشِدِينَ فَأَفْتَاهُمْ بِمُرِّ الْحَقِّ وَأَتَوْنِي شُكَّاكًا فَأَفْتَيْتُهُمْ بِالتَّقِيَّةِ یعنی اس وقت کے شیعہ جو میرے والد کے پاس آتے تھے وہ خلوصِ نیت سے آتے تھے اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حقیقت معلوم کر کے اس پر عمل کریں" اس لیے وہ بھی ان سے حقیقت بیان کر دیتے تھے لیکن اب جو لوگ میرے پاس آتے ہیں ان کا مقصد رہنمائی حاصل کرنا اور عمل کرنا نہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ میں کیا کہتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھ سے کوئی بات سن کر ادھر اُدھر لگائی بجھائی کرتے پھرتے ہیں اور فتنہ پھیلاتے ہیں۔ مجبوراً میں بھی تقیہ سے جواب دیتا ہوں۔

چونکہ یہ حدیث جس میں تقیہ کا مضمون تھا شیعہ روایت تھی اور مخالفین کی گھڑی ہوئی بات نہیں تھی اس لیے مرحوم کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے دل کی خلش بیان کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، ہم خود تقیہ کے لیے مجبور ہیں۔ اپنی مرجعیت کے ابتدائی دور میں میرا خیال تھا کہ میرا کام احکام کا استنباط ہے اور لوگوں کا کام ان احکام پر عمل کرنا۔ میں جو فتویٰ دوں گا لوگ اس پر عمل کریں گے لیکن بعض فتووں کے دوران میں جو لوگوں کے مذاق اور طبیعت کے خلاف تھے میں نے دیکھا کہ دراصل یہ بات نہیں ہے۔

واضح رہے کہ جس قسم کے تقیہ کا حدیث میں تذکرہ ہے وہ اس تقیہ سے مختلف ہے جس کا انہوں نے ذکر کیا۔ حدیث میں جس تقیہ کا تذکرہ ہے وہ ہمارے روحانی ماحول سے مخصوص نہیں۔ ایسا تقیہ تو ساری دنیا میں

پیچھے دوڑنے لگیں اور اصلی باتوں سے کٹ کاٹ جائیں یا ان مسائل پر اس طرح اظہار رائے کریں کہ اسلام غیر ترقی پسند اور پسماندہ نظر آئے اور دشمن اس کا مذاق اڑائیں۔ افسوس کہ اس عظیم آفت نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ اسلام ہر زمانے اور ہر دور کے لیے موزوں نظام ہے۔ لَا یَفْنٰی عَجَائِبُہٗ وَلَا یَنْقَضِیْ غَرَائِبُہٗ اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا کہ اس صدی کے ترقی یافتہ ترین سماجی نظام بھی اسلامی نظام کی برابری نہیں کر سکتے۔

ہمارے عوام زدہ علماء مجبور ہیں کہ سکوت کو کلام پر، سکون کو حرکت پر اور نفی کو اثبات پر ترجیح دیں، اس لیے کہ عوام کا مزاج یہی ہے۔

عوام کے تسلط کے نتیجہ میں ہمارے روحانی معاشرے میں ظاہر داری، تصنع، بناوٹ اور بلند و بالا القاب و آداب کی وہ گرم بازاری ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ عوام کے تسلط نے ہمارے آزاد منش اور اصلاح پسند علماء کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

جن ایام میں میرا قیام قم کے علمی مرکز میں تھا مجھے مرحوم آیت اللہ بروجردی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے درس میں شرکت کا فخر حاصل تھا۔ ایک دن فقہ کے درس میں ایک حدیث آ گئی جس کا مضمون یہ تھا کہ کسی نے امام صادقؑ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت کے جواب پر اس شخص نے کہا کہ اس سے پہلے اسی مسئلہ میں نے آپ کے والد ماجد امام باقر علیہ السلام سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کچھ اور طرح جواب دیا تھا۔ کونسی بات صحیح ہے؟ امام صادقؑ نے فرمایا: جو میرے والد نے کہا تھا وہی درست ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

إِنَّ الشِّيعَةَ أَتَوا أَبِي مُسْتَرْشِدِينَ فَأَفْتَاهُمْ بِمُرِّ الْحَقِّ وَأَتَوْنِي شُكَّاكاً فَأَفْتَيْتُهُمْ بِالتَّقِيَّةِ یعنی اس وقت کے شیعہ جو میرے والد کے پاس آتے تھے وہ خلوصِ نیت سے آتے تھے اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حقیقت معلوم کر کے اس پر عمل کریں" اس لیے وہ بھی ان سے حقیقت بیان کر دیتے تھے لیکن اب جو لوگ میرے پاس آتے ہیں ان کا مقصد رہنمائی حاصل کرنا اور عمل کرنا نہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ میں کیا کہتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھ سے کوئی بات سن کر ادھر اُدھر لگائی بجھائی کرتے پھرتے ہیں اور فتنہ پھیلاتے ہیں۔ مجبوراً میں بھی تقیہ سے جواب دیتا ہوں۔

چونکہ یہ حدیث جس میں تقیہ کا مضمون تھا شیعہ روایت تھی اور مخالفین کی گھڑی ہوئی بات نہیں تھی اس لیے مرحوم کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے دل کی خلش بیان کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، ہم خود تقیہ کے لیے مجبور ہیں۔ اپنی مرجعیت کے ابتدائی دور میں میرا خیال تھا کہ میرا کام احکام کا استنباط ہے اور لوگوں کا کام ان احکام پر عمل کرنا۔ میں جو فتویٰ دوں گا لوگ اس پر عمل کریں گے لیکن بعض فتووں کے دوران میں جو لوگوں کے مذاق اور طبیعت کے خلاف تھے میں نے دیکھا کہ در اصل یہ بات نہیں ہے۔

واضح رہے کہ جس قسم کے تقیہ کا حدیث میں تذکرہ ہے وہ اس تقیہ سے مختلف ہے جس کا انہوں نے ذکر کیا۔ حدیث میں جس تقیہ کا تذکرہ ہے وہ ہمارے روحانی ماحول سے مخصوص نہیں۔ ایسا تقیہ تو ساری دنیا میں

کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ رہا وہ تقیہ جس کا رواج ہمارے روحانی ماحول میں ہے وہ البتہ اس نظام سے مخصوص ہے جو کچھ عرصے سے ہمارے یہاں وجود میں آ گیا ہے۔ مرحوم کو چونکہ تھوڑا سا موقع مل گیا تھا، انہوں نے اپنے دل کی خلش کا اظہار کر دیا۔

حوزۂ علمیہ۔ قم کے بانی مرحوم آیت اللہ الحاج شیخ عبد الکریم حائری یزدی اعلی اللہ مقامہٗ کا خیال تھا کہ کچھ علوم دینیہ کے طلبہ کو کوئی غیر ملکی زبان اور بعض جدید علوم سکھلائے جائیں، تاکہ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں بلکہ غیر ممالک میں بھی تبلیغ کریں۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو عوام اور نیم تعلیم یافتہ افراد کا ایک گروہ تہران سے قم پہنچا اور مرحوم کو الٹی میٹم دیا کہ یہ روپیہ جو سہم امام کے نام سے ہم لوگ دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ طلبہ کفار کی زبان سیکھیں۔ اگر یہی صورت رہی تو ہم یوں کریں گے، وہ کریں گے۔ جب مرحوم نے دیکھا کہ اس طرح تو علمی مرکز برباد ہو کر ختم ہی ہو جائے گا، انہوں نے وقتی طور پر اس منصوبہ کو ترک کر دیا۔

چھ سال قبل مرحوم آیت اللہ سید ابو الحسن اصفہانی اعلی اللہ مقامہٗ کے دورِ قیادت میں نجفِ اشرف کے مقتدر علماء کی ایک معتد بہ تعداد نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جو علماء اس جلسہ میں شریک تھے ان میں سے بعض اس وقت مرجع تقلید ہیں۔ غرض تبادلۂ خیالات کے بعد اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ مسلمانوں کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے طلبہ کے نصاب پر نظر ثانی کی جائے۔ ان مسائل کو جو عقائد کا جزو ہیں، نصاب میں شامل کیا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ نجف کا علمی مرکز صرف فقہ کی تعلیم اور رسائل عملیہ کی تالیف سے مخصوص نہ رہے۔

مرحوم آیت اللہ اصفہانی ان واقعات سے جو مرحوم آیت اللہ حائری

وغیرہ کو پیش آئے تھے، سبق لے چکے تھے۔ انہوں نے پیغام بھیجا کہ جب تک میں زندہ ہوں، کسی کو یہ حق نہیں کہ اس علمی مرکز کی ساخت میں کوئی ردو بدل کرے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ سہم امام جو طلبہ کو دیا جاتا ہے فقط فقہ اور اصول کی تعلیم کے لیے ہے اور کسی چیز کے لیے نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ کارروائی ان حضرات کے لیے سبق آموز تھی جن کے ہاتھ میں اس وقت نجف کے علمی مرکز کا اہتمام ہے۔

اس وضاحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ہماری سربرآوردہ شخصیات برسر کار آتے ہی اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیوں اپنے آپ کو عاجز محسوس کرتی ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے دل میں اصلاح کی فکر بھی ہوتی ہے اور انہیں اصلاح نہ کر سکنے پر دکھ بھی ہوتا ہے، وہ کیوں عملاً کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کیوں ہمارے دینی مراکز یونیورسٹی کی بجائے محض فقہ کے کالج بن گئے ہیں اور ہمارے علماء و فضلاء کو اگر فقہ اور اصول کے علاوہ دیگر علوم سے واقفیت ہوتی بھی ہے تو وہ اسے چھپانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں؟ ہمارے مقدس روحانی ماحول میں بیکار رکھی گھاس پھوس کی اتنی کثرت کیوں ہے کہ ایک روحانی پیشوا مجبور ہے کہ ایک پھول کو سینچنے کے لیے بے شمار کانٹوں اور غیر ضروری گھاس پھوس کی بھی آبیاشی کرے؟ ہمارے روحانی ماحول پر معقولیت، حرکت اور زندگی کے آثار کی بجائے جمود اور مُردنی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عقیدہ کی ہمارے یہاں کمی کیوں ہے؟ علوم دینیہ کے طلبہ کا نصاب زمانے کی ضروریات کے مطابق کیوں ترتیب نہیں دیا جاتا؟ ہمارے علماء معاشرے کے ہادی و رہنما ہونے کی بجائے اس کے پیچھے کیوں چلتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

طریقۂ اصلاح

اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے علماء اور دینی اداروں کے لیے کوئی عمومی نوعیت کا مالی انتظام نہ ہو اور ہر شخص صرف اپنی ذاتی محنت سے روزی کمائے اور نہ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارے علماء بھی مصر کی طرح حکومت کے ماتحت ہو جائیں۔

اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ موجودہ نظام ہی کو باقاعدہ اور منظم بنایا جائے۔ سہم امام کی موجودہ شکل کچھ ایسی ہی ہے کہ جیسے حکومت معلمین کی معاش کے لیے کوئی تعلیمی ٹیکس لگائے اور خود معلموں ہی کو اس کام کے لیے مقرر کر دے کہ وہ یہ ٹیکس لوگوں سے براہ راست وصول کریں۔ ہر معلم کو اختیار ہو کہ وہ جتنی چاہے رقم اکٹھی کرے البتہ یہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہو کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد دوسروں کو دیدے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ صورت ہو تو تعلیم و تربیت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس صورت میں معلم بچوں کو وہی تعلیم دیں گے جو ان کے سرپرستوں کو پسند ہو، جو ظاہر ہے کہ عوام ہی سے ہوں گے۔ اس طرزِ عمل سے وہ لوگ آگے جائیں گے جو عوام کی من پسند بات کہہ کر انہیں لبھائیں گے اور دانشمند اور اصلاح طلب لوگوں کی کوئی بات بھی نہیں سنے گا۔ ریاکاری، زمانہ سازی، ظاہرداری اور حقیقت پوشی کا بازار گرم ہو جائے گا اور وہ تمام عیوب و نقائص رواج پائیں گے جن سے کسی نہ کسی طرح عوام میں مقبولیت حاصل کی جا سکے اس طرزِ عمل کا ایک اور نتیجہ یہ ہوگا کہ معلم بچوں کے سرپرستوں کو اپنی اسامی سمجھے گا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے

کے لیے ہر وہ ممکن تدبیر کام میں لائے گا جو ایک کارخانہ دار مزدوروں سے اور زمیندار کسانوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے کام میں لاتا ہے۔ اس طرح وہ خرابیاں بھی پیدا ہوں گی جن کا تعلق عوام کی توجہ جذب کرنے سے ہے جیسے ریاکاری، ظاہرداری، حقیقت پوشی اور رنگدار سکی اور وہ خرابیاں بھی پیدا ہوں گی جن کا تعلق دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے ہے جیسے کینہ، بغض، نفسیاتی الجھاؤ اور قنوطیت۔

ہمارے علماء کے مالی نظام کی شکل اس وقت بعینہ یہی ہے اور اس کی اصلاح کا فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ اس نظام کو باقاعدہ بنایا جائے۔ اس کا مشترک فنڈ قائم کیا جائے، ہر رقم کا اندراج ہو، ہر مرکز میں آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور اس کا گوشوارہ بنایا جائے۔ کوئی عالم براہ راست لوگوں سے اپنی معاش وصول نہ کرے۔ فنڈ کی نگرانی درجہ اول کے مجتہدین کے ہاتھ میں ہو اور ہر شخص کو اس کی خدمات کے تناسب سے اس فنڈ سے رقم ادا کی جائے۔

اگر یہ کام ہو جائے تو لوگ بھی اپنے عقیدے کی بنا پر خلوص نیت سے واجب الادا رقم ادا کریں گے اور علماء کو بھی عوام کے تسلط اور ان کے شکنجے سے نجات مل جائے گی۔ ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ علماء براہ راست عوام کے ہاتھ سے اپنی روزی وصول کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہیں ذاتی طور پر معطیان سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

ہر وہ مرجع تقلید جن کے اہتمام و انصرام کا مدار سہم امام پر ہے جس کو وہ وصول کر کے علمی اداروں کے طلبہ کو دیتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ

وہ ذاتی طور پر مومنین کا اعتماد حاصل کریں اور ان سے رقم کی تفصیل کریں۔ موجودہ حالات میں چھوٹے شہروں کے علماء کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ روحانیت کو پیشہ بنا کر مسجد کو اپنے کاروبار کا مرکز قرار دیں۔

اگر اس صورتِ حال کی اصلاح ہو جائے تو پھر کسی کو براہِ راست لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بلند پایہ مراجع تقلید آزاد ہو جائیں گے۔ یہ مساجد جو آجکل کمائی کے ٹھکانے بنی ہوئی ہیں ان کی افسوسناک صورت حال نہیں رہے گی۔ جامع گوہر شاد جیسی بڑی مساجد کے ہر گوشے میں الگ الگ جماعت نہیں ہوا کرے گی جس پر ہر سمجھدار آدمی اعتراض کرتا ہے۔ اس سوال کا بھی موقع نہیں رہے گا کہ یہ کیا بات ہے کہ اہلِ تسنن میں تو نماز با جماعت شرکت و جلال کا مظہر ہے اور اہلِ تشیع میں تفرقہ اور اختلاف کی نشانی۔

ذریعۂ معاش

معاش کا مسئلہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی ستون ہے۔ اس میں خلل آنے سے زندگی کے تمام معاملات کا اثر پذیر ہونا ناگزیر ہے۔

یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی طرف پوری توجہ دی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو تو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسلام نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انسانی زندگی سے متعلق تمام معاملات کی تہہ میں یہی ایک عامل کارفرما ہے لیکن حقیقت پسندوں کے خیال میں یہ بات تو صحیح نہیں لیکن اسلام معاش کے بنیادی

کردار کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اسلام معاشی اصلاح کو ہر چھوٹی بڑی معاشرتی تنظیم کے لیے ایک ضروری شرط قرار دیتا ہے۔ گو صرف اسی ایک شرط کا وجود کافی نہیں سمجھتا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ معاش کا مسئلہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی ستون ہے اور اس میں خلل آنے سے زندگی کے تمام معاملات کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

فرض کیجیے کہ ایک دیندار عالم کئی سال کی تحصیلِ علم کے بعد اپنے چند افرادِ خانہ کے ساتھ کسی شہر میں مقیم ہو جاتا ہے اور کسی مسجد میں اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے چونکہ وہ دیندار ہے اس لیے بقدرِ امکان وہ اپنے فرائض بجا لائے گا۔ مسائل بیان کرے گا۔ وعظ کہے گا۔ اخلاق، تفسیر اور اسلامی تاریخ کے موضوعات پر گفتگو کرے گا لیکن چونکہ وہ بہرحال انسان ہے اس لیے اس کا کچھ خرچ بھی ہے۔ اگر مراکزِ روحانیت سے اس کی معاش کا انتظام نہیں ہوتا تو وہ مجبور ہو گا کہ لوگوں سے براہِ راست اپنی روزی حاصل کرے اور اپنے عقیدتمندوں کو ایک نفع اندوزی کی نگاہ سے دیکھے اور چونکہ ممکن ہے کہ شہر میں اس جیسے کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں اور وہ بھی اسی طرح زندگی بسر کر رہے ہوں تو قانونِ قدرت کے مطابق لامحالہ ان میں ایک طرح کا مقابلہ اور مسابقہ پیدا ہو جائے گا کہ کون زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر سکتا اور اپنا عقیدتمند بنا سکتا ہے۔ اس باہمی مقابلے کے نتیجے میں اس عالم کے لیے عوام کے مذاق کی رعایت اور بھی ضروری ہو جائے گی۔ جب وہ بیچارہ یہ دیکھے گا کہ عوام کی مخالفت مول لے کر اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا تو ممکن ہے وہ یہ سوچنے لگے کہ نہی عن المنکر تو اس وقت واجب ہے جب اس کی وجہ سے کسی تکلیف اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر اس سے نقصان پہنچتا ہو

تو پھر یہ واجب ساقط ہو جاتا ہے۔

چونکہ اس کی روزی کا مدار عوام پر ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اپنی شرعی ذمہ داری کا احساس اور خیال ہی نہ رہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ کچھ ایسے بھی افراد ہیں جو سخت معاشی دشواریوں کے باوجود اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے ہیں اور پوری کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں سے رقابت رکھنے کی یا اپنے عقیدت مند پیدا کرنے کی کوشش سے بالاتر ہیں لیکن ایسے افراد مستثنیات میں سے ہیں اور ہم عام اور معمولی آدمیوں کی بات کر رہے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایسی صورتِ حال پیدا نہ کر سکیں جس میں صرف منتخب اور چیدہ افراد ہی اپنے منصبی فرائض انجام دے سکیں۔

ایمان و تقویٰ کا اثر

ممکن ہے کہ قارئین یہ خیال کریں کہ ہم نے ایمان و تقویٰ کے ان حیرت انگیز مناظر کو فراموش کر دیا ہے جو ماضی میں دیکھنے میں آئے ہیں اور مسائل کا جائزہ صرف معاشی جھروکے سے جھانک کر لیا ہے اس لیے ہمارا بیان کردہ اصول فقط دنیاوی معاشرتی تنظیموں پر ہی صادق آتا ہے۔ روحانی تنظیم جس کی تشکیل ایسے متقی اور پرہیزگار افراد کرتے ہیں جن کا تعلق روحانیت سے ہے اس میں انتظامی اداروں اور باقاعدہ قانون کی جگہ روحِ ایمانی کام کرتی ہے اور وہی اسے ہر نوع کا استحکام بخشتی ہے۔

میں عرض کروں گا کہ یہ بات نہیں ہے۔ مجھے ایمان و تقویٰ کے حیرت انگیز اثر کا اعتراف ہے۔ ایمان و تقویٰ بہت سی مشکلات حل کر دیتے ہیں اور بہت سی استحکام بخشنے والی دوسری تدابیر کی جگہ بھی ضرور لے لیتے ہیں۔ اگر اتنی بڑی

رقمیں اسی آزادی سے اور اسی طرح بغیر کسی حساب کتاب اور آمد و خرچ کے گوشواروں کے کسی غیر روحانی تنظیم کے سپرد کر دی جاتیں تو ظاہر ہے کیا حال ہوتا۔ حکومت کے محکموں میں باوجود اس کے کہ بڑے بڑے چھوٹے انتظامی ادارے موجود ہیں، ذمہ داریاں معین ہیں، بے ضابطگی اور بدعنوانی پر سزائیں بھی دی جاتی ہیں، عدالتیں بھی موجود ہیں، حساب بھی آڈٹ ہوتے ہیں لیکن اس سب انتظام کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن لاکھوں کے غبن کے مقدمات چلتے رہتے ہیں۔ یہ مذہب اور روحانیت ہی کی طاقت ہے جس نے حساب کتاب اور نظم نہ ہونے کے باوجود ہمارے دینی اداروں کی حفاظت کی ہے اور انہیں فنا ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔

اس مقدس دینی ماحول میں مرحوم حاجی شیخ مرتضیٰ انصاری جیسے مذہبی رہنما بھی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے خود ان کے بقول اس طرح کے روپیہ کو کپڑے دھونے کے ٹب کا گندا پانی تصور کیا اور صرف انتہائی ضرورت میں اس سے بہت قلیل استفادہ کرتے رہے۔ علوم دینیہ کے طلبہ میں ہمیشہ ایسے افراد رہے ہیں اور اب بھی ہیں جو بے مثال زہد و قناعت اور بے نفسی سے زندگی گزارتے ہیں اور اپنے اساتذہ، رفقائے درس اور نزدیک ترین دوستوں تک کو اپنی غربت کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ ایسے ہی لوگ اس آیت کریمہ کا مصداق ہیں: يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔

باقاعدگی اور انتظام کی قدر و قیمت

ہمیں اعتراف ہے کہ کوئی چیز ایمان و تقویٰ کی جگہ نہیں لے سکتی اور بلکہ ایمان و تقویٰ سے بہت سی خامیوں کی تلافی ہو جاتی ہے لیکن یہ بھی صحیح

نہیں ہے کہ ایمان و تقویٰ ہی سب کچھ ہیں، اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز کا اپنا اثر اور نتیجہ ہوتا ہے اور اس سے اسی نتیجہ کی توقع رکھنی چاہیے۔ نہ مادی چیزیں غیر مادی چیزوں کی جگہ پر کر سکتی ہیں، نہ غیر مادی چیزیں مادی چیزوں کی۔ غیر مادی چیزیں بھی پوری طرح ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ مثلاً نہ ایمان علم کی جگہ پُر کر سکتا ہے اور نہ علم ایمان کی۔

نظم و ضبط اور انتظامی ادارے بھی انسانی زندگی میں ایک مقدس اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ ایمان اور روحانیت نے بے نظمی کی بہت سی خرابیاں دور کر دی ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بے نظمی اور علماء کی معاش سے متعلق انتظامی اداروں کی عدم موجودگی نے بڑے پیمانے پر ایمان اور روحانیت کو مجروح کیا ہے اور ماحول میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ بعض بزرگ مجتہدین کے بیٹے، پوتے اور مصاحبین اس بے نظمی سے فائدہ اٹھا کر خمس کا روپیہ اس طرح اپنے تصرف میں لے آتے ہیں کہ برسوں خوب اللّے تلّلے سے خرچ کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔ کبھی آپ نے سوچا کہ ان واقعات سے عالم روحانیت کو کس قدر نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے؟

ہمارے روحانی معاشرے کا ایک اور بڑا مسئلہ کچھ ایسے نام نہاد مقتدر علماء کا وجود ہے جو کچھ خاص اداروں کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ انہی اداروں کی مدد سے انہیں طاقت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے اور یہی ادارے انہیں مالی امداد فراہم کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی چالاکی سے یا لالچ دیکر یا کسی اور طرح سے کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اور پھر عملاً ہمیشہ ان اداروں

کے مفاد ہیں اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سرگرم عمل رہتے ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ ایسے پلید لوگوں اور ان کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کے بارے میں مزید بحث کروں۔ ہر شخص کم و بیش اس بات سے واقف ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فساد کی جڑ کاٹنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اپنے روحانی اداروں کو باقاعدہ اور منظم بنائیں۔

وعظ و تبلیغ

علماء سے متعلق ایک اور شعبہ وعظ و تبلیغ اور خطبہ و منبر کا ہے۔ اس شعبہ کے کیا فرائض ہیں، اس نے ماضی میں کیا خدمات انجام دی ہیں اور اب کیا خدمات انجام دے رہا ہے اور اس شعبے میں کیا نقائص اور خامیاں ہیں۔ اگر ان سب باتوں پر بحث کی جائے تو اس کے لیے ایک جداگانہ مقالے کی ضرورت ہوگی۔ بہرحال جو نکات میں نے اب تک اٹھائے ہیں، ان کی مناسبت سے اس قدر کہوں گا کہ وعظ و تبلیغ کا شعبہ ایک اور طرح کی "عوام زدگی" میں مبتلا ہے۔ اس خامی کا تعلق سہم امام یا کسی اور مالی مد سے نہیں بلکہ اس بات سے ہے کہ اس کام نے باقاعدہ ایک پیشے اور کمائی کے ذریعے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ واعظ اجرت اور معاوضہ لے کر وعظ کہتے ہیں یعنی ہمارے یہاں ٹھیک اس بات کا دستور ہو گیا ہے جس سے کہ تمام انبیائے کرام نے جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد جگہ آیا ہے، منع کیا ہے۔ چونکہ اس معاملے نے کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ طلب و رسد کے قانون کے مطابق وہی مال فروخت کے لیے پیش کیا جاتا ہے جس کی صارفین میں مانگ ہو۔

یہ بات کہ پیشہ ور واعظوں کا وعظ ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہوتا ہے صرف اسی صورت میں تسلیم کی جاسکتی ہے جب یہ مان لیا جائے کہ اور سب تاجر بھی فقط وہی مال بازار میں لاتے ہیں جو گاہکوں کی مصلحت کے عین مطابق ہو۔

میں مانتا ہوں کہ اچھے اور صالح خطیب بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں اور انہوں نے گرانبہا خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی انجام دے رہے ہیں۔ میں اس کا بھی قائل نہیں کہ موجودہ صورت یکلخت بدل دی جائے اور کوئی دوسرا طریقہ رائج کیا جائے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ خود ہمارا روحانی نظام خطیبوں اور واعظوں کی ایک جماعت کو صحیح خطوط پر تربیت دے اور وہی ان کی معاش کا انتظام کرے۔ یہ واعظ وعظ و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہ لیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنی فکری آزادی برقرار رکھ سکیں گے اور ان کا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کا وجود ہی اس کے لیے کافی ہوگا کہ دوسرے بھی ان کی پیروی کریں۔ اس وقت وعظ و تبلیغ کا شعبہ بھی ہمارے روحانی نظام کی طرح آزادئ رائے کی نعمت سے محروم ہے اور اسی لیے عوام کی جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انتباہ

اگر خدا کے فضل و کرم سے ہمارے روحانی نظام کے مالی مسائل حل ہو جائیں تو اس سے دوسری خرابیاں بھی دور ہو جائیں گی۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا تو پھر زمانہ خود کچھ کرے گا۔ ایک بات جو بڑی حوصلہ افزا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کے سب طبقوں میں لائق بزرگ، مخلص اور

اصلاح پسند شخصیات موجود ہیں۔ درجہ اول کے مراجع تقلید اور اعلیٰ درجہ کے خطیبوں سے لے کر طلبہ اور عام واعظوں میں بھی ایسی شخصیتیں پائی جاتی ہیں۔

میں نے اس مقالہ میں جو کچھ کہا ہے خدانخواستہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے طبقات کے مقابلے میں ہمارے علماء میں کوئی کمی یا خرابی ہے بلکہ یہ مقالہ خود اس کی دلیل ہے کہ راقم الحروف کو ہر اصلاح کی توقع اسی سلسلۂ جلیلہ سے ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ روحانی نظام میں باقاعدگی پیدا کرنے سے دانش اور سربرآوردہ افراد کے لیے راہِ عمل کشادہ ہو جائے گی اور ان کے لیے اپنے مقدس مقاصد کو عملی جامہ پہنانا آسان ہو جائے گا۔

راقم الحروف کی نظر میں اس وقت تک جب کہ بنیادی اصلاح کی صورت پیدا نہ ہو، اصلاح پسند افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی ایسا پیشہ اور مشغلہ اختیار کریں جو نسبتاً کم وقت لے اور اپنی ذاتی محنت سے اپنی روزی کمانے کا بندوبست کریں تاکہ وہ آزادی کے ساتھ سوچ سکیں، آزادی سے اپنی بات کہہ سکیں، آزادی سے کسی اصلاحی مورچے کا دفاع کر سکیں اور بنیادی اصلاح کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔

ہمارے بڑے علماء کو اس نکتہ پر توجہ دینی چاہیے کہ روحانیت اور اسلام کی بقا اسی میں مضمر ہے کہ جن دوررس اصلاحات کی ضرورت اس وقت محسوس کی جا رہی ہے وہ ان اصلاحات کا نفاذ اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان کا واسطہ ایسی قوم سے ہے جو اس وقت تو نیم بیدار ہے مگر روز بروز بیدار تر ہوتی جا رہی ہے۔

اسلام اور علمائے اسلام سے موجودہ نسل کو جو توقعات ہیں، وہ ان توقعات سے مختلف ہیں جو گزشتہ نسل کو تھیں۔ ان خام اور نامعقول توقعات

کا ذکر نہیں جو بعض لوگوں کو ہیں۔ اکثریت کی توقعات جائز اور بجا ہیں۔ اگر ہمارے علماء جلد از جلد نہ جاگے، انہوں نے عوام کے پنجے سے اپنا گریبان نہ چھڑایا اور اپنی طاقتوں کو مجتمع کرکے وسیع النظری کے ساتھ بروقت قدم نہ اٹھایا تو ان اصلاح پسندوں کی طرف سے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، سخت خطرہ لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

آج یہ قوم اپنی خامیوں کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ کل یہ اور زیادہ تشنگی محسوس کرے گی۔ اس قوم کو احساس ہو چکا ہے کہ یہ دوسری اقوام کی بہ نسبت پسماندہ ہے اور یہ چاہتی ہے کہ جلد ان کے برابر ہو جائے۔ اصلاح کے بہت سے مدعی جن کو دین سے تعلق اور دلچسپی نہیں گھات میں لگے ہوئے ہیں کہ نئی نسل کے بلند احساسات وجذبات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر اسلام اور علمائے اسلام نے قوم کی ضروریات، خواہشات اور جذبات پر مثبت ردِ عمل کا اظہار نہ کیا تو وہ عصرِ جدید کے کسی نئے تسلط کی سمت رخ موڑ لیں گے۔ غور کیجیے کہ اگر اصلاحات کے مورچے پر ایسے افراد کا قبضہ ہو گیا تو اسلام اور روحانیت کو کس قدر خطرہ لاحق ہو جائے گا؟

ہاں اگر یہ خواہش ہو کہ خدا کے فضل وکرم کے بھروسے پر دینی اداروں کی تنظیمِ نو کی جائے تو پھر مفکرینِ قوم کو مل بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ کام کس بنیاد پر اور کس پروگرام کے تحت انجام دیا جائے۔ تعلیمی نصاب کیسے ترتیب دیا جائے، کس طرح کے ادارے قائم کیے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس سلسلے میں کچھ یادداشتیں مرتب کی ہیں لیکن میں اس مقالہ میں ان کو اس لیے شامل نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں یہ مقالہ ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

امید اور انتظار

مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ ان خیالات اور خواہشات کو فضول اور ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں روحانی نظام کو منظم کرنا مردے کو زندہ کرنے یا کم از کم ایسے بیمار کو اچھا کرنے کے مترادف ہے جس کی زندگی سے مایوسی ہو چکی ہو۔

لیکن میرا اپنا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں بنیادی طور پر دینی نظام کو زندہ ترین نظام سمجھتا ہوں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسے ان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے نجات دلائی جائے جو اس زندہ و فعال نظام کے ہاتھوں اور پیروں میں پڑی ہوئی ہیں۔

میں نے ہمیشہ کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ ہمارے روحانی نظام کی مثال اس مفید اور کارآمد درخت کی سی ہے جسے کیڑا لگ رہا ہو۔ ہمیں اس کی حفاظت کرنی چاہیے اور اس کا روگ دور کرنا چاہیے۔ جو لوگ اس درخت کو رسیدہ اور ناکارہ سمجھتے ہیں ان کا خیال سو فیصد غلط اور گمراہ کن ہے اور جس کی بیخ کنی ضروری ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل ہوں کہ اسلام منہائے روحانیت کچھ نہیں۔ اگر اسلام سے روحانیت کو نکال دیا جائے تو وہ ایک سامراجی چیز بن کر رہ جائے گا۔ میرے نزدیک کوئی چیز ہمارے روحانی نظام کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اسلامی علوم کے اصل اور اصول ماہر علمائے دین ہی کے گروہ میں پائے جاتے ہیں۔ تنہا یہی وہ مقدس گروہ ہے جو تقوٰی، ایمان، اخلاص، جوش و جذبہ اور قربانی جیسے اوصاف سے متصف ہے اور یہی وہ اوصاف ہیں جن پر ہماری ملت کی بقاء کا دارومدار ہے۔

اسلامی علوم و معارف کا جو وسیع مطالعہ میں نے کیا ہے اور روحانیت سے وابستہ لائق شخصیات کے بارے میں جو مجھے معلومات ہیں ان کی بنا پر میرا عقیدہ ہے کہ نہ صرف اس نظام کی اصلاح واجب اور ضروری ہے بلکہ میری رائے میں یہ عملاً بھی کچھ مستبعد نہیں بلکہ مجھے امید ہے کہ یہ اصلاح عنقریب ضرور ہوگی۔ اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰہُ قَرِیْبًا۔

امام علیؑ اور اصولِ عدل

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ
فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ
وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ (سورۂ حدید۔ آیت ۲۵)

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی
وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۹۰)

یہ دو آیات جو ابھی تلاوت کی گئیں قرآن مجید کی دو مختلف سورتوں میں نازل ہوئی ہیں۔ پہلی آیت سورۂ حدید کی پچیسویں آیت ہے اور دوسری سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۰ ہے۔ ان دونوں آیات کا تعلق ایک ہی

مضمون سے ہے لیکن ہر آیت میں دوسری آیت کے مقابلے میں کچھ اضافہ بھی ہے۔

پہلی آیت میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ:

"ہم نے پیغمبروں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور صحیح و غلط کا معیار نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس معیارِ عدل کے مطابق عمل کریں۔ ہم نے لوہا بھی اتارا ہے جو ایک مضبوط اور مستحکم دھات ہے اور جو انسانی زندگی میں بڑی کار آمد ہے۔ انبیاءؑ کو بھیجنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے امتحان لیا جائے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کون حق اور اہلِ حق کی مدد کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔"

دوسری آیت میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ:

"اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری، برائی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ اللہ تم کو اس لیے نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔"

پہلی آیت میں آسمانی مذاہب کا اصلِ اصول، عدل و انصاف کا قیام بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں وہ اصول بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی روح ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور بدکاری برائی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

عدل و احسان خصوصاً عدل کے موضوع کا تذکرہ نہ صرف قرآنِ کریم میں بار بار آیا ہے بلکہ یہ اسلامی تاریخ اور اہلِ ایمان کے عمل کا ایک درخشندہ

باب ہے۔ نظری حیثیت سے علوم اسلامی کی تاریخ میں بھی اس کا ایک خاص مقام ہے اور عملی نقطۂ نظر سے اسلام کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں بھی۔ چونکہ عدل اسلام کا ایک اہم رکن ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس موضوع پر گفتگو کی جائے خصوصاً ہم شیعوں کے نزدیک تو عدل اصولِ دین میں شامل ہے۔

عدل اصولِ دین میں سے ہے

ہم پانچ چیزوں کو اصولِ دین میں شمار کرتے ہیں:

۱۔ توحید

۲۔ عدل

۳۔ نبوّت

۴۔ امامت

۵۔ قیامت

عدل اور امامت کو خاص طور پر شیعہ اصولِ دین میں سمجھتے ہیں اور اکثر ان دونوں کو مذہب کے دو خاص اصول شمار کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مکتبِ تشیع میں اسلام کا جو مفہوم ہے اس کے مطابق اور اس مذہب کے رہنماؤں کے نقطۂ نظر سے عدل اور امامت اصولِ دین میں سے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے اور ہمارے مکتب کے مطابق عدل کا اصول بڑی اہمیت کا حامل ہے اور یہ محض ایک اخلاقی سوال نہیں ہے۔ اسی مناسبت سے یہ موقع ہے کہ ان خاص راتوں میں (ماہ رمضان کی ۱۹ ویں، ۲۰ ویں اور ۲۱ ویں راتیں) اس اصول اور اس کی تاریخ کے بارے میں کچھ وہ باتیں سامعینِ کرام کے سامنے عرض کی جائیں جو ہماری موجودہ کیفیت

اور حالات سے مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔

علاوہ ازیں ان شعبوں کا تعلق اس امام عادل علی الاطلاق، مجسمۂ عدل و مساوات، شیفتۂ حق و انصاف کی ذات سے ہے جو انسان دوستی اور رأفت و محبت اور احسان کا کامل نمونہ تھا۔ مولائے متقیان امام علی علیہ السلام کے بارے میں غیر بھی مانتے ہیں کہ ان کا عدل و انصاف ہی ان کی شہادت کا باعث ہوا۔ وَقُتِلَ فِیْ مِحْرَابِہٖ لِشِدَّۃِ عَدْلِہٖ۔ آپ عدل کے اصول پر سختی سے کاربند ہونے ہی کی وجہ سے محراب میں قتل ہوئے۔

مور کے پروں کا حسن ہی اس کا دشمن ہے اور آہوئے مشک کو اس کے مشک نافہ ہی کی وجہ سے ذبح کیا جاتا ہے۔

شہیدِ انصاف علیؑ

اس میں شک نہیں کہ علی مرتضیٰؑ مجسمۂ عدل اور نمونۂ رحمت و محبت اور احسان تھے۔ آج کی شب وہ شب ہے جب یہ شہیدِ انصاف حق و عدالت پر سختی سے قائم رہنے اور حقوقِ انسانی کا دفاع کرنے کے نتیجہ میں ایک ضربت سے زخمی ہوئے۔ اس ضربت نے ان تمام کوششوں، تکلیفوں اور مشقتوں کا خاتمہ کر دیا جو وہ اس سلسلے میں اٹھا رہے تھے اور وہ اپنا فرض انجام دیتے ہوئے شہادت کی گلرنگ موت سے ہمکنار ہو گئے۔ وہ خود تو آسودہ و مطمئن ہو گئے لیکن ایسے امامِ عادل کی موت نے جس کی حکومت اگر کچھ دن اور قائم رہتی تو اسلامی معاشرہ مثالی شکل اختیار کر لیتا، عالمِ اسلام کو سوگوار کر دیا۔

یہ کہ وہ ذاتی طور پر آسودہ و مطمئن ہو گئے' یہ وہ تعبیر ہے جو میں نے ان کے اپنے کلام سے اخذ کی ہے۔ جب آپ ضربت کے نتیجے میں بستر شہادت پر آرام کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ میری مثال اس پیاسے کی سی ہے جو اندھیری رات میں پانی کی تلاش میں صحرائے بے پایاں میں سرگرداں ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے۔ میں ہمیشہ اللہ سے دعا کیا کرتا تھا کہ جب میری موت کا وقت موجود آئے تو میں بستر پر نہ مروں بلکہ راہِ خدا میں مارا جاؤں یہ میری آرزو تھی جو پوری ہو گئی۔

وَمَا كُنْتُ إِلَّا كَقَارِبٍ وَرَدَ وَطَالِبٍ وَجَدَ۔ [1]

وہ کونسا انصاف تھا جو حضرت علیؑ کی شہادت کا سبب بنا؟

چونکہ آج کی رات وہی رات ہے جس کا میں نے گفتگو کے آغاز میں ذکر کیا تھا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند راتوں میں مولائے متقیان کے عدل و انصاف کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے اور اس کی وضاحت کی جائے کہ کیسے امام علیؑ کا عدل ان کی شہادت کا سبب بنا اور کس طرح ان کی انصاف پسندی کی وجہ سے ان لوگوں نے فتنہ و فساد برپا کیا جن کے مفاد کو ان کے انصاف سے نقصان پہنچ رہا تھا۔ یہ کیسا عدل و انصاف تھا؟

کیا یہ محض ایک اخلاقی خوبی تھی جیسے ہم کہتے ہیں کہ امام جماعت یا قاضی' یا طلاق کے گواہ یا شرعی شاہد کو عادل ہونا چاہیے؟

ایسا عدل کسی قتل کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ عموماً اس سے تو متعلقہ

---

[1] ملاحظہ فرمائیں امام علیؑ کی شہادت پر جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب فزت برب الکعبہ

شخص کی شہرت، مقبولیت اور اس کے احترام میں اضافہ ہوتا ہے۔

وہ عدل جو مولا کے قتل کا سبب بنا درحقیقت ایک اجتماعی فلسفہ اور اسلامی معاشرتی انصاف کے بارے میں ان کا مخصوص طرزِ فکر تھا، جس کے بارے میں ان کا اصرار تھا کہ اسلام کے معاشرتی انصاف اور اجتماعی فلسفہ کا تقاضا یہی ہے۔

وہ صرف منصف مزاج ہی نہیں بلکہ انصاف طلب بھی تھے۔ منصف مزاج اور انصاف طلب میں ایسا ہی فرق ہے جیسا آزاد اور آزادی طلب میں۔ ایک شخص خود آزاد ہے، دوسرا آزادی طلب ہے یعنی سماجی آزادی کا طرفدار ہے۔ آزادی اس کا مقصد اور مطمحِ نظر ہے۔ یہی صورت علم کی ہے۔ ایک شخص ذاتی طور پر عالم ہے اور دوسرا شخص اشاعتِ علم اور فروغِ تعلیم کا حامی و طرفدار۔ یہی صورت عدل کی ہے۔ ایک شخص ذاتی طور پر عادل و منصف ہے اور دوسرا شخص عدل و انصاف کا طالب۔ عدل اس کی اجتماعی سوچ ہے۔ ایسے ہی ایک شخص صرف خود صالح ہے اور دوسرا یہ چاہتا ہے کہ سب صالح ہو جائیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ

یعنی عدل و انصاف قائم کرنے والے بنو۔

انفرادی طور پر عادل و منصف مزاج ہونے سے بالکل مختلف بات ہے۔

جود و بخشش بہتر ہے یا عدل؟

پہلے تو میں خود علی مرتضیٰ سلام اللہ علیہ ہی کا ایک جملہ نقل کرتا ہوں جو آپ نے کسی کے جواب میں فرمایا تھا۔ آپ سے کسی نے پوچھا: عدل بہتر

ہے یا جود و بخشش؟ اَيُّهُمَا اَفْضَلُ؟ اَلْعَدْلُ اَمِ الْجُوْدُ؟
آپ نے جواب دیا: اَلْعَدْلُ يَضَعُ الْاُمُوْرَ مَوَاضِعَهَا وَالْجُوْدُ يُخْرِجُهَا مِنْ جِهَتِهَا. یعنی عدل بہتر ہے کیونکہ عدل ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے اور ہر حق اس کے حقدار کو پہنچاتا ہے اور جود و بخشش سے چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ بخشش اور فیاضی کا یہی مطلب ہے کہ آدمی اپنا تسلیم شدہ حق چھوڑ دے یا اپنی چیز کسی ایسے دوسرے شخص کو دیدے جو دراصل اس کی نہیں ہے اسی لیے "جود" کا یہ مطلب ہوا کہ کسی چیز کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اَلْعَدْلُ سَائِسٌ عَامٌّ وَالْجُوْدُ عَارِضٌ خَاصٌّ یعنی عدل ایک عام قاعدہ اور زندگی کا اصول ہے اور جود و بخشش ایک استثنائی حالت ہے۔ کسی خاص موقع پر ہی کوئی کسی پر احسان کرتا ہے اور ایثار سے کام لیتا ہے۔ جود و بخشش کو زندگی کا عام اصول قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کی بنیاد پر قانون وضع کر کے اسے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اگر جود و بخشش اور احسان و ایثار کو واجب العمل قانون کے تحت لایا جائے تو پھر اس کا نام جود و بخشش اور احسان و ایثار نہیں رہے گا۔ احسان و ایثار تو وہی ہے جس کے لیے کوئی جبری قانون نہ ہو اور آدمی صرف دوسرے کی بھلائی کی خاطر انسان دوستی بلکہ ذی حیات دوستی کی بنا پر کسی کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اسی بنا پر عدل کا مرتبہ جود و بخشش سے بلند تر ہے۔

یہ تھا علی مرتضیٰؑ کا جواب، جود و بخشش سے عدل کی برتری کے بارے میں۔ کوئی شخص جس کی سوچ اجتماعی نہ ہو اور جو انفرادی پہلوؤں سے چیزوں کو ناپتا ہو اس طرح کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ یہ سمجھی نہیں کہے گا

کہ عدل جود و بخشش سے بلند تر ہے لیکن علیؑ اپنی اس انمول گفتگو میں عدل کو اجتماعی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے اور اجتماعی پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ ایسی بات وہی کر سکتا ہے جس کے سامنے واضح اجتماعی فلسفہ ہو۔

جود و بخشش اور عدل انفرادی اخلاق کے نقطۂ نظر سے

علمائے اخلاق جود و بخشش کو عدل سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن علی مرتضیٰؑ بڑی صراحت سے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں دلیل کی بنا پر عدل جود و بخشش سے بلند تر ہے۔

لیکن یہ دونوں رائیں دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ہیں۔ اگر ہم صرف انفرادی اور شخصی اخلاق کے نقطۂ نگاہ سے معاملے پر نظر ڈالیں تو واقعی جود و بخشش عدل سے برتر ہے۔ اخلاقی خوبیوں کے لحاظ سے جود و ایثار کی عادت عدل و انصاف کی عادت سے برتر ہے' اس لیے کہ ایک عادل اور منصف مزاج انفرادی اخلاق کے نقطۂ نگاہ سے کمالِ انسانی سے صرف اس حد تک بہرہ ور ہے کہ وہ کسی پر زیادتی نہیں کرتا' کسی کا مال غصب نہیں کرتا' کسی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالتا لیکن جو شخص فیاض ہے' ایثار کرتا ہے وہ نہ صرف دوسروں کا مال نہیں چھینتا بلکہ خود اپنے مال اور اپنی کمائی سے دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ وہ نہ صرف کسی دوسرے کا حق نہیں لیتا بلکہ بسا اوقات خود اپنا حق دوسروں کو دے دیتا ہے۔ وہ نہ صرف کسی کو آزار نہیں پہنچاتا بلکہ ہسپتالوں میں' جنگ کے میدانوں میں' غریبوں کی جھونپڑیوں اور گھروں میں بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے جاتا ہے' ان کے حلق میں دوا ڈالتا ہے' ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہے' ان کی مفت تیمارداری کرتا ہے۔ وہ نہ صرف کسی کا خون نہیں بہاتا بلکہ خود اپنا خون معاشرے کی بھلائی کے لیے قربان کرنے کو تیار رہتا ہے۔

لہٰذا اخلاقی عادات اور شخصی صفات کی رو سے جود و بخشش یقیناً عدل سے بالاتر ہے بلکہ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

عدل و انصاف اور جود و بخشش

اجتماعی نقطۂ نگاہ سے

زندگی اجتماعی نقطۂ نگاہ سے کچھ اور ہی صورت کی حامل ہے۔ اجتماعی زندگی میں افراد معاشرے کو ایک وحدت کی شکل میں تشکیل دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو عدل جود و بخشش سے بالاتر ہے۔

معاشرے میں عدل کی مثال ایسی ہے جیسے کسی عمارت کے ستون جن پر عمارت کھڑی ہوتی ہے اور جود و احسان بمنزلہ رنگ و روغن اور زیب و زینت کے ہیں۔ اگر عمارت کی بنیاد ہی کمزور ہے تو رنگ آمیزی اور نقاشی سے فائدہ؟ لیکن اگر عمارت کے ستون مضبوط ہیں تو اس میں رنگ و روغن کے بغیر بھی رہا جا سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی عمارت پر بہت نقاشی کی گئی ہو اور وہ دیکھنے میں غیر معمولی طور پر دلکش اور خوبصورت نظر آتی ہو لیکن اگر اس کی بنیاد کمزور ہو تو ایک ہی بارش میں اپنے مکینوں کے سر پر آگرے گی۔

اس کے علاوہ جود و بخشش اور احسان و ایثار جو اپنے موقع پر بہت خوب اور مفید ہیں بخشش کرنے والے کے نقطۂ نظر سے تو بڑی خوبی ہیں لیکن احسان قبول کرنے والے کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہیں۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ معاشرے پر ان کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ درحقیقت اس بات کو

پیشِ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر ان باتوں کا خیال نہ رکھا جائے تو یہی اخلاقی خوبیاں معاشرے کی خرابی اور بدبختی کا سبب بن سکتی ہیں۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی بے سوچے سمجھے صدقات و اوقاف کی کثرت اور نذر و نیاز کی زیادتی ہوتی ہے معاشرے میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ کم ہمتی اور سستی بھی آجاتی ہے اور ایسا نقصان پہنچتا ہے جو ایک لشکرِ جرار کے پہنچائے ہوئے نقصان سے کم نہیں ہوتا۔ خود اللہ تعالیٰ نے روپیہ کے بے جا خرچ کی بعض صورتوں کے متعلق فرمایا ہے:

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔

(سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۱۷)

جو بیجا خرچ وہ دنیا میں کرتے ہیں، چاہے اسے صدقہ وغیرہ کا نام دیں، اس کی مثال اس بادِ سرد و تند کی سی ہے جو ان لوگوں کی کھیتی کو توڑ مروڑ کر تباہ کر دیتی ہے جنہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

معاشرے کا نظام جود و بخشش سے نہیں چلایا جا سکتا۔ اس کا دارومدار عدل پر ہے۔ بے سوچے سمجھے جود و بخشش معاشرے کے کاروبار کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ امام سجادؑ فرماتے ہیں:

كَمْ مِنْ مَفْتُوْنٍ بِحُسْنِ الْقَوْلِ فِيْهِ، وَكَمْ مِنْ مَغْرُوْرٍ بِحُسْنِ السَّتْرِ عَلَيْهِ، وَكَمْ مِنْ مُسْتَدْرَجٍ بِالْاِحْسَانِ اِلَيْهِ۔

"کتنے ہی لوگ اپنی تعریف سے فتنہ میں پڑ گئے۔ کتنے ہی لوگ اس لیے مغرور ہو گئے کہ ان کے عیب چھپے رہے اور کتنے ہی لوگ آہستہ آہستہ اس لیے غفلت میں مبتلا ہو گئے کہ ان پر احسان کیا گیا۔"

یہی مطلب علی مرتضیٰؑ کے اس قول کا ہے کہ عدل ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے اور جود و بخشش سے چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہیں اس لیے عدل جود سے بہتر ہے۔

کتنے ہی لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ علیؑ جو خود جود و سخا کے مظہر کامل تھے، عدل کو جود و بخشش پر ترجیح دیتے ہیں تو اچنبھے میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عدل جود و بخشش سے بالاتر ہو۔ یہ کیسی بات ہے کہ مجسمۂ ایثار و کرم علیؑ خود یہ فرمائیں کہ جود و کرم سے معاملات اپنی اصل ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں لیکن ہم نے جو تفصیل بیان کی ہے اور جس طرح معاملہ کے دونوں پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم بالعموم عدل اور جود و بخشش کے صرف ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں اور وہ پہلو اخلاقی اور شخصی خوبی اور معاملے کا نفسیاتی پہلو ہے۔ اس لحاظ سے واقعی یہ صحیح ہے کہ جود و بخشش عدل سے بڑھ کر ہے لیکن معاملے کا ایک اجتماعی پہلو بھی ہے جس پر ہم نے اب تک بہت کم غور کیا ہے اور اس طرف توجہ کی کمی کا سبب یہ ہے کہ ابھی تھوڑی ہی مدت سے انسان کو معاشرتی معاملے کی قدر و قیمت کا احساس اور سماجی قوانین کا علم ہوا ہے۔ گزشتہ زمانے میں بھی ہمارے بعض عالی قدر مفکرین نے اس طرف کم و بیش توجہ کی ہے لیکن اس وقت تک یہ علوم باقاعدہ مدوّن نہیں ہوئے تھے اس لیے انہوں نے زیادہ تر معاملات کے انفرادی اور اخلاقی پہلوؤں ہی پر نظر ڈالنے پر اکتفا کیا۔

مجھے یاد نہیں آتا کہ اب تک عدل کے بارے میں امام علیؑ کے اس جملے کے متعلق جو میں نے عرض کیا ہے کسی کتاب میں بحث کی گئی ہو حالانکہ یہ جملہ نہج البلاغہ میں موجود ہے اور سب اس سے واقف ہیں۔ میرے خیال میں وجہ یہ ہے کہ اب تک اخلاقی معیار کے مطابق اس جملے کی کوئی قابلِ ذکر توجیہ نہیں ہو سکی تھی لیکن اب معاشرتی علوم کی پیشرفت کی وجہ سے اخلاقی معیار کے علاوہ دوسرے معیار بھی ہماری دسترس میں ہیں۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کلام کس قدر انمول ہے اور اپنے زمانے بلکہ سید رضی رضوان اللہ علیہ کے زمانے سے بھی جنہوں نے امام علیؑ کے ملفوظات و اقوال کو جمع کیا تھا، کس قدر آگے ہے۔ اس وقت یہ ممکن نہیں تھا کہ سید رضی بلکہ بو علی سینا بھی جو نہج البلاغہ کی تدوین کے دور کے سب سے بڑے فلسفی تھے اس بلند معاشرتی حقیقت کو بیان کر سکتے۔

جود و بخشش اور احسان کا فرق

جود اور احسان معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ قرآنِ کریم میں عدل کے ساتھ احسان کا ذکر ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ.

اس پوچھنے والے نے امیر المومنین سے عدل اور جود کے بارے میں سوال کیا تھا گویا کہ اس کا سوال یہ تھا کہ یہ جو قرآن میں فرمایا گیا ہے إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ تو عدل بہتر ہے یا احسان؟ جود و احسان ایک دوسرے کے نزدیک ضرور ہیں لیکن بالکل ہم معنی نہیں کیونکہ احسان کا مفہوم جود و بخشش سے زیادہ عام ہے۔ احسان میں مالی بخشش بھی شامل

ہے اور دوسری ہر قسم کی نیکی بھی جو کسی کے ساتھ کی جائے جیسے مثلاً اگر آپ کسی ناتواں کو ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرا دیتے ہیں تو یہ جود و بخشش نہیں احسان ہے۔ اسی طرح ان پڑھ کو تعلیم دینا یا گمراہ کو راہ راست پر لانا بھی جود و بخشش نہیں احسان ہے۔

عدل ایک اجتماعی فلسفہ

اس سوال و جواب کو نقل کرنے سے میری غرض اس طرف متوجہ کرنا تھی کہ امام علیؑ عدل کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی نگاہ انفرادی اور شخصی پہلو پر تھی یا ان کی توجہ اجتماعی پہلو پر زیادہ تھی؟ اس سوال و جواب سے اور جواب میں جو آپ نے تشریح فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نظر اجتماعی پہلو پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف امام علیؑ کے کلام سے اور دوسری طرف آپ کے اس طرز عمل سے جو آپ نے اپنے دورِ حکومت میں اختیار کیا تھا، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولائے کائنات کی نظر میں عدل، اسلام کا ایک اجتماعی فلسفہ ہے۔ آپ عدل کو اسلام کا اہم اصول سمجھتے اور اس کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ آپ کی سیاست کی بنیاد یہی اصول تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی بھی مقصد کی خاطر وہ اپنے اصول سے ذرا بھی انحراف کریں۔ یہی وہ واحد، جی ہاں! واحد چیز تھی جس نے ان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دی تھیں ضمناً یہی وہ کنجی ہے جس سے کام لے کر کوئی مورخ اور محقق ان کے دورِ جہانبانی کا تجزیہ کر سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ انصاف کے معاملے میں امام علیؑ کا رویہ قطعاً بے لوچ تھا۔

عدل کے بارے میں امام علیؑ کی شدت کو ان کی انصاف پسندی

بھی کہا جا سکتا ہے اور حقوقِ انسانی کی حفاظت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عثمان کے بعد ان کے خلافت قبول کرنے کا بھی یہی راز تھا کہ اس وقت اجتماعی انصاف درہم برہم ہو چکا تھا اور لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک بہت پیٹ بھرے دوسرے بہت بھوکے۔ آپ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ وَمَا اَخَذَ اللّٰهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ اَنْ لَّا يُقَارُّوْا عَلٰى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُوْمٍ لَاَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلٰى غَارِبِهَا وَلَسَقَيْتُ اٰخِرَهَا بِكَاْسِ اَوَّلِهَا۔

اگر ایسا نہ ہوا ہوتا کہ کچھ لوگ یاور و مددگار بن کر میرے گھر نہ آئے ہوتے اور میرے لیے اس عذر کی گنجائش نہ رہی ہوتی کہ کوئی میرا ساتھ دینے والا نہیں اور دوسری بات یہ نہ ہوتی کہ اللہ تعالےٰ نے داناؤں اور روشن ضمیروں سے عہد لیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے کہ کچھ لوگ تو اس قدر مال و دولت پر قبضہ کر لیں اور اتنا کھانے لگیں کہ بیمار پڑ جائیں، اور کچھ دوسروں کے حقوق اس قدر پامال ہو جائیں کہ ان کے پاس پیٹ بھرنے کے لیے بھی کچھ نہ رہے تو ایسی حالت میں یہ دانا اور روشن ضمیر تماشا نہیں دیکھ سکتے اور محض افسوس نہیں کر سکتے۔ ان دو باتوں کی وجہ سے اگر بحالت موجودہ مجھے اپنے اس فرض کا احساس نہ ہوتا تو میں کنارہ کشی اختیار کرتا اور خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں نہ لیتا اور پہلے کی طرح پہلو تہی کرتا۔

اظہارِ تشویش اور اتمامِ حجت

اپنی حکومت کے دور میں آپ کا پروگرام نہ صرف یہ تھا کہ کسی طرح لوگوں کے حقوق پامال نہ ہوں اور کسی بدعنوانی کی اجازت نہ دی جائے بلکہ یہ پروگرام بھی تھا کہ غاصبوں سے غصب شدہ اموال جن پر انہوں نے گزشتہ دور میں قبضہ کر لیا تھا واپس لیے جائیں۔ اس نقشہ کے مطابق آپ کو خود اندازہ تھا کہ کس قدر شور و غوغا برپا ہوگا اس لیے آپ نے بڑی تشویش کے ساتھ اور بہت تامل کے بعد بارِ خلافت اٹھانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ جب لوگ بیعت کے لیے آئے تو آپ نے فرمایا:

دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي فَإِنَّا مُسْتَقْبِلُونَ أَمْرًا لَهُ وُجُوهٌ وَأَلْوَانٌ لَا تَقُومُ لَهُ الْقُلُوبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَيْهِ الْعُقُولُ.

"مجھے چھوڑ دو، کسی اور کو تلاش کر لو۔ آئندہ کا کچھ یقین نہیں کہ کیا صورت ہوگی۔ مجھے اطمینان نہیں ہے کہ میں اپنا اسلامی فرض انجام دے سکوں گا۔ جب دشواریاں پیش آئیں گی لوگوں کے افکار و خیالات بدل جائیں گے اور وہ ثابت قدم نہ رہ سکیں گے۔ آج تم میرے پاس آئے ہو ممکن ہے راہ کی دشواریاں دیکھ کر راستے ہی سے پلٹ جاؤ۔"

وَإِنَّ الْآفَاقَ قَدْ أَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ.

فضا تاریک ہے اور اسلام کی اس مختصر تاریخ میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کرنا آسان نہیں۔

اس وقت جو کہ ان لوگوں نے خلافت کو قبول کرنے پر اصرار کیا آپ نے فرمایا:

وَاعْلَمُوْا أَنِّي إِنْ أَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا أَعْلَمُ.

یہ سمجھ لو کہ اگر میں تمہاری دعوت قبول کرتا ہوں تو پھر میں اپنے پروگرام پر عمل کروں گا اور کسی کی کوئی سفارش، کوئی بات نہیں سنوں گا۔ البتہ اگر تم مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو اور حکومت و خلافت کی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالو تو میں پہلے کی طرح مشیر کے فرائض انجام دیتا رہوں گا۔

عثمانی جاگیریں

اس اراضی کے متعلق جو عام مسلمانوں کی ملکیت تھی اور حضرت عثمان نے مختلف اشخاص کو بطور جاگیر دے دی تھی، آپ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ لَوْ وَجَدْتُهُ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَاءُ وَمُلِكَ بِهِ الْإِمَاءُ لَرَدَدْتُهُ.

بخدا میں یہ زمینیں واپس لے لوں گا خواہ انہیں عورتوں کے مہر میں دے دیا گیا ہو یا ان سے کنیزیں خریدی گئی ہوں۔

گزشتہ کی طرف توجہ

امیر المومنین کو اپنی خلافت کے دوران میں کافی مشکلات پیش آئیں جن کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ گزشتہ بدعنوانیوں کی اصلاح چاہتے تھے اور گزشتہ اصلوات کے قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ گزشتہ پر بھی

نظر رکھنی ضروری ہے کیونکہ حال و مستقبل کی تعمیر میں ماضی کا بڑا دخل ہے۔ خراب اور فرسودہ بنیادوں پر کوئی بلند و بالا اور مستحکم عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔

عدل کی کشادہ اور

ظلم کی تنگ وادیاں

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

إِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً وَمَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ أَضْيَقُ.

یعنی عدل میں سب کو خوش رکھنے کی سب سے زیادہ گنجائش ہے۔ عدل ہی میں ایسی وسعت ہے کہ سب کو اپنی پناہ میں لے سکتا اور عوام کی خوشی اور خوشحالی کی راہ ہموار کر سکتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنی بد طینتی اور حرص اور لالچ کے نتیجہ میں اپنی حد میں نہیں رہتا اور اپنے حق پر قناعت نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ اپنے حق پر قناعت اس پر ایک بوجھ ہے تو ظلم و جور سے وہ اور بھی زیادہ دباؤ اور تنگی محسوس کرے گا۔

آدمی کی روح پر دو قسم کا دباؤ ہو سکتا ہے۔ ایک تو وہ دباؤ اور گھٹن ہے جو ماحول اور سماجی اثرات کے باعث ہو مثلاً کوئی کسی کو جسمانی تکلیف پہنچائے، مارے پیٹے، کوڑے لگائے، قید کر دے وغیرہ۔ دباؤ اور گھٹن کی دوسری قسم وہ ہے جو انسان خود اپنے اندر سے محسوس کرے۔

جیسے حسد کا دباؤ، کینہ کا دباؤ، انتقام کی خواہش کا دباؤ، حرص، طمع اور لالچ کا دباؤ وغیرہ۔ اگر سماجی انصاف موجود ہو تو بیرونی عوامل کے دباؤ سے نجات مل جاتی ہے کیونکہ سماجی انصاف کی صورت میں کوئی کسی کا حق نہیں دبا سکتا اور نہ کوئی ایسا کام کر سکتا ہے جس سے کوئی دوسرا ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جائے لیکن اگر انصاف کا بول بالا نہ ہو اور میدان زور، زیادتی اور لوٹ مار کے ہاتھ آ جائے تو حریص اور لالچی لوگوں کی خواہشات کو اور مہمیز ملے گی اور وہ حرص وطمع کے عوامل کے تحت دباؤ میں آ جائیں گے اس لیے یہ صحیح ہے کہ جو عدل کے ماحول میں دباؤ محسوس کرتا ہے، وہ ظلم کے ماحول میں اور بھی دباؤ کا شکار ہو گا۔

نہج البلاغہ کے معروف شارح ابن ابی الحدید معتزلی لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد لوگ مسجد میں جمع ہوئے کہ دیکھیں خلافت کس کا حق ہے۔ چونکہ لوگوں کا رجحان حضرت علیؑ کے سوا اور کسی کی طرف نہیں تھا چند لوگوں نے باقاعدہ تقریریں کر کے حضرت علیؑ کی شخصیت اور ان کی سابقہ اسلامی خدمات کا تذکرہ کیا۔ اس پر لوگ حضرت علیؑ کی بیعت کے لیے امنڈ پڑے۔ اس وقت آپ نے فرمایا:

> مجھے چھوڑ دو اور کسی اور کو خلیفہ بنا لو کیونکہ حالات کچھ ایسے ویسے ہی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ جس بات کو میں حق سمجھتا ہوں اس سے ذرہ برابر بھی انحراف کروں۔

جس وقت لوگ آپ کے پاس بیعت کے لیے آئے آپ نے ان سے یہ گفتگو اتمام حجت کے لیے فرمائی تھی۔

اہم انتباہ

ابن ابی الحدید مزید لکھتے ہیں کہ اگلے روز آپ باضابطہ طور پر مسجد میں منبر پر گئے اور ایک دن پہلے جو اشارتاً کہا تھا آج اس کو واضح الفاظ میں بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ:

اللہ جانتا ہے کہ مجھے طاقت اور ریاست حاصل کرنے کے لیے خلافت کی آرزو نہیں۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جو کوئی میرے بعد امت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے گا، قیامت کے دن اس کو پل صراط پر روک لیا جائے گا۔ فرشتے اس کا نامۂ اعمال کھولیں گے۔ اگر اس نے عدل و انصاف سے کام لیا ہوگا تو اللہ تعالےٰ اس کے عدل کی وجہ سے اسے نجات دے گا ورنہ پل صراط ایک جھٹکا کھائے گی اور وہ جہنم کی تہ میں جا گرے گا۔

اس کے بعد آپ نے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور ان لوگوں کو دیکھ کر جو ادھر ادھر کونوں میں دبکے ہوئے بیٹھے تھے، فرمایا:

جو لوگ دنیا میں غرق ہیں اور انھوں نے جائدادیں بنالی ہیں، اپنے لیے نہریں، عمدہ نسل کے گھوڑے اور نازک اندام کنیزیں فراہم کرلی ہیں، کل جب میں یہ چیزیں ان سے واپس لے کر بیت المال میں داخل کردوں گا اور ان کو صرف اتنا ہی دوں گا جتنا ان کا حق ہے تو وہ یہ نہ کہیں کہ علیؑ نے ہمیں دھوکا دیا۔ پہلے کہا تو کچھ اور تھا اور اب عمل کچھ اور ہے۔ اسی لیے میں ابھی

سے اپنے پروگرام کا واضح طور پر اعلان کر دینا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے تفصیل سے گفتگو کی۔ چونکہ بعض لوگ اس کے قائل تھے کہ انہیں امتیازی حقوق حاصل ہیں۔ مگر اس بارے میں ان پر اعتراض کیا جاتا تھا مگر ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم نبی اکرمؐ کی صحبت میں رہے ہیں۔ ہمیں صحابیت کا شرف حاصل ہے اور ہم نے اسلام کے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں صحابیت کی فضیلت کا منکر نہیں اور نہ مجھے کسی کی سابقہ خدمات سے انکار ہے مگر یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اجر حق تعالیٰ خود دے گا۔ ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان حضرات میں اور دوسروں میں فرق روا رکھیں۔ یہ باتیں عام برتاؤ میں امتیاز کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

علیحدگی اور بہانہ بازی کی ابتداء

ایک دن ان لوگوں نے جو سمجھتے تھے کہ امام علیؑ کا یہ حکم ان پر اثر انداز ہوگا باہم مشورہ کر کے اپنا ایک نمائندہ امام کے پاس بھیجا۔ یہ نمائندہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط تھا۔ اس نے آکر کہا:

> یا اباالحسن! آپ کو معلوم ہے کہ اسلامی جنگوں کے تجربے کی بنا پر ہمارے دل آپ سے خوش نہیں ہیں۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس وقت آپ کے ہاتھ سے مارا نہ گیا ہو۔ بہرحال ہم اس بات سے صرفِ نظر کرنے کے لیے تیار ہیں اور آپ کی بیعت پر آمادہ ہیں لیکن دو شرطوں کے ساتھ ایک تو یہ کہ آپ ماضی کا کوئی خیال نہ کریں اور گزشتہ دور میں جو کچھ بھی ہوا اسے رفت گزشت

کر دیں۔ ہاں آئندہ آپ جس طرح چاہیں اس طرح کریں۔ دوسرے یہ کہ قاتلانِ عثمان جو اس وقت آزاد ہیں ان کو ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم ان سے قصاص لے سکیں۔ اگر آپ کو یہ شرائط منظور نہیں تو ہم مجبوراً شام جا کر معاویہ سے مل جائیں گے۔

آپ نے جواب میں فرمایا:

جہاں تک اس خون کا تعلق ہے جو سابق میں بہایا گیا تو اس میں کسی ذاتی کینہ کو دخل نہیں تھا۔ یہ مسلک اور عقیدے کے اختلاف کا سوال تھا۔ ہم حق کے لیے لڑ رہے تھے اور تم باطل کے لیے۔ حق کو باطل پر فتح ہوئی۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے اور خون بہا لینا چاہتے ہو تو جاؤ حق سے لو کہ اس نے باطل کو کیوں نیست و نابود کر دیا۔ رہی یہ بات کہ میں ماضی سے کوئی واسطہ نہ رکھوں اور جو کچھ ہو چکا اس کا کوئی خیال نہ کروں تو یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ یہ تو ایک فرض ہے جو خدا نے مجھ پر عائد کیا ہے۔ جہاں تک قاتلین عثمان کا تعلق ہے اگر ان سے قصاص لینا میں اپنا فرض سمجھتا تو کل ہی ان سے قصاص لے چکا ہوتا۔

ولید یہ صاف اور قطعی جواب سن کر اپنے ہم خیال لوگوں کے پاس واپس گیا اور ان کو امام سے جو گفتگو ہوئی تھی اس سے آگاہ کر دیا۔ یہ سن کر وہ سب مدینہ سے روانہ ہو گئے اور کھلم کھلا مخالفت اور دشمنی کا فیصلہ کر لیا۔

دوستوں کا مطالبہ

اس کے بعد ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اصحاب علیؑ نے جب یہ قصہ سنا اور ان کو معلوم ہوا کہ ایک گروہ حضرت علیؑ کی سربراہی کی مخالفت کے لیے پیدا ہو گیا ہے تو چند اصحاب حضرت علیؑ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ ان لوگوں کی ناراضگی کا اصل سبب آپ کا عدل و مساوات کے سوال پر اصرار ہے۔ قاتلینِ عثمان کو ان کے سپرد کرنے کی بات بھی محض بہانہ ہے۔ ان کے اس مطالبہ کا مقصد صرف اس طرح عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مالک اشتر بھی یہ تجویز پیش کرنے والوں میں شامل تھے۔ مثلاً انہوں نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر ممکن ہو تو آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔

امام علیؑ سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی خیال عوام کے ذہنوں میں راسخ ہو جائے کہ اس وقت اس بات پر اتنا زور دینا ضروری نہیں۔ اس لیے عوام کے سامنے تقریر کرنے کے لیے مسجد کو روانہ ہو گئے۔ جس وقت آپ مسجد میں گئے تو حالت یہ تھی کہ ایک کپڑا کندھے پر پڑا ہوا تھا اور ایک بطور لنگی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ تلوار بھی حمائل کی ہوئی تھی۔ غرض آپ منبر پر چڑھے اور کمان پر ٹیک لگا کر گفتگو کا آغاز کیا۔

آپ نے فرمایا:

"ہم اپنے اس پروردگار اور معبود کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس کی ظاہر اور پوشیدہ نعمتیں ہمارے شامل حال ہیں۔ اس کی سب نعمتیں اس کا احسان اور فضل ہیں۔ ان میں ہمارے

استحقاق کو کچھ دخل نہیں۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"اللہ کے نزدیک افضل ترین شخص وہ ہے جو بہتر طریقے سے اس کی اطاعت کرے اور سنتِ نبوی کی زیادہ پیروی کرے۔ کتاب اللہ یعنی قرآن پر عمل کرے۔ ہم میں سے کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں اِلّا بہ لحاظِ تقویٰ و طاعت ـــ یہ قرآن ہمارے سامنے موجود ہے اور یہ سیرتِ پیغمبر ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ ان کی بنیاد عدل و مساوات پر قائم ہے۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ عناد اور اپنی غرض کے لیے ہٹ دھرمی کی اور بات ہے۔"

اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (سورۂ حجرات آیت ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔"

اس آیت کی تلاوت سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ اس آیت کے حکم کے مطابق میں تمہارے سب امتیازات ختم کرتا ہوں۔

جائیدادوں کی ضبطی

ابن ابی الحدید ان فقروں کی تشریح کرتے ہوئے جن میں امام نے فرمایا تھا کہ میں زمینیں واپس لے لوں گا چاہے وہ عورتوں کے مہر میں دیدی گئی ہوں یا ان سے کنیزیں خریدی گئی ہوں کہتے ہیں کہ آپ نے سب اموال ضبط کر لیے مگر جو لوگ بھاگ گئے تھے وہ آپ کے قابو سے نکل گئے تھے۔ معاشرتی حقوق کے سلسلے میں گزشتہ پر توجہ کا قانونی اصول آپ نے اس جملہ میں بیان فرمایا:

إِنَّ الْحَقَّ الْقَدِيمَ لَا يُبْطِلُهُ شَيْءٌ۔ قدیم حق کو کوئی چیز منسوخ نہیں کرتی یعنی مسلّم الثبوت حق تمادی سے باطل نہیں ہو سکتا۔

عمرو بن عاص کا خط

معاویہ کے نام

اسی اثناء میں عمرو بن عاص نے معاویہ کو ایک خط لکھا:

مَا كُنْتَ صَانِعًا فَاصْنَعْ قَبْلَ اِذْ قَشَرَكَ ابْنُ اَبِي طَالِبٍ مِنْ كُلِّ مَا تَمْلِكُهُ كَمَا تَقْشُرُ عَنِ الْعَصَا لِحَاهَا۔

جو کچھ تم کر سکتے ہو اس سے پہلے پہلے کر لو کہ ابن ابی طالب تم سے وہ تمام دولت جو تم نے اس عرصہ میں جمع کی ہے اس طرح چھین لے جس طرح لاٹھی کا چھلکا اتار دیا جاتا ہے۔

آپ کا عدل وانصاف کس طرح

آپ کے قتل پر منتج ہوا

یہ جو کہا جاتا ہے کہ:

قُتِلَ فِي مِحْرَابِهِ لِشِدَّةِ عَدْلِهِ۔

"آپ انصاف میں شدت برتنے کی وجہ سے قتل ہوئے"۔

اس کے معنی یہی ہیں جو میں نے عرض کیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سوال مثلاً قاتلینِ عثمان کی سپردگی اور اسلام اور جاہلیت کے درمیان جنگوں میں جو کچھ ہوا تھا' یہ سب بہانے تھے۔ اصل سوال سماجی انصاف کے نفاذ کا تھا۔

خاص طور پر اس کی وجہ یہ تھی کہ امام علیؑ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ ماضی سے کوئی تعرض نہ کریں اور آئندہ کے لیے نئی پالیسی شروع کریں۔ آپ کہتے تھے:

إِنَّ الْحَقَّ الْقَدِيمَ لَا يُبْطِلُهُ شَيْءٌ۔

علیؑ اور منصب خلافت سے

فائدہ اٹھانے کی کوشش

اس گفتگو کے آخر میں امام علیؑ کی شخصی زندگی اور اس سختی کے بارے میں کچھ عرض کر دوں جو وہ اپنے اوپر روا رکھتے تھے۔ امام علیؑ اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے کہ وہ خود یا ان کے متعلقین اور اصحاب میں سے کوئی

خلافت کے نام پر کوئی غلط فائدہ اٹھا سکے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ غلط فائدہ اٹھانے کا سوال نہیں ہوتا تھا، صرف خلیفہ سے رعایت اور اس کے لحاظ کی بات ہوتی تھی مگر جہاں تک امام علیؑ کا تعلق تھا، دوسرے ان کا لحاظ کرتے تھے مگر وہ خود اپنے آپ کو نہ کسی پر ترجیح دیتے تھے نہ کسی مراعات کے قائل تھے۔ اگر کوئی چیز خریدنے بازار جاتے تھے تو کوشش کرتے تھے کہ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالیں جو انکو پہچانتا نہ ہو کیونکہ یہ خلیفہ ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی رعایت کرے اور ان کے اور دوسروں کے درمیان کوئی امتیاز کرے۔ وہ اپنے منصب سے اتنا سا فائدہ اٹھانے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔

جو شخص اپنے فرائض کماحقہٗ انجام دینا اور اپنے منصب سے فائدہ اٹھانا نہ چاہتا ہو، اس کی نظر میں منصب کوئی امتیازی حق نہیں ہوتا بلکہ ایک فرض ہوتا ہے۔ ظاہر ہے حق اور فرض میں فرق ہے۔ حق کا مطلب ہے فائدہ اور منفعت اور فرض کے معنی ہیں کام اور ذمہ داری۔ اگر ہم سماجی منصبوں سے بیجا فائدے کا عنصر خارج کر دیں تو پھر ہم دیکھیں گے کہ ہم انہیں حق کا نام نہیں دے سکتے۔ البتہ انہیں فرض کہنا صحیح ہوگا۔ اگر ہم کسی منصب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ کہیں کہ اس منصب میں فلاں فلاں کام شامل ہیں یا نہیں تو ہم یہ کہیں گے کہ اس منصب کے فرائض میں وہ امور شامل ہیں یا نہیں، یوں نہیں کہیں گے کہ یہ حق ان امور پر حاوی ہے یا نہیں کیونکہ اس طرح سوال کی صورت بدل جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم مثلاً ایک سپاہی کا فرض کہتے ہیں، سپاہی کا حق نہیں کہتے۔ اگر منصب سے بیجا فائدہ نہ اٹھایا جائے اور دیانت داری سے کام کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام مناصب فرائض ہیں، حقوق نہیں۔ امام علیؑ کے لیے جو خلافت سے بیجا فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے، خلافت و حکومت فرض تھے نہ کہ امتیازی

حقوق لیکن اگر فرض سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہی مقصود ہو تو پھر ہر کام کا غلط نام حق رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً نماز جو سراسر فرض ہے اگر اس سے بیجا فائدہ اٹھایا جائے تو ایسے نفع پرست شخص کے لیے نماز پڑھنا یا جماعت کی امامت کرنا بھی فرض کی بجائے حق بن جائے گا۔ ممکن ہے سب سے بڑا حق ہی بن جائے مگر حقیقت تو یہ نہیں ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ اپنے منصب سے اتنا فائدہ اٹھانے پر بھی آمادہ نہیں تھے کہ جب کوئی چیز خریدنے جائیں تو کسی ایسے شخص سے خریدیں جو ان کو پہچانتا نہ ہو کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مقام خلافت کے احترام میں کم نرخ پر دیدے تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ خلافت بھی فرض ہے حق نہیں بلکہ فرض سے بھی بڑھ کر ایک مشقت ہے۔

گرمی کے دنوں میں امام علیؑ دارالامارت سے باہر آکر سایہ میں اس لیے بیٹھا کرتے تھے کہ کہیں کوئی سائل یا فریادی گرمی میں ان تک باریابی حاصل نہ کر سکے۔ یہ تھی وہ تکلیف اور مشقت جو انہیں اپنے فرض کی انجام دہی میں اٹھانی پڑتی تھی۔

ایک خط میں امام علیؑ قثم بن عباس کو جو ان کی طرف سے حجاز کے والی تھے لکھتے ہیں:

وَاجْلِسْ لَهُمُ الْعَصْرَيْنِ، فَافْتِ الْمُسْتَفْتِيَ، وَعَلِّمِ الْجَاهِلَ، وَذَاكِرِ الْعَالِمَ وَلَا يَكُنْ لَكَ إِلَى النَّاسِ سَفِيرٌ إِلَّا لِسَانُكَ، وَلَا حَاجِبٌ إِلَّا وَجْهُكَ.

صبح و شام کچھ وقت رعایا کی شکایات سننے کے لیے مقرر کرو اور ان کے سوالات کا بذاتِ خود جواب دو۔ نادانوں اور گمراہوں

کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو اور دانشمند لوگوں سے رابطہ قائم رکھو۔ تمہارے اور عوام کے درمیان خود تمہاری زبان کے سوا کوئی درمیانی واسطہ نہیں ہونا چاہیے اور نہ تمہارے چہرے کے علاوہ کوئی حاجب و دربان (یعنی عوام سے خود براہ راست بات کرو اور انہیں بلا روک ٹوک اپنے پاس آنے دو)۔

آپ نے والیٔ مصر مالک بن اشتر کو لکھا: ؎

"ضرورت مندوں کے لیے کچھ وقت مخصوص کرو اور بذاتِ خود ان کی تکالیف سنو۔ ان کے لیے کھلی کچہری منعقد کرو ؎ اور وہاں اس خدا کے لیے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے تواضع سے کام لو۔ اس موقع پر فوج، پولیس اور اپنے پاسبانوں کو ان کی آنکھوں سے اوجھل رکھو تاکہ لوگ بلا کسی خوف و ہراس کے تم سے بات کر سکیں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو متعدد بار کہتے سنا ہے کہ ایسی قوم کبھی پاکیزہ اور محترم نہیں سمجھی جاسکتی جس میں طاقتور سے کمزور کا حق بغیر کسی دغدغہ کے نہ لیا جاتا ہو۔"

حکام اور عوام کے درمیان چوکی پہرے کے بارے میں آپ نے لکھا:

سرکاری حکام تک عوام کی بے روک ٹوک رسائی کو ممکن بنانے کے لیے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اپنے گورنروں کو جس کھلی کچہری کے لگانے کی تاکید فرمائی تھی، موجودہ دور میں لگائی جانے والی کچہریاں اسی کی تقلید ہے۔

فَلَا تُطَوِّلَنَّ احْتِجَابَكَ عَنْ رَعِيَّتِكَ وَاِنَّ احْتِجَابَ
الْوُلَاةِ عَنِ الرَّعِيَّةِ شُعْبَةٌ مِنَ الضِّيقِ۔

"اپنے عوام سے اپنے آپ کو زیادہ چھپا کے مت رکھو کیونکہ
یہ بھی ایک طرح سے لوگوں کو تنگ کرنا ہے۔"

اسی مضمون کو سعدیؔ نے بوستان میں اس طرح ادا کیا ہے:

تو کے بشنوی نالۂ داد خواہ
بکیواں برت کلۂ خوابگاہ
چناں خسپ کاید فغانت بگوش
اگر داد خواہے برآرد خروش

اسلام میں عدل کی اہمیت

عدلِ اسلامی سے مسلمانوں کے انحراف کا اصل سبب

بعض اوقات یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب اسلام میں عدل کی اس قدر تاکید کی گئی ہے تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں ہوا اور کیوں تھوڑی ہی مدت میں اسلامی معاشرے میں بے انصافی پھیل گئی؟ تو اس سوال پر سب سے پہلے جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس صورتِ حال کی ذمہ داری بعض خلفاء پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس اصول پر صحیح طریقے سے عمل نہیں کیا کیونکہ اس اصول کو نافذ کرنے کا کام درجۂ اول میں مسلمان خلفاء و وزراء ہی کا تھا مگر ان کی نیت خراب تھی اور وہ اس عظیم منصب کے اہل نہ تھے اس لیے

یہ لوگ اس اہم اصول کے نفاذ میں رکاوٹ ثابت ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے میں طرح طرح کی بے انصافی اور اونچ نیچ پیدا ہو گئی۔

یہ جواب درست ہے لیکن صرف اس معنی میں کہ جن کو اس اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف عمل کیا۔ اموی اور عباسی خلفاء کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے۔

عدل کی غلط تفسیر

لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آج کے لکچر میں ہم ایک اور سبب پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جس کا اثر اس پہلے سبب سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوا اور وہ سبب یہ ہے کہ کچھ علمائے اسلام نے عدل کی غلط تشریح کی۔ اگرچہ کچھ اور علمائے اسلام نے ان کا مقابلہ کیا اور ان کے خیالات کی تردید کی لیکن اس سے کام نہیں بنا اور کامیابی پہلے ہی گروہ کو ہوئی۔

ایک اچھے قانون کی سب سے پہلے تعبیر اور تشریح ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اس کو صحیح طریقے سے نافذ کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اگر کسی قانون کی صحیح تشریح ہی نہ ہو تو اگر ذمہ دار لوگ اسے نافذ بھی کرنا چاہیں تو کوئی فائدہ برآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس کو اسی صورت میں نافذ کریں گے جس طرح اس کی تشریح ہوئی ہے اور اگر ان کا صحیح طریقے سے نافذ کرنے کا ارادہ بھی نہ ہو تو پھر ان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ جب قانون کے شارح قانون کی ایسی غلط تشریح کرتے ہیں جو بدقسمتی سے قانون نافذ کرنے والوں کی خواہش کے مطابق ہو تو وہ عملاً اور نتیجہ کے لحاظ سے بدنیت حکام کی نہ صرف زبردست خدمات انجام دیتے ہیں بلکہ انہیں عوام کی مخالفت

اور تنقید سے محفوظ رکھ کر بڑے دردِ سر اور زحمت سے بچا لیتے ہیں۔ اب خواہ ان شارحین کا ارادہ شروع ہی سے لوگوں کو دھوکا دینے اور قانون کی غلط تشریح کرنے کا ہو یا وہ محض کم سمجھی اور غلط فہمی کی بنا پر ایسا کریں نتیجہ ایک ہی ہو گا۔

عدل کی تشریح میں بھی یہی صورت ہوئی۔ جن لوگوں نے اسلام کے اس اصول کا انکار کیا ہے ان میں سے اکثر کی اور شاید سب کی جیسا کہ میں وضاحت کروں گا نیت بری نہیں تھی۔ مسلمانوں کو روز بد اس لیے دیکھنا پڑا کہ ان شارحین کی فکر سطحی تھی اور ان کا خیال تھا کہ احکامِ الٰہی پر کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ یہی بات اسلام کے لیے مصیبت بن گئی۔

ایک دوسری مصیبت اس حکم پر عملدرآمد کے بارے میں نیت کی خرابی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ خلافت کی گاڑی شروع ہی سے اپنے صحیح راستے سے ہٹ گئی تھی۔ عربوں کی غیر عربوں پر اور قریش کو غیر قریش پر ترجیح دی جا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کو آزادانہ اموال اور حقوق پر دست درازی کی اجازت تھی اور دوسرے کچھ لوگوں کو بالکل محروم رکھا گیا تھا۔ امام علیؑ نے اپنے دورِ خلافت کا بیشتر وقت اس کجروی کا مقابلہ کرنے میں گزارا اور یہی چیز ان کی شہادت پر منتج ہوئی۔ معاویہ اور دوسرے خلفاء کے دورِ خلافت میں اس کجروی نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ سطحی نظر رکھنے والے جامد علماء نے ایسے خشک خیالات کو رواج دیا اور ایسی غلط تشریح و توضیح کی کہ اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔

اس جھگڑے کی جڑ علمِ کلام میں ہے

یہ سماجی اصول علمِ کلام کا مسئلہ کیسے بن گیا؟ اس کی توضیح یہ ہے کہ علم کلام پہلی صدی کے نصف دوم میں وجود میں آیا۔ جب لوگوں نے اصولِ دین اور توحید وصفاتِ الٰہی اور تکلیف و آخرت سے متعلق بحثیں شروع کریں۔ انہی لوگوں کا نام متکلمین پڑا۔

ان لوگوں کو متکلمین کیوں کہا گیا؟ اس کی مورخین نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وجہ یہ تھی کہ اہم ترین مسئلہ جس پر مدتوں بحث رہی قرآن مجید کے حادث یا قدیم[1] ہونے کا مسئلہ تھا۔ قرآن مجید چونکہ کلام اللہ ہے اس لیے یہ لوگ متکلمین کہلائے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے خود ہی اپنے فن کا نام کلام رکھا۔ اس نام کا انتخاب منطق کے مقابلے میں کیا گیا جس کا ان دنوں تازہ تازہ رواج ہوا تھا۔ یہ لوگ منطق کے ہم معنی کوئی نام چاہتے تھے چونکہ منطق کے معنی نطق یعنی بولنا ہیں اس لیے کلام نام منتخب کیا گیا جس کے معنی بات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ لوگ بحث و مباحثہ بہت کرتے تھے، اس لیے متکلمین کہلائے۔ بہر حال ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔

عدلِ الٰہی

ایک مسئلہ جو علمِ کلام میں زیر بحث آیا وہ عدل الٰہی کا سوال تھا کہ آیا اللہ تعالٰے عادل ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کرلی اور

---

[1] اشاعرہ قرآن مجید کو قدیم مانتے ہیں۔

اس سے بہت سے ضمنی سوال پیدا ہو گئے جن کا سلسلہ معاشرتی انصاف تک پہنچ گیا جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے۔ یہ مسئلہ کلام اللہ کے حدوث و قدم سے بھی زیادہ اہم بن گیا حالانکہ حدوث و قدم کے مسئلے کے سلسلے میں بڑے فتنے برپا ہوئے تھے اور کتنی ہی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ عدلِ الٰہی کے مسئلہ پر متکلمین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک عدلیہ دوسرے غیر عدلیہ یعنی ایک اصول عدل کا طرفدار اور دوسرا اس کا منکر۔

شیعہ متکلمین عام طور پر عدلیہ یعنی عدلِ الٰہی کے اصول کے قائل ہیں۔ اسی لیے زمانۂ قدیم سے یہ رواج ہے کہ شیعہ کہتے ہیں کہ اصول دین پانچ ہیں: توحید — عدل — نبوت — امامت اور قیامت — یعنی شیعہ نقطۂ نگاہ سے اسلام کے پانچ اصول ہیں۔

عدلِ الٰہی سے متعلق دو سوال زیر بحث آئے۔ ایک تو یہ کہ کیا اس تمام عالم کی تخلیق جس میں آسمان و زمین، جمادات، نباتات، حیوانات، دنیا اور آخرت سب شامل ہیں عدل و انصاف کے اصول پر ہوئی ہے۔ بکوینی نظام میں کسی موجود پر کوئی ظلم نہیں ہوتا اور یہ عالم انصاف کی بنیاد پر قائم ہے۔ بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یا صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ اور مشیت میں مختار مطلق ہے۔ کوئی چیز اس کے ارادہ کو محدود نہیں کر سکتی۔ وہ فعال لما یرید ہے۔ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ اس کی تخلیق کسی معیار اور قاعدہ کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وہ جو کچھ کرے گا وہی عدل ہے۔ یہ نہیں کہ وہ صرف وہی کرتا ہے جو مقتضائے عدل ہو۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا اللہ تعالیٰ روزِ قیامت معیارِ عدل کے مطابق جزا و سزا دے گا اور کسی حساب اور قاعدہ کے مطابق ایک کو

بہشت میں اور دوسرے کو دوزخ میں بھیجے گا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے۔ کوئی قانون اور کوئی قاعدہ اللہ تعالے کے کسی فعل پر روک نہیں لگا سکتا۔ تمام آیئن و قوانین خود اس کے فعل و امر کے تابع ہیں۔ عدل و ظلم بھی اس کے فعل کے تابع ہیں۔ اگر وہ مطیع کو جہنم میں اور عاصی کو جنت میں بھیج دے۔ جب بھی وہ جو کچھ کرے وہ عدل ہے۔ اس کا ارادہ اور اس کا فعل کسی معیار کے تابع اور کسی قانون کا پابند نہیں۔ سب قوانین اور سب معیار اس کے ارادہ کے تابع ہیں۔

اس سوال کا تعلق تو اس بات سے تھا کہ کیا عدل کے اصول کا اطلاق تخلیق کائنات اور نظامِ عالم پر بھی ہوتا ہے یا نہیں اور کیا نظامِ عالم معیارِ عدل پر قائم ہے یا نہیں۔

دوسرے سوال کا تعلق شریعت کے نظام اور دینی تعلیمات سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ احکام الٰہی جو حضرت نبی اکرمؐ کے توسط سے نازل ہوئے اور جن کو شریعت اور اسلامی قانون کہا جاتا ہے ان کی کیا صورت ہے؟ آیا شریعت کا نظام معیارِ عدل کے تابع ہے یا نہیں؟ کیا یہ نظام مبنی بر انصاف ہے یا نہیں؟ ہر حکم میں واقعی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے یا ایسا نہیں ہے؟

جب ہم اسلام کے قوانین شریعت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ چیزیں حلال اور جائز اور کچھ واجب ہیں۔ اس کے برخلاف کچھ چیزیں حرام اور ممنوع ہیں۔ راست بازی اور دیانت داری کا حکم دیا گیا ہے اور جھوٹ خیانت اور ظلم سے منع کیا گیا ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس وقت تو صورت یہی ہے کہ جس کام

کا حکم دیا گیا ہے وہ اچھا ہے اور جس کام سے منع کیا گیا ہے وہ برا ہے لیکن کیا جو کام اچھا ہے وہ ہمیشہ سے ہی اچھا تھا اور جو برا ہے وہ ہمیشہ سے برا ہی تھا اور اسی لیے اسلام نے اس کا حکم دیا اور اس سے منع کیا؟ یا چونکہ اسلام نے ایک کا حکم دیا' اس لیے وہ اچھا ہو گیا اور دوسرے سے منع کیا اس لیے وہ برا ہو گیا؟ اگر اسلام نے جھوٹ' خیانت اور ظلم کا حکم دیا ہوتا تو یہ کام اچھے ہو جاتے اور اگر راست بازی' دیانت داری اور انصاف سے منع کیا ہوتا تو یہی کام برے ہو جاتے؟

شارع اسلام نے ہدایت کی ہے کہ بیع حلال ہے اور سود حرام۔ اس میں شک نہیں کہ اب بیع اچھی چیز ہے اور سود بری چیز ــــ لیکن کیا بیع بالذات اچھی اور انسانیت کے لیے مفید ہے اور اسی لیے اسلام نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور کیا سود بالذات بری چیز اور انسانی معاشرے کے لیے ضرر رساں ہے اور اسی لیے اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ.

(سورۂ بقرہ - آیت ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر۔

یا اس کے برعکس یہ صورت ہے کہ بیع کو چونکہ اسلام نے جائز قرار دیا ہے' اس لیے وہ اچھی ہو گئی اور سود کو چونکہ حرام کہا ہے اس لیے وہ برا ہو گیا۔

حسن وقبح عقلی

اسلام میں علماء کے یہ دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ حسن وقبح عقلی کا طرفدار تھا اور کہتا تھا کہ شارع کا حکم خود اشیاء کے نیک وبد اور اچھے برے ہونے پر مبنی اور موقوف ہے۔ دوسرا گروہ عقلی حسن وقبح کا منکر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا محض شارع کے حکم کے تابع ہے۔ اس میں عقل کا دخل نہیں۔

عدل وظلم جس کا تعلق لوگوں کے حقوق سے ہے اور جو ایک معاشرتی موضوع ہے، اس کے بارے میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ عدلیہ کے نظریہ کے مطابق حق اور حقدار کا وجود ایک حقیقت ہے۔ اسلام کے احکام نازل ہونے سے پہلے بھی حق اور حقدار موجود تھے اور ایسا ہوتا تھا کہ کسی حقدار کو اس کا حق مل جاتا تھا اور کوئی حقدار اپنے حق سے محروم رہ جاتا تھا۔ جب اسلام آیا تو اس نے اپنے احکام اس طرح وضع کیے کہ حقدار کو اس کا قرار واقعی حق ضرور ملے۔ اسلام کے تمام احکام حق وانصاف کے مطابق ہیں۔ حق اور انصاف دونوں خارجی حقیقتیں ہیں جن کا نفس الامر میں وجود ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر حقدار کو اس کا حق مل جانا چاہیئے۔ اگر اسلام کے احکام نہ بھی ہوتے تب بھی یہ حقیقت بدل نہیں سکتی تھی۔

دوسرے گروہ کے خیال کے مطابق حق اور کسی کے حقدار ہونے یا نہ ہونے اور اسی طرح عدل اور ظلم کا بالذات کوئی حقیقی وجود نہیں۔ انکا وجود اس پر موقوف ہے کہ شارع اسلام نے کیا قانون بنایا ہے۔

اس گروہ کے نزدیک جس طرح تکوینی نظام اللہ تعالے نے اپنی

قدرتِ کاملہ اور مشیت مطلقہ سے پیدا کیا ہے اس لیے وہ کسی قاعدہ یا قانون کے تابع نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تشریعی نظام بھی اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے، کسی قانون کے تابع اور کسی اصول کا پابند نہیں۔ اسلام جو قانون بھی وضع کرے وہ حق ہے یعنی اس پر اسلام کی مہر لگ جانے کے بعد وہ حق بن جاتا ہے۔ اسلام جو بھی فیصلہ کرے وہی انصاف ہے۔ اگر اسلام کا حکم یہ ہوتا کہ سب لوگ چاہے کتنی ہی زحمت کرکے اور تکلیف اٹھا کر روزی پیدا کریں لیکن ان میں ان کا اپنا کوئی حق نہیں بلکہ حق کسی اور کا ہے جس نے کوئی زحمت برداشت نہیں کی اور نہ کوئی تکلیف اٹھائی تو اسی طرح ہوتا۔ ان کا کوئی حق نہ ہوتا بلکہ اس غیر شخص کا حق ہوتا۔

حسن و قبح کی بحث کا

عملی اور معاشرتی اثر

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ آخر اس بحث کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ اس بات پر تو دونوں فریق متفق ہیں کہ موجودہ صورت میں اسلامی احکام حق اور انصاف پر مبنی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فریق کا عقیدہ یہ ہے کہ اچھے برے، صحیح و غلط اور حق و ناحق کا وجود پہلے سے تھا۔ شارع نے ان ہی کے مطابق بعد میں احکام جاری کیے۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ ابتداء سے ایسا نہیں تھا، دینی احکام آنے کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی۔ ایک فریق یہ کہتا ہے کہ حسن و قبح حق و ناحق اور عدل و ظلم دینی احکام کا معیار ہیں۔ دوسرے فریق کے خیال میں خود دین حسن و قبح اور عدل و ظلم

کا معیار ہے۔ اب چاہے خواجہ علی کہو یا علی خواجہ بات ایک ہی ہے۔ دونوں فریق کے علماء نے فقہ اور اصولِ فقہ کے مسائل پر گفتگو کی ہے۔ احکامِ اسلامی کی مصلحتوں پر بحث کی ہے اور ایک مصلحت کو دوسری مصلحت پر ترجیح دی ہے۔

جواب میں عرض کروں گا معاملہ اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے۔ حسن و قبح کی بحث کا عملی اثر بہت گہرا اور دور رس ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ احکامِ اسلامی کے استنباط میں عقل سلیم کو دخل ہے یا نہیں۔ اگر ہم پہلے نظریے کو تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ حق و انصاف اور حسن و قبح فی الواقع موجود تھے اور شارعِ اسلام نے اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر احکام وضع کیے تو ہم مجبور ہوں گے کہ جہاں کہیں ہمیں صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہو سکے کہ عقل و علم کے مطابق حق و انصاف کا تقاضا کیا ہے اور اچھی بات کیا ہے اور بری بات کیا ہے وہاں رک کر عقل کی رہنمائی کو تسلیم کر لیں اور جو بات قرینِ عقل ہو اس کو مان لیں۔ عدلیہ یعنی عدل کے قائل علماء نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ كُلُّ مَا حَكَمَ بِهِ الْعَقْلُ حَكَمَ بِهِ الشَّرْعُ۔ جو عقل کا حکم ہے وہی شریعت کا حکم ہے۔ اس قاعدہ کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اَلْوَاجِبَاتُ الشَّرْعِيَّةُ أَلْطَافٌ فِي الْوَاجِبَاتِ الْعَقْلِيَّةِ۔ یعنی عقل جن باتوں کو ضروری قرار دیتی ہے شرعی واجبات ان ہی کی ایک خوشگوار صورت ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ بعض صورتوں میں کوئی نقلی دلیل بظاہر عقل کے خلاف بھی ہو سکتی ہے لیکن ہم اسلامی احکام کی روح اور مقصد کے قائل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اسلام اپنے مقصد سے کبھی انحراف نہیں کرتا۔ ہم اس مقصد کے

ساتھ چلتے ہیں۔ ہم کسی معاملے میں اس کی ظاہری شکل و صورت پر نہیں جاتے مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ سود حرام ہے اور بلا وجہ حرام نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سود چاہے کوئی شکل بھی اختیار کرے' اس کی حرمت علیٰ حالہٖ باقی رہے گی۔ سود کی حقیقت ہر صورت میں سود ہی ہے۔ ظلم کی ماہیت ظلم ہی ہے۔ چوری چوری ہی رہتی ہے۔ گداگری کا مطلب ہر حال میں معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے۔ چاہے سود' ظلم' چوری اور گدائی اپنی عام شکل و صورت میں ہوں اور چاہے بھیس بدل کر حق و انصاف کا روپ دھار لیں' اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ لہذا حکم بھی نہیں بدل سکتا۔

لیکن دوسرے نظریے کے مطابق عقل کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اسلامی قوانین کی کوئی ایسی روح نہیں جس کو ہم بنیاد قرار دے سکیں' اس لیے جو کچھ ہے مسائل کی شکل و صورت ہی ہے اور اس شکل و صورت کے بدل جانے سے ہر چیز بدل جاتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہر چند حق و انصاف کا نام لیا جاتا ہے اور ایک مصلحت کو دوسری مصلحت پر ترجیح دی جاتی ہے لیکن ان چیزوں کا کوئی حقیقی مفہوم نہیں ہے۔ شکل و صورت ہی کو حق و انصاف اور مصلحت وغیرہ کا نام دیا گیا ہے۔

پہلے نظریے کے مطابق ہم حق و انصاف اور مصلحت کو ایک امر واقعی کی حیثیت میں دیکھتے ہیں اور دوسرے نظریے کے مطابق محض خیالی مفروضے کے طور پر۔

ایام جاہلیت میں لوگوں کی گمراہی کا ایک سبب یہ تھا کہ ان میں نیک اور بد کی تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہر بدی اور برائی کو دین کے نام پر قبول کر لیتے تھے اور اس کو دینی کام قرار دیتے تھے۔ قرآن کریم نے اس بات پر

نکتہ چینی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات سمجھ لو کہ برے کام بذات خود برے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالے کسی قبیح فعل کی اجازت دے۔ کسی چیز کا قبیح ہونا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ تم یہ سمجھ لو کہ اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا۔ قرآن شریف میں ہے:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ. (سورۃ اعراف۔ آیت ۲۸)

"جب وہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہدو کہ اللہ ہرگز برے کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاتے ہو جن کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے؟ کہدو کہ میرے پروردگار نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔"

یعنی مشرکین جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دو دلیلیں دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد کا طریقہ ہے اور دوسری یہ کہ خدا کا یہی حکم ہے۔ ان سے کہدو کہ خدا ہرگز بری باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ برائی اور بھلائی خود اپنی جگہ ایک حقیقت ہے اور کسی حکم سے برائی اچھائی میں اور اچھائی برائی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اللہ عدل و اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیتا ہے۔ اس معیار پر تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اللہ کس بات کا حکم دیتا ہے اور کس سے منع کرتا ہے۔

ادلۂ اربعہ

یہی وجہ ہے کہ علمائے عدلیہ کہتے ہیں کہ شرعی دلائل چار ہیں: قرآن، سنت، اجماع (یعنی چند خاص شرائط کے ساتھ علمائے اسلام کا اتفاق رائے) اور عقل۔

لیکن غیر عدلیہ کے نزدیک یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ عقل کو ادلۂ شرعیہ میں شمار کیا جائے اور اسے احکامِ شرعی کے استنباط اور اجتہاد کی بنیاد قرار دیا جائے۔ ان کے خیال میں اصل چیز تعبد محض ہے۔ بالفاظِ دیگر احکامِ الٰہی میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔

شرمناک استدلال

اگر کوئی سنے تو حیران رہ جائے کہ اسلام میں کچھ ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جو واقعی مسلمان تھے اور خود کو دوسروں سے بہتر مسلمان سمجھتے تھے جو بڑے عبادت گزار تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ وہ سو فیصد سنتِ نبوی کی پیروی کرتے ہیں۔

انہی لوگوں نے جو تکوینی اور تشریعی امور دونوں میں عدلِ الٰہی کا انکار کرتے تھے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے شروع کیے۔ تخلیق میں بزعمِ خود بے انصافی ثابت کرنے کے لیے ایسی مثالیں پیش کیں جو شرمناک ہیں۔ انہوں نے بیماریوں اور تکالیف کی مثال دی۔ شیطان کی تخلیق کو بطور دلیل پیش کیا۔ یہ کہا کہ اگر واقعاتِ عالم مبنی بر انصاف ہوتے تو علی بن ابی طالب قتل نہ ہوتے اور زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف

ان کی جگہ نہ لیتے۔ اسی طرح کی اور مثالیں تھیں جو انہوں نے تکوینی نظام کے بارے میں دیں۔

نظام شریعت کے بارے میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کے قوانین کسی قاعدہ و قانون کے تابع نہیں اور نہ ان کی بنیاد کسی کام کے اچھے یا برے ہونے پر ہے۔ بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ اسلامی احکام میں تناقض اور تضاد ہے۔ شارع اسلام نے اکثر مختلف صورتوں میں ایک ہی حکم دیا ہے اور بعض موقعوں پر ایک ہی طرح کے مسائل میں مختلف احکام دیئے ہیں۔ دو چیزیں جو ایک دوسرے سے مکمل مشابہت رکھتی ہیں ان کے بارے میں ایک ہی حکم ہونا چاہیے حالانکہ دو مختلف حکم ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کے معاملے میں فرق ہے۔ مرد کے لیے چار بیویاں جائز ہیں لیکن عورتوں کو ایک سے زیادہ شوہر کی اجازت نہیں۔ چور کے بارے میں حکم ہے کہ چوری کا آلہ یعنی اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے لیکن جھوٹے کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کی زبان جو جرم کا آلہ ہے کاٹ دی جائے۔ یہی صورت زانی وغیرہ کی ہے۔

کتنی شرم کی بات ہے کہ کوئی تاریخ میں یہ پڑھے کہ کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے تھے جو کہتے تو یہ تھے کہ ہم قرآن کا اتباع کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کہ قرآن نے تکوینی اور تشریعی نظام کے بارے میں عدلِ الٰہی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ لوگ تخلیقی نظام اور اسلامی احکام کے غیر دانشمندانہ اور غیر منصفانہ ہونے کی باتیں کرتے تھے۔

منکرینِ عدل کی کامیابی

اس سے بھی زیادہ شرم کی بات یہ ہے کہ ایک صدی کی کشمکش اور زبردست مباحثوں، مناظروں، فتنوں اور خونریزیوں کے بعد بالآخر ان ہی کو غلبہ حاصل ہو گیا جو عدل کے منکر تھے۔ اس وقت کی سیاست نے ان کو آگے بڑھا دیا۔

یہ کام متوکل عباسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ متوکل نے غیر عدلیہ کی حمایت کی، یا تو اس لیے کہ ان کا نظریہ اس کی سیاست سے میل کھاتا تھا یا شاید اس وجہ سے کہ وہ اصل بات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مروج الذہب میں مسعودی لکھتا ہے:

لَمَّا أَفْضَتِ الْخِلَافَةُ إِلَى الْمُتَوَكِّلِ أَمَرَ بِتَرْكِ النَّظَرِ وَالْمُبَاحَثَةِ وَالْجِدَالِ وَالتَّرْكِ لِمَا عَلَيْهِ النَّاسُ فِي أَيَّامِ الْمُعْتَصِمِ وَالْوَاثِقِ وَأَمَرَ النَّاسَ بِالتَّسْلِيمِ وَالتَّقْلِيدِ وَأَمَرَ الشُّيُوخَ الْمُحَدِّثِينَ بِالتَّحْدِيثِ وَإِظْهَارِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ.

"جب خلافت متوکل کو ملی تو اس نے حکم جاری کیا کہ عقلی امور میں بحث و مباحثہ اور نزاع بند کر دیا جائے اور دینی مسائل میں تسلیم اور تقلید کی راہ اختیار کی جائے۔ اس نے شیوخ اہلحدیث کو حکم دیا (جو عدل کے اصول کے منکر تھے) کہ وہ احادیث بیان کریں۔ اہل سنت والجماعت کے طریقہ کی اشاعت کریں۔"

متوکل نے فلسفہ پر بھی جو کچھ مدت سے رواج پا رہا تھا عقلی بحث ہونے کے جرم میں پابندی لگا دی تھی۔

لفظِ سُنّی

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لفظ سُنّی جو اب اصطلاحاً شیعہ کے مقابل استعمال ہوتا ہے، پہلے اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا تھا جو عدل کے اصول کے منکر تھے۔ چونکہ اصولِ عدل کے قائل صرف شیعہ اور معتزلہ تھے اور متوکل کے زمانے سے معتزلہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے اور اپنا علاحدہ تشخص قائم نہ رکھ سکے اس لیے صرف شیعہ متکلمین ہی رہ گئے جو اپنے عقیدے پر قائم رہے اس لیے بعد میں تمام غیر شیعہ مسلمانوں کو اہلِ سنت والجماعت کہا جانے لگا۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ بعد میں آنے والے تمام اہلِ سنت علماء نے اشعری مسلک ہی اختیار کیا ہو۔ بہت سے بعد کے علمائے اہلسنت بھی اصولِ عدل کے قائل تھے مثلاً زمخشری جو اکابرِ علمائے اہلِ سنت میں سے ہے، اصولِ عدل کا قائل اور معتزلی تھا۔ اسی طرح اور بہت سے علماء۔

آہستہ آہستہ یہ اعتقادی بحثیں ٹھنڈی پڑتی گئیں اور ایک گروہ کے عقائد دوسرے گروہ میں سرایت کرتے گئے۔ یہ موقع اس کی تفصیل بیان کرنے کا نہیں ہے کہ کس طرح عدلیہ کے عقائد غیر عدلیہ میں اور غیر عدلیہ کے عقائد عدلیہ میں سرایت کرتے گئے اور آخر انہوں نے کیا شکل اختیار کر لی اور کس طرح یہ مصیبت عام ہو گئی۔

اشعری افکار کی عوام میں مقبولیت

اس زمانے کے عوام غیر عدلیہ طرزِ فکر کو پسند کرتے تھے۔ چونکہ یہ طرزِ فکر تسلیم و رضا اور احکام کی بے چون و چرا تعمیل پر مبنی تھا اور عوام الناس چونکہ غور و فکر سے عاری ہوتے ہیں اس لیے وہ قدرتی طور پر غور کرنے اور عقل سے کام لینے کو خطرناک سمجھتے تھے اور گھبراتے تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ شریعت کے احکام عقل کے تابع نہیں تو اس میں عوام الناس کے نقطۂ نظر سے ایک طرح سے دین کی عظمت اور اہمیت اجاگر ہوتی ہے" اس لیے متوکل کا یہ فعل کہ اس نے آزادیٔ فکر پہ روک لگا دی 'عوام کو پسند آیا' اور اسے دین اور سنت نبوی کی حمایت سمجھا گیا۔ حالانکہ متوکل ایک ظالم اور فاسق شخص تھا لیکن اس پر بھی وہ عوام میں مقبول ہو گیا۔ اس کی تعریف میں اشعار کہے گئے اور اس کا شکریہ ادا کیا گیا کیونکہ عوام کے خیال کے مطابق اس نے دین کی حمایت میں کام کیا تھا۔ اگرچہ وہ دن دراصل مسلمانوں کی عقلی زندگی کے لیے مصیبتِ عظمٰی اور حادثۂ فاجعہ تھا مگر لوگوں نے جشن منایا اور خوشی کا اظہار کیا۔

ایک شاعر نے متوکل کی مدح میں کہا:

"آج پھر سنتِ نبوی کا احترام بحال ہو گیا۔ گویا اسے کبھی ذلت سے دوچار ہونا ہی نہیں پڑا تھا۔ اب پھر سنتِ نبوی اپنی پوری آب و تاب سے درخشاں ہے۔ ظلم اور باطل کے نشان گر رہے ہیں۔ یہ بدبختی (یعنی عدلیہ) فرار ہو کر جہنم رسید ہو گئے۔ اب یہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اللہ نے متوکل

کے ذریعے جو سنت کے تابع اور اس کا شیدائی ہے مسلمانوں کا
بدلہ ان بدعتیوں سے لے لیا۔ متوکل وہی ہے جو ہمیں پروردگار
کا خلیفہ اور رسولؐ کے چچا کا بیٹا ہے۔ وہ خاندان عباسی کا
بہترین فرد ہے۔ وہی ہے جس نے دین کی حمایت کی اور تفرقہ
سے نجات دلائی۔ اللہ اس کی عمر طویل کرے اور اس کا سایہ
ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ اللہ اسے زندہ و سلامت
رکھے اور اپنے دین کی حمایت کے صلہ میں اسے بہشت بریں
میں اپنے نبی کا قرب عطا کرے۔"

یہ تھی مختصر تاریخی داستان اس مسئلہ کی جس کے نتیجہ میں عدلِ الٰہی کی بحث چھڑی۔ بالآخر عدلِ الٰہی کے اصول کے منکرین کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور غیر عدلیہ کے افکار عدلیہ میں سرایت کر جانے سے اسلام میں معاشرتی انصاف کے اصول کو روز بد دیکھنا پڑا۔ یہ فکری انتشار عالم اسلام کو بہت مہنگا پڑا۔

اسلامی اشعریت اور
یونانی سوفسطائیت

یہ جو اسلام میں حق کے موضوع پر دو فریقوں میں یہ بحث چھڑی کہ آیا حق و انصاف دین کا معیار ہے یا دین حق و انصاف کا معیار، یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسی کہ زمانۂ قدیم میں فلاسفہ میں یہ سوال اٹھا تھا کہ آیا حقیقت کا نفس الامر میں واقعی وجود ہے اور ہمارے افکار و احساسات

اس نفس الامری حقیقت کے تابع ہیں یا ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت خود ہمارے ذہنی خیالات کے تابع ہے۔ بالفاظ دیگر جب ہم اپنے علمی اور فلسفی افکار کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ فلاں بات اس طرح ہے تو کیا اس بات کا واقعے میں کوئی حقیقی وجود ہوتا ہے چاہے ہم اس کا احساس کریں یا نہ کریں جب وہ اس بات کو اسی طرح محسوس کر لیتے ہیں جس طرح کہ وہ واقع میں ہے تو کیا ہم ایک حقیقت کا ادراک اور احساس کرتے ہیں یا صورت اس کے برعکس ہے اور حقیقت خود ہمارے ذہنی ادراک کے تابع ہے۔ جس طرح ہم محسوس کریں وہی حقیقت ہے اور چونکہ یہ ممکن ہے کہ مختلف اشخاص ایک ہی بات کو مختلف طریقے سے محسوس کریں اس لیے ان میں سے ہر ایک کی نظر میں اس ایک ہی چیز کی حقیقت مختلف ہوگی اس لیے حقیقت محض اضافی چیز ہے۔ قدیم یونان میں کچھ ایسے گروہ پیدا ہو گئے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ حقیقت کا معیار خود انسان کے اپنے خیالات ہیں۔ حقیقت انسانی افکار کو جانچنے اور پرکھنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ہر چیز کا معیار خود انسان ہے۔ یہی لوگ تاریخ میں سوفسطائی کہلاتے ہیں۔

یہ لوگ بہ لحاظ زمانہ مسلمان متکلمین سے مقدم تھے۔ انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو دلائل پیش کیے وہ اسی طرح کے تھے جس طرح کے دلائل بعد میں اسلام میں عدل کے اصول کے منکرین نے پیش کیے۔ اصول عدل کے منکرین نے بزعم خویش تناقض اور احکام اسلامی میں ایک ہی طرح کے مسائل میں مختلف حکم اور مختلف طرح کے مسائل میں ایک ہی طرح کی مثالیں پیش کیں اور یہ دعوے کیا کہ ان تناقضات کی موجودگی میں مصلحت اور فساد واقعی اور حسن و قبح عقلی اسلامی احکام کا معیار نہیں ہو سکتے بلکہ خود

اسلامی احکام خوب و بد اور غلط اور صحیح کا معیار ہیں۔ سوفسطائی بھی تناقض ہی کی دلیل پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ چونکہ سمجھنے اور محسوس کرنے میں غلطیاں ہوتی ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ حقیقت ہماری سوچ کا معیار بن سکے بلکہ ہماری سوچ حقیقت کا معیار ہے۔

جو جواب فلاسفہ نے ان یونانی اور غیر یونانی متشککین کو دیے ہیں جو زمانۂ قریب میں بھی کم و بیش موجود رہے ہیں۔ اس قسم کے جواب علمائے عدلیہ نے بھی دوسرے فریق کو دیے ہیں جس کو ہم مذہبی متشککین اور دینی سوفسطائیوں کا گروہ کہہ سکتے ہیں۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل میں ہم پڑنا نہیں چاہتے۔

جمود اور روشن خیالی کی جنگ

ہم نے دیکھا کہ عدلیہ اور غیر عدلیہ کا نزاع دراصل جمود و تنگ نظری اور روشن خیالی اور وسیع النظری کے درمیان جنگ تھی۔ بدقسمتی سے اس جنگ میں جمود و تنگ نظری کو غلبہ حاصل ہوا اور اس طرح عالم اسلام کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ مادی نقصان نہیں تھا بلکہ اخلاقی اور روحانی نقصان تھا۔

آدمی میں ایک ایسا جذبہ موجود ہے جس کی بنا پر وہ بعض اوقات چاہتا ہے کہ دینی امور میں زیادہ سے زیادہ اتقیاء و فرمانبرداری کا مظاہرہ کرے۔ اس جذبے کے تحت وہ ایسی باتیں کر گزرتا ہے جن کی دین اجازت نہیں دیتا۔ وہ عقل کی رہنمائی کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کی راہ سے بھی ہٹ جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ سے روایت ہے:

قَصَمَ ظَهْرِی رَجُلَانِ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ وَعَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ۔ یعنی دو اشخاص نے میری اور میرے دین کی کمر توڑ دی۔ ایک متعصب اور نادان زاہد نے دوسرے لاابالی عالم نے۔

ایک اور روایت میں قَطَعَ ظَهْرِی اثْنَانِ کے الفاظ ہیں۔ اس کے بھی یہی معنی ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

اللہ کی طرف سے مقرر کردہ رہنما دو ہیں۔ ایک باطنی اور ایک ظاہری۔ باطنی رہنما عقل ہے اور ظاہری رہنما انبیاءؑ۔

علیؑ جمود و تنگ نظری کی نذر ہو گئے

امام علیؑ کی شہادت کی داستان اور اس کے اسباب اس پہلو سے جو میں نے آج بیان کیا یعنی تعقل و تدین کی جدائی کے پہلو سے بہت عبرت انگیز ہیں۔

علیؑ مسجد میں مشغول نماز تھے کہ ان پر تلوار سے حملہ کیا گیا۔ اسی ضرب کے اثر سے وہ شہید ہوئے وَقُتِلَ فِی مِحْرَابِهِ لِشِدَّةِ عَدْلِهِ بالکل درست ہے۔ انصاف کے معاملے میں آپ کی بے لوچ شدت نے آپ کے دشمن پیدا کر دیے تھے۔ اسی وجہ سے جنگِ جمل اور جنگِ صفین ہوئیں۔ بالآخر جہالت اور فکری جمود نے کچھ ایسے لوگ پیدا کر دیے جو خوارج کہلائے اور ان کی جہالت و تنگ نظری نے علیؑ کو شہید کر دیا۔

خوارج

صفین میں تحکیم کا قصہ پیش آیا۔ اصحاب علیؑ ہی میں سے ایک گروہ نے بغاوت کی جس سے خارجی مذہب وجود میں آیا۔ امام علیؑ کے سر مبارک پر جس نے تلوار ماری وہ ایک خارجی تھا۔ خوارج بھی مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے، گو ہمارے عقیدہ کی رو سے یہ لوگ کافر ہیں لیکن وہ خود اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے بلکہ اپنے سوا کسی کو مسلمان نہ سمجھتے تھے اور سب کو بے دین اور خارج از اسلام گردانتے تھے۔ یہ کسی نے دعوے نہیں کیا کہ خوارج کا اسلام پر عقیدہ نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس سب کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ اسلام پر اپنے عقیدے میں پر جوش اور مخلص تھے۔ ان کی نمایاں خصوصیت ان کی عقل اور سمجھ سے دوری تھی۔ خود امام علیؑ نے ان کو عقیدے میں سخت لیکن جاہل اور سطح ذہن کہا ہے۔ یہ لوگ بڑے عبادت گزار، شب زندہ دار، قرآن کی تلاوت کے شیدائی مگر جاہل اور کم عقل تھے بلکہ دین کے معاملے میں عقل کے دشمن تھے۔

امام علیؑ نے ان سے اتمام حجت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

وَقَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ هٰذِهِ الْحُكُومَةِ فَأَبَيْتُمْ عَلَيَّ إِبَاءَ الْمُخَالِفِينَ الْمُنَابِذِينَ حَتّٰى صَرَفَ رَأْيِي إِلٰى هَوَاكُمْ وَأَنْتُمْ مَعَاشِرُ أَخِفَّاءُ الْهَامِ وَسُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ.

آج تم مجھ پر تحکیم کے بارے میں اعتراض کر رہے ہو اور کہتے ہو کہ یہ غلطی تھی۔ ہم نے توبہ کر لی ہے، تم بھی توبہ کرو اور

معاہدہ توڑ دو۔ میں نے شروع ہی میں تم سے کہا تھا کہ میں تحکیم قبول نہیں کرتا۔ اس وقت تم نے سخت رویہ اختیار کیا اور تلواریں سونت لیں اور کہا کہ ہم قرآن کے لیے لڑ رہے ہیں اور یہ قرآن کو سامنے لائے ہیں۔ آخر میں نے مجبوراً تمہاری بات مان لی اور معاہدہ کر لیا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ معاہدہ غلط تھا اور دباؤ ڈال رہے ہو کہ میں اس معاہدے کو توڑ دوں۔ حالانکہ قرآن میں ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (عہد کو پورا کرو)۔ رسولِ خدا نے مشرکین سے جو معاہدہ کیا اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔ دغابازی اور مکاری کو کبھی جائز نہیں سمجھا۔ مشرک و بت پرست سے بھی بے وفائی نہیں کی۔ اب تم مجھ سے چاہتے ہو کہ معاہدہ کرنے کے بعد اس کو توڑ دوں۔"

یہ باتیں امام علیؑ نے ان سے مختلف موقعوں پر کہی تھیں۔ تمام باتوں کی جان یہ فقرہ تھا:

وَاَنْتُمْ مَعَاشِرُ اَخِفَّاءُ الْهَامِ وَسُفَهَاءُ الْاَحْلَامِ

یعنی تم تہی مغز، بے عقل اور نادان لوگ ہو۔ تم میں بڑا عیب یہی ہے کہ ایک دن شدت سے تحکیم کی طرفداری کرتے ہو اور اگلے دن اسے کفر و ارتداد قرار دیتے ہو۔

خوارج کی تاریخ بڑی عجیب اور عبرت انگیز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دینی عقیدے میں جہالت، نادانی اور تعصب کی آمیزش ہو جائے تو پھر کیا گل کھلتے ہیں۔

جب امیرالمومنینؑ کے حکم سے ابن عباس ان لوگوں سے مذاکرات کے لیے گئے تو انہوں نے جو ان کی حالت دیکھی حیران رہ گئے۔

رَأَى مِنْهُمْ جِبَاهًا قَرِحَةً لِطُولِ السُّجُودِ وَأَيْدِيًا كَثَفِنَاتِ الْإِبِلِ عَلَيْهِمْ قُمُصٌ مُرَحَّضَةٌ وَهُمْ مُشَمِّرُونَ

"ان کی پیشانیوں پر سجدے کے گہرے نشانات تھے۔ ان کے ہاتھ اونٹ کے گھٹنوں کی طرح کھردرے تھے۔ ان کے کرتے پھٹے ہوئے تھے اور انہوں نے دامن کمر سے باندھے ہوئے تھے۔"

مورخین نے لکھا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو گناہوں سے بچتے تھے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ زیاد جیسے جابر حکام کے سامنے اپنے عقیدے کا برملا اظہار کرتے تھے۔ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے سخت خلاف تھے۔ ان میں سے بعض قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔ دوسری طرف ان کے عقائد سطحی تھے۔ خلافت کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ کوئی خلیفہ ضرور ہو۔ قرآن موجود ہے۔ لوگوں کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ بعد میں جب انہوں نے دیکھا کہ کسی رئیس اور سربراہ کے بغیر کام نہیں چلتا تو انہوں نے اپنا عقیدہ بدل لیا اور عبداللہ بن وہب راسبی کی بیعت کر لی جو انہی میں سے ایک تھا۔ بوجہ کم عقلی کے یہ اپنے عقائد میں تنگ نظر تھے۔ اکثر خوارج مسلمانوں کے سب فرقوں کو کافر سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔ ان کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے تھے۔ عمل کو جزو ایمان سمجھتے تھے اسی لیے تنگ نظر تھے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر

قرار دیتے تھے اور کہتے تھے ہمارے سوا سب کافر اور جہنمی ہیں۔

درحقیقت خوارج اپنے خیال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اُٹھے تھے۔ جب وہ امام علیؑ کو اپنا ہم خیال بنانے میں مایوس ہو گئے تو وہ پہلی بار کوفہ کے ایک مکان میں اکٹھے ہوئے اور ان میں سے ایک شخص نے سنسنی خیز تقریر کی:

"بخدا جو لوگ خدائے رحمٰن پر یقین رکھتے ہیں اور قرآن کے احکام پر سرِتسلیم خم کرتے ہیں' ان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ امر بالمعروف ' نہی عن المنکر اور اعلانِ حق کے مقابلے میں دنیا کو عزیز رکھیں۔ ہر چند ان باتوں سے کوئی نقصان اور ضرر پہنچے۔ جو لوگ اس دنیا میں نقصان اٹھائیں گے ان کو قیامت میں ان کا صلہ اللہ کی خوشنودی اور جنت کی شکل میں ملے گا۔ لہٰذا بھائیو! آؤ' اس شہر سے جو فساد اور ظلم کا گڑھ ہے' باہر نکلیں اور کسی پہاڑ کے دامن میں یا ایسے شہر میں چلے جائیں جہاں کے لوگ ان گمراہیوں اور بدعتوں میں مبتلا نہ ہوں۔"

امر بالمعروف کی شرائط

شیعہ فقہاء اور سنی فقہاء دونوں نے امر بالمعروف کی کچھ شرائط بیان کی ہیں۔ ان شرائط کی رو سے فقہاء اس کو جائز نہیں سمجھتے کہ ہر کس و ناکس امر بالمعروف کے نام پر دوسروں کو تنگ کرنا شروع کر دے یا مار پیٹ یا خونریزی کا سبب بنے کیونکہ تشدد کے استعمال کے لیے اور بھی سخت شرائط ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دو بنیادی شرطیں ہیں۔

جو ہر حال میں ضروری ہیں۔ خوارج میں ان دو میں سے ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی تھی بلکہ ایک شرط کے تو وہ سرے ہی سے منکر تھے۔

دو شرطیں یہ ہیں:

۱۔ دین کی بصیرت اور ۲۔ عمل کی بصیرت۔

دین کی بصیرت سے یہ مراد ہے کہ دینی امور کے متعلق کافی اور صحیح واقفیت رکھتا ہو۔ حلال اور حرام، واجب اور غیر واجب میں امتیاز کر سکتا ہو۔ ان لوگوں کو یہ بصیرت حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا انہوں نے قرآن کی ایک آیت: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ۔ (سورۂ انعام، آیت ۵۷) (حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں چلتا۔ وہ صحیح بات بتلانے والا اور بہترین فیصلہ کرنے والا ہے) کو اپنی ساری کارروائی کی بنیاد بنالیا تھا اور لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ کو اپنا نعرہ قرار دیا تھا۔ حالانکہ اس آیت کا تحکیم وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ رہی عملی بصیرت تو اس بارے میں فقہاء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں ایک شرط ممکن اثر کے عنوان سے اور ایک شرط مفسدہ مرتب نہ ہونے کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقصد یہ ہے کہ نیکی رواج پائے اور بدی مٹ جائے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہیں ہونا چاہیے جہاں حصول مقصد کا احتمال ہو۔ اگر معلوم ہو کہ مطلوبہ نتیجہ نہیں نکلے گا، تو امر بالمعروف واجب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقصد اصلاح احوال ہے۔ اس لیے یہ عمل وہیں انجام پانا چاہیے جہاں پہلے سے بھی بڑھ کر کوئی اور مفسدہ پیدا نہ ہو۔ ان دونوں شرائط کے لیے بصیرت ضروری ہے۔ جو شخص بصیرت نہیں رکھتا وہ یہ پیش بینی نہیں کر سکتا کہ آیا اس کام کا صحیح نتیجہ نکلے گا یا نہیں

اور یہ کہ کوئی اور بڑی خرابی تو پیدا نہیں ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر امر بالمعروف جاہلانہ طریقے سے کیا جائے تو اس کا نتیجہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اصلاح سے زیادہ فساد ہے۔

دوسرے واجبات کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ ان میں سے کسی کی شرط یہ ہے کہ اگر تمہیں معلوم ہو کہ کچھ فائدے کا احتمال ہے تو اس کو بجالاؤ' ورنہ نہیں' حالانکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے' ہر واجب کے بجالانے میں کوئی فائدہ اور مصلحت ضرور پیش نظر ہے لیکن اس مصلحت کو سمجھنا لوگوں پر نہیں چھوڑا گیا ہے۔ نماز کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ اگر دیکھو کہ کچھ فائدہ ہے تو پڑھو اور اگر دیکھو کہ فائدہ نہیں تو نہ پڑھو۔ روزے کے متعلق بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اگر فائدے کا احتمال ہو تو رکھو اور اگر نہ ہو تو نہ رکھو۔ ہاں روزے کے بارے میں البتہ کہا گیا ہے کہ اگر مضرت کا اندیشہ ہو تو نہ رکھو۔ اسی طرح حج یا زکات یا جہاد کے بارے میں بھی ایسی کوئی قید نہیں۔ امر بالمعروف کے بارے میں البتہ قید ہے کہ یہ دیکھو کہ اس کا کیا اثر اور کیا رد عمل ہوگا اور کیا اس کا بجالانا اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے کہ نہیں۔ اس واجب کو بجالاتے ہوئے ہر شخص کا یہ حق ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ دلیل سے' عقل سے اور بصیرت سے کام لے اور دیکھے کہ اس کام سے فائدہ ہے یا نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جس عمل کا نام ہے یہ محض تعبدی نہیں یعنی ایسا عمل نہیں جس کو محض عبادت سمجھ کر غور و خوض کیے بغیر انجام دیا جائے۔

امر بالمعروف کے بارے میں خوارج کا عقیدہ

خوارج کو چھوڑ کر سب اسلامی فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بصیرت سے کام لینا واجب ہے تعصب اور جمود چونکہ خوارج کی امتیازی خصوصیات تھیں' اس لیے وہ کہتے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر محض تعبدی عمل ہیں۔ ان سے فائدہ ہونے اور نقصان ہونے کے احتمال کی کوئی شرط نہیں اور نہ ان باتوں کا حساب لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک ایسا فرض ہے جو آنکھ بند کر کے انجام دینا چاہیے۔ خوارج اگرچہ جانتے تھے کہ وہ مارے جا رہے ہیں اور ان کا خون بیکار جا رہا ہے لیکن وہ اسی عقیدے کے مطابق بغاوتیں کرتے رہے' دہشت پھیلاتے رہے' پیٹ پھاڑتے رہے۔ عمل کے معاملے میں نہ صرف یہ بصیرت سے بے بہرہ تھے بلکہ جہاں تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق ہے یہ کسی بصیرت کی ضرورت کے قائل بھی نہیں تھے اور اسی وجہ سے یہ عالم اسلام کے لیے زبردست مصیبت بن گئے تھے۔

وہ مصیبتیں جو خوارج نے اسلام کے لیے پیدا کیں

اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو گی کہ علی مرتضیٰؑ خوارج کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی تھا۔ جیسا کہ خود امیرالمومنینؑ نے فرمایا' اسے امیرالمومنینؑ سے کوئی ذاتی دشمنی یا عناد نہیں تھا۔ امیرالمومنینؑ نے اس پر احسانات کیے تھے لیکن وہ جاہل اور گستاخ آدمی تھا اور اپنے عقیدے کی بنا پر یہ سمجھتا تھا کہ علیؑ کافر ہو گئے۔ اور وہ ان تین آدمیوں میں سے ایک ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں فتنہ و فساد پھیلا ہے۔ لہٰذا

محرمیں اس نے دو اور آدمیوں کے ساتھ مل کر یہ طے کیا کہ ایک ہی شب میں ان تینوں یعنی علیؑ، معاویہ اور عمرو بن العاص کو ایک ساتھ ہی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس کام کے لیے انہوں نے سترہ یا انیس رمضان کی رات مقرر کی۔ یہ رات کیوں معین کی؟

ابن ابی الحدید کہتا ہے:

تم کو تعجب ہو گا کہ عقیدے کے تعصب کے ساتھ اگر جہالت شامل ہو جائے تو دونوں مل کر کیا آفت ڈھاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انہوں نے اس رات کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہ ایک مبارک رات اور عبادت کی شب ہے چونکہ وہ اس جرم کو بھی عین عبادت سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اس مبارک رات کا انتخاب کیا۔

لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ ان کا نعرہ بن گیا۔ علیؑ جانتے تھے کہ یہ بیچارے بدبخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اس لیے اس کے باوجود کہ وہ آپ کو تنگ کرتے رہتے تھے آپ نے ان پر سختی روا نہیں رکھی۔ یہاں تک حکم دیا کہ میرے بعد خوارج کو قتل نہ کیا جائے۔

لَا تَقْتُلُوا الْخَوَارِجَ بَعْدِیْ فَلَیْسَ مَنْ طَلَبَ الْحَقَّ فَاَخْطَاَهٗ کَمَنْ طَلَبَ الْبَاطِلَ فَاَدْرَکَهٗ.

یعنی میرے بعد ان کو قتل مت کرنا۔ ان میں اور معاویہ اور اصحاب معاویہ میں فرق ہے۔ یہ حق اور دیانت کے خواہاں ہیں لیکن چونکہ جاہل اور بے تمیز ہیں، اس لیے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس کے برخلاف معاویہ، عمرو بن العاص

اور ان کے ساتھی شروع ہی سے دنیا طلبی میں پڑے ہوئے ہیں' چنانچہ ان کو دنیا مل گئی۔

یہ لوگ عموماً علی علیہ السلام کی تکفیر کرتے تھے لیکن چونکہ یہ جاہل تھے اس لیے علیؑ نے بیت المال سے ان کا وظیفہ تک بند نہیں کیا۔ یہ لوگ عموماً مسجد میں آتے تھے اور ایک طرف بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ حضرت خطبہ پڑھ رہے ہیں اور یہ آوازے کستے تھے: لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ. کبھی کہتے تھے اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ لَا لَكَ يَا عَلِيُّ.

ایک دفعہ علیؑ نماز پڑھا رہے تھے اور قراٴت میں مشغول تھے۔ اس وقت ایک خارجی بھی موجود تھا۔ اس نے یہ آیت پڑھی:

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ.

آپ کو اور آپ سے پہلے جو ہوئے ہیں ان کو بذریعہ وحی بتلا دیا گیا ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے سب عمل بیکار ہو جائیں گے۔

اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ علیؑ تم کافر و مشرک ہو گئے ہو۔ چونکہ حکم ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہو جانا چاہیے' لہٰذا علیؑ خاموش ہو گئے۔ جب اس نے آیت پوری کر لی' آپ نے پھر قراٴت شروع کر دی۔ اس شخص نے دوبارہ یہی آیت پڑھی۔ علیؑ پھر احتراماً خاموش ہو گئے۔ آپ نے پھر تلاوت شروع کی ہی تھی کہ اس نے تیسری بار یہی آیت پڑھی۔ اس دفعہ بھی علیؑ خاموش ہو گئے۔ جیسے ہی اس نے آیت پوری کی' علیؑ نے سورۂ روم کی آخری آیت پڑھی:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۔

آپ صبر سے کام لیں۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور جو یقین نہیں کرتے آپ ان کی باتوں سے مشتعل نہ ہوں۔

اس کے بعد اس شخص نے اپنی آیت نہیں دہرائی اور خاموش ہو گیا۔ خوارج کی سخت گیری نے عجیب خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ کے فقرے سے دلوں پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن ابن ملجم کوفہ آیا۔ دو اور اپنے ہم عقیدہ و ہم مسلک شخص تلاش کیے اور مقررہ رات تینوں نے مسجد میں بسر کی۔ جب اس نے حضرت علیؓ کے سر مبارک پر وار کیا" ایک آواز سنائی دی اور تاریکی میں آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ آواز تھی لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ اور بجلی تھی تلوار کی چمک۔

اسلام میں حقوق انسانی کی بنیاد

آج رمضان کی اکیسویں شب ہے۔ یہ عبادت کی رات بھی ہے اور شہادت کی رات بھی۔ اللہ کے مخلص بندے مولائے متقیان امیرالمومنین علی علیہ السلام کی شبِ شہادت۔ یہ شبِ قدر اور جاگنے کی رات ہے۔ ہم سب کی کامیابی اور خوشحالی کے طلبگار رہیں اور خدائے متعال سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان راتوں میں سب کو عبادت کرنے اور پیمانِ عبودیت کی تجدید کرنے کی توفیق عطا کرے۔

ہم دراصل عدل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جو دین اسلام کا ایک رکن ہے۔ دنیائے اسلام میں اس اصول کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ گو ابتدا میں عدلِ الٰہی کی بحث کی تھی لیکن پھر سلسلہ سماجی انصاف تک جا پہنچا اور بات یہاں تک بڑھی کہ جس انصاف کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ لوگوں کے باہمی تعلقات انصاف اور ایک دوسرے کے حقوق

کی رعایت کی بنیاد پر قائم ہوں اور کوئی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ کرے۔ رہا ان حقوق کی بالذات اور فی الواقع کوئی حقیقت ہے یا نہیں۔ اس سے قطع نظر کہ شارع اسلام نے کیا حکم دیا ہے اور کیا حقوق بیان کیے ہیں، کیا ان حقوق کا اپنا کوئی وجود ہے اور کیا اسلام نے ان ہی حقوق کو بیان کیا ہے اور ان کی ہی وضاحت کی ہے جو واقع میں پہلے سے موجود تھے اور کیا عدل و انصاف کا یہی مطلب ہے کہ لوگوں کے ان حقوق کی رعایت اور حفاظت کی جائے جو فی الواقع ان کے حقوق ہیں یا یہ صورت ہے کہ اگر دینی احکام سے قطع نظر کریں تو حق و انصاف ضروری نہیں رہتے۔ حق و انصاف کا وجود محض دینی احکام کا مرہونِ منت ہے۔ جس چیز کو دین حق و انصاف قرار دے وہی حق و انصاف ہے اور جس بات کو ظلم و زیادتی قرار دے وہی ظلم و زیادتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے عالم ہوتے ہیں جنہوں نے اصلِ عدل کا انکار کیا ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالے کی ذات اپنے تکوینی اور تشریعی نظام میں اس اصول سے بالاتر ہے۔ اس کے افعال اور احکام ہرگز کسی قانون کے پابند نہیں، ان کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے وہی حق و انصاف ہے۔ یہ نہیں کہ وہ وہی کرتا ہے جو حق و انصاف ہو۔ اسی طرح اس کے احکام خود حق و انصاف ہیں۔ یہ نہیں کہ اس کے احکام حق و انصاف کے تابع ہوں۔ اس سے ان علماء نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ نظامِ عالم میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ ناممکن ہو کہ کسی شخص کو کمالِ اطاعت اور نیکوکاری کے باوجود آخرت میں عذاب دیا جائے یا کسی گنہگار کو اس کے سخت گناہوں اور انتہائی سرکشی کے باوجود جنت میں بھیج دیا جائے۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی امر مانع نہیں کہ کچھ لوگ

بغیر کسی وجہ کے اس دنیا کی تمام نعمتوں سے نواز دیے جائیں اور کچھ دوسرے لوگ قطعاً محروم رہیں۔ کیونکہ عدل اور ظلم کوئی حقیقی اور عقلی چیز نہیں بلکہ ان کا وجود حکم شریعت کے تابع ہے۔ شریعت جو حکم دے وہ عین انصاف ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا تھا چونکہ اس سوچ کا ظاہری پہلو یہ تھا کہ شریعت عقل کی تابع اور عقل کے قانون کی پابند نہیں، اس لیے عوام الناس نے اسے ایک طرح سے شریعت کی عظمت اور اس کی اہمیت کا اعتراف سمجھا اور عوام پسند ہونے کی وجہ سے یہ سوچ تیزی سے مقبول ہوئی اور عالم اسلام میں ایک زبردست لہر پیدا ہو گئی۔

بحثِ عدل کا بنیادی نتیجہ

ایک بڑا نتیجہ اس بحث کا یہ ہے کہ پہلے نظریے کی بنا پر کچھ کام واقعی اچھے ہیں اور کچھ برے اور اسلام کے احکام اسی حسن و قبح کے تابع ہیں اور یہ کہ حق و انصاف کا واقعی وجود ہے جس کا اسلام نے باضابطہ اعتراف کیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا اپنا ایک معاشرتی فلسفہ ہے اور اسلام میں کچھ بنیادی حقوق ہیں اور اس بنا پر ہم غور کر سکتے ہیں اور یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ بنیادی حقوق کیا ہیں اور اسلام کے اس ضمن میں کیا اصول ہیں۔ اسلام کس بنیاد پر کسی کو حقدار اور ذی حق تسلیم کرتا ہے اور اس نے کس بنیاد پہ قوانین وضع کیے ہیں۔ اس طرح ہم بہت سی صورتوں میں ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن دوسرے نظریے کے مطابق اسلام کا نہ کوئی معاشرتی فلسفہ ہے اور نہ اسلام میں بنیادی حقوق ہیں اور نہ ان حقوق سے متعلق کوئی

اصول۔ بلکہ یہ نظریہ تو سرے سے ہی بنیادی حقوق کا منکر ہے۔ اس کے مطابق اصل چیز احکامِ الٰہی کی بے چون و چرا تعمیل ہے۔

شیعہ مذہب میں عدل کا اصول

ہم چونکہ شیعہ ہیں' ہمارے نقطۂ نظر سے عدل کا اصول کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ شیعوں کے نزدیک یہ ایک بنیادی اصول ہے اور ضروریاتِ دین میں شامل ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہ فقرہ مشہور ہے کہ:

اَلْعَدْلُ وَالتَّوْحِيْدُ عَلَوِيَّانِ وَالْجَبْرُ وَالتَّشْبِيْهُ اُمَوِيَّانِ. یعنی عدل اور توحید علوی اصول ہیں اور جبر اور تشبیہ اموی۔

عدل کا مطلب وہی ہے جو بیان کیا جا چکا ہے۔ توحید کا مطلب ہے خدا کو اجسام کی تمام صفات سے منزہ سمجھنا اور اس کی ذات اور صفات کو ایک دوسرے سے الگ نہ سمجھنا۔ جبر کے معنی ہیں انسان کو مجبور سمجھنا اور اس کا انکار کرنا کہ وہ اپنے افعال میں مختار ہے۔ چونکہ اختیار عدل ہی کی ایک شاخ ہے اس لیے عدل کی شاخ کے انکار کا مطلب جبر کے عقیدہ کا قائل ہونا ہے۔ تشبیہ[1] سے مراد ہے خدا کو ممکنات کے مشابہ سمجھنا اور ممکنات کی جو صفات ہیں ان میں سے کسی صفت کو یہ سمجھنا کہ یہ خدا کی صفت بھی ہے[2]

---

[1] مثلاً خدا کا شبِ برأت میں پہلے آسمان پر اترنا۔ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے کتب تشیع اور اسلام دینِ حکمت مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی۔

اسلام میں بنیادی حقوق

عدلیہ کے مسلک کے مطابق جن میں شیعہ بھی شامل ہیں بلکہ درحقیقت یہ مسلک شیعوں ہی کا ہے' اسلام میں متعدد بنیادی حقوق ہیں اور اس ضمن میں اسلام کے کچھ اصول ہیں جن کے مطابق اسلامی قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ چونکہ عدل کے معنی ہیں اِعْطَاءُ کُلِّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ ہر حقدار کو اس کا حق پہنچانا' اس لیے آیئے یہ دیکھیں کہ ان اصولوں کے مطابق جو قرآنِ کریم اور پیشوایانِ دین کے اقوال سے مستنبط ہوتے ہیں' اسلام میں بنیادی حقوق کیا ہیں؟ یہ کیسے ہوتا ہے کہ انسان میں اور کسی دوسری چیز میں ایسا تعلق پیدا ہو جائے جس کو حق کہا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس چیز کو متعلقہ شخص سے لے لے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے اس کا حق چھین لیا' اس تعلق کی مُوجد کیا چیز ہے؟

میں نے کہا کہ اس تعلق کی موجد کیا چیز ہے؟ موجد یعنی وجود میں لانے والا۔ بہ الفاظِ دیگر علت اور سبب۔ نظامِ عالم علت و معلول اور سبب و مسبب کا ایک سلسلہ ہے۔ اس موجد یا علت یا سبب کی جو نام بھی اس کا دکھیں دو قسمیں ہیں۔ فاعلی اور غائی یعنی اگر کوئی چیز دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے تو یا تو وہ اس کی فاعلی یعنی کرنے والی ہوتی ہے۔ مثلاً انسان بات کرتا ہے تو یہ بولنے والا اپنے کلام کا فاعل ہے۔ اگر یہ فاعل نہ ہوتا تو اس کے فعل یعنی کلام یا بات کا بھی وجود نہ ہوتا' یا جو چیز کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے وہ اس فعل کی غایت یا اس کا مقصد ہوتی ہے اور فعل اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پھر وہی مثال

لیجیے۔ جب کوئی بات کرتا ہے تو بات کرنے سے اس کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ وہ یا تو کسی سے اپنی بات منوانا چاہتا ہے یا اس کو کسی بات پر آمادہ کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ مقصد اور غرض نہ ہوتی اور ایسا نہ ہوتا کہ بات کرنا اس مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہو تو یہ کلام وجود میں نہ آتا۔ حاصل یہ ہوا کہ جب کوئی بات کرتا ہے تو ایک تو اس بات کا تعلق خود اس شخص سے ہوتا ہے جس کا ذریعہ اور وسیلہ بات ہے۔ اس طرح بات کرنے کے دو سبب ہوئے۔ پہلا سبب فاعلی کہلاتا ہے اور دوسرا سبب غائی۔ اگر ان دونوں میں ایک بھی سبب موجود نہ ہو تو بات کرنے کا عمل وجود میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ دونوں سبب اس عمل کے موجد یعنی اس عمل کو وجود میں لانے والے ہیں۔

جب ہم حق اور ذی حق کی بات کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ بشر مثلاً مادی فلسفے کے مطابق اس بات کے کوئی معنی نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ موجوداتِ عالم کی علتِ غائی انسان ہے اور دنیا کی سب نعمتیں انسان کی خاطر وجود میں آئی ہیں۔ یہ ہم صرف اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں جب ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ تمام قوانینِ فطرت ایک طرح کے شعورِ کلی کے تابع فرمان ہیں اور وہ شعورِ کلی ایک چیز کو دوسری چیز کی خاطر وجود میں لاتا ہے۔ اگر وہ دوسری چیز نہ ہوتی یا اس کی کسی ضرورت کو پورا کرنا مقصود نہ ہوتا تو پہلی چیز بھی وجود میں نہ لائی جاتی۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ منہ میں دانت چبانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ غذا چبا کر اور زیرِ زبان غدود سے جو رطوبت خارج ہوتی ہے اس کے ساتھ مل کر ہضم کا پہلا مرحلہ منہ میں ہی طے کرے لیکن مادی فلسفے کی رو سے کوئی چیز کسی دوسری چیز کی مدد کے لیے پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی موجود دوسرے موجود سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں

کہ دوسرا موجود پہلے موجود کی مدد کے لیے بنایا گیا ہے بلکہ یہ اتفاق ہے کہ دو پہلے موجود کے لیے مفید ہے اور پہلا موجود اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

ہمیں اس وقت اس سلسلے کے تمام نظریوں سے بحث نہیں ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلامی عقائد کے بموجب مجموعی طور پر صورتِ حال کیا ہے۔[1]

حق اور ذی حق کے درمیان تعلقِ غائی

مجموعی طور پر اسلامی عقائد اور انسان کائنات اور زندگی کے متعلق اسلامی طرزِ فکر کے مطابق انسان اور کائنات کی کارآمد چیزوں کے درمیان تعلقِ غائی موجود ہے۔ یعنی انسان اور کائنات کی کارآمد چیزوں کے درمیان تخلیقی نقشہ کے مطابق ایک ایسا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر انسان نہ ہوتا تو کائنات کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور اس کی تخلیق ہی کسی دوسرے طرز پر ہوتی۔ قرآن کریم نے اس کی بار بار تصریح کی ہے کہ دنیا کی سب سے کارآمد چیزیں انسان ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے انسان اور اللہ کی قدرتی نعمتوں کے درمیان اس وقت سے ایک طرح کا تعلق اور رشتہ قائم ہے جب ابھی انسان نے ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونا شروع بھی نہیں کیا تھا اور نہ پیغمبرِ اسلام کے ذریعہ دینی احکام کا اعلان ہوا تھا۔ قرآن کہتا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۹)

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے استاد مطہری کی کتاب "جہان بینی اسلامی" ملاحظہ فرمائیں۔

زمین میں جو کچھ ہے اللہ نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

سورۂ اعراف میں تخلیقِ آدم کے قصّے کی ابتدا میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ.

"بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کے لیے جگہ دی اور تمہارے لیے اس میں سامانِ زندگی پیدا کیا۔ تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔"

یعنی تم جن نعمتوں سے استفادہ کرتے ہو یہ تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کی متعددِ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کی تصریح سے قطع نظر اگر ہم خود نظامِ عالم پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ جمادات اور نباتات میں اور اسی طرح جمادات و نباتات اور حیوانات میں اور پھر جمادات و نباتات و حیوانات اور انسان میں ایک طرح کا تعلقِ غائی موجود ہے۔ اس زمین پر ایک طرف غذائی مواد کا ایک سلسلہ ہے اور دوسری طرف حیوانات کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ وہ صرف اس غذائی مواد پر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر وہ غذائی مواد نہ ہو تو ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ اب کہا یہ جا سکتا ہے کہ کائنات کے مجموعی نظام میں غذائی مواد اور انسانوں اور دوسرے جانداروں کے تغذیہ کے نظام کی ساخت میں کوئی تعلق موجود نہیں اور ان دونوں میں تطابق محض اتفاقی ہے۔ علمائے حیاتیات کہتے ہیں کہ زندہ موجودات کے بارے میں علّتِ غائی کے اصول کا کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ غذائی مواد اور تغذیہ کے نظام میں تعلق اور ربط ضروری ہے خواہ ہم یہ کہیں کہ غذائی

مواد تغذیہ کی ضرورت کے مناسب پیدا کیا گیا ہے، یا یہ کہیں کہ تغذیہ کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ موجود غذائی مواد سے فائدہ اٹھا سکے۔ بہرحال دونوں میں تعلق غائی اور تطابق ضرور ہے۔

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اگر انسان یا حیوانات کو اس کی ضرورت نہ ہوتی تو یہ غذائی مواد موجود نہ ہوتا تو انسان کی بناوٹ کچھ اور ہوتی بہرحال موجودہ تخلیقی نظام سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ غذا سے استفادہ کا حق قانونِ آفرینش نے دیا ہے جس کا وجود قانونِ شریعت سے پہلے سے ہے اور چونکہ دونوں قانون اللہ ہی کی طرف سے ہیں اس لیے اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ بنایا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قانونِ فطرت کچھ اور طرح کا ہو اور قانونِ شریعت کچھ اور طرح کا۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں دونوں قوانین کا ذکر ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ.

"تم اپنا رخ یک سو ہو کر اس دینِ محکم کی طرف رکھو۔ یہ وہ سرشت و فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ قانونِ فطرت تغیر ناپذیر ہے۔" (سورۂ روم۔ آیت ۳۰)

قرآن میں جو کچھ آیا ہے اس سے قطع نظر بھی یہ تخلیقی نظام اس بات کا گواہ ہے کہ انسان اور دنیا کی نعمتیں ایک دوسرے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ذرا اس بچے کو دیکھیے جو بطنِ مادر سے ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔ اس نوزاد کا کیا حال ہے۔ کیا یہ اپنی خوراک خود تلاش کر سکتا ہے؟ یہ کیا کھا سکتا ہے؟

اس کا معدہ کس قسم کی غذا ہضم کر سکتا ہے؟ دوسری طرف یہ دیکھیے کہ کس طرح خداوند عالم نے ماں کے سینے پر غذا کے دو سرچشمے پستانوں کی صورت میں رکھ دیے ہیں۔ جیسے جیسے بچے کی پیدائش کا وقت نزدیک آتا ہے' آہستہ آہستہ حیرت انگیز طور پر بچے کے نظامِ ہضم کے مناسب غذا وہاں بننا شروع ہو جاتی ہے اور جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اس تیار شدہ غذا سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے کی ضرورت اور پستان اور دودھ کی عجیب اور حیرت انگیز بناوٹ میں کوئی تعلق نہیں۔ کیا ماں کے مخصوص طرز کے پستان اور بچے کے ننھے ننھے ہونٹوں کی بناوٹ میں کوئی مناسبت نہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماں کا دودھ بچے ہی کا حق ہے؟

یہ حق کس نے مقرر کیا ہے؟

قانونِ آفرینش نے۔

بچے اور اس کی ماں کے دودھ کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

تعلقِ غائی۔

یعنی یہ دودھ اور اس کے بنانے کا پورا انتظام بچے ہی کی خاطر وجود میں آیا ہے' اس لیے پیدائشی طور پر یہ دودھ بچے کا حق قرار پاتا ہے۔ پستانوں کے غدود سے جو دودھ ٹپکتا ہے وہ بچے ہی کے لیے ٹپکتا ہے کسی اور کے لیے نہیں اور نہ ہی یہ بلاوجہ ٹپکتا ہے۔

حکماء کی ایک اصطلاح ہے۔ وہ اس عالم کی تمام مخلوقات کو طبیعی موجودات سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سات باپ ہیں' چار مائیں اور تین بچے۔ سات باپوں سے ان کی مراد سات آسمان ہیں جن کے قدماء قائل تھے۔ چار ماؤں سے مراد عناصرِ اربعہ ہیں۔ قدماء کا خیال تھا کہ عناصر چار ہیں:

پانی، مٹی، ہوا اور آگ اور تین بچوں سے مراد اس دنیا کے مرکبات ہیں جن کی مجموعی طور پر تین اقسام قرار دی گئی ہیں۔ یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات۔ انسان بھی حیوانات میں شامل ہے۔ باپ، ماں اور بچے کی تعبیر انہوں نے اس لیے اختیار کی تھی کہ ان کا کہنا تھا کہ اجرامِ فلکی عناصرِ اربعہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں مرکبات یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات ظہور میں آتے ہیں اس لیے یہ مرکبات اجرامِ فلکی اور عناصر کے بچے ہوئے۔

جہاں تک مرکبات کا تعلق ہے تو یہ تعبیر بالکل درست ہے کیونکہ عناصر چار ہوں یا سو سے بھی زیادہ اور افلاک کا اس طرح جیسا کہ قدماء نے فرض کیا تھا وجود ہو یا نہ ہو بہر صورت مرکبات زمین، پانی ہوا اور حرارت ہی کے بچے ہیں۔ انسان بھی ان ہی والدین کا فرزندِ ارجمند ہے۔ قدرتی طور پر بچوں کے والدین پر حقوق ہوتے ہیں۔ جس طرح جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، وہاں اس کے لیے انتظام ہوتا ہے اور جب وہ پیدا ہو کر ماں کی گود میں آتا ہے تو وہاں بھی اس کے آرام کا انتظام ہوتا ہے۔ جونہی بچے کی پیدائش کا وقت آتا ہے، پستانوں کی مشینری اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ غدود سے دودھ رِسنا شروع ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ بچے کے لیے ہوتا ہے۔ یہی صورت اس نظامِ عالم کی ہے۔ موسموں کا آنا جانا، بادلوں کا اٹھنا، بارش کا ہونا۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ مادرِ گیتی کے پستانوں کا ترشح ہی تو ہے جو فرزندانِ جہاں کی خاطر ہوتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت ۱۰ میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ

وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کے لیے پانی ملتا ہے اور وہ اس سے تمہارے لیے درخت اگاتا ہے اور ان درختوں کے پتوں سے تم کام لیتے ہو اور اس پانی سے تمہارے لیے کھیتی اور زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو سوچتے اور غور کرتے ہیں۔"

قرآن میں ایسی آیات بکثرت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینی حالات کے تغیر اور انسانی ضروریات کے درمیان ایک تعلق اور ہم آہنگی ہے۔

امام علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لِكُلِّ ذِیْ رَمَقٍ قُوْتٌ وَلِكُلِّ حَبَّةٍ اٰكِلٌ۔

ہر ذی حیات کی روزی مقرر ہے اور ہر دانہ کا کھانے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کھانے والے اور موادِ غذائی کے درمیان ایک فطری تعلق موجود ہے۔ اسلام کے نظریہ جہاں بینی کے مطابق اور اصولی طور پر یہ تعلق حق اور ذی حق کا ہے۔

حق اور ذی حق کے درمیان تعلق فاعلی

تعلق کی ایک اور قسم تعلقِ فاعلی ہے۔ یعنی ذی حق خود اس چیز کو وجود میں لائے جس پر اس کا حق ہے۔ مثلاً کوئی شخص زمین میں درخت بوتا ہے،

اس کی نگہداشت کرتا ہے' اس کو پانی دیتا ہے یہاں تک کہ درخت پھل دینے لگتا ہے۔ اب اس شخص اور پھل کے درمیان فعل اور فاعل کا تعلق ہے کیونکہ وہ پھل اس کی محنت اور کوشش کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔ اگر یہ سرگرم عمل نہ ہوتا تو وہ پھل وجود میں نہ آتا۔ اس تعلق نے اس پھل پر اس کا حق قائم کر دیا۔

تعلقِ غائی سے بالقوہ حق پیدا ہوتا ہے

پہلی قسم کا تعلق یعنی تعلق غائی جو انسان اور اس دنیا کی نعمتوں کے درمیان ہے ایک کلی اور عمومی تعلق ہے اور اس لحاظ سے ان نعمتوں میں کسی کا بلا شرکت غیرے حق پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ سب لوگ خدا کی مخلوق اور اسی آب و گل کے فرزند ہیں اس لیے زمین پر سب کا حق ہے اور چونکہ سب کا حق بالقوہ ہے اس لیے کوئی شخص دوسروں کا مزاحم نہیں ہو سکتا اور نہ ساری زمین کو اپنے لیے مخصوص کر سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ سب اپنا حق کس طرح وصول کر سکتے ہیں' یہ ایک دوسرا مرحلہ ہے۔ یہاں فرض اور حق ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں فرض کی ادائیگی سے بالفعل حق پیدا ہوتا ہے اور اس طرح ہر شخص کو اس کا مخصوص حق مل جاتا ہے۔

اس سلسلے میں میں پہلے قرآن کی ایک آیت پڑھتا ہوں۔ سورۂ ہود میں ہے:

هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ

"وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور تم کو زمین پر آباد کیا۔ پس سرکشی سے باز آجاؤ، توبہ کرو اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرو۔"

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم کو اللہ نے زمین پر پیدا کیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم کو زمین سے پیدا کیا۔ تم کو زمین کے پیٹ سے نکالا۔ گویا اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ زمین تمہاری دوسری ماں ہے۔ پھر کہا گیا کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ تم اس زمین کو آباد کرو۔ یعنی تنہا فرزند زمین ہونا اس کے لیے کافی نہیں کہ تم بالفعل ذی حق ہو جاؤ۔ اس کے لیے کہ تمہارا جداگانہ حق قائم ہو ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے زمین کو آباد کرنا، اس کو کام میں لانا جب تک تم یہ فرض عملاً انجام نہیں دو گے تمہارا جداگانہ حق قائم نہیں ہوگا۔ یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ انسان کو عقل، ارادہ اور اختیار دیا گیا ہے۔ عقل و اختیار کی وجہ سے اس کا دائرہ عمل وسیع ہو گیا ہے۔

عقل و اختیار کے باعث

انسان کے حق کے دو مرحلے

انسان کی زندگی کا نظام دوسرے جانداروں کی زندگی کے نظام سے مختلف ہے۔ جانور اپنی فطرت کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا فرزندِ زمین ہونا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ ان کا حق مسلم ہو جائے لیکن انسان عقل رکھتا ہے، صاحب ارادہ ہے۔ وہ اپنے خداداد حق سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک اپنا فرض پورا نہ کرے۔

البتہ اس وقت تک جب تک وہ اپنے فطری مرحلے میں ہوتا ہے اور اس پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ اس کا بھی حق ثابت اور مسلّم رہتا ہے۔ بچے کو پستانِ مادر پر جو حق ہے، اس کے سلسلے میں کسی فرض کی ادائیگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ماں کے دودھ پر اس کا حق ہے لیکن جب وہ مادرِ گیتی کا دودھ پینا چاہتا ہے تو یہ دودھ اسے خود بخود نہیں مل جاتا، اس کے لیے اسے آبادکاری کے عمل کی ضرورت ہے۔ مادرِ گیتی پر اس کا حق ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری بھی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مادرِ گیتی کا بھی اس پر ایک حق ہے اور وہ ہے زمین کو آباد کرنا اور اس کو کارآمد بنانا۔

زمین کا حق انسان پر

امام علیؑ نے اپنی خلافت کے اوائل ہی میں لوگوں سے کہا تھا:

اِنَّكُمْ مَسْئُوْلُوْنَ حَتّٰى عَنِ الْبِقَاعِ وَالْبَهَائِمِ.

تم پر زمین اور چوپایوں کی بھی ذمہ داری ہے۔ تم پر اللہ اور اس کے بندوں ہی کا حق نہیں بلکہ حیوانات اور زمین کا بھی حق ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ بوجھ اٹھانے والے جانور کو تم اپنی ملکیت سمجھ کر اس سے جیسا چاہو سلوک کر سکتے ہو۔ تم اس پر جتنا چاہے بوجھ نہیں لاد سکتے۔ یہ نہیں کر سکتے کہ اگر دل چاہے تو گھاس دانہ دو اور نہ دل چاہے تو نہ دو۔ اگر وہ پیاسا ہے تو رہے اور بھوکا رہے تو رہے۔ اگر زخمی ہو تو ہوا کرے۔ گویا جانور کو کھلانا پلانا اور اس کی جان کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے اس کے علاوہ تم ان زمینوں

کے بھی ذمہ دار ہو۔ ان کو ویران مت چھوڑو، ان کو آباد کرو۔ یہی خداوند متعال کا حکم ہے۔

مالکِ اشتر کے نام اپنے مشہور فرمان کے سرنامہ میں امام علیؑ نے لکھا تھا:

هٰذَا مَا اَمَرَ بِهٖ عَبْدُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَالِكَ بْنَ الْحَارِثِ الْاَشْتَرَ فِيْ عَهْدِهٖ اِلَيْهِ حِيْنَ وَلَّاهُ مِصْرَ جِبَايَةَ خَرَاجِهَا وَجِهَادَ عَدُوِّهَا وَاسْتِصْلَاحَ اَهْلِهَا وَعِمَارَةَ بِلَادِهَا.

یہ ہدایت نامہ بندۂ خدا علی امیرالمومنین نے مالک بن الحارث المعروف بہ اشتر کے نام اس وقت جاری کیا جب مالک کو مصر کا والی مقرر کیا اور مالیہ کی وصولی، دشمنوں سے جہاد، اہلِ مصر کی صلاح و فلاح اور اس علاقے کی آبادکاری کا کام ان کو تفویض کیا۔

حق اور فرض لازم و ملزوم ہیں

حق اور فرض کے ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہونے کے بارے میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

لَا يَجْرِيْ لِاَحَدٍ اِلَّا جَرٰى عَلَيْهِ وَلَا يَجْرِيْ عَلَيْهِ اِلَّا جَرٰى لَهٗ.

”جس کا کچھ حق ہے، اس کے ذمہ کچھ فرض بھی ہے اور جس کے ذمہ کچھ فرض ہے اس کا کچھ حق بھی ہے۔“

یعنی فرض اور حق ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی کا

حق ہے تو اس حق کے ساتھ فرض بھی ہے۔

رسولِ خدا نے فرمایا ہے:

مَلْعُوْنٌ مَنْ اَلْقٰی كَلَّهٗ عَلَى النَّاسِ.

"وہ شخص خدا کی رحمت سے دور اور لعنتی ہے جو اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالتا ہے۔"

یعنی حقوق سے تو استفادہ کرتا ہے مگر اپنا فرض انجام نہیں دیتا۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ کرتا ہوں جس سے گزشتہ مضامین کی تائید ہوتی ہے اور ضمناً ایک شبہ کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو ممکن ہے پیش آ سکے۔

کمزوروں کا حق

یہ درست ہے کہ اسلام میں غریبوں، اپاہجوں اور کمزوروں کا حق دوسروں کے مال میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ.

"رشتہ داروں، غریبوں اور مجبور مسافروں کا حق ادا کرو۔"

سورۂ معارج میں ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.

مومنین کے مال میں سوال کرنے والے اور محروم دونوں کا مقررہ حق ہے۔

وہ کمزور، ناچار اور غریب جو روزی کمانے پر قادر نہیں یا ان کی کمائی ان کے گزارے کے لیے کافی نہیں ہوتی وہ اپنی طاقت سے زیادہ محنت کرنے کے مکلف نہیں۔ گو وہ روزی پیدا نہیں کرتے اور اپنا معاشرتی فرض

انجام نہیں دیتے، پھر بھی ان کو محروم نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ اس تعلقِ غائی کی بنا پر جو ان کے اور اس دنیا کے ساز و سامان کے مابین ہے۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا جو دستر خوان بچھا ہوا ہے وہ ان کے لیے بھی ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ۔

یعنی اللہ نے یہ زمین سب لوگوں کے لیے (نہ کہ بعض کے لیے) بنائی ہے۔ اگر وہ اپنا فرض انجام دے سکتے اور پھر انجام نہ دیتے، جب تو ان کی سزا یہ ہوتی کہ وہ محروم رہتے لیکن اب جبکہ ان میں یہ طاقت نہیں تو ان کا اصل حق اپنی جگہ باقی ہے۔ ضعیفوں، غریبوں اور مجبوروں کا حق دولتمندوں کے اموال میں ہے۔

ایک بنیادی فرق

وہ سماجی فلسفہ جو مادی اصولوں پر مبنی ہے اس میں اور اسلامی حقوق میں جن کی بنیاد علت غائی پر ہے، یہی فرق ہے کہ اسلامی حقوق کے جو اصول ہیں ان کے مطابق محتاج ذی حق ہیں لیکن لامذہبی اصول کے مطابق حق صرف پیداواری کام، محنت اور صنعت سے پیدا ہوتا ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں امام علیؑ کا ایک فقرہ نقل کیا تھا جس میں انسان اور مواد غذائی کے درمیان تعلقِ غائی کا بیان تھا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ:

لِكُلِّ ذِيْ رَمَقٍ قُوْتٌ وَلِكُلِّ حَبَّةٍ اٰكِلٌ۔

ہر ذی حیات کے لیے روزی مقرر ہے اور ہر دانے کا کھانے والا ہے۔

میں آپ ہی کا ایک اور فقرہ نقل کرتا ہوں جو حق اور حقدار کے درمیان تعلق فاصل کے بارے میں ہے۔

ایک شیعہ امام کے پاس آیا اور اس نے فئے اور مالِ غنیمت میں سے جو مسلمان سپاہیوں نے لڑ کر حاصل کیا تھا کچھ طلب کیا۔

امام نے جواب میں فرمایا کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ اگر تم بھی ان کے ساتھ تھے اور تم نے بھی جنگ کی صعوبت اٹھائی ہے تو تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو اور تمہارا بھی حق ہے۔

وَ اِلَّا فَجَنَاةُ اَیْدِیْهِمْ لَا تَكُوْنُ لِغَیْرِ اَفْوَاهِهِمْ۔

ورنہ جو انہوں نے اپنے دست و بازو سے حاصل کیا ہے

وہ کسی دوسرے کے منہ میں نہیں جا سکتا۔

یعنی جو تکلیف اٹھا کر اور محنت کر کے کچھ حاصل کرے گا وہ اسی کا مال ہو گا۔ اس کا کسی دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے کوئی معنی نہیں کہ تکلیف تو اٹھائیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔

معاشرے کا حق

اسلام میں حق کا احترام کیا جاتا ہے۔ حقوق العباد کا خاص خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ انصاف کو غیر معمولی تقدس حاصل ہے۔ حقوق میں خیانت خصوصاً عوام کے حقوق میں اسلام کی نظر میں بدترین خیانت ہے۔

امام علیؑ نے فرمایا ہے:

اَعْظَمُ الْخِیَانَةِ خِیَانَةُ الْاُمَّةِ وَ اَفْظَعُ الْغِشِّ غِشُّ الْاَئِمَّةِ۔

سب سے بڑی خیانت قوم کے ساتھ خیانت کرنا ہے اور بدترین دغابازی مسلمان زعماً کو دھوکا دینا ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی مسلمانوں ہی کے ساتھ خیانت کے مترادف ہے۔

اسلام بہت کم مدت میں اور بڑی تیزی کے ساتھ دنیا میں پھیل گیا کیا اس کی وجہ صرف اس کے سادہ اخلاقی احکام تھے؟ اگر اسلام معاشرتی اصلاحات کی طرف توجہ مبذول نہ کرتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ صرف اپنے اخلاقی احکام کی بنا پر کامیابی حاصل کر سکتا۔ اسلام انصاف، حق، آزادی اور مساوات کا علمبردار اور بیجا فرق و امتیاز کا مخالف تھا۔ ان ہی اصولوں کی بنا پر اس نے ایک نئی دنیا بسائی اور ان ہی اصولوں کے درہم برہم ہو جانے سے اسے نقصان پہنچا۔

اسلام میں حقوق کی بڑی اہمیت ہے۔ انصاف جو حقوق کی حفاظت کا دوسرا نام ہے۔ اسلام میں ایک مقدس فریضہ ہے۔ حقوق اور انصاف کا احترام ہی اسلامی تحریک کی ترقی اور کامیابی کی وجہ تھی۔ اسلام میں حقوق پہلے سے طے شدہ ہیں اور ان ہی کی بنیاد پر ایسے قواعد و ضوابط وضع کیے گئے ہیں جو اس مذہب کی انتہائی باریک بینی کے آئینہ دار ہیں۔ ماں، باپ اور استاد وغیرہ کے حقوق کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو بجائے خود بڑی لطیف اور دقیق ہیں۔

ہمسفر کا حق

اپنے عہد خلافت میں ایک روز امام علیؑ کسی کام سے شہر کوفہ سے جو دارالخلافہ تھا باہر تشریف لے گئے۔ حسب معمول ان کے ساتھ

کوئی محافظ دستہ نہیں تھا۔ اس روز بھی سادگی سے تنہا ہی گئے تھے۔ واپسی میں اتفاقاً اہل کتاب میں سے کسی شخص کا ساتھ ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ عیسائی تھا یا یہودی یا پارسی۔ وہ شخص امام علیؑ کو پہچانتا نہیں تھا۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہاں جا رہے ہو تو معلوم ہوا کہ دونوں کے راستے کا بڑا حصہ ایک ہی ہے۔ دونوں نے طے کیا کہ اکٹھے چلیں گے۔ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک دوراہے پر پہنچے جہاں سے کوفہ کا راستہ اس کتابی کی منزل سے جدا ہوتا تھا۔ وہ شخص اپنے راستے پر چل پڑا۔ امام علیؑ بھی کوفہ جانے والی سڑک کو چھوڑ کر اپنے ہمسفر کے ساتھ ہو لیے۔ اس نے کہا:

تم نے تو کہا تھا کہ میں کوفہ جا رہا ہوں۔

آپ نے فرمایا: تو پھر کیا؟

اس نے کہا: تو پھر اس راستے پر کیوں نہیں جاتے؟

آپ نے فرمایا: ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہا ہے کہ جب دو آدمی اکٹھے سفر کریں تو ایک کا دوسرے پر حق ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس سفر میں ہمارا تمہارا ساتھ رہا ہے اس لیے تمہارا مجھ پر حق ہو گیا۔ اس حق کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ کچھ دور تک تمہاری مشایعت کروں۔

وہ شخص سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر اٹھا کر کہا: یہ تمہارے پیغمبر کے اعلیٰ اخلاق ہی کی وجہ ہے کہ اسلام اس تیزی سے پھیل گیا ہے۔

وہ آدمی اس وقت امام علیؑ کو پہچانتا نہیں تھا۔ ایک دن وہ کوفہ آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ امیر المومنین مسندِ خلافت پر متمکن ہیں۔ جب اسے خیال آیا کہ اس دن اس کے ہمسفر خلیفۂ وقت علی بن ابی طالبؑ تھے وہ فوراً اسلام لے آیا اور امام علیؑ کے اصحاب میں شامل ہو گیا۔

علیؑ۔ انصاف کا دوسرا نام

بعد میں خود امام علیؑ کا نام ہی انصاف کے مترادف ہو گیا۔ عمر بن عبدالعزیز کہتے تھے کہ علیؑ نے اگلوں کو بھلا دیا اور بعد میں آنے والوں کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ ان کی سیرت اور ان کا طریقہ دوسرے خلفا پر نکتہ چینی اور ان کی مخالفت کا سبب بن گیا۔

ایک سال معاویہ حج کو گئے۔ وہاں ایک عورت کے متعلق دریافت کیا جو علیؑ کی طرفدار اور معاویہ کی دشمنی کے لیے مشہور تھی۔ معلوم ہوا کہ زندہ ہے۔ اس کو بلوا کر پوچھا: جانتی ہو میں نے تجھے کیوں بلایا؟ میں نے اس لیے بلوایا ہے کہ تجھ سے یہ پوچھوں کہ تو علیؑ کو کیوں دوست اور مجھے دشمن سمجھتی ہے؟

اس نے کہا بہتر ہے کہ اس بارے میں بات ہی نہ کرو۔

معاویہ نے کہا: نہیں، تجھے جواب ضرور دینا ہو گا۔

اس پر عورت نے کہا: وجہ یہ ہے کہ وہ عادل اور مساوات کے حامی تھے۔ تم ان سے بلاوجہ لڑتے رہے۔ میں علیؑ کو اس لیے پسند کرتی ہوں کہ وہ فقیر دوست تھے۔ تم کو اس لیے دشمن سمجھتی ہوں کہ تم نے ناحق خونریزی کی اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی۔ تم ظالمانہ فیصلے کرتے ہو اور اپنی من مانی چلاتے ہو۔

معاویہ کو اس پر غصہ آ گیا اور دونوں میں تند و تلخ گفتگو ہوئی۔ آخر غصے کو ضبط کر کے اپنی عادت کے مطابق خفا ہوتے ہوئے پوچھا کہ تو نے کبھی علیؑ کو دیکھا ہے؟

اس نے کہا: ہاں دیکھا ہے۔

معاویہ نے پوچھا پھر کیسا پایا؟

اس نے کہا بخدا میں نے یہ دیکھا کہ وہ حکومت اور سلطنت' جس نے تم کو اپنا فریفتہ بنا کر غافل کر دیا ہے ان کو غافل نہ کر سکی۔

معاویہ نے پوچھا کہ کبھی علیؑ کو بات کرتے ہوئے سنا؟

اس عورت نے کہا کہ ہاں سنا ہے۔ ان کی باتوں سے دل کا میل اس طرح کٹ جاتا تھا جیسے زیتون کے تیل سے زنگ دور ہو جاتا ہے۔

معاویہ نے کہا: کچھ ضرورت ہو تو بتلاؤ۔

اس نے کہا: میں جو مانگوں گی وہ دو گے؟

معاویہ نے کہا ضرور دوں گا۔

اس نے کہا: اچھا تو سو سرخ اونٹ دیدو۔

معاویہ نے کہا: پھر تو میں تیری نظر میں علیؑ کے برابر ہو جاؤں گا۔

اس نے کہا کبھی نہیں۔

معاویہ نے حکم دیا ایک سو اونٹ جیسے اس نے مانگے تھے' اسے دے دیے جائیں۔ پھر اس سے کہا کہ بخدا اگر علیؑ زندہ ہوتے تو ان میں سے ایک بھی تجھے نہ دیتے۔

اس نے جواب دیا: خدا کی قسم وہ تو ان کا ایک بال بھی نہ دیتے' کیونکہ یہ عام مسلمانوں کا مال ہے۔

عدی بن حاتم طائی کبار صحابہ میں سے تھے اور مولائے متقیان کے عاشق زار تھے۔ رسول خدا کی آخری عمر میں اسلام لائے تھے مگر اسلام پر پختہ تھے۔ علیؑ کے زمانۂ خلافت میں آپ کی خدمت میں تھے۔ عدی

کے تین بیٹے طرفہ، طریف، طارف، آپ کی ہمرکابی میں صفین میں شہید ہو گئے۔ امام علیؑ کی شہادت کے بعد جب معاویہ کی خلافت جم گئی تو ایسا اتفاق ہوا کہ یہ ایک دن معاویہ کے پاس پہنچ گئے۔ معاویہ نے یہ سوچ کر کہ اگر عدی کو بیٹوں کی یاد دلا کر ان کے غم کو تازہ کروں تو ممکن ہے وہ علیؑ کے بارے میں میری خواہش کے مطابق اظہار رائے کریں۔ عدی سے کہا:

تمہارے بیٹے طرفہ، طریف اور طارف کیا ہوئے؟

عدی نے بڑے اطمینان اور متانت سے جواب دیا: انہوں نے صفین میں علی بن ابی طالب پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ عدی نے یہ الفاظ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے تھے کہ وہ بیٹوں کی شہادت پر خوش ہیں اور ان کو اس پر فخر ہے۔

معاویہ نے کہا: مَا اَنْصَفَكَ ابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اِذْ قَدَّمَ بَنِيْكَ وَاَخَّرَ بَنِيْهِ علیؑ نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تمہارے بیٹوں کو آگے کر دیا اور اپنے بیٹوں کو پیچھے رکھا۔

عدی نے کہا: بَلْ اَنَا مَا اَنْصَفْتُ عَلِيًّا اِذْ قُتِلَ وَبَقِيْتُ میں نے علیؑ سے انصاف نہیں کیا۔ وہ تو مارے گئے اور میں زندہ ہوں۔

معاویہ نے یہ دیکھ کر کہ میرا حربہ کامیاب نہیں ہو رہا، بات بدل کر کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ علیؑ کیسے آدمی تھے؟

عدی نے کہا: مجھے تو معاف ہی رکھو۔

معاویہ نے کہا: یہ تو ممکن نہیں۔

اس پر عدی نے حضرت علیؑ کے یہ اوصاف بیان کیے۔ انہوں نے کہا: بخدا علیؑ بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ طاقتور تھے۔ انصاف کی بات

کرتے تھے اور نپا تلا فیصلہ دیتے تھے۔ علم و حکمت کا سرچشمہ تھے۔ دنیا کی چمک دمک سے متنفر اور شب کی تنہائی سے مانوس تھے۔ اکثر غور و فکر کرتے رہتے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے تھے۔ فقیرانہ زندگی کو پسند کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ اس طرح رہتے گویا ہمیں میں سے ایک تھے۔ جب ہم ان سے کوئی درخواست کرتے اسے شرف قبولیت بخشتے۔ جب ہم ان کے پاس جاتے ہمیں اپنے نزدیک جگہ دیتے۔ اگرچہ وہ ہم سے الگ تھلگ نہیں رہتے تھے، اس کے باوجود ان کی ہیبت ایسی تھی کہ ہمیں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا مشکل تھا۔ جب وہ مسکراتے تھے ان کے دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے تھے۔ اہل دیانت اور اہل تقویٰ کا احترام کرتے تھے اور غریبوں محتاجوں کے ساتھ مہر و محبت سے پیش آتے تھے۔ نہ طاقتور کو ان کے ظلم کا اندیشہ تھا اور نہ کمزور کو ان کے انصاف سے مایوسی۔ بخدا ایک رات میں نے خود دیکھا محراب عبادت میں کھڑے تھے۔ ہر طرف رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ مارگزیدہ کی طرح تڑپ رہے تھے اور مصیبت زدہ کی طرح رو رہے تھے۔ اس وقت بھی گویا میں ان کی آواز سن رہا ہوں۔ کہہ رہے تھے:

دنیا تو کیا میرے منہ لگتی ہے۔ جا اور کسی اور کو فریب دے۔ میں تجھ کو تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ اب رجوع کا سوال نہیں۔ تیری لذت تھوڑی ہے اور اہمیت کم۔ آہ! زادِ راہ قلیل ہے اور سفر طویل۔ ساتھی کوئی نہیں۔

عدی کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ انہوں نے دیکھا کہ معاویہ کے آنسو بہنے لگے فَجَعَلَ یَنْشِفُهَا بِكُمِّهٖ۔ اپنی آستین سے آنسو پونچھنے شروع کیے۔ پھر کہا:

خدا علیؑ پر رحمت کرے، واقعی وہ ایسے ہی تھے۔ اب یہ بتاؤ کہ ان کی جدائی میں تمہارا کیا حال ہے؟

عدی نے کہا: میرا حال اس عورت کا سا ہے جس کے بچے کا اس کی گود میں سر کاٹ دیا جائے۔

معاویہ نے کہا: ان کو کبھی بھولو گے نہیں؟

عدی نے جواب دیا: زمانہ کہاں بھولنے دیتا ہے۔

شیخ مفید "الارشاد" میں لکھتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے بعد امیر المومنینؑ کی امامت کی مدت تیس سال تھی۔ اس میں سے فقط پانچ سال چھ ماہ خلافت کا انتظام آپ کے پاس رہا۔ اس مدت میں بھی کم و بیش اہل نفاق اور کچھ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ جنگ جاری رہی۔ آخر میں شیخ مفید کہتے ہیں کہ امیر المومنینؑ کی شہادت رمضان کی اکیس تاریخ کو شب جمعہ میں طلوع فجر کے قریب ہوئی۔ آپ نے ابن ملجم مرادی کی تلوار کی ضربت کے نتیجہ میں شہادت پائی۔

"الکافی" میں امیر المومنینؑ کی مشہور وصیت مفصل مذکور ہے۔

یہ وصیت آپ نے اپنے فرزندوں کو، اپنے اصحاب کو اور ان سب لوگوں کو کی تھی جن تک یہ روزِ قیامت تک پہنچ سکے۔ اس وصیت کے آخر میں آپ نے فرمایا تھا:

حَفِظَكُمُ اللّٰهُ مِنْ اَهْلِ بَيْتٍ وَحَفِظَ فِيْكُمْ نَبِيَّكُمْ

یعنی خدا تم اہلِ بیت کو محفوظ رکھے اس لیے کہ نبی کا احترام تمہاری ہی حفاظت اور احترام سے وابستہ ہے۔

اَسْتَوْدِعُكُمُ اللّٰهَ

میں تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

"اغانی" میں لکھا ہے کہ اس کے بعد آپ کی زبان پر کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ آپ کی روح عالمِ بالا کو پرواز کر گئی۔ صَلَوٰتُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّاہِرِیۡنَ۔

رعایت حقوق اور دنیا کی بے وقعتی

اسلام میں دھوکا دہی اور ظلم و زیادتی کے بارے میں جو قانون ہیں، انصاف کے جو قاعدے مقرر ہیں، حکمرانوں، انتظامی عہدہ داروں اور قاضیوں کے جو فرائض معین کیے گئے ہیں، گواہوں کے بارے میں جو ضابطے مقرر کیے گئے ہیں، اسی طرح جو دوسرے قاعدے قانون ہیں ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین میں لوگوں کے حقوق کی کس قدر اہمیت ہے اور ان کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال اور شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ ایک طرف تو اسلام میں حقوق کی ادائیگی پہ اس قدر زور دیا جاتا ہے اور دوسری طرف جیسا کہ معلوم ہے، اسلام کے اصولوں کی بنیاد دنیا اور متاع دنیا کو حقیر سمجھنے پر ہے۔ لوگوں کے جو حقوق ایک دوسرے پر ہیں۔ ان کا تعلق بھی تو دنیاوی معاملات ہی سے ہے مثلاً یہی کہ کسی کا مال خورد برد نہ کرو۔

اگر کسی کی نظر میں کسی چیز کی قدر و قیمت نہیں ہوگی تو اس سے متعلقہ امور کی بھی وقعت نہیں ہو سکتی۔ پس جب دنیا اور دنیاوی زندگی کی اسلام کی نظر میں وقعت نہیں تو اس زندگی سے متعلق حقوق کی بھی اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔

ذاتی وقعت اور اضافی وقعت

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دین کی نظر میں جو دنیا کی وقعت نہیں ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ اس طرح کے بہت سے شبہات اور سوالات اسی بات کے واضح نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسی چیز کی وقعت ہونے نہ ہونے کو خود اس چیز کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر چیز کی وقعت ہے۔ یعنی ہر چیز خود اپنے لیے اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ ہر چیز کا اپنا ایک وجود ہے اور بقول فلاسفہ وجود خیر کے مساوی ہے لیکن اگر کسی چیز کو خود اس کی نظر سے نہیں بلکہ اس نظر سے دیکھا جائے کہ کسی دوسری چیز سے اس کا کیا تعلق ہے اور دوسری چیز کے وجود پر اس کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے تو یہ ممکن ہے کہ دوسری چیز کی نسبت سے یہ چیز بے وقعت ہو۔ اس دوسری چیز کو اس سے کوئی فائدہ یا نقصان نہ پہنچتا ہو لیکن اگر اس چیز کا دوسری چیز پر کوئی مثبت اثر پڑتا ہے تو ہم کہیں گے یہ چیز اس کے لیے باوقعت ہے۔ یہ اضافی وقعت ہے۔ ایک چیز کی دوسری چیز کے لیے وقعت بھی دو طرح کی ہے۔ بعض دفعہ کسی چیز کی الگ سے اہمیت دیکھی جاتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ انسان کے لیے روپیہ کی اہمیت ہے اور بعض دفعہ ایک چیز کی اہمیت کا دوسری چیز کی اہمیت سے مقابلہ کرتے ہیں مثلاً انسان

کے لیے صحت یا علم یا اخلاق کے مقابلے میں روپیہ کی کوئی اہمیت نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ایک مشتِ خاک یا ایک پتھر یا ایک مٹھی کی انسان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں اس لیے کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی بے وقعت چیز کے حق کی بھی کوئی اہمیت نہیں لیکن روپیہ کی اہمیت ہے کیونکہ یہ انسان کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس سے بہت سے کام نکلتے ہیں لیکن یہی روپیہ صحت، شرافت اور خودداری کے مقابلے میں اپنی وقعت کھو دیتا ہے۔ صرف اس کی وقعت کم ہی نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ روپیہ کتنا بھی ہو تھوڑی سی شرافت سے بھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ کسی شخص کو روپیہ کتنا بھی عزیز ہو لیکن اگر اس کی طبیعت میں شرافت اور خودداری ہے تو وہ روپیہ حاصل کرنے کی صرف اسی حد تک کوشش کرے گا۔ جہاں تک اس کی شرافت، عزت اور آبرو پر حرف نہ آئے۔ جہاں شرافت اور خودداری کو ٹھیس لگنے کا احتمال پیدا ہوا وہ روپیہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ اس کو ساری دنیا کی دولت بھی دے دی جائے تو وہ عزتِ نفس گنوا کر اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اس شخص کی نظر میں روپیہ کی وقعت ہے لیکن آبرو اور شرافت کے مقابلے میں نہیں۔ ایسا موقع آئے تو پھر روپیہ کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ نہیں کہ تھوڑا روپیہ عزت و آبرو کی برابری نہیں کر سکتا اور زیادہ کر سکتا ہے۔ نہ زیادہ کر سکتا ہے نہ کم۔

امام علیؑ اپنے اور اپنے جذبات کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وَاللّٰهِ لَوْ اُعْطِیْتُ الْاَقَالِیْمَ السَّبْعَةَ بِمَا تَحْتَ اَفْلَاکِهَا

عَلٰی اَنْ اَعْصِیَ اللّٰہَ فِیْ نَمْلَۃٍ اَسْلُبُہَا جُلْبَ شَعِیْرَۃٍ مَا فَعَلْتُہٗ۔

خدا کی قسم اگر مجھے ہفت اقلیم زیرِ قبۂ آسمان جو کچھ ہے اس سمیت دے دی جائیں اس شرط پر کہ میں ایک چیونٹی پر ظلم کرکے اس سے ایک جو کا چھلکا چھین لوں تو ہرگز میں ایسا نہیں کروں گا۔

یعنی تمام دنیا کی بھی میری نظر میں اتنی وقعت نہیں کہ میں اس کے لیے ایک چیونٹی پر ظلم کروں۔

امام علیؑ نے اس جملہ میں دنیا اور دنیا کی حکومت کی قدر و قیمت کو نہیں گھٹایا بلکہ حق و انصاف کی قدر و قیمت کو بڑھایا ہے۔ وہ یہ کہنا نہیں چاہتے کہ آسمان کے نیچے جو کچھ ہے چونکہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اس لیے ایک چیونٹی پر بھی اس کے لیے ظلم کرنا گوارا نہیں کروں گا بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ظلم اتنی بری چیز ہے کہ تمام دنیا کی حکومت کے لیے بھی کسی معمولی سے معمولی شخص پر ظلم نہیں کیا جا سکتا یہاں تک کہ ایک چیونٹی پر بھی نہیں۔

سعدی نے اسی مضمون کو اس شعر میں یوں پیش کیا:

دنیا نیرزد آں کہ پریشاں کنی دلے
زنہار بد مکن کہ نکردہ است عاقلے

سعدی بھی یہ کہنا نہیں چاہتے کہ دنیا اس قدر بے وقعت ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ اس کے لیے کسی کا ذرا بھی دل دکھایا جائے جو ایک

معمولی بات ہے بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دل دکھانا اتنی بُری بات ہے کہ اس کے بدلے میں ساری دنیا بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ یہ مطلب ہے متفق علیہ بے وقعتی کا۔

دین کی نظر میں جو دنیا کی وقعت نہیں، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ دین کے مقابلے میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ دنیا کی وقعت اتنی نہیں کہ تم اس کے لیے اخلاقی اور معاشرتی اصول قربان کر دو اور انسانیت اور شرافت سے ہاتھ دھو لو۔ دنیاوی اور مادی فائدہ کے لیے جھوٹ بولو، دھوکا دو، وعدہ خلافی کرو، ظلم کرو، دوسروں کے حقوق پامال کرو، دنیا کے لالچ میں کسی کا دل دکھاؤ یا حتیٰ کہ کسی چیونٹی کا حق بھی اس سے چھینو۔

انسانی منطق

یہ منطق بہت خوب اور نہایت بلند ہے لیکن یہ غلط ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ دین نے یہ کہا ہے کہ دنیا اتنی حقیر ہے کہ اس کے لیے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، خیانت اور ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ بات کو کہنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دین اصول، حقوق، عقیدے اور ایمان کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ ان کی خاطر دنیا و مافیہا کو قربان کر دینا چاہیے۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر ہمیں انسان، انسانیت اور روحانی اقدار کا احساس ہو تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دنیا بھر میں جو لوگ مادی مسلک رکھتے ہیں، وہ بھی مجبور ہیں کہ اصول اور حقوق کو اہمیت دیں اور مادی منفعت اور دنیاوی لالچ کو عقیدہ و مسلک اور اصول و حقوق کے مقابلے میں کمتر سمجھیں۔ اسی بات کو دین کی زبان میں جس کی اپنی زبان

ے اس طرح تعبیر کیا جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف دینی اصولوں ہی کے ذریعے سے انسان کو یہ باور کرایا جا سکتا ہے کہ عقیدہ و مسلک اور اصول کا درجہ دنیاوی فائدے سے بڑھ کر ہے۔ اگر ہم انسان سے دینی اصول لے لیں تو پھر اس حقیقت کے لیے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی کہ انسانیت دنیاوی منفعت سے بالاتر ہے۔

اگر فی نفسہٖ دیکھا جائے تو اس سے قطع نظر کہ ہم دنیا کمانے کی خاطر گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، حقوق کو پامال کرتے ہیں، دنیا کی ہمارے لیے بڑی اہمیت اور وقعت ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ۔ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

امیرالمومنینؑ کے الفاظ میں دنیا مَسْجِدُ اَحِبَّآءِ اللّٰہِ وَ مُصَلّٰی مَلَآئِکَۃِ اللّٰہِ وَ مَھْبِطُ وَحْیِ اللّٰہِ وَ مَتْجَرُ اَوْلِیَآءِ اللّٰہِ ہے۔ یعنی خدا کی عبادت کا مرکز ہے۔ نزولِ وحیِ الٰہی کی جگہ ہے، اولیاء اللہ کے کاروبار کا میدان ہے۔

ایسی جگہ کو بے فائدہ اور بے حقیقت تو نہیں کہا جا سکتا۔

مذہب نے اپنے اس طرزِ فکر سے دنیا کی قدر جو واقعی ہے اور جس کو سب سمجھتے ہیں کم نہیں کی بلکہ روحانیت، تقویٰ، فضیلت اور معاشرتی حقوق جن کی قدر و قیمت کو کم لوگ ہی سمجھتے ہیں ان کی اہمیت بتلائی ہے اور ان کی قدر بڑھائی ہے۔ لہٰذا اگر دنیا حقیر ہے تو صرف مقابلتہً اور یہ بات دنیاوی زندگی سے متعلق حقوق کی اہمیت کے منافی نہیں بلکہ یہ تو ان حقوق کی اہمیت کا اعتراف ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حقوق کے متعلق اسلام میں جو پختہ احکام موجود ہیں وہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر دنیا حقیر ہے تو صرف مقابلۃً۔

اجتماعی منطق

اسی سوال کا ایک اور جواب یہ دینا چاہوں گا کہ کیا اسلام نہیں چاہتا کہ اسلامی معاشرہ باقی رہے؟ ظاہر ہے کہ چاہتا ہے۔ اب اگر اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ باقی رہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی معاشرے میں نہ انصاف ہو اور نہ عوام کے حقوق کی حفاظت اور وہ پھر بھی باقی رہ جائے؟ کیا ہمارے عظیم پیغمبرؐ نے نہیں فرمایا:

اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ۔

اگر معاشرے میں انصاف اور توازن ہے تو لوگ اگر کافر بھی ہوں تو وہ معاشرہ باقی رہ سکتا ہے لیکن اگر ظلم و ستم ہے، معاشرتی ناہمواری اور پستی و بلندی ہے تو وہ معاشرہ باقی نہیں رہ سکتا چاہے اس کے افراد عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ فلاں اور فلاں قوم کی ہلاکت کا سبب اس قوم کے لوگوں کا ظلم تھا۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُهْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ

یعنی اگر لوگ مصلح ہوں تو اللہ ان کو کسی ایک ظلم کے سبب ہلاک نہیں کرتا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے کیونکہ شرک بھی ظلم کی ایک قسم ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ یعنی خدائے تبارک و تعالیٰ لوگوں کو کفر و شرک کے

سبب سے ہلاک نہیں کرتا بشرطیکہ وہ معاشرتی تعلقات اور سماجی حقوق کے لحاظ سے عادل ہوں۔

روحانی امور میں حق اور سماجی انصاف کا کردار

تیسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ دنیا کی بے وقعتی اضافی اور مقابلۃً نہیں ہے بلکہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے دنیا فی نفسہٖ بری ہے، پھر بھی چاہے اور کسی چیز میں بھی شک کیا جائے، اس میں تو شک نہیں کیا جاسکتا کہ پیغمبرانِ خدا کسی خاص مقصد کے لیے آئے تھے۔ وہ آئے تھے پاک عقائد کی تعلیم دینے کے لیے لوگوں کی روح کی پاکیزگی کے لیے بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ (میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں) لوگوں کو نیک اعمال کی ترغیب دینے کے لیے اور برے کاموں سے روکنے کے لیے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے کچھ چیزیں اچھی ہیں۔ انبیاء ان کو پھیلانے کے لیے آئے تھے اور کچھ چیزیں بری ہیں، انبیاء ان کے خلاف جدوجہد کے لیے آئے تھے۔ مجموعی طور پر دینی احکام کی تین قسمیں ہیں:

اعتقادات ــــ اخلاقیات اور عملی احکامات

اعتقادی احکام جیسے اللہ پر ایمان، انبیاء اور اولیاء پر ایمان، آخرت اور جزا و سزا پر ایمان۔ اخلاقی احکام جیسے ہمیں عفت و تقویٰ کے راستے پر چلنا چاہیے۔ صبر و شکر اختیار کرنا چاہیے۔ عفو و حلم سے کام

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حقوق کے متعلق اسلام میں جو پختہ احکام موجود ہیں وہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر دنیا حقیر ہے تو صرف مقابلۃً۔

اجتماعی منطق

اسی سوال کا ایک اور جواب یہ دینا چاہوں گا کہ کیا اسلام نہیں چاہتا کہ اسلامی معاشرہ باقی رہے؟ ظاہر ہے کہ چاہتا ہے۔ اب اگر اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ باقی رہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی معاشرے میں نہ انصاف ہو اور نہ عوام کے حقوق کی حفاظت اور وہ پھر بھی باقی رہ جائے؟ کیا ہمارے عظیم پیغمبرؐ نے نہیں فرمایا:

اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ۔

اگر معاشرے میں انصاف اور توازن ہے تو لوگ اگر کافر بھی ہوں تو وہ معاشرہ باقی رہ سکتا ہے لیکن اگر ظلم و ستم ہے، معاشرتی ناہمواری اور پستی و بلندی ہے تو وہ معاشرہ باقی نہیں رہ سکتا چاہے اس کے افراد عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ فلاں اور فلاں قوم کی ہلاکت کا سبب اس قوم کے لوگوں کا ظلم تھا۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُھْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَھْلُھَا مُصْلِحُوْنَ

یعنی اگر لوگ مصلح ہوں تو اللہ ان کو کسی ایک ظلم کے سبب ہلاک نہیں کرتا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے کیونکہ شرک بھی ظلم کی ایک قسم ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ یعنی خدائے تبارک و تعالےٰ لوگوں کو کفر و شرک کے

سبب سے ہلاک نہیں کرتا بشرطیکہ وہ معاشرتی تعلقات اور سماجی حقوق کے لحاظ سے عادل ہوں۔

روحانی امور میں حق اور سماجی انصاف کا کردار

تیسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ دنیا کی بے وقعتی اضافی اور مقابلۃً نہیں ہے بلکہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے دنیا فی نفسہٖ محض ہے، پھر بھی چاہے اور کسی چیز میں بھی شک کیا جائے، اس میں تو شک نہیں کیا جا سکتا کہ پیغمبرانِ خدا کسی خاص مقصد کے لیے آتے تھے۔ وہ آئے تھے پاک عقائد کی تعلیم دینے کے لیے لوگوں کی روح کی پاکیزگی کے لیے بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ (میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں) لوگوں کو نیک اعمال کی ترغیب دینے کے لیے اور برے کاموں سے روکنے کے لیے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے کچھ چیزیں اچھی ہیں۔ انبیاءؑ ان کو پھیلانے کے لیے آئے تھے اور کچھ چیزیں بری ہیں، انبیاءؑ ان کے خلاف جدوجہد کے لیے آئے تھے۔ مجموعی طور پر دینی احکام کی تین قسمیں ہیں:

اعتقادات — اخلاقیات اور عملی احکامات

اعتقادی احکام جیسے اللہ پر ایمان، انبیاءؑ اور اولیاءؑ پر ایمان، آخرت اور جزا و سزا پر ایمان۔ اخلاقی احکام جیسے ہمیں عفت و تقویٰ کے راستے پر چلنا چاہیے۔ صبر و شکر اختیار کرنا چاہیے۔ عفو و حلم سے کام

لینا چاہیے۔ باہم الفت و محبت سے رہنا چاہیے۔ اتحاد و اتفاق رکھنا چاہیے۔ ہماری روح پاکیزہ ہونی چاہیے۔ ہم کسی سے حسد اور کینہ نہ رکھیں۔ بزدلی اور کنجوسی سے کام نہ لیں۔ کسی پر ظلم نہ کریں۔ کسی کا برا نہ چاہیں۔ عملی احکام بھی واضح ہیں۔ کچھ عبادات مقرر ہیں:

مثلاً نماز، روزہ، حج، جہاد، امر بالمعروف وغیرہ۔ معاشرت کے متعلق احکام ہیں مثلاً احسان اور صلۂ رحم کا حکم۔ اس قسم کے احکام جیسے جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو، گالی نہ دو، کسی کو قتل نہ کرو، شراب، جوئے، سود وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی چیز میں شک ہو تو ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ شارعِ اسلام نے جس بات کو اچھا سمجھا اسکے متعلق کہا کہ یہ ہونی چاہیے اور جس بات کو برا سمجھا اسکے متعلق ہدایت کی کہ یہ کسی طرح بھی نہیں ہونی چاہیے۔

آئیے اب غور کر کے دیکھیں کہ اگر عوام کے حقوق محفوظ ہوں، معاشرے میں توازن اور عدل و انصاف ہو، بیجا امتیاز، محرومیت اور ناانصافی کا لوگوں میں احساس نہ ہو تو ایسی صورت میں صحیح عقائد، عمدہ اخلاق، صفائے قلب اور اعمالِ صالحہ کا زیادہ امکان ہوگا یا نہیں اور گناہوں کے ارتکاب اور بداخلاقیوں اور فاسد عقائد کے پھیلنے کے مواقع کم ہو جائیں گے یا نہیں؟ یا یہ ہوگا کہ اگر معاشرے میں توازن نہ ہو، افراط و تفریط، ظلم و زیادتی، اختلاف اور ناہمواری کا دور دورہ ہو تو ایسی صورت میں تزکیۂ نفس اور پاکیزگیٔ روح کا زیادہ امکان ہوگا۔ ان دونوں میں سے کون سی بات درست ہے؟ یا پھر تیسری صورت یہ ہے کہ خواہ معاشرتی حالات کچھ بھی ہوں ان کا روحانی اور اخلاقی امور پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کا معاملہ ہی الگ ہے۔

کوئی ہوشمند یہ نہیں کہے گا کہ معاشرے میں حق و انصاف کے عدم لحاظ

سے جتنی زیادہ ابتری پھیلے گی اتنا ہی صحیح عقائد، تزکیہ نفس اور اعمال صالحہ کو پھلنے پھولنے کا بہتر موقع ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ انصاف کے ہونے نہ ہونے اور حقوق کے محفوظ رہنے یا نہ رہنے کا ان باتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شاید ہمارے یہاں کے بہت سے دیندار لوگوں کا یہی خیال ہو اور وہ یہ سمجھتے ہوں کہ انصاف اور مذہبیت کا معاملہ بالکل الگ الگ ہے۔ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

اگر کسی کا واقعی ایسا خیال ہے تو اس سے کہنا چاہیے زہے تصور باطل! زہے خیالِ محال! حقیقت یہ ہے کہ عام حالات اور سماجی انصاف کا وجود اور عدم وجود عوام کے افعال و اعمال، اخلاق حتیٰ کہ ان کے افکار اور عقائد پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور یہ اثر تینوں مرحلوں میں ہوتا ہے۔ فکر و عقیدہ یعنی سوچ کے مرحلے میں بھی، عادت کے مرحلے میں اور عمل کے مرحلے میں بھی۔

سماجی انصاف کا افکار
اور عقائد پر اثر

جہاں تک فکر و عقیدے کا تعلق ہے، جب ہم اپنے ادبی سرمایہ کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے شعرائے کرام کے افکار و خیالات کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گو ہمارے ادیب اور شاعر حقیقت شناس اور بلند خیال تھے تاہم بعض اوقات انکے ذہن نے ایسے خیالات کی تراوش کی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ قسمت، نصیب اور اتفاق پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم چاہے سوتے رہو تمہاری قسمت

جاگتی رہنی چاہیے۔ جب قسمت کی بات آتی ہے تو پھر ان کی نظر میں کسی چیز کی وقعت باقی نہیں رہتی، نہ علم کی، نہ عقل کی، نہ سعی و کوشش کی، نہ فن کی، نہ ہنر اور صنعت کی، نہ زورِ بازو کی، سب چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔

قسمت سے کام بنتا ہے، عقل سے نہیں۔

اوفتادہ است در جہاں بسیار
بے تمیز ارجمند و عاقل خوار

قسمت اچھی ہونی چاہیے، ہنرمندی اور لیاقت سے کیا ہوتا ہے!

اگر بہ ہر سرِ موئیت ہنر دو صد باشد
ہنر بہ کار نیاید چو بخت بد باشد

سعی و عمل اور کوشش سب بیکار باتیں ہیں۔ اصل چیز قسمت ہے، دولت کوشش سے ہاتھ نہیں آتی، اس لیے تگ و دو فضول ہے۔

چند آنکہ جہد بود دویدیم در طلب
کوشش چہ سود چوں نکند بخت یاوری

قسمت ہی اصل چیز ہے۔ زورِ بازو سے کچھ نہیں ہوتا۔

چہ کند زورمند وارُون بخت
بازوئے بخت بہ کہ بازوئے سخت

ہر جگہ قسمت ہی کی بات کہی گئی ہے۔ اب اگر ان شعراء حضرات سے یہ پوچھا جائے کہ جناب یہ قسمت کیا ہے؟ ذرا اس کی تعریف تو کیجیے۔ آپ قسمت کا نام تو لیتے ہیں لیکن آپ کو اس کا پتا نشان بھی معلوم ہے؟ تو شاید جواب نہ بن پڑے۔

اس خیال کی پیدائش کا سبب

یہ صحیح ہے کہ ان حضرات نے ایک مبہم سا نشان دیکھا ہے۔ وہیں سے قسمت اور نصیب پر ان کا اعتقاد ہو گیا۔ انہوں نے کیا دیکھا ہے؟

انہوں نے یہ دیکھا ہے کہ معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو عمر بھر محنت اور کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ان کے بالمقابل ایسے بھی لوگ ہیں جو بالکل فضول اور بیکار ہونے کے باوجود خاصے خوشحال ہیں۔ نالائق صاحب حیثیت ہیں اور عقلمند ذلیل و خوار۔ لیاقت اور قابلیت کے تناسب سے حق اور حصہ نہیں ملتا۔ جب انہوں نے اپنے معاشرے میں یہ صورت دیکھی تو رفتہ رفتہ ان کے مشاہدات نے ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی۔ دانستہ یا نادانستہ ابتری، بدنظمی اور مظالم کا نام قسمت اور نصیب رکھ دیا گیا۔ قسمت کے فلسفہ کی جڑ سوائے معاشرے کی ناہمواری اور سماجی بے انصافی کے اور کچھ نہیں۔

ان خیالات کا سرچشمہ دو اور چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب ہے۔ قرآنی آیات، احادیث رسول پاکؐ اور ائمہ اطہارؑ کے اقوال بھی شعراء کے خیالات کا بڑا ماخذ رہے ہیں لیکن قرآن شریف، رسولؐ اور ائمہ کے اقوال میں ہمیں کہیں بخت و اتفاق کا ذکر نہیں ملتا۔ دوسرا سرچشمہ عقل اور علم و فلسفہ ہیں۔ قدیم فلسفہ کی کتابوں میں بھی جہاں قسمت یا بخت و اتفاق کا ذکر ہے اس کو محض وہم قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا قسمت اور اتفاق کا یہ خارق العادۃ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ اس کو عقل، علم، محنت، کوشش، ہنر اور طاقت سب سے بالاتر سمجھ لیا گیا؟

اس شیطانی فکر کا سرچشمہ سوائے بدنظمی، معاشرے کی ناہمواری اور بلا استحقاق رعایت کے کچھ نہیں۔ جب بھی سماجی نظام میں خلل پڑتا ہے حقوق کا خیال نہیں رکھا جاتا، غیر مستحق کے ساتھ رعایت برتی جاتی ہے، ملازمتوں میں ذاتی تعلقات، سفارش اور پارٹی بازی کا دخل ہو جاتا ہے تو پھر قسمت اور اتفاق کا خیال اور اسی قسم کے دوسرے خیالات فروغ پانے لگتے ہیں کیونکہ بخت و اتفاق کے معنی یہی ہیں کہ کسی کام کے لیے کوئی شرط نہ ہو۔

کس قدر فرق ہے اس شخص میں جو سعی و کوشش کے اثر کا قائل ہے اور اَن لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی پر اس کا ایمان ہے اور اس شخص میں جو کہتا ہے کہ کتنی ہی محنت کرو، کچھ نتیجہ نہیں۔ کسی کام کا کوئی طریقہ مقرر نہیں۔ کتنا فرق ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ پر اعتقاد میں اور قسمت اور اتفاق پر یقین میں۔

زمانے پر نکتہ چینی

ہمیں اپنے ادبی سرمائے میں ایک اور طرز فکر نظر آتا ہے۔ زمانے کی شکایت کے عنوان سے کیا کیا گالیاں زمانے کو نہیں دی گئی ہیں۔ اس کو بے وفا کہا گیا ہے۔ ظالم اور ستمگر کہا گیا ہے۔ ہر وہ برائی جس سے جور و جفا اور مکر و فریب ظاہر ہوتا ہو زمانے سے منسوب کی گئی ہے یہاں تک کہ سمجھا گیا ہے کہ زمانہ نیک لوگوں سے خاص دشمنی اور کینہ رکھتا ہے۔

دراصل جس زمانے کو مورد الزام ٹھیرایا گیا ہے اس سے مراد چرخ اور فلک یا زمین و زماں نہیں۔ یہ شاعر کا اپنا مخصوص سماجی ماحول ہے نہ کہ زمانہ علی الاطلاق۔ شاعروں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے ذاتی حالات

اور احساسات کا آئینہ دار ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ صرف اس کا ذاتی احوال نہیں ہوتا وہ اپنے ماحول کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ وہ غمِ جاناں کے پردے میں غمِ دوراں کو پیش کرتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے چاروں طرف ظلم کا بازار گرم دیکھتا ہے اور اس کا اصل سبب اس کی سمجھ میں نہیں آتا یا آتا بھی ہے تو اسے بیان نہیں کر سکتا تو وہ چرخِ ناہنجار اور فلکِ کج رفتار کو برا بھلا کہہ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیتا ہے لیکن اس کے نتیجہ میں تکوینی نظام سے ایک طرح کا سوءِ ظن پیدا ہو جاتا ہے اور اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ زمانے کی بنیاد اچھے اور نیک لوگوں سے عداوت پر ہے۔ لوگ مجبوراً زمانے اور نظامِ کائنات پر بلکہ خود خدا پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ابنِ راوندی کہتا ہے: [۱]

"کتنے ہی ہوشیار اور سمجھدار لوگ ہیں جن پر زندگی کی راہیں بند ہیں۔ ان کو کہیں خوشی میسر نہیں آتی اور کتنے ہی جاہل اور احمق ہیں جن کو سب کچھ میسر ہے۔ یہی چیز ہے جس نے عقلوں کو پریشان کر دیا ہے اور دانا‌ؤں کو بے دین اور زندیق بنا دیا ہے۔"

بہرحال معاشرتی توازن اور بے جا فرق و امتیاز کا براہِ راست ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے اور مسرت اور خوشحالی کے جو اصل عوامل ہیں جیسے علم، عقل، تقویٰ، سعی و عمل اور ہنر اور لیاقت ان پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، قدرت کے تکوینی نظام بلکہ خود سرچشمۂ تخلیق سے سوءِ ظن اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے جو عقیدہ و فکر پر بے انصافی کا اثر ہے۔

سماجی انصاف اور

انفرادی اخلاق

رہا یہ سوال کہ سماجی بے انصافیوں سے اخلاق کیوں خراب ہوتے ہیں اور ذہنی الجھنیں کیوں پیدا ہوتی ہیں تو وجہ یہ ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح اخلاق کے بننے اور بگڑنے کا بھی ایک سبب ہے۔ کوئی بات بلاوجہ نہیں ہوتی۔ عادت اور مزاج کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ماحول اور ترغیبات کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک خاص چیز جس سے اخلاق میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور جو روح کو مسموم اور بیمار کر دیتی ہے وہ ہے احساسِ محرومیت۔ اسی سے حسد، کینہ، عداوت اور بدخواہی جیسی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔

مستثنیٰ افراد

البتہ کچھ ایسے غیر معمولی افراد بھی ہوتے ہیں جن پر مظلومیت اور محرومیت کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے وہ غیر معمولی ہوتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کی روحانی قوت مدافعت ہوتی ہے۔ ایمان کی قوت کے سبب بہت سے عوامل ان کے دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ایسے مستثنیٰ افراد کی سوچ عوام کی سطح سے بلند ہوتی ہے۔ وضاحت کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں:

ماں باپ اور بچے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ گھر میں غذا، پھل، مٹھائی کپڑے جو کچھ آتا ہے سب گھر والوں کو اس میں سے حصہ ملتا ہے لیکن

ایک ماحول میں رہنے کے باوجود ماں باپ اور بچوں کی سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ ان کی سوچ کی سطح مختلف ہوتی ہے۔

جہاں تک بچوں کے ایک دوسرے کے متعلق احساس کا تعلق ہے، جب کوئی بچہ یہ دیکھتا ہے کہ اسے غذا، مٹھائی یا کپڑوں میں سے کم حصہ ملا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے، روٹھتا ہے، روتا ہے اور جب اسے مظلومیت اور محرومیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے تو انتقام پر اتر آتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ اگر والدین کو بچوں کی صحت اور سلامتی عزیز ہے تو وہ شروع ہی سے اس کی کوشش کریں کہ بچوں کے ساتھ برتاؤ میں کسی طرح کا فرق و امتیاز نہ ہو۔ فرق و امتیاز کا مطلب اختلاف، حسد اور انتقام کا بیج بونا ہے جس بچے کے ساتھ فرق و امتیاز برتا جاتا ہے اس کی ہمت و حوصلہ پر برا اثر پڑتا ہے، وہ گھٹ کر رہ جاتا ہے اور جس بچے کا زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ دوسروں پر تکیہ کرنے لگتا ہے اور زود رنج اور لالچی بن جاتا ہے۔ بچے کو اگر کوئی جسمانی بیماری ہو جائے تو ماں باپ فوراً ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن وہ اس کی ذہنی صحت و سلامتی کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں حالانکہ ذہنی صحت جسمانی صحت سے کم ضروری نہیں بلکہ اس کی اہمیت بدرجہا زیادہ ہے۔

غرض کہ بچوں کی فکری سطح چونکہ مختلف ہوتی ہے اس لیے ایک دوسرے کے مقابلے میں محرومیت کے احساس کا ان پر بہت جلد برا اثر پڑتا ہے لیکن والدین کو چونکہ زیادہ سمجھ ہوتی ہے اور ان کی فکری سطح بلند تر ہوتی ہے وہ کچھ اور طرح سوچتے ہیں اور دوسری طرح محبت کرتے ہیں۔ انہیں اس طرح کی محرومی اور کمی بیشی سے تکلیف نہیں ہوتی۔ ان کو اگر میوہ

یا کم ملے تو وہ پریشان نہیں ہوتے اور نہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

یہی حال معاشرے کا ہے۔ غیر معمولی افراد جو بمنزلہ امت کے باپ کے ہیں محرومیت سے متاثر نہیں ہوتے۔ مظلومیت و محرومیت کا ان پر اثر نہیں ہوتا۔ جس طرح باپ ہمیشہ بچوں کی بھلائی چاہتا ہے اسی طرح یہ بھی امت کی بھلائی چاہتے ہیں

جنگ احد میں جب رسول اکرمؐ کی پیشانی کو پتھر سے زخمی کر دیا گیا تھا اور آپ کے دندانِ مبارک شہید کر دیے گئے تھے' آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ .

خداوندا! میری قوم کو ہدایت عطا فرما' ان کو معاف کر دے کیونکہ یہ لوگ ناواقف ہیں۔

علی مرتضیٰؑ فدک کے موضوع پر فرماتے ہیں:

فَشَحَّتْ عَلَیْھَا نُفُوْسُ قَوْمٍ وَسَخَتْ عَنْھَا نُفُوْسُ اٰخَرِیْنَ وَمَا اَصْنَعُ بِفَدَکٍ وَغَیْرِ فَدَکٍ وَالنَّفْسُ مَظَانُّھَا فِیْ غَدٍ جَدَثٌ تَنْقَطِعُ فِیْ ظُلْمَتِہٖ اٰثَارُھَا .

"کچھ لوگوں نے اس کا لالچ کیا اور کچھ اس سے بے نیاز رہے ہیں فدک یا کسی اور چیز کا کیا کروں گا۔ کل یہ بدن قبر میں ہو گا اور قبر کی تاریکی میں اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔"

فرق اور امتیاز کے

اخلاقی اثرات

یہ تو غیر معمولی افراد کی بات تھی۔ باقی افراد کی حالت گھر کے بچوں کی سی ہے۔ جن بچوں میں فرق و امتیاز کے سبب محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے وہ افسردہ و پریشان رہتے ہیں اور ان میں کینہ اور انتقام کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے بچے جو لاڈلے ہوتے ہیں وہ اوچھے، کم حوصلہ، زود رنج، بیکار اور فضول خرچ ہو جاتے ہیں۔ یعنی کچھ میں حسد، نفرت، کینہ، انتقام اور دشمنی کے جذبات ابھر آتے ہیں تو کچھ میں کم ہمتی، بے صبری اور فضول خرچی کے۔ اب خود غور کیجیے کہ بے انصافی کے نتیجے میں کیا صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔

رسولِ اکرمؐ کی ایک مشہور دعا ہے جو اس جملے سے شروع ہوتی ہے:

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا يَحُولُ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعْصِيَتِكَ.

الٰہی ہمیں اس قدر خشیت نصیب فرما کہ وہ ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان حائل ہو جائے۔

اسلامی دعائیں اخلاقی اور روحانی تعلیمات کی بہترین معلّم ہیں۔[1] دعا کی زبان میں عجیب عجیب نفسیاتی اور معاشرتی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

---

[1] تفصیلات کے لیے جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب "مکتبِ تشیّع" میں باب ۵ "اہلبیت کے اخلاق اور ان کا تربیتی مکتب" ملاحظہ فرمائیں۔

اسی دعا میں ایک جملہ ہے: وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا۔ یعنی خدایا ہماری انتقام کی خواہش کو ان سے مخصوص فرما جنہوں نے ہم پر ظلم کیا ہے۔ اس جملہ میں ایک باریک نکتہ ہے۔ رسولِ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ خدایا جن لوگوں نے ہم پر ظلم کیا ہے ان سے انتقام لے بلکہ یہ فرمایا کہ ہماری انتقام کی خواہش کو ان سے مخصوص فرما جنہوں نے ہم پر ظلم کیا ہے۔

دعا میں ثار کا لفظ ہے جس کے اصل معنی ہیں انتقام کی خواہش یا اصطلاحاً بدلہ لینے کی خواہش کا احساس۔ آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ہم پر جب ظلم ہوتا ہے تو لازماً اس سے ہمیں ذہنی تکلیف پہنچتی ہے اور ہمارے ذہن میں انتقام کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ جب یہ حالت ہوگی تو اس کا اثر کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ظاہر ہوگا اور یہ شعلہ ضرور بھڑکے گا۔ آج علمائے نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ کینہ و عداوت کے جذبات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر وہ لاشعور کی گہرائی میں کہیں دب جائیں اور بظاہر انسان ان کو فراموش کر دے لیکن یہ جذبات بالکل فنا نہیں ہوتے۔ وہ روح کی گہرائی میں لاشعوری طور پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح باہر نکلیں۔ رسولؐ اکرم فرماتے ہیں کہ یہ آگ جو ہمارے دل میں ہے اور کسی دن اس کے شعلے بھڑکیں گے کسی دوسرے کو نہ جلائے۔ اگر جلائے تو اسی کو جلائے جس نے ہمارا دل جلایا ہے اور جس نے یہ آگ لگائی ہے۔ اگر کوئی اپنے ارادے اور عقل و شعور سے کام لے کر انتقام لیتا ہے تو ایک کا انتقام دوسرے سے نہیں لیتا۔ اگر بلخ میں کسی لوہار نے گناہ کیا ہے تو اس کے بدلے میں شوشتر میں کسی کسیرے کا گلا نہیں کاٹے لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں اور دل میں چھپا ہوا کینہ اور نفسیاتی گرہیں انتقام

پر اکساتی ہیں تو پھر آدمی ان باتوں کا خیال نہیں کرتا۔

رسولِ خدا فرماتے ہیں کہ خدایا ایسا کر کہ ہمارا انتقام اور بغض ہمیں تنگ رہے کہ دشمن کا سر کچل دیں۔ ہماری روح کی گہرائیوں میں بے انصافیوں، مظلومیوں اور بے بسی کے باعث ایسی نفسیاتی گرہیں نہ پڑیں اور انتقام کی ایسی خواہش پیدا نہ ہو کہ ہمارا ذہن گھٹ کر نا فرمان، سرکش، بدخواہ اور ظالم ہو جائے۔ ظلم ہی میں اسے مزہ آنے لگے اور لوگوں کو کچل کر خوش ہونے لگے۔

متوازن معاشرے میں

متوازن اخلاق

بلند اخلاق کے معنی ہیں متوازن اور موزوں اخلاق۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ اگر معاشرہ متوازن نہ ہو اور سماجی نظام اور معاشرتی قوانین و قواعد موزوں اور متوازن نہ ہوں تو شخصی اور انفرادی اخلاق بھی موزوں نہیں رہ سکتا۔ معاشرے کے عدم توازن سے صرف مظلوم عوام ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ خواص کا وہ طبقہ جو بیشتر مراعات پر قبضہ کر لیتا ہے وہ بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ عوام بددلی اور خوف و گھبراہٹ کا شکار ہوتے ہیں اور اونچا طبقہ بیکاری، نا اتفاقی، بے صبری، ناشکری، کم ہمتی اور فضول خرچی کا۔

امام علیؑ مالکِ اشتر کے نام اپنے مشہور فرمان میں طبقۂ خواص کے بارے میں کہتے ہیں:

"حاکم کے لیے خوشحالی کے زمانے میں اس طبقے سے مہنگا

کوئی طبقہ نہیں اور مصیبت کے وقت یہی طبقہ ہے جس سے سب سے کم مدد ملتی ہے۔ یہ عدل و انصاف سے متنفر ہے اس طبقہ کی توقعات بہت زیادہ ہیں لیکن یہ سب سے زیادہ ناشکرا ہے اور اپنی توقعات کے بارے میں کسی کا عذر قبول نہیں کرتا مصیبت کے وقت اس سے زیادہ بے صبرا کوئی نہیں۔ دین کا ستون، مسلمانوں کی مرکزی طاقت اور دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونے والے عوام ہیں اس لیے تمہاری توجہ کا مرکز ہمیشہ عوام رہنے چاہئیں، خواص نہیں"۔

امام علیؑ نے کس خوبی سے طبقہ خواص کی ذہنیت کی تشریح کی ہے جو خواہ مخواہ کے لاڈلے بنے ہوئے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی ایک حدیث ہے: اِسْتَوُوْا تَسْتَوِ قُلُوْبُکُمْ اعتدال اور مساوات کو اپناؤ۔ تمہارے درمیان ناہمواری اور فرق و امتیاز کا وجود نہ ہو تاکہ تمہارے دل ایک دوسرے کے نزدیک رہیں اور تم ایک ہی سطح پر رہو یعنی اگر کاروبار اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے تمتع میں تمہارے درمیان فاصلہ ہوگا تو تمہارے دل بھی ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے، پھر تم ایک دوسرے کے ہم خیال نہ ہو سکو گے اور تمہارے درمیان الفت و محبت کا رشتہ قائم نہ ہو سکے گا اور تم مجبوراً مختلف گروہوں میں بٹ جاؤ گے۔

قرآن کریم میں ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۰۳)

"تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد رکھو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔"

اس آیت میں جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہے اسی اتحاد اور اتفاق کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں میں اسلام کے سبب سے پیدا ہوا۔

اسلام کی کامیابی کا راز

میں نے پچھلے جلسہ میں کہا تھا کہ اگر اسلام کا صرف اخلاقی پہلو ہوتا اور کسی دوسرے اخلاقی مکتبِ فکر کی طرح اس کا کام بھی فقط پند و نصیحت تک محدود ہوتا اور یہ بھی صرف وعظ و نصیحت کرتا اور سماجی نظام سے اس کا کوئی سروکار نہ ہوتا تو یہ ایک ایسے نئے معاشرے کو تشکیل نہیں دے سکتا تھا جو متحد اور ہم خیال ہو اور تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو چیز دلوں کو جوڑتی ہے وہ عقیدہ اور ایمان ہے۔ رسولِ خدا نے عقیدے کی وحدت پیدا کی جو وحدت و یگانگت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ سب کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے پرچم تلے جمع کیا لیکن آپ نے ایمان و عقیدے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ وحدت کے حصول میں جو چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں ان کو دُور کرنے کی طرف بھی توجہ دی۔ موانع و مشکلات کو دور کیا۔ ان اسباب

کی بیخ کنی کی جس سے کینہ، حسد اور انتقام کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ قانون میں فرق و امتیاز کو مٹایا۔ ظاہر ہے جب اتحاد و اتفاق کے اسباب موجود اور موانع مفقود ہوں تو الفت و ہم آہنگی خود بخود پیدا ہو جائے گی لیکن اگر اتحاد و اتفاق کے اسباب ہی نہ ہوں یا ہوں لیکن رکاوٹیں موجود ہوں تو پھر یگانگت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

اس لیے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام نے صرف عقیدہ کی وحدت پیدا کر کے ہی لوگوں کو متحد کر دیا۔ نہیں اس نے اس راہ کی مشکلات اور رکاوٹوں کو بھی دور کیا۔ عدم مساوات اور بیجا فرق و امتیاز کا بھی خاتمہ کیا۔ اگر اس نے یہ کہا کہ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا "آؤ ہم اس بات پر آپس میں اتفاق کر لیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہیں کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔" تو اس کے فوراً ہی بعد یہ بھی کہا کہ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ. "خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا رب قرار نہیں دیں گے۔" اس طرح اسلام نے مساوات اور برابری قائم کر دی۔

پیغمبرِ اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ كُلُّكُمْ مِنْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَىٰ عَجَمِيٍّ إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ.

لوگو! تم سب کا خدا ایک ہے۔ تم سب کا باپ ایک ہے۔ تم سب فرزندِ آدم ہو اور آدم خاک سے وجود میں آئے۔

تھے۔ لہٰذا تم سب بھی خاک سے وجود میں آئے ہو۔ فضیلت کا دارومدار صرف تقویٰ پر ہے۔ لہٰذا عرب یہ نہ سمجھیں کہ ان کو غیر عربوں پر کوئی تفوق اور برتری حاصل ہے۔"

کسی نسل کو کسی دوسری نسل پر کوئی برتری نہیں ہے۔ برتری صرف اور صرف تقویٰ سے ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟

"کیا میں نے خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیا؟"

سب نے کہا جی ہاں آپ نے پہنچا دیا۔ قَالُوْا نَعَمْ۔

آپ نے فرمایا:

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ۔

"اچھا جو یہاں موجود ہیں، وہ ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔"

یعنی موجودہ نسل آئندہ نسل تک اور اسی طرح ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل تک پہنچاتی رہے۔

عام رویہ پر انصاف کا اثر

یہاں سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ انصاف کے ہونے اور نہ ہونے کا اثر لوگوں کے طور طریقوں پر بھی پڑتا ہے۔ جب اس بات کا اثر عقائد اور اخلاق پر پڑتا ہے تو ضرور ہے کہ اطوار و اعمال پر بھی پڑے گا۔ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ۔ ہر شخص اپنی سوچ، اپنے عقیدے

اور اپنی روحانی کیفیت کے مطابق کام کرتا ہے۔ انسان کے اعمال کی جڑ اس کی روح میں ہے۔

ہم ان اثرات کا ذکر کر چکے ہیں جو بے انصافی، عدم مساوات اور محرومی کے احساس کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ غریبی بھی خواہ اس کا سبب بے انصافی ہو یا کچھ اور گناہوں کا سبب ہے۔ اگر اس کے ساتھ محرومی اور بے انصافی کا احساس بھی شامل ہو جائے تو حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے اور اگر ساتھ ہی یہ حسرت بھی شامل ہو جائے کہ کچھ لوگ عیش کر رہے ہیں تو پھر حالت مزید بدتر ہو جاتی ہے۔ حافظ کہتا ہے:

سخن درست بگویم نمی توانم دید
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم

سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ دوسرے تو عیش کریں اور میں دیکھتا رہوں۔

یہی دیکھ نہ سکنا چوری، رشوت، غبن اور غصب کا سبب بن جاتا ہے اس کے باعث طرح طرح کے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ جعل فریب، دھوکا دہی اور جعل سازی سب اسی کا نتیجہ ہیں۔ اونچے طبقہ میں شامل ہونے کی خاطر لوگ رشوت لیتے ہیں، چوری کرتے ہیں، دوسروں کا حق مارتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

امام علیؑ نے اپنے فرزند عزیز محمد معروف بہ ابن الحنفیہ سے فرمایا تھا:

بیٹا! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم تنگدستی کا شکار نہ ہو جاؤ۔ دعا کرتے رہو کہ خدا تم کو اس سے پناہ میں رکھے کیونکہ اس سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس سے عقل چکرا جاتی ہے اور لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

تنگدستی سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا غریبی کوئی گناہ ہے؟ گناہ تو نہیں، لیکن اگر آدمی کا ایمان مضبوط نہ ہو تو تنگدستی آدمی کو مجبور ضرور کر دیتی ہے۔ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو فقر و فاقہ کی وجہ سے ہی سرزد ہوتے ہیں۔ اسی لیے رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

کَادَ الْفَقْرُ یَکُوْنُ کُفْرًا

فقر کفر کی سرحد سے قریب ہے۔ غریبی روح کو گناہ پر آمادہ کرتی ہے اور حوصلہ پست کرتی ہے۔

غریبی کا ایک دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے عقل چکرا جاتی ہے۔ غربت اور تنگدستی میں عقل و فکر کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ آدمی صحیح طریقے سے نہیں سوچ سکتا۔ جس طرح مصیبت سے پریشان خیالی پیدا ہوتی ہے اسی طرح غریبی سے بھی یہی حال ہوتا ہے۔

البتہ کچھ لوگ مستثنیٰ ہوتے ہیں اور ان پر سرد و گرم زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ کسی مصیبت سے نہیں گھبراتے لیکن سب کا یہ حال نہیں۔

غریبی کا تیسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ حقارت سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس سے ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے اور ذہن میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ شاید امام علیؑ کا مقصد اس فقرے سے یہ ہو کہ تنگدستی میں تم لوگوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگو گے اور ان کو اپنی بدقسمتی کا ذمہ دار ٹھیراؤ گے۔

میں اپنی گفتگو امیرالمومنین کے اصحاب میں سے ایک بزرگ کے اقوال پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ان بزرگ کا نام صعصعہ بن صوحان عبدی ہے۔ یہ مولائے متقیان کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ حضرت کو ان سے تعلقِ خاطر تھا۔ زبردست مقرر اور خطیب تھے۔ جاحظ "البیان والتبیین" میں ان کی قوت

بیان اور قدرت استدلال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَ اَدَلُّ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ اِسْتِنْطَاقُ عَلِیٍّ لَهٗ.

ان کی قوتِ بیان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ علیؑ ان سے تقریر کرایا کرتے تھے اور یہ علیؑ کی موجودگی میں تقریر کرتے تھے۔

امام علیؑ کی خلافت کے پہلے دن صعصعہ نے ایک مختصر بات کہی تھی۔ جب امام علیؑ ابن ملجم مرادی کی تلوار سے زخمی ہونے کے بعد بستر پر لیٹے ہوئے تھے' اس وقت پھر ایک اور بات کہی اور امام کے دفن کے بعد ذرا تفصیل بات کہی۔ خلافت کے پہلے دن صعصعہ نے امام علیؑ کو مخاطب کر کے کہا:

زَیَّنْتَ الْخِلَافَةَ وَمَا زَانَتْكَ وَرَفَعْتَهَا وَمَا رَفَعَتْكَ وَهِیَ اِلَیْكَ اَحْوَجُ مِنْكَ اِلَیْهَا.

"امیرالمومنینؑ! آپ نے خلافت کو زینت بخشی' اس نے آپ کو زینت نہیں دی۔ آپ نے اس کا درجہ بلند کیا' اس نے آپ کی شان میں اضافہ نہیں کیا۔ آپ کو خلافت کی ضرورت نہیں' خلافت کو آپ کی ضرورت ہے۔"

دوسرا فقرہ صعصعہ نے اس وقت کہا جب امیرالمومنینؑ تلوار کی ضرب سے زخمی ہو چکے تھے۔ حضرت کے سب اصحاب غیر معمولی طور پر مضطر تھے۔ صعصعہ بھی عیادت کے لیے آئے لیکن ان کو آپ تک رسائی کا موقع نہیں ملا۔ کسی سے جو کمرے کے اندر آجا رہا تھا اپنا سوزِ دل بیان کیا اور یہ پیامِ محبت بھجوایا:

یَرْحَمُكَ اللّٰهُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ حَیًّا وَّمَیِّتًا لَقَدْ کَانَ اللّٰهُ فِیْ صَدْرِكَ عَظِیْمًا وَّکُنْتَ بِذَاتِ اللّٰهِ عَلِیْمًا.

"امیرالمومنینؑ زندگی اور موت ہر حال میں اللہ کی رحمت آپ کے

شاملِ حال رہے۔ آپ کے دل میں خدا کی عظمت تھی اور آپ کو معرفتِ الٰہی حاصل تھی"۔

جب صعصعہ کا پیغام امیرالمومنین کے پاس پہنچا' آپ نے فرمایا:
میری طرف سے صعصعہ سے کہو:

وَاَنْتَ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَلَقَدْ كُنْتَ خَفِيْفَ الْمَؤُنَةِ كَثِيْرَ الْمَعُوْنَةِ:

اللہ کی رحمت تمہارے بھی شاملِ حال ہو۔ تم بوجھ کم تھے اور مدد تم سے زیادہ ملتی تھی۔

تیسری بات صعصعہ نے حضرت کے دفن کے بعد کہی۔ امیرالمومنین کے جسدِ مبارک کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ جنازے میں اور تدفین میں چند مخصوص اصحاب کے علاوہ کوئی شریک نہیں تھا۔ ان میں سے ایک یہی صعصعہ تھے۔ جیسے ہی لوگ دفن سے فارغ ہوئے' صعصعہ قبر کے پاس آئے۔ ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھا' دوسرے ہاتھ سے ایک مٹھی خاک لیکر اپنے سر پر ڈالی اور کہا:

بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ امیرالمومنین میرے ماں باپ آپ پر قربان' هَنِيْئًا لَكَ يَا اَبَا الْحَسَنِ اے ابوالحسن! یہ موت آپ کو مبارک۔

پھر کہا:

لَقَدْ طَابَ مَوْلِدُكَ وَقَوِیَ صَبْرُكَ وَعَظُمَ جِهَادُكَ وَرَبِحَتْ تِجَارَتُكَ وَقَدِمْتَ عَلٰی خَالِقِكَ۔

آپ کی پیدائش بڑی بھاگوان تھی۔ آپ بڑے صابر تھے

آپ نے خوب جہاد کیا۔ آپ کا کام نفع بخش رہا یہاں تک کہ آپ اپنے خالق سے جا ملے۔

پھر کہا:

فَاَسْئَلُ اللّٰهَ اَنْ يَمُنَّ عَلَيْنَا بِاقْتِفَائِنَا اَثَرَكَ وَالْعَمَلِ بِسِيْرَتِكَ.

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہم کو آپ کے نقش قدم پر چلنے اور آپ کی سیرت پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے۔

فَقَدْ نِلْتَ مَا لَمْ يَنَلْهُ اَحَدٌ وَاَدْرَكْتَ مَا لَمْ يُدْرِكْهُ اَحَدٌ.

آپ نے وہ کچھ پایا جو کسی کو نہیں مل سکا اور آپ کو وہ مرتبہ حاصل ہوا جو کسی کو حاصل نہیں ہو سکا۔

آخر میں دوبارہ کہا:

وَهَنِيْئًا لَكَ يَا اَبَا الْحَسَنِ.

ابوالحسن آپ کو یہ شہادت مبارک۔

لَقَدْ شَرَّفَ اللّٰهُ مَقَامَكَ. اللہ نے آپ کو بڑا درجہ دیا۔ لَا اَحْرَمَنَا اللّٰهُ اَجْرَكَ وَلَا اَضَلَّنَا بَعْدَكَ فَوَاللّٰهِ لَقَدْ كَانَ حَيَاتُكَ مَفَاتِيْحَ لِلْخَيْرِ مَغَالِقَ لِلشَّرِّ۔ اللہ ہمیں اس اجر سے محروم نہ کرے جو آپ کی وجہ سے ہم کو ملنا چاہیے اور آپ کے بعد ہم کو گمراہی سے بچائے۔ خدا کی قسم آپ کی زندگی خیر کی کنجی اور برائیوں کے لیے روک تھی۔

وَلَوْ اَنَّ النَّاسَ قَبِلُوْا مِنْكَ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَلٰكِنَّهُمْ اٰثَرُوا الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ۔

اگر لوگ آپ کی بات مانتے تو ان پر چاروں طرف سے رزق کے دروازے کھل جاتے لیکن افسوس انھوں نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔

ثُمَّ بَكٰى بُكَاءً شَدِيْدًا وَاَبْكٰى كُلَّ مَنْ كَانَ مَعَهٗ۔ یہ کہہ کر معصومہ خود بھی بہت روئے اور جملہ حاضرین کو بھی رلایا۔

صحیح امتیاز اور غلط امتیاز

میں اس جلسے میں عدل و مساوات کے معنی کی تشریح کرنا اور یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرح کی اونچ نیچ اور فرق و امتیاز ہے جو انصاف کے منافی ہے۔ کیا ہر وہ تفاوت جو مختلف افراد کے درمیان کسی معاشرے میں پائی جائے، انصاف کے منافی ہے؟ کیا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی فرد کو کسی دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل ہی نہ ہو، یا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی بیجا اور نامناسب امتیاز حاصل نہ ہو؟ اگر دوسری شق مقصود ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بجا اور بیجا، مناسب اور نامناسب کا معیار کیا ہے؟ تفاوت اور امتیاز کس بنیاد پر ہو تو اسے بجا اور جائز سمجھا جائے گا، اور کس بنیاد پر ہو تو اسے بیجا اور ناجائز سمجھا جائے گا۔

امام علیؑ کی نظر میں عدل کی تعریف

میں نے پچھلے جلسہ میں امام علیؑ کا وہ جواب نقل کیا تھا جو آپ نے عدل وجود کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ جود و بخشش بہتر ہے یا عدل وانصاف؟ امام کا جواب یہ تھا کہ عدل بہتر ہے۔ آپ نے اس کی دو دلیلیں بھی دی تھیں۔ ایک دلیل یہ تھی کہ عدل ہر چیز کو اس کی اپنی صحیح جگہ پر رکھتا ہے اور جود و بخشش سے چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ عدل اس لیے بہتر ہے کہ اس سے سب لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ عدل اس لیے بہتر ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی اپنی صحیح جگہ پر رکھتا ہے۔

عدل وجود کے بارے میں امیر المومنینؑ کے جواب کی بنیاد اس قاعدے پر ہے کہ انصاف کا تقاضا یہ نہیں کہ افراد کے درمیان ہر قسم کا تفاوت ختم کر دیا جائے بلکہ اس پر ہے کہ جس کا جو حق ہو وہ اس کو ضرور ملے۔ یہاں جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استحقاق اور عدم استحقاق اور بیجا اور بیجا ہونے کا معیار کیا ہے؟

معاشرہ ایک زندہ جسم کی مانند ہے

پہلے کچھ تمہید عرض کرتا ہوں، بعد میں اس سوال کا جواب دوں گا۔ معاشرے کی اس سے بہتر تشبیہہ نہیں ہو سکتی کہ اسے زندہ جسم کہا جائے۔ جس طرح جسم اعضاء و جوارح کا مرکب ہے اور اس میں ہر عضو اپنا مخصوص کام

کرتا ہے اسی طرح معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور جن جن کاموں کی معاشرے کو ضرورت ہوتی ہے وہ مختلف افراد اور برادریوں کے درمیان پیشیوں کی شکل میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جسم کے اعضاء میں ہر عضو کا اپنا مقام اور درجہ ہوتا ہے۔ کوئی حکم دیتا ہے' کوئی قبول کرتا ہے۔ کسی کا درجہ کم ہوتا ہے اور کسی کا زیادہ۔ اسی طرح ہر معاشرے میں چاہے اس کا انتظامی ڈھانچہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور معاشرے میں کوئی بھی نظام حکومت کارفرما کیوں نہ ہو تقسیم کار کا ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ علیحدہ علیحدہ پیشے اور عہدے ہونے لازمی ہیں۔ ایک طرح کی درجہ بندی بھی ضروری ہے۔ ایک شخص سوچ کر منصوبہ بناتا ہے' دوسرا اسے عملی جامہ پہناتا ہے۔ ایک حکم دیتا ہے' دوسرا اس کی تعمیل کرتا ہے۔ ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوتا ہے' دوسرا ادنیٰ عہدے پر۔ معاشرے میں کوئی بھی نظام نافذ ہو' اس کی اپنی مخصوص تنظیم کا ہونا بہت ضروری ہے۔

جس طرح جسم تندرست اور بیمار ہوتا ہے اسی طرح معاشرہ بھی تندرست اور بیمار ہوتا ہے۔ جسم پیدا ہوتا ہے' نشوونما پاتا ہے' پھر اس کا انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور آخر موت واقع ہو جاتی ہے یہی حال معاشرے کا ہے۔ جسم اگر صحت مند ہو تو سب اعضاء مل جل کر کام کرتے ہیں۔ معاشرہ بھی اگر صحت مند اور زندہ ہو اور اس میں اجتماعی روح موجود ہو تو پھر اس کی بھی یہی صورت ہے۔

معاشرے کو جسم سے خود رسولِ اکرمؐ نے تشبیہ دی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ

إِذَا اشْتَكَىٰ بَعْضٌ تَدَاعَىٰ لَهُ سَائِرُ أَعْضَاءِ جَسَدِهِ بِالْحُمَّىٰ وَالسَّهَرِ۔

"مومنین میں جو آپس میں محبت و ہمدردی ہے اس کے لحاظ سے ان کی مثال ایک جسم کی سی ہے۔ جب جسم کے کسی حصّہ میں تکلیف ہوتی ہے تو سب اعضاء ایک دوسرے کو اس کی اطلاع دے دیتے ہیں اور بخار اور بے خوابی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے"۔

شیخ سعدی نے اپنے مشہور اشعار میں اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے:

بنی آدم اعضاء یک پیکرند
کہ در آفرینش زیک گوہرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار

جسم اور معاشرے میں اور بھی کئی باتوں میں مشابہت ہے۔

عام طور پر جب کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو ان میں ایک یا دو باتوں میں مشابہت ہوتی ہے لیکن جسم اور معاشرے میں دس سے زیادہ وجوہ مشابہت موجود ہیں اور شاید اور بھی زیادہ ہوں۔ اس لحاظ سے یہ تشبیہ اپنی نظیر آپ ہے۔

گو یہ تشبیہ بڑی جامع ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جسم اور معاشرے میں ہر لحاظ سے مماثلت ہے۔ کئی لحاظ سے جسم اور معاشرے میں بھی فرق ہے۔ عدل و انصاف کا مطلب واضح کرنے کے خیال سے ہم آج اس فرق کے

بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

زندہ جسم اور معاشرے کا فرق

ایک فرق یہ ہے کہ جسم میں ہر عضو کا مقام معلوم اور متعین ہے۔ نہ کسی عضو کی جگہ بدلتی ہے اور نہ اس کا کام۔ مگر معاشرہ جن افراد سے تشکیل پاتا ہے ان کی یہ صورت نہیں۔ آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں ہر ایک کا ایک معین مقام اور مخصوص کام ہے۔ آنکھ ہمیشہ آنکھ ہی رہتی ہے اور کان ہمیشہ کان ہی رہتا ہے۔ آنکھ کا کام ہمیشہ دیکھنا ہی ہے اور کان کا کام ہمیشہ سننا ہی۔ اسی طرح ہاتھ ہمیشہ ہاتھ ہی رہتا ہے اور پاؤں ہمیشہ پاؤں ہی۔ یہ ممکن نہیں کہ کان اپنی قابلیت کی بناء پر آنکھ کی جگہ لے لے یا ہاتھ، پاؤں ہو جائے اور پاؤں ہاتھ بن جائے۔ یہی حال اور سب اعضاء و جوارح کا ہے۔ دل، دماغ، پھیپھڑا، جگر، معدہ، آنتیں سب کا ایک ناقابلِ تغیر مقام ہے اور ہر ایک کو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام انجام نہیں دے سکتا۔

اب دیکھیے معاشرے کے افراد کی کیا صورت ہے؟ کیا یہ بھی اعضاء اور جوارح کی طرح ہیں؟ کیا ہر فرد اور ہر گروہ کا معاشرے میں اپنا ایک اور فقط ایک مخصوص مقام ہے؟ ہر فرد اور ہر گروہ فقط ایک ہی کام کے لیے بنا ہے اور اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ جس طرح آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، جگر وغیرہ کا کام معین اور معلوم ہے، کیا افراد اور مختلف ذاتوں اور برادریوں کا کام بھی مقرر ہے۔ ایک ذات کے لوگ وہی کام کرنے پر مجبور ہیں جو اس ذات سے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا کام یا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔ یا یہ بات

نہیں ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ صورت نہیں۔ اعضاء و جوارح خود کوئی عقل نہیں رکھتے، نہ اپنے ارادے سے ان میں اختیار اور انتخاب کا سلیقہ ہے۔ وہ اس روح کے تابع ہیں جو پورے جسم پر حکم فرما ہے۔ وہ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ کا مکمل مصداق ہیں لیکن معاشرے میں افراد کی یہ صورت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ معاشرہ بھی ذی حیات ہے۔ اس کی بھی روح ہے لیکن اس روحِ اجتماعی کو اپنے افراد پر اس درجہ قابو اور تسلط حاصل نہیں ہے۔

انسان کے مدنی الطبع ہونے کا مطلب

بہت زمانے سے حکماء کہتے آئے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی وہ فطرتاً سوشل ہے۔ بعد میں آنے والے فلاسفر نے اس فقرہ کا مزید تجزیہ یہ دیکھنے کے لیے کیا کہ انسان کے فطری طور پر سوشل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اگر یہ مطلب ہے کہ انسان اور نباتات و حیوانات (البتہ بعض حیوانات) میں فرق یہ ہے کہ انسان میں جو فطری استعداد موجود ہے اور جن کمالات کو حاصل کرنے کی انسان سے امید کی جا سکتی ہے ان کا فروغ معاشرتی زندگی ہی میں میسر آ سکتا ہے اور انسانی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے متمدن زندگی کا ہونا ضروری ہے جب تو یہ بات درست ہے لیکن اگر مطلب یہ ہو کہ قدرتی طور پر انسان معاشرتی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہے اور وہ اس کا ایسا فطری تقاضا ہے جس میں اس کے اختیار اور انتخاب کو دخل نہیں

جیسا کہ شہد کی مکھی، دیمک اور چیونٹی جیسے بعض جانوروں کے ساتھ یہی صورت ہے جن کی فطری ساخت ہی یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہی مل جل کر رہیں۔ ان کے افراد اجتماعی زندگی بسر کریں اور اپنا مخصوص کام اس طرح انجام دیتے رہیں جس طرح مختلف جسمانی اعضاء انجام دیتے ہیں تو انسان کے مدنی الطبع ہونے کا یہ مطلب صحیح نہیں۔ انسان کی معاشرتی زندگی اس طرح کی نہیں ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ انسان معاشرے سے الگ تھلگ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ علاوہ ازیں انسان میں کچھ ایسی پوشیدہ صلاحیتیں بھی موجود ہیں جو اجتماعی زندگی کے بغیر بروئے کار نہیں آسکتیں اور کچھ ایسی ضرورتیں ہیں جو اجتماعی زندگی کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں۔ یہ ضرورتیں اور صلاحیتیں انسانی خلقت کا ایک حصہ ہیں اور یہی ضرورتیں اور صلاحیتیں انسان کو اجتماعی زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہیں لیکن یہ بات انسان کے نسبتاً صاحب عقل و ارادہ اور ذی اختیار ہونے کے منافی نہیں۔ انسان نے اجتماعی زندگی کو خود اپنی عقل کے مطابق اور اپنے ارادے سے اختیار کیا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے مشہور فرانسیسی مفکر ژان ژاک روسو نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے Du Contrat Social یعنی قرارداد اجتماعی۔ یہ کتاب اسی نظریے پر مبنی ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی انسانوں کی باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہے۔ یہ کوئی جبری اور فطری چیز نہیں۔ اگرچہ روسو کا یہ نظریہ کہ انسان مدنی الطبع نہیں ہے، مجموعی طور پر قابل قبول نہیں لیکن ہمارے نظریے اس میں بھی شک نہیں کہ انسانی معاشرے کے قیام میں افراد کے اپنے انتخاب کو بھی دخل ہے۔ اس وقت ہم مزید اس فلسفیانہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے اور جسم میں کمال مشابہت کے باوجود

یہ فرق ہے کہ جسم کے ہر عضو کا مقام متعین اور معلوم ہے اور اس کا کام بھی مقرر ہے لیکن معاشرے کے افراد کی یہ صورت نہیں۔ جسم کے اعضاء ہی کچھ ہو سکتے ہیں جو وہ ہیں، لیکن معاشرے کے افراد اپنی محنت اور قابلیت سے کچھ بھی بن سکتے ہیں۔ معاشرے کے افراد کے لیے قدرتی اور فطری طور پر یہ مقرر نہیں کہ ان کا کیا مقام اور درجہ ہوگا اور وہ معاشرے میں کس نوعیت کی خدمت انجام دیں گے اور کیا پیشہ اختیار کریں گے۔ فرد کا معاشرے میں مقام مقرر نہیں، اس کے لیے عمل کا میدان وسیع اور کھلا ہوا ہے۔ ہر فرد اپنی لیاقت و قابلیت کے مطابق اپنے کام اور پیشے کا آزادی سے انتخاب کر سکتا ہے اس لیے اس کے مقام، پیشے اور عہدے میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ کسی کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ وہ لازماً فلاں کام اور فلاں پیشہ اختیار کرے گا اور فلاں دوسرا شخص وہ دوسرا کام کہ جس طرح آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں کا کام مقرر ہے اسی طرح یہ مقرر نہیں کہ معلم کون ہوگا، معمار کون ہوگا، بڑھئی کون ہوگا، تاجر کون ہوگا، کسان کون ہوگا، دوا ساز کون ہوگا، الیکٹریکل انجینئر کون ہوگا اور سول انجینئر کون ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ جسم کے اعضاء میں کام کی تقسیم اور درجہ بندی قدرتی ہے اور فطری طور پر ہر ایک کی جگہ مقرر ہے لیکن معاشرے میں یہ کام خود انسان کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ لوگ خود اپنا کام تقسیم کرتے اور اپنی درجہ بندی کرتے ہیں۔ میدانِ عمل سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ سب انسان ہیں، سب عقل رکھتے ہیں۔ سب صاحب ارادہ و اختیار ہیں۔ سب کی اپنی اپنی شخصیت ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ تقسیم کار کی صورت کیا ہونی چاہیے؟ درجہ بندی جس میں ادنیٰ و اعلیٰ اور پست و بالا کا

ہونا لازمی ہے، کس بنیاد پر ہو؟ معاشرے میں افراد کی جگہ مقرر کرنے کا معیار کیا ہو؟ کیا یہ سب باتیں طے کرنے کے لیے قرعہ اندازی ہونی چاہیے؟

طریقہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کسی پر کوئی زبردستی نہ کی جائے۔ سب کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ زندگی مقابلے کا میدان ہو اور مقابلے میں شرکت کا ہر شخص کو حق ہو۔ پھر ہر شخص اپنے ذوق اور استعداد کی مناسبت سے اور اپنی لیاقت اور محنت کے مطابق پیشہ اور کام اختیار کرے اور اپنا مقام پیدا کرے۔

تنازُع للبقاء

بعض لوگ زندگی کو میدان جنگ سے تشبیہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی تنازع للبقاء سے عبارت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جہد للبقاء کہا جائے کیونکہ تنازع میں لڑائی جھگڑے کا مفہوم شامل ہے۔ تو بعض لوگوں کے نزدیک زندگی کا مطلب ہی جنگ و جدال ہے۔ ان کے خیال میں انسانی زندگی میں سب سے بڑا اصول جو کارفرما ہے وہ مخاصمت اور دشمنی ہے۔ تعاون اور صلح جوئی تو جھگڑوں کے نتیجہ میں زبردستی انسان پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ اس وقت اس نکتہ پر بحث کا موقع نہیں۔ اجمالاً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ دراصل یہ بات صحیح نہیں ہے۔ لڑائی جھگڑا انسان کی فطرت کا لازمی جزو نہیں، البتہ زندگی میں مقابلہ فطری چیز ہے۔ زندگی اگر اپنے صحیح محور پر ہو تو اس میں بقاء کے لیے مقابلہ ضروری ہے لیکن زندگی کی دوڑ میں مقابلے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تو فرد کی آزادی دوسرے معاشرے میں نظم و ضبط تاکہ بدنظمی اور ابتری نہ پھیلنے پائے۔

اس مقابلے کی مزید وضاحت ضروری ہے۔

کسی جسمانی مقابلہ کا خیال کیجیے۔ مثلاً کشتی کا مقابلہ، دوڑ کا مقابلہ یا وزن اٹھانے کا مقابلہ۔ ان مقابلوں میں تمغے ملتے ہیں، انعام ملتے ہیں، عزت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ انعام کس کو ملتے ہیں؟ اس کو جس کی مقابلے میں کارکردگی بہتر ہو۔ پیدائش کے دن سے کسی کے ماتھے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کو وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے ہونے کا حق ہے اور کسی اور کو حق نہیں ہے بلکہ مقابلے میں سب کو شرکت کا حق ہے۔ شرکت کی آزادی ہے۔ ان ہی میں سے کچھ اپنی مشق اور محنت کی وجہ سے انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں اور کچھ یا تو فطری عدم صلاحیت کے باعث یا مشق اور محنت کی کمی کی وجہ سے انعام سے محروم رہتے ہیں۔ یہی حال کسی جماعت کے طلبہ کا ہے۔ وہ سال بھر ایک کلاس میں حاضر ہوتے ہیں۔ سبق پڑھتے ہیں۔ سال ختم ہونے پر ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔ ان کو نمبر دیے جاتے ہیں۔ کوئی پاس ہوتا ہے، کوئی فیل ہو جاتا ہے۔ کوئی اول آتا ہے، کوئی امتیازی نمبر حاصل کرتا ہے۔ باقی کو ان کی استعداد اور محنت کے مطابق نمبر ملتے ہیں۔

چونکہ معاشرے اور جسم میں فرق ہے اس لیے معاشرے کے افراد کے فرائض منصبی تخلیقی نظام کے تحت معین نہیں کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد اور خود مختار پیدا کیا ہے لہٰذا اس کا کام، مقام اور اس کی حیثیت اس طرح مقرر نہیں کی ہے کہ اس میں کوئی رد و بدل نہ ہو سکے بلکہ اس کو عمل کے لیے وسیع میدان دیا ہے۔ ان تمام امور کی بنا پر معاشرہ ایک طرح سے مقابلہ کا میدان ہے۔ افراد یہ مقابلہ جیت کر اور اپنی لیاقت، استعداد اور کارکردگی کا مظاہرہ کر کے دنیا کی مختلف نعمتیں اور حقوق حاصل

کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب لوگ اپنے ذوق اور استعداد کے لحاظ سے برابر ہیں اور سب ایک طرح سے کام کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لحاظ سے ہر شخص کی استعداد مختلف ہے۔ ہر ایک کا اپنا ذوق ہے اس لیے ہر شخص کو کسی کام میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور کسی کام میں کم لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ کوئی شروع ہی سے یہ سمجھ لے کہ وہ صرف ایک خاص کام کے لیے بنا ہے یا جس طرح جسمانی اعضاء کی جگہ مقرر ہے اسی طرح معاشرے میں اس کی کوئی جگہ مقرر ہے" اس لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرے میں مقابلے کا میدان ان تمام معاملات میں کھلا رہے اور سب کو اس مقابلے میں شرکت کا مساوی موقع دیا جائے اور معاشرہ ایسا منظم ہو اور اس کا انتظام اتنا عمدہ ہو کہ صرف وہی لوگ معاشرے میں آگے آ سکیں جو ان مقابلوں میں اپنی اہلیت اور قابلیت ثابت کر دیں۔

مقابلے کے دو خاص جزو

مقابلہ دو چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک تو وہ کام جس میں مقابلہ ہوتا ہے جیسے دوڑ، کشتی یا وزن اٹھانا۔ دوسرے وہ انعام اور عزت جو مقابلہ جیتنے والے کو ملتی ہے۔ معاشرہ بھی چونکہ مقابلے کا میدان ہے اس لیے اس میں بھی دو پہلو موجود ہیں۔ ایک تو وہ کام جس میں مقابلہ ہو اور دوسرے وہ حق اور حصہ جو اس کے نتیجہ میں کچھ لوگوں کو ملے۔

اب سوال یہ ہے کہ مقابلہ کس چیز میں ہونا چاہیے اور اس کا انعام کیا ہونا چاہیے۔ اس پر اگر تھوڑا سا غور کر لیا جائے تو مطلب حل ہو جاتا ہے۔ مقابلے کے کام تو وہی ہیں جو انسان کے لیے مفید ہیں اور جن سے

انسان کی سماجی زندگی وابستہ ہے۔

مقابلہ ان کاموں میں ہونا چاہیے جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ علم و فضل میں مقابلہ ہونا چاہیے، نیکی اور تقویٰ میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ عقل و سمجھ اور فہم و فراست میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ سعی و عمل میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ پیداواری کاموں اور خدمت میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والوں کا انعام ان کے وہ حقوق ہیں جن کے وہ اپنے کام، صلاحیت و لیاقت اور محنت کے مطابق مستحق قرار پائیں۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ افراد کے حقوق بمنزلہ اس انعام کے ہیں جو مقابلوں میں شرکت کرنے والوں کو دیے جاتے ہیں۔ یہ گویا کہ وہ نمبر ہیں جو طلبہ کو امتحان کے بعد دیے جاتے ہیں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ مقابلہ صرف ان کاموں میں ہوتا ہے جن کو مذہب نے خیر اور عملِ صالح قرار دیا ہے۔ اگر ہم ان دو باتوں کو سمجھ لیں تو ہماری سمجھ میں اچھی طرح آ جائے گا کہ کس کو انعام اور نمبر دیں اور کس کو نہ دیں۔ کس کو زیادہ دیں اور کس کو کم۔

میں نے پچھلے جلسوں میں کہا تھا کہ اسلام میں حق اور فرض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ یہ مقابلہ وہی حق اور فرض کا مقابلہ ہے۔ حقوق دراصل وہ نمبر ہیں جو فرض کے میدان میں مقابلہ کرنے والوں کو ملنے چاہئیں۔

اسلام میں حق اور فرض کا جو ساتھ ہے اگر ہم اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں، یہ سمجھ لیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زندگی ایک مقابلہ اور ایک دوڑ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی فرائض کی ادائیگی کا مقابلہ ہے، بقولِ نے وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش

کرتا ہے۔ ہم یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ زندگی کے مقابلے کا نتیجہ اور انعام سماجی حقوق سے بہرہ مند ہونا ہے۔ اگر ہم یہ سب باتیں بخوبی سمجھ لیں تو گویا ہم نے اسلام میں سماجی حقوق کا سب سے بڑا بنیادی اصول سمجھ لیا۔ یہ بنیادی اصول تمام معاملات میں ایک روشن چراغ کی طرح ہماری رہنمائی کرے گا اور ہمیں اندھیروں میں بھٹکنے نہیں دے گا۔

عدل یا مساوات

یہاں سے عدل کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں اور اس سوال کا جواب مل جاتا ہے جو میں نے شروع میں اٹھایا تھا۔ سوال یہ تھا کہ انصاف کا کیا مطلب ہے اور اس کے بالمقابل فرق و امتیاز اور تفاوت کا کیا مطلب ہے۔ کیا ہر قسم کا تفاوت جو معاشرے میں پایا جاتا ہو انصاف کے منافی ہے؟ کیا عدل کا مطلب مکمل مساوات ہے؟ یا عدل کا مطلب نہ صرف مکمل مساوات نہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ امتیاز اور تفاوت باقی رہے۔ انصاف کا تقاضا صرف یہ ہے کہ فرق و امتیاز بیجا اور بلا استحقاق نہ ہو۔ اس دوسری صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بجا اور بیجا کا معیار کیا ہے؟

یہ تو معلوم ہو گیا کہ انصاف کے یہ معنی نہیں کہ سب کا ایک ہی مقام اور ایک ہی درجہ ہو۔ معاشرے میں مختلف مقامات اور مختلف درجات کا ہونا لازمی ہے۔ اس معاملے میں بھی انسانی معاشرے کی مثال انسانی جسم کی سی ہے۔ جب مقامات اور درجات میں تفاوت ہوا تو درجہ بندی بھی ضروری ہو گئی۔ اس کی واحد صورت یہ ہے کہ افراد کو آزاد چھوڑ دیا

جائے اور مقابلے کے لیے راہ ہموار کر دی جائے۔ چونکہ سب کی استعداد یکساں نہیں اور نہ سب برابر محنت اور کوشش کرتے ہیں اس لیے خود بخود فرق اور تفاوت پیدا ہو جائے گا۔ کوئی آگے نکل جائے گا، کوئی پیچھے رہ جائے گا۔ کوئی بہت آگے بڑھ جائے گا، کوئی بہت پیچھے رہ جائے گا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو فرق معاشرے میں ناگزیر ہے وہ استعداد اور لیاقت کے تابع ہو۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو طلبہ امتحان میں شرکت کریں، ان میں ہر ایک کو اتنے ہی نمبر دیے جائیں جتنے نمبروں کا وہ مستحق ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں کہ سب کو برابر نمبر دے دیے جائیں اور یہ کہا جائے، اگر یکساں نمبر نہ دیے گئے تو یہ امتیاز ہوگا جو ظلم ہے۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ اگر سب کو برابر نمبر دیے گئے تو اس صورت میں حقدار کا حق مارا جائے گا۔ یہی دراصل ظلم ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ چیمپئن شپ کے مقابلوں میں ہارنے اور جیتنے کا معیار لیاقت، کوشش اور اپنے فن کی نمائش ہو۔ یہ انصاف کا تقاضا نہیں کہ ماہر فن اور اناڑی کو ایک آنکھ سے دیکھا جائے اور لائق اور نالائق میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے اس طرح کی مساوات تو عین ظلم اور بے انصافی ہے البتہ جس فرق کی بنیاد قابلیت اور کارکردگی پر ہو وہ عین انصاف ہے۔ انصاف کا تقاضا مساوات ضرور ہے لیکن صرف یکساں قانونی حالت میں یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو لوگ کسی علمی یا جسمانی مقابلے میں شرکت کریں، ان کے مابین ان امور کے علاوہ جن کا تعلق استعداد، ہنر اور لیاقت سے ہے کسی اور بنیاد پر فرق کیا جائے۔ مثلاً اس بنیاد پر کہ ایک گورا ہے، دوسرا کالا یا فرض کرو ایک نوابزادہ ہے، دوسرا کسی غریب کا بیٹا۔ ایک کے پاس سفارش ہے دوسرے کے پاس نہیں۔ ایک کے

حامیوں کا جتھا ہے' دوسرے کا کوئی مددگار نہیں۔ ایک کی استاد یا رنگریزی سے رشتہ داری ہے یا برادری کا تعلق ہے' دوسرے کا نہیں۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کو کامیابی یا ناکامی میں دخل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ وہ امور ہیں جن کا تعلق قابلیت' استعداد' کارگزاری اور کوشش سے نہیں ہے۔ اگر قابلیت اور استعداد کا لحاظ رکھے بغیر سب کو مساوی نمبر دے دیے جائیں اور کوئی امتیاز روانہ رکھا جائے تو یہ بھی ظلم ہوگا اور اگر فرق تو کیا جائے لیکن فرق کا معیار اس قسم کی باتوں کو بنایا جائے تو یہ بھی ظلم ہوگا۔

یہ فرق بےجا اور بیجا تفاوت ہیں اور روا اور ناروا امتیاز ہیں' اور یہی معنی ہیں اس فقرہ کے کہ اَلْعَدَالَةُ اِعْطَاءُ کُلِّ ذِی حَقٍّ حَقَّهٗ یعنی انصاف یہ ہے کہ ہر حقدار کو اس کا صحیح حق دیا جائے اور یہی مطلب ہے امیرالمومنین سلام اللہ علیہ کے اس قول کا جس میں آپ نے فرمایا:

اَلْعَدْلُ یَضَعُ الْاُمُوْرَ مَوَاضِعَهَا۔ ہر چیز کو اپنی صحیح جگہ پہ رکھتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ عدل سب کو ایک ہی درجہ اور مرتبہ میں رکھتا ہے اور سب کو بلا امتیاز ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اجتماعی امور میں سماجی حقوق اور سماجی فوائد حاصل کرنے کے ایک عمل مقابلے کی صورت پیدا کی جائے اور اس پر عمل ہو۔ مساوات اور سب کو ایک آنکھ سے دیکھنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ کام میں ذاتیات کا سوال قطعاً نہ ہو۔ شخصی اور طبقاتی فرق کا لحاظ نہ کیا جائے اور سب کو برابر سمجھا جائے۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا: اَلنَّاسُ کَاَسْنَانِ الْمُشْطِ۔ لوگوں کی مثال کنگھی کے دندانوں کی سی ہے یعنی سب برابر ہیں یا آپ نے فرمایا ہے: اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ کُلُّکُمْ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ

"تمہارا پروردگار ایک ہے۔ تم ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔"

یعنی کسی طرح کا شخصی امتیاز، فرق اور برتری ایسی نہیں ہونی چاہیے، جس کی بنیاد علم و فضل تقویٰ و طہارت اور عمل و لیاقت پر نہ ہو۔ اس لیے آپ نے اس جملہ کا بھی اضافہ فرمایا: وَلَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔ قرآن کریم رنگ و خون اور نسل و جنس کے تمام امتیازات کو لغو قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے: اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ "ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پہچان کے لیے قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے۔"

اس کے فوراً بعد کہا گیا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ یہاں تقویٰ پر مبنی امتیاز کا باضابطہ اعتراف کیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ عالم و جاہل اور متقی اور غیر متقی ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اہلِ ایمان اور نیک کام کرنے والوں کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کو برابر کر دیں اور اہلِ تقویٰ کو بدکاروں کے برابر درجہ دیدیں۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

"کہدیجیے کہ کیا عالم و جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ سمجھدار

لوگ ہی یہ بات سمجھتے ہیں کہ برابر نہیں ہوسکتے۔"
ایک اور جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا "گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں اللہ نے جہاد کرنے والوں کو اپنے فضل سے بڑا اجر دیا ہے۔"
سورۂ زخرف میں ارشاد ربانی ہے:
اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا "کیا وہ لوگ آپ کے پروردگار کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟ یہ تو ہم نے دنیا جہان کی نعمتیں ان لوگوں میں اس دنیاوی زندگی میں تقسیم کی ہیں اور ان میں سے کچھ کو بعض دوسروں سے بڑھ کر بنایا ہے" اور یہی فرق اس کا باعث ہوکر لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور زندگی کا سماجی نظام استوار ہوسکے۔

اہلیت کے لحاظ سے افراد میں فرق

افراد کی صلاحیت میں قدرتی فرق تخلیق کا شاہکار ہے خصوصاً اگر یہ بات نظر میں رکھی جائے کہ اگر کسی ایک کو ایک لحاظ سے امتیاز اور تفوق حاصل ہے تو کسی دوسرے کو کسی دوسرے لحاظ سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور سب کو ایک دوسرے

کی ضرورت ہے۔

دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کی کوشش یہ ہے کہ عدل و مساوات کا قیام ہو۔ اس کام میں ان کو جتنی بھی کامیابی ہوئی ہے، اس کی یہ صورت نہیں ہے کہ اہل اور نا اہل، ہوشیار اور احمق، مستعد اور کاہل، ہونہار اور اناڑی، دیانتدار اور بددیانت، خدمت گزار اور خائن میں عدل اور مساوات کے نام پر امتیاز نہ کیا جائے۔ ان میں امتیاز نہ کرنا انصاف نہیں بلکہ ظلم ہوگا۔

حقیقی مساوات

مساوات یہ ہے کہ سب کو مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ ترقی کا میدان سب کے لیے بطور یکساں کھلا ہوا ہو۔ راہ سب کے لیے ہموار ہو تاکہ اگر کوئی ہمت کرے تو وہ چاہے کہیں بھی ہو اور اس کا کسی طبقہ سے بھی تعلق کیوں نہ ہو، وہ اس مقام تک پہنچ سکے جس کا وہ اپنی اہلیت، قابلیت اور محنت کے مطابق حقدار ہو۔ اس پر بھی اگر کوئی کوتاہی کرے تو نتیجہ کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔

مثلاً تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہر شخص کے لیے فراہم ہونا چاہیے۔ تاکہ سب اسکول جا سکیں۔ اعلیٰ تعلیم کا موقع بھی سب کے لیے فراہم ہو۔ یہ نہ ہو کہ ایک کے لیے تو تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہو اور دوسرے کے لیے نہ ہو۔ ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے دوسرا نہ کر سکے۔ سب کے لیے بطور مساوی اس طرح موقع ہونا چاہیے کہ کسی دور دراز علاقے کے کسان کا بچہ بھی اپنی علمی اور اجتماعی صلاحیت کو بروئے کار لاسکے۔ اس کے

لیے بھی ایسے وسائل موجود ہوں کہ وہ درجہ بدرجہ ترقی کر کے مثلاً کسی مضمون میں تخصص کے درجہ تک پہنچ سکے اور اگر اس میں ضروری قابلیت ہو تو مثلاً وزیر بن جائے۔

بیجا فرق و امتیاز کا مطلب یہ ہے کہ سب کے لیے کام کرنے کا مساوی موقع موجود نہ ہو۔ ایک کے لیے ترقی کرنا ممکن ہو اور دوسرے کے لیے نہ ہو۔ ایک نیچے رہنے پر مجبور رہو، دوسرے کو اس کی نالائقی کے باوجود ہاتھ پکڑ کر کرسی وزارت و صدارت پر بٹھا دیا جائے۔

معاشرے کی حالت ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ جب کسی وقت فراقری پیدا ہو تو اس وقت علم و ہنر کی قدر معلوم ہو اور اس وقت عقلمند دیہاتی کے بچے وزارت تک پہنچ جائیں کم عقل وزیر کے بچے بھیک مانگنے چل دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ منصفانہ اور متوازن معاشرہ وہی ہے جس میں مساوات کا قانون حکم فرما ہو جس میں سب کے لیے مساوی مواقع موجود ہوں جس میں افراد کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جاتا ہو کہ عملاً علمی اور جسمانی مقابلہ ہوتا رہے۔ ایسے معاشرے کی ہمیشہ یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ دیہاتیوں کے ایسے بچے جن میں اہلیت اور استعداد ہو اعلیٰ ترین مناصب تک پہنچ سکیں اور اعلیٰ عہدیداروں کے کم عقل بچے پیچھے رہ جائیں اور ناکام ہوں۔

حسب فرمان رسول اکرمؐ ایسے معاشرے میں سب افراد مساوی مواقع کے لحاظ سے کنگھی کے دندانوں کی مانند ہوں اور اعزاز حاصل کرنے کے لحاظ سے آیات کریمہ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

کا مصداق ہوں۔ یہ سب کچھ ایک عام معمول ہونا چاہیے۔

کیا صدرِ اسلام میں ایسا نہیں ہوا تھا؟ کیا اس آیت کریمہ کا سماں نظروں میں نہیں پھر گیا تھا کہ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔

یعنی ہم کو یہ منظور تھا کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جو دنیا میں مستضعف یعنی کمزور۔ جنھیں علم و عمل کے میدان میں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا اور جن کے حقوق پامال۔ کر دیے گئے تھے ان کو دنیا کا پیشوا اور زمین کا وارث بنا دیں۔ (سورہ قصص آیت ۵)

کیا صدرِ اسلام میں عبداللہ بن مسعود جیسے غلاموں اور غلام زادوں نے عزت و مرتبہ حاصل نہیں کیا تھا؟ کیا ابوجہل، ابولہب اور ولید بن مغیرہ جیسی بااثر شخصیتیں خاک میں نہیں مل گئی تھیں؟ کیا خاک نشین اور غلام اپنی لیاقت، تقویٰ اور نیک اعمال کی بدولت قوم کے سردار نہیں بن گئے تھے؟ اور کیا نالائق اور بدعنوان سردارانِ قوم ذلت کے گڑھوں میں نہیں گر گئے تھے؟

غیر طبقاتی اسلامی معاشرہ

یہ مسلّم ہے کہ اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے۔ وہ اس امر کا قائل ہے کہ معاشرے کی اپنی شخصیت ہے۔ معاشرہ پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔ معاشرہ بنتا ہے اور بگڑتا ہے۔ اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خرابیاں بھی۔ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ معاشرے کا مفاد فرد کے مفاد پر مقدم ہے لیکن ان

سب باتوں کے باوجود اسلام کے معاشرتی نظام میں افراد کے حقوق اور ان کے واقعی امتیازات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اسلام فرد کو شخصی لحاظ سے معاشرے کے مقابلے میں بے حقیقت نہیں سمجھتا۔ بعض دوسرے منکرین کی طرح وہ یہ نہیں کہتا کہ فرد بیکار محض ہے۔ جو کچھ ہے معاشرہ ہی ہے۔ حق صرف معاشرے کا ہے۔ فرد کا کوئی حق نہیں۔ مالک معاشرہ ہے' فرد نہیں۔ اہمیت معاشرے کی ہے' فرد کی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام شخصی حقوق کا قائل ہے۔ فرد کی اہمیت اور آزادی کا قائل ہے۔ وہ اس بات کو انصاف نہیں سمجھتا کہ فرد معاشرے میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس کے نزدیک انصاف یہ ہے کہ معاشرے میں مکمل مقابلے کے حالات پیدا کیے جائیں اور اس مقابلے کے نتیجے میں جو کام کی لگن' فرائض کی بجا آوری اور فضیلت و شرف کے میدان میں ہوتا ہے افراد کو خاص حقوق و امتیازات دیے جائیں۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام نے ایسے فرق و امتیاز کی جس کا تعلق علم' تقوی' عمل اور جہاد فی سبیل اللہ سے نہ ہو' سختی سے مخالفت کی ہے۔ ایسے امتیاز کی نہ صرف اسلامی احکام میں مذمت کی گئی ہے بلکہ ائمہ اور پیشوایانِ دین کا عمل بھی اس کے خلاف رہا ہے۔

اسلامی معاشرے کے غیر طبقاتی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاشرہ فرضی اور بے بنیاد امتیازات کا قائل نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اس فرق کو بھی زبردستی نظر انداز کر دیتا ہے جس کی اساس' اہلیت' لیاقت اور اکتسابِ علم و ہنر پر ہو۔

جویبر اور زلفاء

یمامہ کے ایک شخص نے مدینہ آکر اسلام قبول کیا۔ یہ صاحب اچھے مسلمان بن گئے۔ اسلامی تعلیم و تربیت حاصل کرلی۔ ان کا نام جویبر تھا۔ پستہ قد، بدشکل اور سیاہ فام آدمی تھے اور ساتھ ہی بہت غریب بھی چونکہ ان کا مدینہ میں کوئی نہیں تھا اس لیے رات کو مسجد میں سوتے تھے۔ دراصل مسجد کے سوا ان کا کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے ہی جیسے کچھ دوست بنالیے یعنی کچھ اور ایسے مسلمان پیدا ہوگئے جو جویبر کی طرح غریب بھی تھے اور پردیسی بھی۔ رسولؐ اللہ کی ہدایت کے بموجب یہ لوگ بھی عارضی طور پر مسجد میں رہنے لگے۔

آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ اللہ کا حکم آیا کہ مسجد کو پاک اور صاف رکھا جائے۔ مسجد سونے کی جگہ نہیں ہے۔ علی مرتضیٰؑ اور فاطمہ زہراؑ کے گھر کے سوا جن گھروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، وہ سب دروازے بند کردیے گئے اور مسجد کی طرف سے گھروں میں آمدورفت بند کردی گئی تاکہ مسجد کا احترام محفوظ رہے۔

رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ ان چند بے گھر غریبوں کے لیے ایک کونے میں ایک سائبان ڈال دیا جائے تاکہ اس کی چھت کے نیچے یہ لوگ رہ سکیں۔ اس جگہ کا نام صُفّہ رکھا گیا اور یہ لوگ اصحابِ صُفّہ کے نام سے مشہور ہوگئے۔

جویبر بھی ان ہی اصحابِ صُفّہ میں سے ایک تھے۔ رسولؐ خدا اور عام مسلمان ان سے محبت کرتے تھے اور ان کے گزارہ کا انتظام کرتے تھے۔ ایک دن رسولِ اکرمؐ نے جویبر کو دیکھ کر فرمایا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر تم شادی

کر لیتے۔ تمہاری جنسی ضرورت بھی پوری ہو جاتی اور بیوی سے دین و دنیا کے کاموں میں مدد بھی ملتی۔

جویبر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے بیوی کہاں سے ملے گی؟ میرے پاس حسب ہے نہ نسب، نہ مال اور نہ جمال۔ کون عورت میری بیوی بننا پسند کرے گی؟ آپ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ وَضَعَ بِالْاِسْلَامِ مَنْ کَانَ بِالْجَاھِلِیَّۃِ شَرِیْفًا وَشَرَّفَ بِالْاِسْلَامِ مَنْ کَانَ بِالْجَاھِلِیَّۃِ وَضِیْعًا وَاَعَزَّ بِالْاِسْلَامِ مَنْ کَانَ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ ذَلِیْلًا۔

جویبر! اللہ نے اسلام کے سبب سے قدریں بدل دیں۔ بہت سی چیزیں جو دورِ جاہلیت میں بیش قیمت تھیں کم قیمت رہ گئیں۔ بہت سے لوگ جاہلیت کے غلط نظام میں محترم سمجھے جاتے تھے اسلام نے انکی وقعت کم کر دی اور بہت سے لوگ جو جاہلیت میں حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اسلام نے ان کو سربلند کر دیا۔

فَالنَّاسُ الْیَوْمَ کُلُّھُمْ اَبْیَضُھُمْ وَاَسْوَدُھُمْ قُرَشِیُّھُمْ وَعَرَبِیُّھُمْ وَعَجَمِیُّھُمْ مِنْ اٰدَمَ وَاِنَّ اٰدَمَ خَلَقَہُ اللّٰہُ مِنْ طِیْنٍ۔

آج سب لوگ گورے، کالے، قریشی، عربی، عجمی فرزندانِ آدم ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔ جویبر! خدا کو سب سے محبوب وہ ہے جو سب سے زیادہ احکامِ الٰہی پر عمل کرتا ہو۔ کوئی مسلمان وہ مہاجر ہو یا انصاری تم سے بہتر نہیں ہو سکتا مگر تقویٰ کی بدولت۔

پھر فرمایا: جاؤ، زیاد بن لبید انصاری کے گھر جا کر ان سے کہو کہ رسولؐ اللہ نے مجھے آپ کے پاس آپ کی لڑکی زلفاء کے رشتہ کے لیے بھیجا ہے۔

جویبر رسولؐ اللہ کے حکم کے بموجب زیاد بن لبید کے گھر گئے۔ زیاد انصاری تھے اور اہلِ مدینہ میں محترم شمار ہوتے تھے۔ جب جویبر پہنچے تو زیاد کے کئی رشتہ دار ان کے گھر جمع تھے۔ جویبر اجازت لے کر اندر گئے اور وہاں بیٹھ کر زیاد سے مخاطب ہو کر کہا: میں رسول اللہ کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ آپ کہیں تو سب کے سامنے کہہ دوں یا پھر تنہائی میں کہوں؟

زیاد نے کہا: ایسی کیا بات ہے۔ سب کے سامنے کہو۔

جویبر نے کہا: مجھے رسول اللہ نے بھیجا ہے تاکہ میں اپنے لیے آپ کی لڑکی زلفاء کا رشتہ مانگوں۔ اب آپ کیا کہتے ہیں، آپ جو جواب دیں میں رسولؐ اللہ سے جا کر کہہ دوں۔

زیاد نے حیرت سے پوچھا: کیا واقعی تمہیں رسولؐ اللہ نے رشتہ کے لیے بھیجا ہے؟

جی ہاں! رسولؐ اللہ نے بھیجا ہے۔ اب میں رسولؐ اللہ پر بہتان باندھنے سے تو رہا۔ جویبر نے جواب دیا۔

زیاد نے کہا: ہمارے یہاں یہ دستور نہیں کہ کسی غیر کو بیٹی دیں۔ ہم تو رشتہ بیاہ اپنے ہم کفو انصاریوں ہی میں کرتے ہیں۔ اچھا، تم جاؤ میں خود رسولؐ اللہ سے بات کروں گا۔

جویبر باہر آئے تو سوچنے لگے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالےٰ

نے اسلام کے ذریعہ قبیلہ خاندان اور نسب پر گھمنڈ ختم کر دیا ہے مگر صاحب تو کہہ رہے ہیں ہمارے یہاں دستور نہیں کہ غیر کفو کو بیٹی دیں۔ ان کی بات تو قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ جب جویبر جا رہے تھے تو لوگوں نے سنا کہ وہ آہستہ سے کہہ رہے تھے:

وَاللّٰهِ مَا بِهٰذَا نَزَلَ الْقُرْاٰنُ وَلَا بِهٰذَا ظَهَرَتْ نُبُوَّةُ مُحَمَّدٍ۔

یہ بات نہ قرآن میں نازل ہوئی ہے اور نہ پیغمبرِ اسلام اس کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔

چلتے چلتے جب جویبر آپ ہی آپ یہ باتیں کر رہے تھے تو زیاد کی بیٹی زلفاء نے بھی ان کی بات سن لی۔ باپ سے پوچھا قصہ کیا ہے؟

زیاد نے سب قصہ بیان کر دیا۔

بیٹی نے کہا: خدا کی قسم! جویبر جھوٹ نہیں بول رہے۔ کوئی بات ایسی نہ کرو کہ یہ مایوسی کے عالم میں رسولؐ اللہ کے پاس پہنچیں۔ بہتر یہ ہے کہ کسی کو بھیج کر جویبر کو واپس بلوا لو۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جویبر کو واپس گھر بلا لیا گیا۔

اس کے بعد زیاد خود رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا:

میرے ماں باپ آپ پر قربان! جویبر آپ کی طرف سے ایسا پیغام لے کر آئے تھے۔ ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ ہم اپنوں ہی میں بیٹی دیتے ہیں۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا:

يَا زِيَادُ جُوَيْبِرٌ مُؤْمِنٌ وَالْمُؤْمِنُ كُفْوُ الْمُؤْمِنَةِ

وَالْمُسْلِمُ كُفْوُ الْمُسْلِمَةِ۔

زیاد! جویبر مومن ہے اور مومن مرد مومن عورت کا اور مسلمان مرد مسلمان عورت کا کفو ہوتا ہے اس لیے اپنی بیٹی کی شادی سے انکار نہ کرو۔

زیاد واپس گھر آئے اور سب قصہ بیٹی سے بیان کیا۔

زلفاء نے کہا کہ مجھے منظور ہے۔ جب رسول اللہؐ نے جویبر کو بھیجا ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے؟

زیاد جویبر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رشتہ داروں کے پاس لے گئے اور سنت کے مطابق اپنی بیٹی کا نکاح اس سیاہ فام سے کر دیا۔ چونکہ جویبر کا اپنا گھر نہیں تھا، زیاد نے ہی ایک مکان کا انتظام کر کے اس کو ضروری سامان سے سجا دیا۔ بیٹی کو جہیز دیا اور وہ اس کے شوہر کے گھر بھجوا دیا۔ دو جوڑے کپڑوں کے جویبر کے لیے بھی تیار کیے۔ جب جویبر اس شان سے دلہن کے کمرے میں پہنچے تو بارگاہِ احدیت کی نسبت جس نے ان کی اتنی قدر افزائی کی تھی تشکر و امتنان کے جذبات سے ان کی روح سرشار ہو گئی۔ شکر و سپاس گزاری کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ گھر کے ایک کونے میں جا کر صبح تک اپنے اللہ سے راز و نیاز اور شکر و سپاس میں مشغول رہے۔ جب دیکھا تو صبح ہو چکی تھی۔ اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھ لیا۔ تین دن تین رات اس روحانی وجد و سرور کی کیفیت میں گزر گئے۔ رفتہ رفتہ دلہن کے میکے والوں کو تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں خدانخواستہ ایسا تو نہیں کہ اس شخص کو بیوی کی ضرورت ہی نہ ہو۔

جب اس معاملے کی اطلاع رسول اللہؐ کو دی گئی تو آپ نے جویبر کو

بلا کر ان سے ماجرا پوچھا۔

جویبر نے کہا: یا رسول اللہ! جب میں اس گھر میں گیا اور وہاں کا سامان دیکھا اور یہ دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی بھی موجود ہے اور یہ سب چیزیں میری اپنی ہیں تو مجھے خیال آیا کہ میں تو غریب اور اس شہر میں پردیسی تھا، یہ سب اللہ کی دین اور اس کا فضل ہے جو اس نے اسلام کی وجہ سے مجھ پر کیا ہے اور اس پر میرا دل چاہا کہ میں اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے رات عبادت میں گزار دوں۔ اگلے دن میں نے شکرانہ کا روزہ رکھ لیا۔ تین دن اسی حالت میں گزر گئے۔ رات کو عبادت کرتا تھا اور دن میں روزہ رکھتا تھا۔ اب البتہ میں اپنی بیوی کے پاس جاؤں گا۔

عدم مساوات کو دور کرنے کی طرف رسول اکرمؐ کی توجہ

جب ہم رسولِ اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان اختلافات کو دور کرنے کی طرف آپ کی خاص توجہ تھی جو رفتہ رفتہ عادت بن گئے تھے اور جن کا تعلق علم و عمل، اور فضیلت و سبقت الی الخیرات میں مقابلے سے نہیں تھا۔ یہ صرف عادات تھیں جنہوں نے ناہمواری اور بے جا پستی و بلندی پیدا کر دی تھی۔ آپ کی کوشش تھی کہ اس ناروا فرق کو قطعاً مٹا دیا جائے۔

مثلاً آپ اس کا خیال رکھتے تھے کہ آپ کی مجلس میں لوگ باہم حلقہ بنا کر بیٹھیں اور کوئی صدر اور کوئی پائین مجلس نہ ہو۔ آپ کا حکم تھا کہ مجلس میں

اور تو جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ۔ اپنے لیے کوئی ایک خاص جگہ مقرر نہ کرو اور وہ جگہ حاصل کرنے کے لیے زور نہ لگاؤ۔ جب آپ خود کسی محفل میں تشریف لے جاتے تو آپ کو یہ پسند نہیں تھا لوگ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہوں۔ اگر کبھی کھڑے ہو جاتے تو آپ منع کرتے اور بیٹھے رہنے کا حکم دیتے۔ آپ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے کہ جب آپ سوار ہوں تو کوئی اور شخص پیدل چلے۔ یا تو اس کو سوار کر لیتے تھے یا کہتے تھے تم آگے جاؤ یا بعد میں آؤ۔ بہر حال اس کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے کہ وہ پیدل آپ کے ہمرکاب چلے۔ آپ خالی زمین پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہتے تھے۔

سیرت نبوی کا اجتماعی پہلو

ممکن ہے کہ ہم اس سب کو آنحضرتؐ کی فروتنی اور تواضع پر محمول کریں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ میں انتہا درجہ کی تواضع تھی۔ آپ ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے تھے کہ آپ اللہ کے بندے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ ذات باری کی عظمت کے بالمقابل اپنے آپ کو ایسا عبدِ ضعیف سمجھا کہ جس کے ہاتھ میں نہ نفع ہے نہ نقصان، جس کو موت پر قابو ہے نہ زندگی پر۔ جس کی یہ حالت ہو ظاہر ہے کہ وہ کس قدر متواضع اور بندگانِ خدا پر مہربان ہوگا۔ آپ کی تاریخ حیات آپ کی تواضع، فروتنی، مہربانی اور خالق کے سامنے اظہارِ عبودیت کے واقعات سے پُر ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ میں سب خوبیاں ہیں مگر ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ آپ رکھ رکھاؤ سے کام نہیں لیتے۔ آپ اپنے آپ سے غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ آپ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: مجھ سے بڑھ کر بندہ اور غلام اور کون ہوگا۔

اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ ؟

اس میں شک نہیں کہ آپ کی تواضع اور انکسار کا اخلاقی پہلو بھی تھا۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان معاملات کے اجتماعی پہلو پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہ القاب و آداب اور امتیازات جو بظاہر معمولی بات معلوم ہوتے ہیں' کس طرح افراد کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل ہو جاتے ہیں اور دونوں میں بُعد پیدا کر دیتے ہیں۔

یہی باتیں ہیں جن سے ناہمواری اور پستی و بلندی وجود میں آتی ہے۔ جو یکجہتی اور مساوات کی راہ میں چٹان بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یہ چیزیں جو ابتدا میں محض اعتباری اور خیالی معلوم ہوتی ہیں' انجام کار ایک خارجی حقیقت میں بدل جاتی ہیں۔ یہی غلط احترام اور جھوٹے القاب و آداب بیجا فرق و امتیاز کا بیج بوتے ہیں۔

میرے ایک استاد تھے' بڑے متقی اور عابد و زاہد۔ ان کا خیال تھا کہ پچھلی نصف صدی میں ایک کام اچھا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ القاب و آداب کی مخالفت ہونے لگی ہے۔

ایک سفر میں رسولِ خدا کے ساتھ ان کے اصحاب بھی تھے۔ دوپہر کو ایک منزل میں قیام ہوا۔ طے پایا کہ ایک بکری ذبح کی جائے اور دوپہر کے کھانے میں اس کا گوشت کھایا جائے۔ ایک صحابی نے کہا کھال اتارنا میرے ذمہ۔ ایک دوسرے صحابی نے کہا گوشت میں پکاؤں گا۔ رسول اللہ نے فرمایا صحرا سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لانا میرا کام ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تکلیف نہ کریں۔ آپ آرام کریں' ہم بخوشی سب کام کرلیں گے۔ ہم آپ کو زحمت دینا نہیں

چاہتے۔ آپ نے فرمایا: میں جانتا ہوں تم سب کام کر لو گے لیکن اِنَّ اللّٰہَ یَکْرَہُ مِنْ عَبْدِہٖ اَنْ یَرَاہُ مُتَمَیِّزًا بَیْنَ اَصْحَابِہٖ۔ اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی بندہ اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے ممتاز خیال کرے۔

رسولِ کریمؐ اور ائمۂ اطہارؑ کی سیرت میں ایسے معاملات اور قصے بہت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ اس طرح کی عادات جو ابتدا میں معمولی بات معلوم ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ حقوق میں بے جا تفاوت کی شکل میں نکلتا ہے ان کی اصلاح کرتے رہیں۔

بات کا خلاصہ

بات کا خلاصہ یہ ہے کہ عدل و مساوات کے یہ معنی ہیں کہ اس فرق اور امتیاز، ناہمواری اور اونچ نیچ کو مٹا دیا جائے جس کی بنیاد رسم و رواج، عادات یا زور و زبردستی پر ہو لیکن اس اختلاف و تفاوت کو جس کا منشا افراد کی قابلیت، اہلیت اور کارکردگی ہو اس کو باقی رکھا جائے۔ جس طرح مقابلے کے میدان کی سطح کو ہموار رکھا جاتا ہے، اسی طرح سوشل ترقی کے مواقع سب کو برابری کی بنیاد پر فراہم کیے جائیں اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ اس مقابلے میں سب کو مساوی طور پر شرکت کا موقع مل سکے۔

لیکن مقابلے میں ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جس کا مقابلے کے میدان اور مقابلے کی شرائط سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق خود مقابلہ کرنے والوں سے ہوتا ہے۔ ایک شخص دوسروں سے پھرتیلا اور مستعد ہے۔ ایک دوسروں کی نسبت دبلا و پتلا ہے۔ ایک زیادہ باہمت ہے، ایک زیادہ محنت و کوشش کرتا ہے۔ ایک کی مشق زیادہ ہے۔ اس طرح کا فرق بھی

مقابلے کے نتیجہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی فرق کی بنا پر کوئی آگے نکل جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔

مقابلے کے میدان کی جس ناہمواری کو اسلام کے نقطۂ نظر سے دور کرنا مناسب ہے اس کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کو بیان کرنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا۔ ان پانچ جلسوں میں جو گفتگو ہوئی ہے اس کی مناسبت سے میں اگلے جلسے میں اللہ تعالےٰ کی رزاقیت کے بارے میں گفتگو کروں گا اور بتاؤں گا کہ ہم خدا کو جو رزاق سمجھتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے اور اس کا حق اور فرض کے مسئلے سے جس کے بارے میں ان جلسوں میں گفتگو ہوئی، کیا تعلق ہے؟

خدا کے رازق ہونے کا مطلب

مولانا رومی نے مثنوی میں ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ایک بچے کے دانت نکلے تو باپ کو فکر ہوئی کہ اس کے لیے روٹی کہاں سے لاؤں گا۔ بیوی سے تذکرہ کیا تو اس نے کیا خوب جواب دیا کہ جس نے دانت دیے ہیں وہ روٹی بھی دے گا۔ روزی دینے والا اللہ ہے اس لیے تم فکر میں اپنی جان ہلکان مت کرو۔ جو بچہ عطا کرتا ہے وہ اس کی عمر اور روزی بھی مقرر کرتا ہے۔

خدا کے کام میں دخل

ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہو کہ چونکہ ہم موحد ہیں اور اللہ کو خالق و رازق سمجھتے ہیں اور چونکہ ہماری مقدس آسمانی کتاب قرآن مجید میں تصریح ہے کہ روزی رساں اللہ ہے

"روئے زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو۔"

اس کے علاوہ جو روزی اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور جس کی ضمانت دی ہے اس سے مراد وہ حصّہ ہے جو ہر ایک کے نصیب میں ہے اور جو اسے ملنا چاہیے تاکہ وہ اپنے وجود اور اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکے اور لوگوں کے تمام حقوق کا تعلق ان کے نصیب ہی سے ہے۔ اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان مسائل کے بارے میں جن کا تعلق لوگوں کے رزق سے ہے کوئی فکر کریں یا کسی کے فرائض معیّن کریں بلکہ اس بارے میں سوچنے کا ہمیں حق ہی نہیں کیونکہ یہ تو ایک طرح سے خدا کے کام میں دخل دینا ہے جو توحید کے اصول کے منافی ہے۔ خدا کا کام خدا پر چھوڑنا چاہیے۔ ہمارا کام اللہ پر توکل اور اس کی رزاقی پر بھروسہ ہے۔ روزی رسانی اللہ کا کام ہے۔

اس شبہ کے جواب میں عرض ہے کہ اگر ہم اللہ کو اس طرح پہچانیں جس طرح کہ اس کی قدوسیت و کبریائی کے شایانِ شان ہے اور حتی الامکان اس کی صفاتِ عالیہ کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کو اپنی طرح ایک عاجز مخلوق تصور نہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کی رزاقی میں اور اس میں کہ ہم اپنے حقوق و فرائض کو سمجھیں اور اس پر غور کریں کہ انصاف کیا ہے اور اس کا تقاضا کیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی منافات اور تضاد نہیں ہے۔ اس نے اگر بندوں کی روزی کی ذمہ داری لی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس بارے میں ہمارا کوئی فرض

نہیں اور ہم پر یہ لازم نہیں کہ ہم اپنا حق لینے کی کوشش کریں۔ کوشش کا پہلا درجہ یہی ہے کہ ہم حق و انصاف کے معنی کو سمجھیں۔ اگر ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد ہوتا تو خود قرآن کریم جس نے خدا کی رزاقی کی صفت بیان کی ہے سعی و عمل اور کوشش کو واجب نہ ٹھیراتا۔ اگر کوئی تضاد ہوتا تو ائمہ اہلبیتؑ جو قرآن کے تربیت یافتہ تھے احقاقِ حقوق کے لیے قربانیاں نہ دیتے۔ اگر تضاد ہوتا تو لوگوں کے حقوق اور ان کی تحصیل کے لیے دینی احکام میں قاعدے قانون مقرر نہ ہوتے۔ اگر منافات ہوتی تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور صدقات دینے کا حکم نہ آتا۔ انفاق اور صدقات کا مطلب یہی تو ہے کہ رزق و روزی میں غریبوں کی مدد کی جائے۔ کیا یہ کام خدا کی رزاقی میں مداخلت اور خدا کو اس کام میں مدد دینا ہے جس کا اس نے خود ذمہ لیا ہے؟

خدا کا انسان پر قیاس

انسان قدرتی طور پر اپنے اوپر قیاس کرتا ہے۔ جو حالات اس پر گزرتے ہیں اور جو باتیں اس میں پائی جاتی ہیں وہی دوسروں میں فرض کر لیتا ہے۔ بچے اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں یہ سمجھتے ہیں کہ جو احساسات ان میں موجود ہیں وہی دوسری موجودات میں بھی ہیں چاہے وہ موجودات ان سے کمتر درجے کی ہوں یا اونچے درجہ کی۔ بچہ سمجھتا ہے کہ اس کے کھلونوں کے احساسات بھی اسی کی طرح کے ہیں مثلاً اگر ان کو مارا جائے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ لہٰذا جب اسے غصہ آتا ہے تو وہ انہیں مارتا ہے۔ اونچے درجہ کی چیزوں کی نسبت بھی اس کا تصور اسی طرح کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے سے کم درجے اور اونچے درجے کی چیزوں کو اپنی ہی سطح پر دیکھتا ہے۔

تنزیہ کا اصول

مسئلہ توحید کا ایک رکن تنزیہ ہے۔ تنزیہ سے مراد ہے تشبیہ کی نفی لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ، اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے، ہم کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جب ہم اللہ کی صفات علم، حیات، قدرت، ارادہ اور رزاقی وغیرہ کا ذکر کریں اور یہ کہیں کہ اللہ سمیع و بصیر ہے، تو یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ ہماری طرح کی کسی مخلوق کے مشابہ ہے۔ اگر وہ عالم ہے تو اس کا عالم ہونا ہمارے عالم ہونے سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے عالم ہونے اور ہمارے عالم ہونے میں قطعاً کوئی مماثلت نہیں۔ یہی حال اس کی قدرت، حیات، ارادے، مشیت اور رزاقی وغیرہ اور دوسری صفات کا ہے۔

اللہ کا وعدہ اور ضمانت

ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا روزی رسانی کا وعدہ اور رزق کی ضمانت انسانی وعدوں اور ضمانتوں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اگر کوئی انسان کسی کے رزق کا کفیل بنتا ہے اور اس کے اخراجات کی ذمہ داری لیتا ہے تو یہ کچھ اور بات ہے اور اللہ کا روزی کا ضامن ہونا کچھ اور ہے۔ اس کی ضمانت اس کی ذاتِ کامل کے شایانِ شان ہے۔ جب ہم قرآن میں یہ پڑھتے ہیں کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا روئے زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالےٰ کے ذمے نہ ہو تو ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ذمہ داری اللہ نے لی ہے کسی مخلوق نے نہیں۔ اس اللہ نے جو اس تمام نظام اور ساری مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے۔ خالق کی

ذمہ داری میں اور کسی مخلوق کی ذمہ داری میں فرق ہے۔ آدمی خود اسی نظامِ عالم کا حصہ ہے اور اسی کے دائرہ میں کام کرتا ہے۔ اسی لیے فرق ہے اس کے فعل میں جو اس نظام کا جزو، اس کا محکوم اور اس کا تابع ہے اور اس کے فعل اور ارادے میں جو اس نظام کا خالق ہے اور اس پر مجبور نہیں کہ اس کے افعال اس نظام کے تابع ہوں۔ لہٰذا آپ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کا نظم محکم اصولوں پر قائم ہے۔ نظامِ عالم کو سمجھنا ہی خدا کے فعل اور اس کی رزاقی کو سمجھنا ہے۔

ہم خود اس نظامِ عالم کا جزو ہیں اور دوسرے اجزائے عالم کی طرح ہمارے بھی کچھ فرائض ہیں جن میں رزق اور روزی کے بارے میں بھی فرائض اور حقوق شامل ہیں۔ ہمارے یہ فرائض قانونِ آفرینش نے اور قانونِ شریعت نے مقرر کیے ہیں اور درحقیقت یہ بھی اللہ تعالےٰ کی ہی رزاقی کا ایک پہلو ہے۔

غذا حاصل کرنے کی جو قوت پودوں میں ہے نباتات، حیوانات اور انسان میں تغذیہ کا جو نظام ہے، جانداروں میں غذا کی طرف جو فطری میلان پایا جاتا ہے یہ سب اللہ کی رزاقی کے مظاہر ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے جانداروں میں تغذیہ کا یہ حیرت انگیز نظام بنایا ہے جس کی مدد سے وہ پانی، ہوا اور غذا سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے جانداروں میں غذا کی طرف ایسی رغبت اور میلان پیدا کیا ہے کہ وہ یہ سمجھے بغیر کہ ان کو غذا کی کیوں ضرورت ہے اور اس کا فلسفہ کیا ہے، ضروری غذا کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور اس کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کی عقل، اس کا ارادہ اور یہ احساس کہ اس کو اپنے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ وہ احکام جو شریعت نے اپنے حقوق کے حصول

ان کی محافظت اور دوسروں کے حقوق کا احترام کرنے کے بارے میں دیے ہیں، وہ کوششیں جو انسان اپنا حق اور حصہ حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، وہ مقابلہ جو انسان اپنے حقوق غصب کرنے والوں سے کرتا ہے، وہ غور و خوض جو انسان اپنے حقوق کے بارے میں کرتا ہے، وہ کتابیں جو اس ضمن میں لکھتا ہے، وہ تحقیق جو وہ اس سلسلے میں کرتا ہے۔ وہ فلسفے جو وہ پیش کرتا ہے، یہ سب اللہ کی رزاقی کے کرشمے اور اس کے مختلف پہلو اور وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کی تجلیات ہی تو ہیں۔

اگر اس نظام عالم میں اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کی کفالت اور ضمانت نہ ہوتی تو نہ کسی جاندار کو غذا کی فطری خواہش ہوتی نہ اس کے جسم میں غذا کو ہضم کرنے، اس کو جزو بدن بنانے اور فضلے کے اخراج کا کوئی انتظام ہوتا، نہ کھانے میں لذت اور ذائقہ ہوتا، نہ کسی چیز کے خوش مزہ یا بد مزہ ہونے کا سوال پیدا ہوتا، نہ گھاس کی جڑیں زمین میں ہوتیں اور نہ انسان اور حیوانات میں نظام ہضم ہوتا، نہ انسان کو اپنے حقوق کی حفاظت میں دلچسپی ہوتی اور نہ اس ضمن میں دینی احکام وارد ہوتے، نہ انسان اس بارے میں سوچتا، نہ کتابیں لکھی جاتیں اور نہ فلسفہ وجود میں آتا۔ یہ سب ہنگامہ، یہ سب دلچسپیاں، یہ سب ترغیبیں اسی کے ناموں یا مدبر اور یا رزاق کا پرتو ہیں جس نے یہ سارا نظم اسی شکل خاص میں ترتیب دیا ہے۔ اگر اللہ کی رزاقی نہ ہوتی تو پھر کچھ بھی نہ ہوتا، نہ نباتات ہوتی، نہ حیوانات ہوتے، نہ انسان ہوتا بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا اس لیے کہ وسیع معنی میں رزق و روزی کا اس کے سوا کچھ مطلب نہیں کہ ایک موجود دوسری موجودات سے مدد لے اور بالآخر سب موجودات اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے فضل کے محتاج ہوں۔ ہر موجود جہاں بھی ہو ہر لمحہ مدد کا محتاج ہے۔

اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ جب اللہ ہمارے رزق اور ہمارے نصیب کا کفیل اور ذمہ دار ہے تو ہمیں ان مسائل کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، ہماری سوچ، ہماری فکر اور کوشش اللہ کی صفتِ رزاقی کے عین مطابق ہے۔ یہ اسی کی رزاقی ہے جس نے رزق اور رزق حاصل کرنے والوں کو ایک دوسرے کا فریفتہ و شیفتہ بنا کر ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرمِ عمل کر دیا ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ ان موضوعات پر سوچنا خدا کے کام میں دخل دینا ہے۔ ہم خدا کے کام میں تو اس وقت دخل دے سکتے ہیں جب خدا کی بجائے ہم اس نظام اور اس عالم کے خالق بن سکیں۔ یا اس نظام کو از خود درہم برہم کر کے کوئی اور نظام قائم کر سکیں، جو ایک انہونی بات یا عقلاً محال ہے۔

چونکہ اللہ رازق ہے اس لیے اس نے ہماری ساخت میں رزق سے دلچسپی رکھی ہے۔ اس کے حکم سے ہمارے جسم کا نظام اس طرح بنا ہے کہ ہم کھاتے ہیں۔ اسی نے ہمیں عقل اور سوچنے کی قوت بخشی ہے۔ مذہب نے ہم پر اپنے حقوق کی حفاظت اور دوسروں کے حقوق کا احترام فرض کیا ہے۔ ہم روزی کما کر نہ صرف خدا کے کام میں دخل نہیں دیتے بلکہ اس کی مشیت پر عمل کرتے ہیں۔ اگر ہم روزی کی فکر نہ کریں، اس کی جستجو نہ کریں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے مُردوں کی طرح ساکت و صامت بیٹھے رہیں تو یہ خدا کی زیادہ نافرمانی ہو گی۔

خداوند متعال خالق بھی ہے اور رازق بھی۔ خالق اس لیے کہ اس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اگر اس کا ارادہ اور اس کی مشیت نہ ہوتی تو کوئی چیز وجود میں نہ آتی۔ وہ رازق ہے یعنی اس نے موجوداتِ عالم کی اس طرح

تخلیق کی ہے کہ ان کو رزق کی ضرورت ہے۔ وہی ان کو رزق اور روزی پہنچاتا ہے۔ جن موجودات کو رزق کی ضرورت ہے وہ، وہ موجودات ہیں جن کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی بقاء کے لیے کسی دوسری مخلوق کو اپنی غذا بنائیں۔ یعنی اس کو کسی طرح اپنے وجود کا جسز و بنالیں اور اس کو اپنے اندر تحلیل کرلیں۔ پھر ممکن ہے کہ کوئی دوسری چیز اس چیز کو اپنی غذا بنالے۔ رزق اور رزق خوروں کی جماعتیں الگ نہیں ہیں۔ ہر رزق خور کسی دوسری چیز کی غذا ہے جو ایک کو کھاتا ہے کوئی دوسرا اسے چٹ کر جاتا ہے۔

کارخانۂ قدرت کا نظام دیکھیے۔ پانی مٹی میں جذب ہوتا ہے، مٹی سے سیکڑوں طرح کی گھاس اگتی ہے۔ حیوان کو لب و دنداں عطا کیے گئے ہیں، وہ یہ گھاس کھاتا ہے۔ جب وہ یہ گھاس کھا کر فربہ ہو جاتا ہے تو وہ خود انسان کا لقمہ بن جاتا ہے۔ پھر انسان مر کر خاک میں مل جاتا ہے اور خود مٹی کی خوراک بن جاتا ہے۔ اس طرح اس دنیا کی سب چیزیں کسی چیز کو اپنی خوراک بناتی ہیں اور پھر خود کسی دوسری چیز کی خوراک بن جاتی ہیں۔ انسان گیہوں کھاتا ہے لیکن گیہوں بھی بغیر غذا کے پنپ نہیں سکتا۔ یہ ہے وہ نظام جو سارے عالم میں جاری و ساری ہے۔

خوراک اور خوراک خور میں مطابقت

اب ایک اور نکتے پر غور کیجیے: خوراک اور اس کے کھانے والے کے درمیان کس طرح مطابقت اور تناسب کا خیال رکھا گیا ہے۔ میں نے اپنے ایک گزشتہ لکچر میں اس طرف توجہ دلائی تھی کہ حق کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟ یہ کیسے ہوتا

ہے کہ کسی کا کسی چیز پر حق پیدا ہو جائے۔ میں نے کہا تھا کہ حق پیدا ہونے کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کی تخلیق ہی کسی دوسری چیز کے لیے ہو۔ مثلاً آپ کبھی اپنے آپ کو کسی گھر کا مالک اس لیے سمجھتے ہیں کہ خود آپ نے اس کو بنایا ہے اور کبھی اس لیے کہ کسی نے خاص کر آپ کے لیے بنایا ہے۔ آپ اس پر اپنے دعوے کے ثبوت میں یہی کہتے ہیں کہ یہ گھر میرا ہے، کیونکہ فلاں شخص نے اس کو میرے لیے بنایا ہے۔

تخلیقی لحاظ سے اس دنیا کی چیزوں میں جو حیرت انگیز نظم و ترتیب اور باہمی مطابقت پائی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کی تخلیق ہی کچھ دوسری چیزوں کے لیے ہوتی ہے۔ بچے اور ماں کے دودھ کا نظام دو مختلف چیزیں ہیں لیکن اگر اس غیر معمولی نظام اور بچے کی ضرورت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ایک عجیب مطابقت ہے۔ ماں کے دودھ اور بچے کے ہاضمہ کے نظام میں ایک مکمل تناسب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر ان کا ایک دوسرے سے تعلق ہے۔ پستان مادر میں دودھ اور شیر سازی کا یہ مکمل کارخانہ بچے ہی کے لیے وجود میں آیا ہے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پستان کی ساخت اور دودھ بننے کے عمل کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔

اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ یہ دودھ بچے ہی کے لیے بنا ہے اور دونوں میں فی الحقیقت ایک خاص تعلق ہے جس کی وجہ سے دونوں میں باہمی مطابقت پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک بچہ شیر خوار ہے اور خود اپنی خوراک حاصل نہیں کر سکتا، اس کی خوراک اس کے پہلو میں یعنی پستان مادر میں مہیا ہے۔ آہستہ آہستہ بچے میں طاقت آتی جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں

کام کرنے لگتے ہیں، وہ چلنے لگتا ہے۔ اس کو عقل اور سمجھ آجاتی ہے۔ وہ اپنی کوشش سے اپنی خوراک حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس وقت پہلے کی طرح اس کے لیے خوراک مہیا نہیں ہوتی۔ گویا اس کی خوراک اس سے فاصلے پر رکھ دی جاتی ہے تاکہ وہ وہاں جا کر اس کو حاصل کرے اور اس کو کام میں لائے۔ مجموعی طور پر خوراک اور خوراک خور کی طاقت کے درمیان تناسب کا خیال رکھا گیا ہے اور مجموعی طور پر دونوں میں ایک طرح کا تعلق، رابطہ اور کشش موجود ہے۔ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ خوراک خود دوڑ کر کھانے والے کے پاس آتی ہے جیسا کہ بارش اس کی متکفل ہے کہ بادل کی سواری پر سوار ہو کر خشک زمینوں کی طرف جائے اور ان کو سیراب کرے۔

"وہ اللہ ایسا ہے کہ اپنے باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو لوگوں کو خوش کر دیتی ہیں۔ جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف لے جاتے ہیں جہاں اس بادل سے پانی برساتے ہیں۔ پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل اگاتے ہیں۔"

(سورۂ اعراف۔ آیت ۵۷)

کسی جگہ کھانے والے کا یہ اپنا کام ہوتا ہے کہ وہ خوراک کی طرف چل کر جائے اور خود کو رزق تک پہنچائے۔ نباتات زمین میں سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہیں اور صرف ابتدائی مواد یعنی پانی، مٹی، روشنی اور ہوا سے اپنی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ ان کے لیے اسی طرح رزق کا بندوبست کیا گیا ہے اور اسی بندوبست کے مطابق ان میں یہ قابلیت رکھی گئی ہے کہ اپنی خوراک تک دسترس حاصل کر سکیں، اور ہوا، مٹی، روشنی اور رطوبت

سے فائدہ اٹھا سکیں یعنی قدرت نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ غذائی مواد تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس لیے ان کی رہنمائی کی گئی ہے اور مناسب وسائل مہیا کیے گئے ہیں۔

حیوانات کی ساخت کچھ اور طرح کی ہے۔ زمینی خام مواد جو ہر جگہ بکھرا ہوا ہے وہ ان کے لیے کافی نہیں اس لیے ان میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں۔ وہ نباتات کی طرح ایک ہی جگہ کھڑے نہیں رہتے۔ ان کی رہنمائی کے لیے بھی زیادہ بہتر انتظام کیا گیا ہے۔ ان کو حواس دیے گئے ہیں۔ ان میں خواہش و رغبت کا مادہ رکھا گیا ہے۔ وہ اپنی خواہش کی تحریک اور حواس کی رہبری سے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے رہتے ہیں تاکہ اپنی غذا کے لیے وہ ثانوی مواد حاصل کر سکیں۔ جو ہر جگہ موجود نہیں یعنی نباتات اور دوسرے حیوانات۔ ان کے لیے صرف زمین کی رطوبت کافی نہیں۔ ان کو پینے کا پانی چاہیے جو ہر جگہ موجود نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ پانی کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جائیں۔ نباتات کی طرح ان میں سردی گرمی برداشت کرنے کی بھی قوت نہیں اس لیے ان کو کسی گھونسلے، بھٹ یا رہنے کے ٹھکانے کی ضرورت ہے۔ انہی ضرورتوں کے لحاظ سے ان کو دیکھنے، سننے، چکھنے اور سونگھنے کی قوتیں دی گئی ہیں۔ ان کے لیے فطری رہنمائی کا حیرت انگیز سامان مہیا کیا گیا ہے۔

خاص طور پر بعض حشرات (یعنی کیڑے مکوڑوں) کی کارکردگی عجیب و غریب ہے۔ مثلاً چیونٹی کو لیجیے۔ امام علیؑ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"چیونٹی کو دیکھو جو اپنے چھوٹے اور نازک جسم کے باوجود کہ نظر بھی مشکل سے آتی ہے کس طرح زمین پر چلتی اور اپنی

روزی تلاش کرتی ہے۔ دانہ اپنے سوراخ میں لے جاتی ہے اور خوراک کو محفوظ رکھتی ہے۔ گرمی میں سردی کے موسم کے لیے اور اچھے وقت میں برے وقت کیلئے انتظام کرتی ہے۔ اگر تم اسکی غذا کے پیٹ میں جانے کے راستوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھو، اس کے نظام ہضم پر غور کرو۔ اس کے سر میں جو آنکھیں اور کان ہیں ان پر توجہ دو تو حیرت زدہ رہ جاؤ۔"

خوراک حاصل کرنے کے لحاظ سے چیونٹی حیوانات میں ایک مثالی نمونہ ہے۔

انسان اور رزق

رہا انسان، وہ جانوروں میں زیادہ ترقی یافتہ ہے جو انتظام حیوانات کے لیے کافی ہے وہ اس کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے لیے خوراک حاصل کرنے کے مسئلہ کی شکل کچھ اور ہے۔ یہاں خوراک اور خوراک خور کے درمیان فاصلہ زیادہ ہے۔ لہٰذا اسے زیادہ وسائل مہیا کیے گئے ہیں۔ رہنمائی کا انتظام زیادہ ہے۔ اس کو عقل دی گئی ہے، سمجھ دی گئی ہے، علم دیا گیا ہے۔ وحی و نبوت کے ذریعے سے اس کی مدد کی گئی ہے۔ اس کے فرائض معین و مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ سب اللہ کی رزاقی کے مظاہر ہیں۔

لہٰذا یہ جو کہا گیا ہے کہ جس نے دانت دیے ہیں وہی روٹی بھی دے گا غلط نہیں ہے، بات صحیح ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف دانت ہونا کافی ہے اور من و سلویٰ آسمان سے اترے گا بلکہ یہ مطلب ہے کہ تخلیقی نظام میں دانتوں اور روٹی کے درمیان ربط اور تعلق ہے۔ اگر روٹی نہ ہوتی تو دانت بھی نہ ہوتے اور اگر دانت والا نہ ہوتا تو روٹی بھی نہ ہوتی۔

خوراک، اس کو کھانے والے، خوراک حاصل کرنے کے ذرائع، خوراک کو کھانے اور ہضم کرنے کے وسائل اور خوراک تک رہنمائی کے سامان فطری طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ جس نے انسانی فطرت کی تخلیق کی ہے اور آدمی کو دانت دیے ہیں، اسی نے غذائی مواد بھی مہیا کیا ہے اور انسان کو اس کے حاصل کرنے کی طاقت اور حس بھی دی ہے۔

خدا نے انسان کو روزی بھی دی ہے اور دانت بھی دیے ہیں لیکن اس کی رزاقی سے یہ لازم نہیں آتا کہ محنت، کوشش اور روزی کمانے کے لیے سعی و عمل کی ضرورت نہیں۔ روزی حاصل کرنے کے بہتر طریقوں کے متعلق سوچنا ضروری نہیں یا اپنے حقوق کا دفاع ضروری نہیں۔ رزق، دانت، کھانے کی طاقت، سوچنے، سمجھنے کی قوت اور روزی کمانے اور رزق حاصل کرنے سے متعلق عقلی اور مذہبی فرائض سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور یہ سب ل اللہ کی رزاقی کا مظہر ہیں اس لیے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ رزق اور رزق خور کے درمیان ایک خاص تعلق ہے اور اللہ ہی نے رزق حاصل کرنے کے ذرائع پیدا کیے ہیں اور اس سلسلے میں ہمارے اوپر فرائض بھی عائد کیے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ رزق حاصل کرنے کا بہترین اور صحیح طریقہ کیا ہے اپنی صلاحیتوں کو اس طریقہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے بروئے کار لائیں اور اللہ پر جس نے یہ طریقے پیدا کیے بھروسہ رکھیں اور توکل کریں۔

توکل

توکل کے کیا معنی ہیں؟ توکل جدوجہد اور سعی و عمل کی ضد نہیں کہ یا تو ہم کام اور محنت کریں یا توکل کریں۔ توکل کے معنی ہیں وہ کام کیا جائے جو حق کا مقتضا

اور صحیح ہو اور اس معاملے میں اللہ پر بھروسہ رکھا جائے۔ اللہ ان کا حامی و مددگار ہے جو حق کے حامی ہیں اور صحیح طریقہ اختیار کرتے ہیں جو حق کے حامی ہیں توکل ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک ضمانت ہے۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں:

آپ کسی اسٹور میں جا کر کوئی چیز خریدتے ہیں۔ اسٹور کا مالک آپ کو اطمینان دلاتا ہے کہ چیز اچھی ہے۔ آپ اس کے کہے ہوئے پر بھروسہ کر لیتے ہیں کہ چیز واقعی اتنی ہی اچھی ہے جتنی وہ بتا رہا ہے۔ اسی طرح حق کا راستہ انبیاء نے دکھایا ہے اور اللہ کی طرف سے اس کی ضمانت دی ہے کہ جو شخص اس راستے پر چلے گا کامیاب ہوگا۔ اللہ تعالے نے یہ کائنات اس طرح بنائی ہے کہ جو حق اور سچائی کا ساتھ دیتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ حق کو ہمیشہ ایک طرح کی روحانی تائید حاصل ہوتی ہے۔

انبیاء کہتے ہیں کہ خدا پر توکل کر کے راہِ خدا میں جہاد کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور حلال کی روزی کماؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی خدا کے بتلاتے ہوئے راستہ پر چلے گا تو اسے ایک طرح کی تائید ایزدی حاصل ہوگی۔

توکل کے یہ معنی نہیں کہ کوئی کام ہی نہ کیا جائے۔ کوئی شخص ایک جگہ بیٹھا رہے اور خدا پر بھروسہ رکھے کہ وہ اس کی جگہ خود کام کرے گا۔ کام نہ کرنے اور ہاتھ پاؤں نہ ہلانے پر تو کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ بے کاری کی کیا تائید ہو سکتی ہے؟ کام نہ کرنے اور ہاتھ پاؤں نہ ہلانے کا تو کوئی نتیجہ ہی نہیں نکلتا جس کی اللہ یا غیر اللہ کی طرف سے ضمانت دی جا سکے۔

اگر قرآن کریم کی تمام آیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ توکل کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حق کے راستے پر چلنے سے نہ ڈرو

اور توکل کرو۔ باطل کی قوت سے نہ ڈرو اور توکل کرو۔ اس ضمن میں نمونے کے طور پر ہم دو قرآنی آیات کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک آیت میں جو حضرت نوحؑ کے بعد آنے والے سب پیغمبروں کی زبان سے ادا ہوئی ہے۔ یہ پیغمبران لوگوں سے جو ان کی مخالفت کرتے تھے اور ان کے سدِ راہ ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ.

"ہم خدا پر کیوں توکل اور بھروسہ نہ کریں جب کہ اس نے ہمیں صحیح راہ دکھائی ہے۔ ہم تمہاری ایذاؤں پر صبر کریں گے اور استقامت کا دامن تھامے رہیں گے۔ ہم بھروسہ کرنے والے فقط اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

یہ آیت پوری صراحت کے ساتھ توکل کو ایک مثبت طریقہ بتلاتی ہے۔ ایک راستے پر چلنا ہے۔ تکالیف اس راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ انبیاء کہتے ہیں کہ ہم باطل کی قوت سے خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھیں گے اور راہِ حق پر چلتے رہیں گے۔

دوسری آیت خود رسولِ اکرمؐ کے بارے میں ہے۔ اس آیت میں بھی کمال صراحت کے ساتھ توکل کے مثبت مفہوم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ.

جب فیصلہ کرلو تو خدا پر بھروسہ رکھو اور اپنے کام کو پورا کرو۔

۳۸۴

اللہ نے یہ نہیں کہا کہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہو اور توکل کرو۔ یہ کہا ہے کہ اپنا کام کرو اور خدا پہ بھروسہ رکھو۔

یہ معنی ہیں توکل کے اور وہ معنی ہیں اللہ کی رزاقی کے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام

چونکہ آج صادقِ آلِ محمدؐ حضرت امام جعفر ابن محمد الصادقؑ کی وفات کا دن ہے اس مناسبت سے آج کی گفتگو آپ کی عظیم شخصیت اور آپ کی سیرت کے بارے میں ہو گی۔

امام صادقؑ ماہ ربیع الاول ۸۳ ہجری میں عبدالملک بن مروان اموی کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوئے اور شوال یا رجب ۱۴۸ ہجری میں ابو جعفر منصور عباسی کے زمانۂ خلافت میں فوت ہوئے۔ ایک سفاک مگر ہوشیار اموی خلیفہ کے زمانے میں آئے اور ایک طاقتور اور جابر عباسی خلیفہ کے زمانے میں رحلت فرمائی۔ اس درمیانی عرصے میں آپ نے خلافت ایک خاندان سے دوسرے خاندان کو منتقل ہوتے دیکھی۔

آپ کی والدہ ام فروہ، جیسا کہ کافی، بحار اور دوسری کتابوں میں تحریر ہے قاسم بن محمد بن ابی بکر کی بیٹی تھیں۔ اس طرح والدہ کی طرف سے آپ کا

سلسلۂ نسب ابوبکر تک پہنچتا ہے۔ چونکہ قاسم بن محمد بن ابی بکر نے اپنے چچا عبدالرحمن بن ابی بکر کی بیٹی اسماء سے شادی کی تھی اس لیے آپ کی والدہ باپ کی طرف سے بھی اور ماں کی طرف سے بھی ابوبکر کی پوتی ہوتی تھیں۔ امام صادقؑ خود فرمایا کرتے تھے کہ:

وَلَدَنِی اَبُوبَکْرٍ مَرَّتَیْنِ۔

یعنی میرا سلسلۂ نسب دو طریقوں سے ابوبکر تک پہنچتا ہے۔

سنہری موقع

امام صادقؑ شیخ الائمہ ہیں۔ آپ نے دوسرے سب ائمہ سے زیادہ عمر پائی۔ ۶۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ نسبتاً طویل عمر اور امویوں اور عباسیوں میں جنگ کے باعث حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے آپ کو یہ سنہری موقع ملا کہ افاضہ و تعلیم کی بساط بچھائیں۔ تعلیم و تربیت اور عظیم علمی مرکز کی تاسیس کا کام انجام دیں اور اسلامی حقائق کو پھیلانے میں کامیابی حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ علم حدیث میں قَالَ الصَّادِقُ کا فقرہ اس کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت سے آج تک سب علماء، خواہ وہ شیعہ ہوں یا غیر شیعہ، اپنی کتابوں میں آپ کا، آپ کی درسگاہ کا، آپ کے ان شاگردوں کا جن کی کثیر تعداد میں آپ نے تربیت کی تھی اور اسلامی علم و ثقافت کو جو آپ نے ترقی دی تھی اس کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح سب نے آپ کے تقویٰ اور آپ کی روحانیت اور عبادت گزاری کا اعتراف کیا ہے۔

علمائے شیعہ میں سے شیخ مفید لکھتے ہیں کہ آپ سے منقول علمی آثار جو سب ملکوں میں پھیل چکے ہیں، اس کثرت سے ہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں علماء نے

اہل بیتؑ میں سے کسی اور سے منقول نہیں۔ علمائے حدیث نے ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے آپ کے خرمن فیض سے استفادہ کیا، چار ہزار بتلائی ہے۔ ان میں ہر طبقے، ہر عقیدے اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں۔

محمد بن عبدالکریم شہرستانی جو اہل سنت کے ایک بڑے عالم اور مشہور کتاب "الملل والنحل" کے مصنف ہیں، آپ کے بارے میں کہتے ہیں:

هُوَ ذُوْ عِلْمٍ غَزِیْرٍ وَاَدَبٍ کَامِلٍ فِی الْحِکْمَةِ وَزُهْدٍ فِی الدُّنْیَا وَوَرَعٍ عَنِ الشَّهَوَاتِ۔

آپ کا علم وسیع تھا اور آپ نہایت ذہین، متقی اور پرہیزگار تھے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ آپ مدت تک مدینہ میں رہے جہاں آپ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو تعلیم دیتے تھے۔ کچھ دن عراق میں بھی قیام کیا۔ عمر بھر کبھی جاہ و مرتبہ کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ امام خود فرماتے ہیں:

"جو دریائے معارف میں غوطہ زن ہوا اس کو ساحل کی تمنا نہیں رہتی اور جو حقیقت کی بلندیوں تک پہنچ گیا اس کو پھر پستی کا خوف نہیں رہتا۔"

ہر فرقہ اور مذہب کے بزرگوں نے امام صادق صلوات اللہ علیہ کے مقام کی رفعت کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ میرا مقصد ان سب روایات کو نقل کرنا نہیں ہے صرف اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ جو امام صادقؑ کو جانتا ہے وہ آپ کی عظیم اور فیض رساں علمی درسگاہ سے بھی واقف ہے جس کے آثار ابھی تک زندہ و پائندہ ہیں۔ آج کے شیعہ علمی مراکز اسی درسگاہ کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

امام صادقؑ کے متعلق گفتگو کا میدان بہت وسیع ہے۔ مختلف

موضوعات پر خصوصاً احکام عملیہ اور وعظ و نصائح پر بہت ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ دوسرے آپ کی زندگی میں بہت سے سبق آموز واقعات ہیں۔ دہریوں اور دوسرے مذاہب اور علماء کے ساتھ آپ کے مباحثے اور بلند پایہ اور پر معنی دلائل ایسے ہیں کہ سب قابلِ استفادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی تاریخ جس کا تعلق آپ سے یا آپ کے شاگردوں سے ہے، وہ بھی سننے اور سمجھنے کے لائق ہے۔

امام صادقؑ کی سیرت اور روش

آج میں اپنی گزارشات میں اس روش کا موازنہ جو امام صادقؑ نے اپنے لیے منتخب کی تھی ان کے بزرگ اجداد کی سیرت سے کرنا چاہتا ہوں۔ بسا اوقات ان دونوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ میں اس کا راز عرض کرتا ہوں جس سے ایک ایسے اہم نکتہ پر روشنی پڑتی ہے جو ہمیشہ کی طرح ہمارے لیے آج کے حالات میں بہت سودمند اور مفید ہے۔

معصومینؑ کی گوناگوں

روش کا فائدہ

ہم شیعہ بارہ اماموں کی امامت کے قائل ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ سب نبی اکرمؐ کے وصی اور حقائقِ اسلام کے شارح ہیں۔ ہم ان کے اقوال کو رسولِ خدا کے اقوال، ان کے کردار کو رسولِ خدا کا کردار اور ان کی سیرت کو رسولِ خدا کی سیرت تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حقائق

کو سمجھنا جس قدر ہمارے لیے ممکن ہے دوسروں کے لیے نہیں ہے۔ ^ل^
چونکہ گیارھویں امام حسن عسکری کی وفات (۲۶۰ ہجری) کے بعد غیبت کا دور شروع ہو گیا ہے اس لیے ہم شیعوں کی نظر میں ایسا ہے گویا ۲۶۰ ہجری تک خود رسول اکرمؐ زندہ تھے۔ اور اس زمانے کے تمام تغیرات' انقلابات اور صورتِ حال اور ضروریات میں تبدیلی کے وقت آپ بنفسِ نفیس موجود تھے۔ البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رسولِ اکرمؐ اگر بالفرض اس دوران میں زندہ ہوتے تو کیا صورتِ حال ہوتی اور عالمِ اسلام میں کیا واقعات رونما ہوتے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم شیعوں کی نگاہ میں جو امامت و وصایت پر عقیدہ رکھتے ہیں اس طویل مدت میں ائمہ کا وجود اس لحاظ سے کہ ان کی گفتار'

ل ہشام بن سالم اور حماد بن عیسیٰ وغیرہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم نے ابو عبداللہ امام صادق علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

> "میری حدیث' میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث حسینؑ کی حدیث ہے اور حسینؑ کی حدیث حسنؑ کی حدیث ہے اور حسنؑ کی حدیث امیرالمومنین علیہ السلام کی حدیث ہے اور امیرالمومنینؑ کی حدیث رسول اللہ کی حدیث ہے اور رسولؐ اللہ کی حدیث ارشاد الٰہی ہے۔" (اصول الکافی ۱/۵۳)

عنبسہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ابو عبداللہ علیہ السلام سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آنجناب نے جواب دیا۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ اگر ایسا اور ایسا ہوتا تو اس میں دوسرا قول نہ ہوتا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جب کبھی ہم کسی مسئلہ میں جواب دیں تو وہ رسولِ اکرمؐ سے ہے ہم کوئی جواب اپنی رائے سے نہیں دیتے۔ (بصائر الدرجات۔ ۳۰۰-۳۰۱)

ان کا کردار اور ان کی سیرت حجتِ قطعی کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسا تھا گویا خود پیغمبر اکرمؐ موجود تھے لیکن بحیثیت نبی کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک مسلمان کے جو اپنا فرض انجام دے رہا ہو اور اس زمانے میں مسلمانوں پر جو مختلف دور گزرے وہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور ہر دور میں بغیر کسی غلطی یا اشتباہ کے اپنا فرض بطریق احسن انجام دیتا رہا ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ فرض کر کے مسلمان ہر زمانے اور ہر دور میں اپنے فرائض بہتر طریقے سے سمجھ سکتے اور انجام دے سکتے ہیں۔

ائمہ کی سیرت میں ظاہری تعارض

اور اس کے حل کی ضرورت

ہم ائمہ کی سیرت میں کچھ ایسی باتیں دیکھتے ہیں جن میں بظاہر تضاد اور تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح تناقض اور تعارض بعض اوقات ان اخبار و آثار میں بھی دیکھنے میں آتا ہے جو ائمہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ جن روایات کا تعلق فقہی احکام سے ہے ان کا تعارض جس طرح علما نے دور کیا ہے وہ تو اپنے مقام پر مذکور ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ بظاہر سیرت میں جو تعارض نظر آتا ہے اس کے حل کی کیا صورت ہے۔

اگر فقہی احکام سے متعلق اخبار اور روایات کا تعارض دور نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی کہ ہر شخص کسی ایک روایت یا حدیث کو سند مان کر اس پر عمل کرنے لگے گا اور اس سے افراتفری اور بدنظمی پیدا ہوگی یہی صورت ائمہ کی سیرت اور ان کے طرزِ عمل کی ہے۔ اس میں جو بظاہر اختلاف ہے

اگر اس کا اصل راز معلوم نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ بھی اخلاقی اور اجتماعی بدنظمی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ممکن ہے ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق کوئی ایک طریقہ اختیار کرے اور اس کے جواز میں کسی امام کا عمل جس کا تعلق کسی خاص زمانے اور کسی خاص صورتِ حال سے ہو پیش کردے۔ اسی طرح کوئی دوسرا شخص اپنی خواہش اور ذوق کے مطابق کوئی اور راہ اختیار کرے اور وہ بھی ائمہ علیہم السلام میں سے کسی امام کے عمل سے جس کا تعلق کسی مخصوص زمانے اور کسی مخصوص واقعہ سے ہو سند تلاش کرے اور اس طرح ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق ایک الگ راستہ اختیار کرے۔

مثلاً یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے مزاج اور ذہنی تربیت کے اعتبار سے سخت گیر ہو اور اسے کفایت شعاری اور جز رسی کی زندگی پسند ہو اور جب اس سے پوچھا جائے کہ تم اپنے اوپر اور گھر والوں پر اتنی سختی کیوں کرتے ہو تو وہ یہ کہے کہ رسولِ خدا اور علی مرتضیٰؑ کا یہی طریقہ تھا اور وہ کبھی اچھے کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ لذیذ کھانے نہیں کھاتے تھے اور عمدہ سواری استعمال نہیں کرتے تھے اور شاندار مکان میں نہیں رہتے تھے۔ وہ جَو کی روٹی کھاتے تھے اور موٹا لباس پہنتے تھے۔ اونٹ یا خچر پر سواری کرتے تھے اور کچے مکان میں رہتے تھے۔

ایک اور شخص ہے جو فطرتاً اچھی زندگی گزارنے اور شان و شوکت سے رہنے کا عادی ہو جب یہ پوچھا جائے کہ تم زہد و قناعت کی زندگی کیوں بسر نہیں کرتے تو وہ یہ کہے کہ امام حسن مجتبیٰؑ یا امام جعفر صادقؑ بھی شان و شوکت سے رہتے تھے۔ لذیذ غذاؤں سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ عمدہ لباس پہنتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے گھوڑوں پر سواری کرتے تھے اور عموماً شاندار مکانوں میں رہتے تھے۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص طبعاً جوشیلا ہو اور جسے سکون و آرام ناپسند ہو خود رسولِ اکرمؐ کی سیرت یا امام حسینؑ کی تحریک کربلا سے استدلال کرے؛ اور ایک دوسرا شخص جو اس کے برعکس عافیت طلب اور گوشہ نشین ہو اور جس میں ہمت و جرأت کا فقدان ہو، امام صادق علیہ السلام یا دیگر ائمہ کی تقلیدی روش سے سند لائے۔

ایک شخص جو طبعاً ملنسار اور یار باش ہو ایک امام کی سیرت کو اور دوسرا جو تنہائی پسند اور گوشہ گیر ہو کسی دوسرے امام کے عمل اور سیرت کو اپنے لیے نمونہ قرار دے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ صرف رسولِ اکرمؐ اور ائمۂ اطہارؑ کی سیرتِ پاک اور بامعنی روش سے صحیح استفادہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس لیے کہ ہر شخص اپنے عمل کی اپنے طور پر توجیہ کرتا ہے اور کسی دوسرے کی بات نہیں سنتا، معاشرے میں ابتری اور بدنظمی پھیل جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ ائمۂ اطہار علیہم السلام کی سیرت میں بظاہر تناقض معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی تھی اور امام حسینؑ نے یزید کے بالمقابل قیام کیا اور اس کی اطاعت قبول نہیں کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ رسولِ خدا اور علی مرتضیٰؑ اپنے زمانے میں نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے اور شان و شوکت سے احتراز کرتے تھے لیکن سب ائمہ کی یہ حالت نہیں تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس تعارض کو رفع کیا جائے اور اس کا راز دریافت کیا جائے۔

تعارض نہیں، درس و تعلیم

میں نے کہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ اس تعارض کو رفع کیا جائے اور اس کا راز دریافت کیا جائے۔ واقعی اس میں ایک خاص راز ہے۔ یہ وہ تعارض نہیں ہے جو راویانِ حدیث نے پیدا کر دیا ہے اور جس کو ہم اس طریقے سے حل کرتے ہیں جو عام طور پر مختلف روایات میں تطبیق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تعارض اس سے مختلف اور خود اسلام کا پیدا کردہ ہے۔ چونکہ اسلامی تعلیمات ہمیشہ زندہ رہنے والی اور ہر دور کی ضروریات کے مطابق ہیں، اس لیے اس تعارض کا ہونا لازمی ہے۔ درحقیقت یہ اختلاف تعارض اور تضاد نہیں بلکہ درس و تعلیم ہے، بہت معنی خیز اور سبق آموز۔

اس کی وضاحت میں ان ہی دو مثالوں سے کرتا ہوں جو میں نے ابھی پیش کی تھیں۔ ایک مثال تو تھی زہد و قناعت کی زندگی اور اس کے بالمقابل شان و شوکت اور وسعت و فراغت کی زندگی کی اور دوسری مثال تھی قیام اور جنگ کی اور اس کے بالمقابل سکون اور تقیے کی۔ یہی دو مثالیں نمونے کے لیے کافی ہیں۔ پہلے سادگی اور قناعت کی مثال لیجیے۔

زہد کا فلسفہ

یہ بات مسلّم ہے کہ رسولِ خداؐ اور علی مرتضیٰؑ نہایت سادگی اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے اس عمل کی تشریح دو طرح سے کی جا سکتی ہے: ایک تو یہ کہ ہم یہ کہیں کہ اسلام کا انسان کو حکم یہی ہے کہ اس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے پرہیز کرے۔ جس طرح اسلام اخلاص، شرک سے اجتناب، ذیاخدا کی

محبت اور صدق و صفا کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی نعمتوں سے بھی احتراز اور بچنے کی ہدایت کرتا ہے۔ جس طرح توحید اور اخلاص کا بذات خود انسانی کمالات میں شمار ہے اور ہر زمانے میں انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ موحد ہو، دیانتدار ہو، محبت اور صدق و صفا کے اوصاف سے متصف ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہر دور میں اور ہر قسم کے حالات میں دنیا کی نعمتوں اور راحتوں سے اجتناب کرتا رہے۔

ایک دوسری تشریح یہ ہو سکتی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان چیزوں میں جن کا تعلق عقیدہ اور اخلاق سے ہے اور ان چیزوں میں جن کا تعلق طرز معاشرت سے ہے فرق ہے۔ رسولِ خدا اور علی مرتضیٰؑ اگر غذا، لباس اور رہن سہن میں تنگی برتتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ خوشحال زندگی بذاتِ خود بری اور ناپسندیدہ ہے بلکہ اس کا تعلق کچھ اور باتوں سے تھا۔ ایک تو یہ کہ اس زمانے کا دستور ہی یہ تھا کیونکہ عام طور پر بہتر وسائل میسر نہیں تھے اور تنگدستی عام تھی۔ ان حالات میں ہمدردی اور دلداری کا تقاضا یہی تھا کہ کم پر قناعت کی جائے اور جو کچھ بچے دوسروں کو دے دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ حضرات اپنے زمانے کے رہنما اور پیشوا تھے۔ چونکہ رہنما اور پیشوا پر سب کی نگاہیں لگی رہتی ہیں اس لیے اس کے فرائض اوروں سے مختلف ہیں۔

جب امام علیؑ بصرہ میں علاء بن زیاد حارثی نامی ایک شخص سے ملے تو اس نے اپنے بھائی کی شکایت کی اور کہا کہ میرا بھائی تارک الدنیا ہو گیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہے۔ بیوی بچوں کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔

آپ نے فرمایا اس کو بلاؤ۔ جب وہ آیا تو آپ نے پوچھا کہ تم اپنے اوپر تنگی کیوں کرتے ہو اور اپنے آپ کو تکلیف کیوں دیتے ہو؟ بیوی بچوں پر ترس کیوں

نہیں کی تھے؟ اللہ نے جو پاکیزہ نعمتیں پیدا کی ہیں اور ان کو حلال ٹھہرایا ہے' کیا ان کو استعمال کرنا تمہیں ناپسند ہے؟ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی بندہ اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو؟

اس نے عرض کیا: هٰذَا أَنْتَ فِي خُشُونَةِ مَلْبَسِكَ وَجُشُوبَةِ مَأْكَلِكَ ۔ امیرالمومنین آپ خود بھی تو نہ اچھے کپڑے پہنتے ہیں نہ اچھا کھانا کھاتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: مجھ میں اور تجھ میں فرق ہے۔ میں امام اور پیشوا ہوں میرے اوپر عوام کی زندگی کی ذمہ داری ہے۔ اس حیثیت میں میرے لیے ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے' جب تک کوئی غریب باقی ہے' غریب ترین لوگوں کی طرح رہوں تاکہ ان کو اپنی محرومی کا احساس نہ ہو' اور کچھ نہیں تو ان کی ذہنی تکلیف ہی کم کروں اور ان کی تسلی اور تسکین کا سبب بنوں۔

اس طرح رسولِ خدا اور علی مرتضیٰ کی زاہدانہ زندگی کی دو طریقوں سے تشریح کی جا سکتی ہے۔

اگر پہلی تشریح صحیح ہوتی تو پھر یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہر دور میں خواہ لوگوں کو وسائل میسر ہوں یا نہ ہوں اور خواہ تنگی ہو یا کشادگی سب کو ایسی ہی زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ ائمہ علیہم السلام تو بطریقِ اولیٰ یہی طرزِ زندگی اختیار کرتے' لیکن اگر دوسری تشریح صحیح ہو تو پھر اس طرزِ زندگی کی پیروی کی ضرورت نہیں کیونکہ طرزِ زندگی کا تعلق اس زمانے کے مخصوص حالات سے تھا اور جب وہ حالات نہ ہوں' تو اس طریقہ پر چلنا ضروری نہیں۔

جب ہم امام صادقؑ کے حالات اور آپ کے اقوال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر آپ کی زندگی میں اور رسولِ خدا اور علی مرتضیٰؑ کی زندگی

میں نمایاں فرق تھا۔ اس کی یہی وجہ تھی اور یہ نکتہ خود امام صادقؑ نے اپنے ہم عصرین کو زہد کے فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے سمجھایا ہے۔

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا' آپ ہی کی تعلیمات سے ماخوذ تھا۔

امام صادقؑ کے زمانے میں ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو رسول اللہؐ کی سیرت اور آپ کی دنیا سے بے رغبتی کی تفسیر چلے طریقہ پر کرتا تھا اور جس کا خیال تھا کہ مسلمان کو ہمیشہ اور ہر دور میں دنیا کی نعمتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس گروہ نے اپنے اس مسلک کو زہد کا نام دیا تھا۔ یہ لوگ اس زمانے میں متصوفہ کہلاتے تھے۔ ان میں سے ایک سفیان ثوری تھے۔ سفیان کا شمار اہلِ تسنن کے فقہا میں ہوتا ہے اور ان کے اقوال فقہ کی کتابوں میں اکثر نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ صاحب امام صادقؑ کے ہم عصر تھے اور حضرت کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے اور سوال و جواب کیا کرتے تھے۔

کتاب کافی میں لکھا ہے کہ ایک دن سفیان امام صادقؑ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ حضرت عمدہ اور خوبصورت سفید لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اعتراض کے طور پر کہا: فرزندِ رسول! آپ کے لیے مناسب نہیں کہ آپ دنیا میں آلودہ ہوں۔ امام نے فرمایا: ممکن ہے تمہیں یہ خیال رسول اللہؐ اور صحابہ کے طرزِ زندگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہو اور ان کے طریقہ کو دیکھ کر تم نے یہ سمجھ لیا ہو کہ یہی طریقہ اللہ نے مسلمانوں کے لیے فرض کیا ہے اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ قیامت تک اسی طریقے پر چلیں لیکن یہ حقیقت نہیں۔ رسولِ خدا ایسے زمانے میں اور ایسی زندگی گزارتے تھے جہاں فقر و تنگدستی عام تھی۔ عوام ضروریاتِ زندگی سے محروم تھے۔ اگر کسی زمانے میں ضروریاتِ زندگی فراہم ہو جائیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس طرزِ زندگی کی تقلید کی جائے بلکہ مسلمان اور صلحاء ہی اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے

مستفید ہونے کے زیادہ مستحق ہیں۔

یہ قصہ کافی لمبا ہے۔ سفیان اور سفیان کے کچھ اور ساتھیوں کے جواب میں جو سفیان سے آملے تھے، امام نے متعدد دلائل دیے تھے اور ان کے خیالات کو غلط ثابت کیا تھا۔ اس وقت اس پوری گفتگو کو نقل کرنے کا موقع نہیں ہے۔

ثابت اور متغیر اصول

آئمہ اہلبیتؑ کی سیرت میں یہ ظاہری اختلاف اور تعارض آئمہ کے ان اقوال کی مدد سے دور ہو جاتا ہے جن سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ رہن سہن اور معاشرت و معیشت کے مسائل سے متعلق کچھ باتیں تو ایسی ہیں جن کو ایسے تغیر پذیر اصول کا درجہ حاصل ہے جو کبھی نہیں بدلتے لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی یہ صورت نہیں۔

ایک ناقابل تغیر اصول یہ ہے کہ کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اپنی زندگی کو عام مسلمانوں کی زندگی سے الگ سمجھے۔ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح عام لوگ زندگی بسر کر رہے ہوں اسی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ جب عام طور پر لوگ تنگدستی اور بدحالی میں مبتلا ہوں تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ کچھ لوگ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ کو دلیل بنا کر عیش و عشرت میں پڑ جائیں۔ ہر چند کہ انہوں نے حلال ذریعوں سے ہی دولت حاصل کی ہو۔

امام صادق علیہ السلام اپنے اہل خاندان کے ساتھ اس زمانے کے حالات کے مطابق خوشحال زندگی گزارتے تھے لیکن خود ان کے ساتھ بھی ایسا اتفاق ہوا کہ ایک دفعہ قحط پڑ گیا اور اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں بہت

چڑھ گئیں۔ امام نے اپنے خادم کو بلا کر پوچھا کہ اناج کا کتنا ذخیرہ ہمارے یہاں موجود ہے؟ اس نے کہا کافی ہے کئی مہینے چل جائے گا۔ آپ نے کہا کہ اس سب کو بازار میں لے جا کر عوام کے ہاتھ فروخت کر دو۔ اس نے کہا کہ اگر ایک دفعہ بیچ دیا تو پھر نہیں مل سکے گا۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں، پھر ہم بھی اور لوگوں کی طرح نانبائی کی دکان سے ہر روز روٹی منگا لیا کریں گے۔ خادم نے کہا اس روٹی میں آدھا گیہوں کا آٹا ہوتا ہے اور آدھا جَو کا۔ آپ نے فرمایا کہ گو اس گرانی اور تنگی کے دور میں بھی میں اپنے بچوں کے لیے گیہوں کی روٹی کا انتظام کر سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اللہ دیکھے کہ میں عوام کے ساتھ ہوں۔

ایک اور ناقابلِ تغیر اصول جو ہر حال اور ہر زمانے میں پسندیدہ ہے زہد کا اصول ہے۔ زہد کے معنی ہیں عزتِ نفس، غلط کاموں سے قدرتی تنفر اور بلند نظری۔ ہر زمانے اور ہر حال میں یہ اچھی بات ہے کہ انسان مادی امور کا ہی ہو کر نہ رہ جائے۔ آدمی کو چاہیے کہ دین کو دنیا کے بدلے میں ہرگز نہ بیچے اور فضیلت و اخلاق کو روپیہ پیسہ پر ترجیح دے اور مادی چیزوں کو محض وسیلہ سمجھے، مقصد قرار نہ دے۔

باقی تمام امور جن کا تعلق معیشت میں فراخی، تنگی اور سامانِ زندگی کے مہیا ہونے نہ ہونے سے ہے مستقل اور ناقابلِ تغیر نہیں ہیں۔ ممکن ہے ایک زمانے میں حالات کا تقاضا کچھ اور ہو اور دوسرے زمانے میں کچھ اور۔ جیسا کہ جنابِ رسولِ خدا اور حضرت علی مرتضیٰ علیہما السلام کا طرزِ زندگی کچھ اور تھا اور باقی آئمہ علیہم السلام کا کچھ اور۔

قیام یا سکوت

دوسری مثال جو میں نے دی تھی وہ قیام و سکوت کا سوال تھا۔ یہ بھی ایسا سوال ہے جس پر گفتگو کی کافی گنجائش ہے۔ اس جلسہ میں یہ توقع نہیں کہ اس پر خاطر خواہ بحث کی جا سکے۔ نمونے کے طور پر سید الشہداء امام حسینؑ اور امام صادقؑ کے طرزِ عمل کا موازنہ کرتا ہوں۔

امام حسینؑ نے نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر اور اس کے باوجود کہ آثار یہی بتلاتے تھے کہ آپ شہید ہو جائیں گے اور آپ خود بھی یہی کہتے تھے لیکن اس سب کے باوجود آپ نے قیام کیا۔ اس کے برعکس لوگ خود امام صادقؑ کے پاس آئے لیکن آپ نے کوئی توجہ نہیں کی اور قیام سے انکار کر دیا اور اس کو ترجیح دی کہ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں اور تعلیم و تدریس اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھیں۔

بظاہر دونوں کے طرزِ عمل میں تعارض اور تناقض نظر آتا ہے۔ اگر امام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ظلم کے مقابلے میں کسی خطرے کی پروا کیے بغیر اٹھ کھڑا ہو تو امام صادقؑ نے کیوں قیام نہیں کیا اور زندگی میں تقیہ کی راہ کیوں اختیار کی؟ اور اگر تقیہ ضروری ہے اور امام کا فرض یہ ہے کہ تعلیم و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہے تو پھر امام حسینؑ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس زمانے کے سیاسی حالات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

امام صادقؑ کے زمانے کے سیاسی حالات

امام صادقؑ کے زمانے میں خلافت اموی خاندان سے عباسی خاندان

کو منتقل ہوئی۔ عباسی بنی ہاشم ہیں اور علویوں کے چچا کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔ اموی دور کے آخر میں جب آخری اموی خلیفہ محمد بن مروان کی طاقت مختلف اسباب کی بنا پر کمزور پڑنے لگی تو کچھ عباسیوں اور علویوں نے اپنی تحریک اور پروپیگنڈا شروع کیا۔ علویوں کے دو گروہ تھے۔ بنی الحسن امام حسن مجتبیٰؑ کی اولاد تھے اور بنی الحسین سید الشہداء امام حسینؑ کی۔ بنی الحسینؑ کی اکثریت نے جن کے سربراہ امام صادقؑ تھے' اس تحریک میں حصہ لینے سے اجتناب کیا۔ حضرت صادقؑ کو بار بار دعوت دی گئی لیکن آپ نے یہ دعوت قبول نہیں کی۔ ابتدا میں نام علویوں ہی کا تھا اور عباسی بظاہر علویوں کے لیے کام کر رہے تھے۔ سفاح، منصور اور ان کے بڑے بھائی ابراہیم الامام نے محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ کی جو نفس زکیہ کے نام سے مشہور ہیں بیعت کی تھی حتیٰ کہ منصور جو بعد میں محمد بن عبداللہ کا قاتل بنا' شروع میں محمد کے باپ عبداللہ بن حسن کے گھوڑے کی رکاب پکڑ کر چلتا اور نوکر کی طرح گھوڑے کی زین پر ان کے کپڑے ٹھیک کیا کرتا تھا۔ عباسیوں کو معلوم تھا کہ چونکہ علوی مقبول ہیں' اس لیے کام ان ہی کا نام لے کر نکلے گا۔ عباسی ایسے نہیں تھے کہ ان کے دل میں دین کی تڑپ ہوتی۔ ان کا مقصود دنیا تھی اور انہیں ریاست و خلافت کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ امام صادقؑ نے ابتدا ہی سے ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کیا۔

عباسی شروع سے اپنے داعی اور مبلغ کسی خاص شخص کے نام سے نہیں بھیجتے تھے بلکہ اَلرِّضَا مِنْ اٰلِ مُحَمَّدٍ یا اَلْمُرْتَضیٰ مِنْ اٰلِ مُحَمَّدٍ یعنی آلِ محمد کے بہترین فرد کے نام پر دعوت دیتے تھے اور اس طرح چپکے چپکے اپنے لیے راستہ صاف کر رہے تھے۔ ان کے داعیوں میں سب سے مشہور دو آدمی گزرے ہیں۔ ایک عرب تھا جس کا نام ابو سلمہ خلال تھا۔ وہ خفیہ طور پر کوفہ میں رہتا تھا اور

وہی سے دوسرے داعیوں اور مبلغین کو ہدایات جاری کرتا تھا۔ اس کو وزیر آلِ محمد کا لقب دیا گیا تھا۔ اسلام میں سب سے پہلے لفظ وزیر کا اطلاق اسی پر کیا گیا۔ دوسرا شخص ایک ایرانی تھا یعنی مشہور سردار ابو مسلم خراسانی۔ اس کا لقب امیر آلِ محمد تھا۔

جیسا کہ مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے سفاح اور منصور کے بڑے بھائی ابراہیم الامام کے قتل کے بعد جس نے سفاح کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا ابو سلمہ نے یہ طے کیا کہ عباسیوں کی بجائے علویوں کو دعوت کا مرکز بنا دیا جائے۔ اس غرض سے اس نے ایک ہی مضمون کے دو خط لکھے اور ایک قاصد کے ہاتھ مدینہ بھجوا دیے۔ ایک خط امام صادقؑ کے نام تھا جو بنی حسین کے سربراہ تھے اور ایک خط عبداللہ بن حسن مثنّٰی کے نام تھا جو بنی حسن کے بزرگ تھے۔ امام صادقؑ نے اس خط کی طرف التفات نہیں کیا اور جب قاصد نے جواب کے لیے اصرار کیا تو آپ نے وہ خط چراغ کی لو پر جلا دیا اور فرمایا: یہ ہے اس خط کا جواب' لیکن عبداللہ بن حسن دھوکے میں آگئے اور بہت خوش ہوئے۔ امام صادقؑ نے فرمایا بھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بنی عباس کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ خلافت تمہیں اور تمہاری اولاد کو مل جائے لیکن عبداللہ نہ مانے۔ عبداللہ کا جواب ابو سلمہ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی سفاح کو ابو سلمہ پر شک ہو گیا تھا۔ اس نے ابو مسلم کے مشورے سے ابو سلمہ کو قتل کرا دیا اور یہ مشہور کر دیا کہ اس کو خوارج نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد خود ابو عبداللہ اور ان کے بیٹے گرفتار اور قتل ہو گئے۔ یہ تھا امام صادقؑ کے خلافت قبول کرنے سے انکار کا قصہ۔

امام صادقؑ کا انکار

امام صادقؑ کے انکار کی محض یہی وجہ نہیں تھی کہ آپ کو یہ خوف تھا کہ بنی عباس مزاحمت کریں گے اور آپ کو شہید کر دیں گے۔ اگر آپ یہ سمجھتے کہ آپ کی شہادت اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہو گی تو آپ ضرور شہادت کو ترجیح دیتے۔ جیسا کہ اسی وجہ سے امام حسینؑ نے شہادت کا انتخاب کیا تھا۔ اس زمانے میں جس کی خصوصیات کی طرف ہم آگے چل کر اشارہ کریں گے جو چیز بہتر اور زیادہ منفعت بخش تھی وہ تھی ایک علمی و فکری تحریک کی سربراہی جس کا اثر آج تک باقی ہے۔ امام حسینؑ کے زمانے میں ان کی تحریک کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہی بجا اور مناسب تھی۔ اس کا اثر بھی ہنوز باقی ہے۔

اصل راز یہی ہے۔ ان تمام کاموں میں وہ قیام و جہاد ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو یا سکوت اور تقیہ ہو زمانے کے تقاضے اور متوقع نتیجہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہ امور وضو، غسل اور نماز روزہ کی طرح تعبدی نہیں ہیں۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے ان کے نتائج مختلف نکلتے ہیں۔ کبھی قیام اور جہاد اسلام کے لیے مفید ہے اور کبھی سکوت و تقیہ۔ پھر قیام کی بھی حالات کے لحاظ سے مختلف صورتیں ہیں۔ ان سب باتوں کا دارومدار وقت کے تقاضے پر ہے جس کو سمجھنے کے لیے بالغ نظری کی ضرورت ہے۔ وقت کے تقاضے کو سمجھنے میں ذرا سی غلطی سے اسلام کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

امام صادقؑ کے زمانے کے اجتماعی حالات

جس زمانے میں امام صادقؑ تھے اس زمانے کے سیاسی واقعات سے

تبع نظر ان دونوں اجتماعی پیچیدگیوں فکری ابہام اور غیر یقینی کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ یہ زیادہ ضروری تھا کہ امام صادقؑ اس محاذ پر اپنے جہاد کا آغاز کریں۔ امام صادقؑ دوسری صدی کے وسط میں تھے۔ اس دور کے تقاضوں اور امام حسینؑ کے دور کے تقاضوں میں جو پہلی صدی کے وسط میں تھے بہت فرق تھا۔

پہلی صدی کے وسط میں ان لوگوں کے لیے جو اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے اسلامی مملکت میں صرف ایک ہی محاذ موجود تھا اور وہ تھا اس وقت کی بداطوار حکومت کے ساتھ مقابلے کا محاذ۔ باقی محاذ ابھی وجود میں نہیں آئے تھے اور اگر کوئی وجود میں آ بھی گیا تھا تو ابھی اس کی اہمیت نہیں تھی۔ عالم اسلام کا محور دربار خلافت ہی تھا۔ عوام کی روحانی اور فکری زندگی میں ابھی صدر اسلام کی سادگی باقی تھی لیکن بعد کے زمانے میں مختلف اسباب کی بنا پر دوسرے محاذ وجود میں آتے چلے گئے۔ مسلمانوں میں ایک عظیم علمی اور فکری تحریک کے آغاز کی وجہ سے مختلف فرقے اور مسلک وجود میں آنے لگے اور اصول و فروع دین میں اختلاف پیدا ہونے لگا۔ ایک مورخ کے بقول اب مسلمان جنگ اور لشکر کشی چھوڑ کر علم و ثقافت کے سر کے سر کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اسلامی علوم مدون ہو رہے تھے۔ امام صادقؑ کے دور میں ایک طرف تو امویوں اور عباسیوں کی چپقلش کی وجہ سے حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور کسی حد تک حق بات کے بیان میں جو رکاوٹ تھی وہ دور ہو گئی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں میں بات کو سمجھنے اور تحقیق کرنے کا شوق اور جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ امام صادقؑ جیسی کوئی شخصیت اس محاذ کی رہنمائی کرے۔ تعلیم و ارشاد کی بساط بچھائے اور احکام و اخلاق سے متعلق علمی گتھیوں کو سلجھانے کا کام اپنے ہاتھ میں لے۔ اس سے پہلے کے زمانے میں اس کام کے لیے راہ ہموار نہیں تھی کیونکہ نہ لوگوں میں

اتنی استعداد اور قابلیت تھی اور نہ جوش اور شوق۔

امام صادقؑ کے سوانح میں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن ابی العوجاء اور ابو شاکر دیصانی جیسے زنادقہ اور دہریے اور حتیٰ کہ مقفع آپ کے پاس آتے اور بحث کرتے ہیں اور جواب شافی پاتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کے طویل اور مفصل مباحثوں کا ریکارڈ موجود ہے جو واقعی حیرت انگیز ہے۔ توحید مفضل ایک ضخیم رسالہ ہے جس میں آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص مفضل اور ایک دہریے کے درمیان مباحثے کا بیان ہے جس کے دوران مفضل نے امام صادقؑ سے رجوع کیا تھا۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اکابر معتزلہ جیسے عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء جو بڑے دانشور تھے، آپ کے پاس آتے تھے اور دینی اور سماجی مسائل کے بارے میں آپ سے گفتگو کر کے جاتے تھے۔

تیسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بڑے بڑے فقہا یا تو آپ کے شاگرد تھے یا آپ سے سوالات پوچھا کرتے تھے۔ ابو حنیفہ اور مالک امام صادقؑ کے ہمعصر ہیں اور دونوں نے آپ سے استفادہ کیا ہے۔ شافعی اور احمد بن حنبل آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ مالک مدینہ میں تھے اور اکثر امامؑ کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ میرا احترام کرتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی اور میں خدا کا شکر کرتا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ مالک امام صادقؑ کے بارے میں کہتے ہیں:

كَانَ مِنْ عُظَمَاءِ الْعُبَّادِ وَ اَكَابِرِ الزُّهَّادِ وَالَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَكَانَ كَثِيْرَ الْحَدِيْثِ طَيِّبَ الْمُجَالَسَةِ كَثِيْرَ الْفَوَائِدِ۔

وہ بڑے عابدوں اور زاہدوں میں سے تھے۔ آپ کو رسولِ خدا کی احادیث بہت یاد تھیں۔ بڑی دلچسپ گفتگو کرتے تھے اور آپ کی مجلس میں بیٹھنے سے بڑے فوائد حاصل ہوتے تھے۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

مَارَأَتْ عَيْنٌ وَلَاسَمِعَتْ أُذُنٌ وَلَاخَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ أَفْضَلَ مِنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ.

جعفرؑ بن محمدؑ سے لائق آدمی نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی کے تصور میں آیا۔ ابوحنیفہ کہتے تھے:

مَارَأَيْتُ أَفْقَهَ مِنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ.

میں نے جعفرؑ بن محمدؑ سے بڑھ کر کوئی فقیہہ نہیں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب جعفرؑ بن محمدؑ منصور کے حکم پر عراق آئے تو منصور نے مجھ سے کہا کہ ان سے پوچھنے کے لیے مشکل ترین چالیس مسائل تیار کرو۔ میں ایسے ہی چالیس مسائل تیار کر کے منصور کے دربار میں لے گیا۔ منصور نے میرا تعارف کرایا۔ امام نے فرمایا: میں ان کو جانتا ہوں۔ یہ میرے پاس آتے ہیں۔ اس کے بعد منصور کے حکم پر میں نے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ آپ نے ہر ایک کے جواب میں فرمایا تم لوگوں یعنی علمائے عراق کا قول یہ ہے۔ فقہائے مدینہ یہ کہتے ہیں' خود آپ نے کبھی ہمارے ساتھ موافقت کی کبھی اہلِ مدینہ کی تصویب کی اور کبھی ایک تیسری رائے ظاہر کی۔

کبھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ متصوفین آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال و جواب کرتے تھے۔ اس کا ایک مختصر نمونہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

امام صادقؑ کا زمانہ وہ تھا کہ افکار و آراء کا تصادم اور عقائد کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ضرورت اس کی تھی کہ امام اپنی کوشش کو اس محاذ پر مرکوز کریں۔

اس کے برخلاف سید الشہداؑ جانتے تھے کہ ان کی شہادت کا اچھا اثر مرتب ہوگا۔ اس لیے انہوں نے قیام کیا اور شہید ہوگئے۔ یہ اثر آج تک باقی ہے۔ امام صادقؑ نے علمی مرکز کے قیام کے لیے موقع مناسب سمجھا، آپ نے اس طرف توجہ کی۔ بغداد جو صدرِ اسلام میں علمی اور اسلامی تحریکوں کا مرکز تھا، آپ ہی کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ آخیر عمر میں بغداد تشریف لائے تھے۔ یہ امام صادقؑ ہی کا اثر ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ تمام اسلامی علوم میں دوسروں سے آگے ہیں یا ان کے ہمقدم ضرور ہیں۔ بعض علوم کی تو بنیاد ہی شیعوں نے رکھی۔ ادب، تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ، معرفت، نجوم، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کے سب شعبوں میں شیعوں نے کتابیں لکھیں۔ بڑے بڑے لوگ پیدا کیے اور بلند پایہ علمی شہکار دنیا کو دیے۔

اگر ہم آج دیکھتے ہیں کہ ہزار سال کے بعد اصلاح پسند لوگ شیعہ مذہب کا باضابطہ اعتراف کرنے لگے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ شیعہ مسلک واقعی اسلامی مسلک ہے اور ہر شعبے میں شیعہ کارنامے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اب اس مسلک پر کوئی سیاسی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ کارنامے ایمان اور عقیدے کا نتیجہ ہیں۔ سیاست ایسی فقہ، اخلاق، فلسفہ، تفسیر اور حدیث کو پیدا نہیں کر سکتی۔ آج شیعیت کا باضابطہ اعتراف امام صادق سلام اللہ علیہ کی اس وقت کی کوشش اور آپ کے طرزِ عمل کا ہی نتیجہ ہے۔

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام نے ہر زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ اور اس کے تقاضے بدلتے رہے اسی کے مطابق ان کا طرزِ عمل بھی بدلتا رہا۔ ہر زمانے میں انہوں نے اسلامی مفاد کا لحاظ رکھا اور پوری بصیرت کے ساتھ وقت کی ضرورت کو سمجھ کر ایک خاص محاذ

پر جہاد کیا۔

بظاہر جو تعارض نظر آتا ہے یہ در حقیقت تعارض نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بہترین درس ہے جو عقل و فکر سلیم رکھتے اور ہر زمانے اور ہر دور کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کبھی سید الشہداءؑ کے زمانے کی طرح ان کی تحریک مسلح جہاد کی شکل اختیار کرتی ہے، کبھی امام صادقؑ کے زمانے کی طرح تعلیم و ارشاد، عمومی تعلیم میں وسعت اور ذہنی تربیت کی اور کبھی کوئی اور شکل۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

مشہور روایت کے مطابق آج امام ہفتم موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام کی شب وفات ہے۔ آپ کی ولادت اموی دور کے اواخر میں ۱۲۸ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۸۳ ہجری میں عباسی خلیفہ ہارون رشید کے قید خانہ میں ہوئی۔ آپ نے ۵۵ سال کی عمر پائی۔ عمر کے آخری سال قید خانے میں گزرے جہاں آپ زہر خورانی کے اثر سے رحلت فرما گئے۔

مولانا رومی نے اپنی مثنوی کے دفترِ اول میں ایک قصہ بیان کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے مصائب میں گرفتار رہنے، کنوئیں میں گرنے، غلام بن جانے اور برسوں قید میں رہنے کے بعد ان کے بچپن کا ایک دوست ان سے ملنے آیا۔ مولانا رومی کہتے ہیں:

"یوسف صدیق کا ایک عزیز دوست جس سے بچپن کی واقفیت تھی کہیں باہر سے آکر آپ کا مہمان ہوا۔ اس نے آپ کو بچایوں

کا ظلم اور حسد یاد دلایا۔ آپ نے کہا کہ ہم شیر ہیں اور وہ واقعات زنجیر تھے۔ شیر کو اگر زنجیر سے باندھ دیا جائے تو اس کی شان میں فرق نہیں آتا۔ شیر کی گردن میں زنجیر بھی ہو جب بھی وہ زنجیر پہنانے والوں پر بھاری رہتا ہے۔

دوست نے پوچھا، جب آپ قید میں اور کنوئیں میں تھے، اس وقت کیا صورت تھی؟

آپ نے فرمایا: وہی جو چاند کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ گھٹتا اور غائب ہو جاتا ہے لیکن وہ پھر پورا چاند بن کر آسمان پر چمکتا ہے۔ گیہوں کو مٹی کے نیچے دبا دیتے ہیں لیکن وہ مٹی سے ابھرتا ہے اور اس پر خوشے لگتے ہیں۔ پھر اسے چکی میں پیسا جاتا ہے لیکن اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اور وہ روٹی بن جاتا ہے۔ پھر روٹی کو دانتوں سے چباتے ہیں، وہ حیات اور عقل و سمجھ بن جاتی ہے۔"
(مثنوی مولوی)

اس لحاظ سے کہ آپ کی زندگی کا کچھ حصہ قید خانے میں گزرا۔ امام موسے بن جعفر علیہ السلام کا حال یوسف صدیق سے مشابہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ حضرت یوسفؑ پر زنانِ مصر نے دباؤ ڈالا۔ آپ نے اپنے گوہر ایمان کو محفوظ رکھنے اور لباس تقویٰ کو آلودگی سے بچانے کے لیے قید خانے کی آرزو کی۔

یوسف نے کہا: "خدایا جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھ کو بلا رہی ہیں اس سے تو قید ہو جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے۔ اگر تو اپنے فضل سے مجھ کو ان کی چالوں سے نہیں بچائے گا تو میں ان کی

طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا۔"

چنانچہ اللہ نے ان کی سن لی اور ان کو کید زنان سے بچا لیا۔ بے شک وہ بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ پھر مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ یوسفؑ کو کچھ وقت کے لیے قید کر دیا جائے۔ (سورۂ یوسف)

بھائیوں کے حسد نے یوسفؑ کو کنویں میں ڈالا، زنانِ مصر کی ناقابلِ قبول خواہشوں نے آپ کو قید خانے بھجوا دیا۔ برسوں آپ قید رہے۔ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ۔ قید خانے ہی میں نبوت ملی اور وہاں سے خالص تر، کامل تر اور پختہ تر ہو کر نکلے۔

پیغمبروں میں یوسفؑ ہیں جو اس جرم میں کہ وہ باپ کے لاڈلے تھے، کنویں میں ڈالے گئے اور پاکیزگی اور تقویٰ کے جرم میں قید خانے بھیجے گئے۔ ائمۂ اہلبیت میں موسیٰ بن جعفرؑ اس جرم میں کہ لوگوں کو ان سے محبت اور عقیدت تھی اور وہ ان کو ہارون سے زیادہ لائق سمجھتے تھے، برسوں قید میں رہے۔ فرق یہ رہا کہ یوسفؑ تو آخر قید سے آزاد ہو گئے لیکن ہارونی حکومت نے آخرِ کار موسیٰ بن جعفرؑ کو قید خانے ہی میں زہر دے کر شہید کر دیا۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ۔

"جب دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں پر اللہ کا فضل ہے تو ان سے حسد کرنے لگتے ہیں اور ان کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔"

ایک عرب شاعر کہتا ہے:

قَالُوا حُبِسْتَ فَقُلْتُ لَيْسَ بِضَائِرِي

حَبْسِي وَأَيُّ مُهَنَّدٍ لَا يُغْمَدُ

"لوگ مجھ کو طعنے دیتے ہیں کہ تجھے قید کر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں

رہے تو کوئی عیب کی بات نہیں۔ کون سی شمشیر خارا شگاف ہے
جس کو میان میں نہیں رکھا جاتا۔"
آگے چل کر شاعر کہتا ہے:

أَوَ مَا رَأَيْتَ اللَّيْثَ يَأْلَفُ غِيلَهُ
كِبْرًا وَأَوْبَاشُ السِّبَاعِ تَرَدَّدُ

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ شیر جب بڈھا ہو جاتا ہے تو اسے اپنے کچھار
میں رہنے کی عادت ہو جاتی ہے جب کہ ادنیٰ درجے کے درندے
ہر طرف دوڑتے پھرتے ہیں۔"
"سورج جب تک آنکھوں سے اوجھل نہ ہو، چھوٹے ستارے چمکتے
ہوئے نظر نہیں آتے۔"
"جب تک آگ کو چقمے سے کریدا نہ جائے آگ پتھروں میں چھپی
رہتی ہے اور اس سے تاپا نہیں جا سکتا۔"
"اگر قید کسی اخلاقی جرم کی بنا پر نہیں ہوئی تو قید خانہ بری جگہ
نہیں۔"

اگر کسی نے چوری کی ہے، قتل کیا ہے، غبن کیا ہے، فساد پھیلایا ہے اور عدالت نے اسے سزا دے کر جیل بھیج دیا ہے تو واقعی یہ شرم کی بات ہے، ننگ و عار کا سبب ہے، ذلت کا مقام ہے بلکہ اگر ان کاموں کی وجہ سے جیل جانا نہ بھی پڑے تب بھی یہ کام شرمناک اور رسوائی کا سبب ہیں لیکن اگر کوئی حق گوئی اور حق خواہی کے جرم میں اور ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کی بنا پر جیل جاتا ہے تو یہ فخر کی بات ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ:

بَيْتٌ يُجَدَّدُ لِلْكَرِيمِ كَرَامَةً
وَيُزَارُ فِيهِ وَلَا يَزُورُ وَيُحْفَدُ

"قید خانہ وہ جگہ ہے جہاں جا کر شریف کی عزت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں اس سے لوگ ملنے جاتے ہیں۔ اس سے ملاقات پر فخر کرتے ہیں۔ اس کو ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"
پھر شاعر کہتا ہے: ؎

"جب آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل میں آتشِ شوق بھڑک رہی تھی، میں نے محبوب سے کہا کہ تو پاؤں میں زنجیریں دیکھ کر مت گھبرا، یہی زنجیریں مردوں کی زینت ہیں۔" لہ

حریت پسندی کے جرم میں

قید کے اثرات

یہاں دو نکتے قابلِ ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ وہ سختیاں، سزائیں اور مصیبتیں جو کسی شخص کو حق گوئی اور حق خواہی کے نتیجہ میں اور دینی، اخلاقی اور فکری شخصیت کی وجہ سے جھیلنی پڑتی ہیں باعثِ شرم نہیں بلکہ فخر کا موجب ہیں۔ اس نکتے کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو تاریخ ایسے واقعات سے پُر ہے جن میں بڑے بڑوں نے عزت کے ساتھ جان دی، قید ہوئے، سختیاں جھیلیں اور تشدد برداشت کیا۔ اس راہ کے مصائب نہ صرف اُن

لہ شبلی نعمانی نے بھی زنجیر کو "زیور" سے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں

پہنائی جا رہی ہیں علمائے دین کو زنجیریں
یہ زیور "سید سجادؑ" عالی کی وراثت ہے

بزرگوں کے لیے سامانِ عزت وافتخار رہیں بلکہ خود انسانیت کے لیے فخر ومباہات کا موجب ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس طرح کی سختی اور تشدد برداشت کرنا جوہرِ انسانیت کی تکمیل اور تہذیبِ نفس کا ذریعہ ہے۔ ایسے ہی جیسے کہ اس کے برعکس ناز و نعم کی زندگی ہمت و حوصلہ کی پستی اور اخلاق کی خرابی کا سبب ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز حوصلہ کو پست کرنے والی اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے والی اور زندگی تباہ کرنے والی نہیں۔

سختیوں، تکلیفوں اور مشکلوں سے روح کی ورزش ہوتی ہے۔ اس میں طاقت آتی ہے۔ وجودِ انسان کا سونا کھرا اور مضبوط ہوتا ہے۔ جب تک آدمی مصائب میں گرفتار نہ ہو اور مشکلات کا سامنا نہ کرے اس کی ذات کی نشوونما اور تکمیل نہیں ہوتی۔ ذات کی توڑ پھوڑ کے بغیر ارتقاء کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ بقول مولانا رومی گیہوں کا دانہ خاک کے نیچے جا کر مٹی کے جیل خانے میں بند ہو جاتا ہے۔ وہیں وہ پھٹتا ہے جس سے اس کی ذات فنا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک بلند تر مرحلے کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ چند ہی دن میں گیہوں ایک پودے کی شکل میں ابھرتا ہے جس پر خوشے لگتے اور ان میں دانے پڑتے ہیں۔ گیہوں کا مٹی میں ملنا ہی اس کے ارتقاء کی تمہید ہے۔ پھر یہی دانۂ گندم چکی میں پس کر آٹا بنتا ہے۔ آٹا روٹی بن جاتا ہے۔ پھر روٹی دانتوں کی چکی میں پس کر جسم میں تحلیل ہوتی ہے اور آخر کار گیہوں ترقی کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا عقل و فہم کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

تضاد و تصادم کا قانون

قدرت کا ایک قانون ہے جس کا نام ہے قانونِ تضاد۔ فلاسفہ کہتے ہیں:
لَوْلَا التَّضَادُ مَا صَحَّ دَوَامُ الْفَیْضِ عَنِ الْمَبْدَءِ الْجَوَادِ۔

اگر تضاد اور اس کے نتیجے میں تصادم نہ ہوتا تو مبداءِ فیاض سے فیضِ وجود کے تسلسل کا بھی امکان نہ ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر موجود میں کسی نہ کسی طرح کے ارتقاء کی صلاحیت ہے۔

دوسری طرف دیکھیے تو ہر موجود اپنے ارتقاء کے ہر مرحلے پر کچھ ایسے سامان سے بھی لیس ہوتا ہے جو اس کے لیے اس مرحلے میں ضروری اور مفید ہوتا ہے۔ مثلاً اس چھلکے کو دیکھیے جو کسی میوے کی گری کو اپنے گھیرے میں لیے ہوتا ہے یا انڈے کے چھلکے کو دیکھیے جو انڈے کی سفیدی اور زردی کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ چھلکے ضروری اور مفید ہیں لیکن اس وقت تک جب تک گری گری رہے اور انڈا انڈا رہے لیکن اگر میوے کا دانہ یہ چاہے کہ ترقی کر کے درخت بن جائے یا انڈا یہ چاہے کہ پہلے چوزہ اور پھر مرغ بن جائے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ چھلکے کا حصار توڑ کر آزاد ہو جائے۔

یہ حصار اور یہ دیواریں قدرتی تضاد اور تصادم کے نتیجے میں ڈھے جاتی ہیں اور اس طرح رکاوٹیں دور ہو کر فیضِ الٰہی جاری رہتا ہے۔

یہ تکالیف اور سختیاں ہی ہیں جن کے نتیجے میں بڑے بڑے سورما اور غیر معمولی ذہین اور عبقری پیدا ہوتے ہیں۔ طاقت اور قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ تکالیف برداشت کر کے ہی وہ عظیم رہنما وجود میں آئے جنہوں نے دنیا کو بڑی بڑی تحریکوں سے روشناس کیا۔

زینب کبریٰ

ہماری مذہبی اور دینی تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ خواتین اسلام میں ایک قابل فخر خاتون زینب کبریٰ علیہا السلام ہیں۔ تاریخ بتلاتی ہے کربلا کے خونیں مصائب اور شدائد نے زینبؑ کو فولاد بنادیا تھا۔ جو زینبؑ شام سے مدینے واپس آئیں وہ وہی زینبؑ نہیں تھیں جو مدینے سے روانہ ہوئی تھیں۔ جو زینبؑ شام سے واپس آئیں وہ زیادہ نکھری ہوئی تھیں حتیٰ کہ دوران اسیری میں جو کارنامے آپ سے ظہور پذیر ہوئے وہ ایام کربلا کے ان واقعات سے یکسر مختلف ہیں جب آپ کے عظیم بھائی ابھی زندہ تھے اور آپ پر ابھی ذمہ داری کا بوجھ نہیں پڑا تھا۔

ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی ہمارے زمانے کی ایک قابل مسلمان عرب خاتون ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے بطلۃ کربلا (کربلا کی عظیم خاتون) یہ کتاب فارسی میں ترجمہ ہوکر کئی بار چھپ چکی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ زینب کبریٰؑ کی عظمت کا سبب زیادہ تر حوادث و مصائب کربلا ہی ہیں۔ یہ واقعات کربلا ہی تھے جو اس کا موجب ہوئے کہ زینبؑ نے دربار یزید میں وہ آتش بار خطبہ دیا جو آپ سب نے سنا ہے۔[1]

مشہور عرب شاعر ابو تمام کہتا ہے:

اگر عود کی لکڑی آگ میں نہ جلتی تو کوئی بھی اس کی خوشبو سے واقف نہ ہوسکتا۔ اسی مضمون کو سعدی نے اس طرح ادا کیا ہے:

---

[1] دیکھیے جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب "تاریخ عاشورا" مولفہ ڈاکٹر آیتی۔

قولِ مطبوع از درونِ سوزناک آید کہ عود
چوں ہمی سوزد جہاں از وے معطر می شود

رودکی کہتا ہے:

اندر بلائے سخت پدید آید
فضل و بزرگواری و سالاری

موسیٰؑ بن جعفرؑ

موسیٰ بن جعفر علیہما السلام حق گوئی، ایمان و تقویٰ اور اپنی مقبولیت کے جرم میں قید ہوئے۔ آپ کا ایک ملفوظ ہے۔ آپ نے اپنے حامیوں میں سے کسی کو مخاطب کرکے فرمایا: "دیکھو خدا کے غضب سے ڈرتے رہو۔ ہمیشہ حق بات کہو، چاہے اس کا انجام بربادی ہی کیوں نہ نظر آئے کیونکہ دراصل اسی میں تمہاری نجات ہے۔"

شیخ مفید آپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ موسیٰ کاظمؑ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عبادت گزار، سب سے بڑے فقیہ، سب سے زیادہ فیاض اور سب سے زیادہ باوقار تھے۔ ہمیشہ بارگاہِ خداوندی میں تضرع اور اظہارِ عاجزی کرتے رہتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الرَّاحَةَ عِنْدَ الْمَوْتِ وَالْعَفْوَ عِنْدَ الْحِسَابِ.

"یا اللہ میں موت کے وقت راحت اور حساب کے وقت معافی کا خواستگار ہوں۔"

اکثر فقراء کی تلاش میں رہتے تھے۔ رات کے وقت نقدی، آٹا اور کھجوریں ایک ظرف میں ڈال کر مختلف طریقوں سے فقرائے مدینہ تک پہنچاتے۔ ان غریب

کرتا بھی نہ جانا کہ ان کا محسن کون ہے۔ بے مثل حافظِ قرآن تھے۔ ایسی خوش الحانی سے تلاوت کرتے تھے کہ دلوں پر چوٹ لگتی تھی۔ سامعین آپ کی تلاوت سن کر رونے لگتے تھے۔ اہلِ مدینہ نے آپ کو زین المجتہدین کا لقب دیا تھا۔

۱۷۹ھ ہجری میں ہارون حج کے لیے بغداد سے نکلا۔ پہلے مدینے گیا۔ وہاں جا کر حکم دیا کہ امام کو حاضر کیا جائے۔ یہ سن کر اہلِ مدینہ چونک پڑے۔ سارے مدینہ میں تہلکہ مچ گیا۔ ہارون نے حکم دیا کہ راتوں رات محمل پر پردے ڈال کر اس میں امام کو بصرے روانہ کر دیا جائے اور وہاں عیسیٰ بن جعفر عباسی کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ بصرہ کا حاکم اور ہارون کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہاں لے جا کر حضرت کو قید کر دیا گیا۔ ادھر ہارون نے حکم دیا کہ ایک اور محمل پر پردے ڈال کر کوفے کی طرف بھیجا جائے تا کہ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ امام کو کوفے روانہ کیا گیا اور وہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں کہ چونکہ کوفہ حضرت کے دوستوں اور شیعوں کا مرکز ہے وہاں حضرت کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ اگر کچھ لوگ حضرت کو راستے سے واپس لانے کی کوشش بھی کریں تو ان کا خیال کوفے جانے والے راستے ہی کی طرف جائے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ ایک سال تک بصرہ میں قید رہے۔ ہارون نے عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ قید خانے ہی میں امام کا کام تمام کر دے لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔ اس نے جواب میں لکھا کہ میں نے اس ایک سال میں اس شخص کو ہر وقت عبادت ہی میں مشغول پایا ہے۔ یہ عبادت سے کبھی نہیں اکتاتا۔ میں نے کچھ لوگوں کو اس بات پر مامور کیا کہ یہ دیکھیں کہ یہ اپنی دعاؤں میں آپ پر یا مجھ پر لعنت و نفرین تو نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنے لیے خدا سے رحمت و بخشش کی طلب کے سوا اور کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا۔ میں ایسے شخص کے قتل میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں ایسے شخص کو قید خانے میں بھی رکھنا نہیں چاہتا" یا تو آپ

اس کو واپس لے لیں ورنہ میں رہا کردوں گا۔

ہارون نے حکم دیا کہ امام کو بصرے سے بغداد لاکر فضل بن ربیع کے قید خانے میں رکھا جائے۔ ہارون نے فضل بن ربیع سے بھی امام کو قتل کردینے کے لیے کہا مگر اس نے بھی منظور نہ کیا۔ اس پر ہارون نے فضل بن یحییٰ برمکی کی سپردگی میں دے دیا تاکہ وہاں قید میں رکھا جائے۔ فضل بن یحییٰ نے خود اپنے مکان کا ایک کمرہ حضرت کے لیے مخصوص کردیا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اس پر نگاہ رکھی جائے کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ اس کو بتلایا گیا کہ آپ دن رات نماز، دعا اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ دن کو اکثر روزہ رکھتے ہیں۔ عبادت کے سوا کسی بات سے آپ کو دلچسپی نہیں۔ فضل بن یحییٰ نے حکم دیا کہ آپ کا احترام کیا جائے اور آپ کے آرام و راحت کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔

مخبروں نے اس قصہ کی ہارون کو اطلاع دی۔ جس وقت یہ خبر ہارون کو ملی وہ بغداد میں نہیں تھا۔ ہارون نے فوراً فضل کو ایک عتاب آمیز خط لکھی اور یہ خواہش کی کہ امام کو قتل کردیا جائے لیکن فضل تیار نہ ہوا۔ ہارون بہت جز بز ہوا۔ اس نے اپنے خادم خاص مسرور کے ہاتھ دو خط، ایک سندی بن شاہک کے نام اور ایک عباس بن محمد کے نام روانہ کیے۔ ساتھ ہی مسرور کو حکم دیا کہ خفیہ طریقے سے تحقیق کرے۔ اگر موسیٰ ابن جعفر فضل کے مکان پر آرام سے ہوں تو اس کا انتظام کرے کہ فضل بن یحییٰ کے کوڑے لگائے جائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور فضل بن یحییٰ نے کوڑے کھائے۔ مسرور نے اس پوری کارروائی کی اطلاع چٹھی لکھ کر ہارون کو دے دی۔ ہارون نے حکم دیا کہ امام کو فضل بن یحییٰ کی تحویل سے لے کر سندی بن شاہک کے حوالے کردیا جائے۔

یہ ایک غیر مسلم تھا جو نہایت سنگدل اور جابر تھا۔ ضمناً یہ بھی سن لیجیے کہ

ایک دن ہارون نے مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ فضل بن یحییٰ نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں تم بھی اس پر لعنت بھیجو چنانچہ بے ضمیر لوگوں نے محض ہارون کو خوش کرنے کے لیے فضل بن یحییٰ پر لعنت بھیجنی شروع کر دی۔ جب اس قصے کی اطلاع فضل بن یحییٰ برمکی کے باپ یحییٰ بن خالد برمکی کو ملی' وہ سوار ہو کر رقہ پہنچا اور اپنے بیٹے کی طرف سے معذرت کی۔ ہارون نے بھی یہ معذرت قبول کر لی۔ قصہ مختصر بالآخر سندی ہی کے قید خانے میں حضرت کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

ایک عہدہ دار کا امام کی مزاج پرسی کے لیے آنا

ایک دن سندی بن شاہک کے قید خانے میں ہارون نے اپنے ایک آدمی کو حضرت کی مزاج پرسی کے لیے بھیجا۔ سندی خود بھی اس عہدہ دار کے ساتھ تھا۔ جب یہ فرستادہ امام کی خدمت میں پہنچا آپ نے پوچھا: کیا کام ہے؟

اس نے جواب دیا: خلیفہ نے مجھے آپ کی مزاج پرسی کے لیے بھیجا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ خلیفہ کو میری طرف سے کہہ دو کہ ہر روز جو ایک سختی کا دن مجھ پر گزرتا ہے تو تیری خوشی کا ایک دن کم ہو جاتا ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب میں اور تو ایک جگہ اکٹھے ہوں گے۔ وہاں اہل باطل کو اپنی غلط روی کا برا انجام معلوم ہوگا۔

اسی زمانے میں جب آپ ہارون کی قید میں تھے ایک روز ہارون نے فضل بن ربیع کو ایک پیغام دے کر بھیجا۔ فضل کہتا ہے کہ جب میں آپ کے پاس پہنچا

تو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ کی ہیبت ایسی تھی کہ مجھے بیٹھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اپنی تلوار پر ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ نماز ختم ہوئی تو آپ نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی اور دوسری نماز شروع کر دی۔ آخر جب وہ نماز ختم ہوئی تو تیسری نماز شروع کرنے سے قبل میں نے اپنی بات شروع کر دی۔

میں نے کہا: خلیفہ نے مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اس کے نام کے ساتھ امیر المومنین کا لقب استعمال نہ کروں' بلکہ یہ کہوں کہ آپ کے بھائی ہارون نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ ہمیں کچھ اطلاعات ملی تھیں جن سے غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کوئی غلطی نہیں تھی لیکن میری خواہش ہے کہ آپ ہمیشہ میرے پاس رہیں اور مدینہ نہ جائیں۔ چونکہ اب یہ طے ہو گیا ہے کہ آپ ہمارے پاس ہی رہیں گے' میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ فرمادیں کہ آپ کو کس قسم کی غذا پسند ہے۔ فضل کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کی راحت رسانی کا انتظام کرے۔

یہ سن کر آپ نے دو لفظوں میں فضل کی بات کا جواب دے دیا۔ آپ نے فرمایا: میرے پاس اپنا روپیہ موجود نہیں جس سے میں فائدہ اٹھاؤں اور مانگنے کی میری عادت نہیں کہ تم سے کوئی خواہش کروں۔

لَیْسَ لِیْ مَالٌ فَیَنْفَعُنِیْ وَمَا خُلِقْتُ سَئُوْلًا.

ان دو لفظوں میں آپ نے اپنی بے نظیر خودداری اور طبیعت کے استغنا کو واضح کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ قید و بند نے آپ کے حوصلہ کو پست نہیں کیا۔ یہ کہہ کر آپ فوراً اٹھے اور اللہ اکبر کہہ کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ [۲۰]

مشکلات و مصائب کی اصلیت

میں نے پچھلے جلسہ میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جو چیزیں تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق کی تکمیل میں مدد دیتی اور ان قوتوں کو بروئے کار لاتی ہیں جو انسانی وجود میں پوشیدہ ہیں ان میں سے ایک مصیبتیں، تکلیفیں اور بلائیں ہیں۔ آج میں اس مضمون کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

مصائب اللہ کی عنایات ہیں

قرآن و حدیث میں یہ مضمون بار بار ملتا ہے کہ اللہ نے فلاں پیغمبر یا اپنے فلاں نیک بندے کو مصیبتوں اور بلاؤں میں ڈالا یا یہ کہ بلائیں خاص طور پر ان ہی پر آتی ہیں جن پر اللہ کا خاص لطف و کرم ہوتا ہے یا یہ مضمون کہ مصائب اور مشکلات تحفۂ الٰہی ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَتَعَاهَدُ الْمُؤْمِنَ بِالْبَلَاءِ كَمَا يَتَعَاهَدُ الرَّجُلُ

اَهْلَهٗ بِالْهَدِيَّةِ مِنَ الْغَيْبَةِ۔

"جس طرح پردیس سے کوئی شخص اپنے گھر والوں کو تحفہ بھیجتا ہے اسی طرح جس بندۂ مومن پر اللہ کا کرم ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کوئی مصیبت بھیج دیتا ہے۔"

یا ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا غَتَّهٗ بِالْبَلَاءِ غَتًّا۔

"اللہ جب کسی کو محبوب رکھتا ہے تو اس کو مشکلات و مصائب میں غوطہ دے دیتا ہے۔"

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اس شخص کے یہاں کھانا تناول نہیں فرماتے تھے جو کسی مشکل یا مصیبت میں گرفتار نہ ہوا ہو۔ اس بات کو اس کی عدم قابلیت کی علامت اور خدا سے دوری کا نشان سمجھتے تھے۔

اس پر فوراً یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں آتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی پر اللہ تعالےٰ کے لطف و کرم اور اس کی محبت و عنایت کا تقاضا یہ ہو کہ اس کو مصائب و مشکلات میں مبتلا کر دیا جائے۔ مہر و محبت کا اقتضا تو یہ ہے کہ آرام اور راحت کا سامان فراہم کیا جائے نہ یہ کہ بے آرامی اور تکلیف کا۔

قرآن و سنت میں ایک اور لفظ آیا ہے جس سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ امتحان کا لفظ ہے۔ اللہ مصائب اور مشکلات کے ذریعے اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اللہ اس سے ناواقف ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کیا ہے جو امتحان لے کر معلوم کرنا چاہتا ہے؟ کیا خود قرآن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں، کوئی حرکت اور جنبش ایسی نہیں، کوئی چھوٹی بڑی چیز ایسی نہیں جس کا پورا حال حق تعالیٰ سبحانہٗ

معلوم اور اس پر منکشف نہ ہو، پھر امتحان کے کیا معنی؟

مشکلات کا تعمیری پہلو

ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت معلوم ہوتا ہے جب مشکلات اور مصائب کا فلسفہ اور آدمی پران کا اثر معلوم ہو جائے۔ یہ معلوم ہو جائے کہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ بہت سے کمالات کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب سختیوں کا اور مشکلات کا سامنا کیا جائے، حوادث کا مقابلہ کیا جائے اور مصائب پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ ان کمالات کا حصول سخت تصادم اور ٹکراؤ پر منحصر ہے۔

صرف یہی بات نہیں کہ مشکلات اور تکالیف سے گزرنے کے بعد ہی ہر شخص کے جوہر کھلتے ہیں۔ ہر شخص میں کچھ ایسے جوہر موجود ہیں مگر ایسے چھپے رہتے ہیں جیسے کان میں ہیرا مٹی کے نیچے چھپا رہتا ہے۔ یہ جوہر مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔ صرف یہی بات نہیں بلکہ بات اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ مصائب و مشکلات کا اثر انقلاب آفریں ہے۔ مصائب و مشکلات سے کایا پلٹ جاتی ہے۔ مصائب پارس کا پتھر ہیں جو آدمی کو کندن بنا دیتے ہیں۔ ان کے تعمیری اثر سے آدمی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ کمزور قوی ہو جاتے ہیں، پست ہمت عالی حوصلہ بن جاتے ہیں، خام پختہ ہو جاتے ہیں۔ مشکلات کا اثر میل کاٹنا اور زنگ دور کرنا ہے، ابھارنا اور اکسانا ہے۔ ہوشیاری اور احساس پیدا کرنا ہے، کمزوری اور سستی کو دور کرنا ہے۔

اس لیے ان باتوں کو قہر و غضب نہیں، لطف و کرم سمجھنا چاہیے۔ یہ لطف ہیں قہر کی شکل میں، خیر ہیں شر کی صورت میں، نعمت ہیں نقمت کے لباس میں۔

جو جو ہر قابل ہیں وہ ان الطافِ فرمنا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صرف موجودہ مشکلات ہی سے فائدہ نہیں اٹھاتے' بلکہ ان کی مثال کسی طالع آزما کی ہے۔ وہ خود مشکلات کی تلاش میں رہتے ہیں اور دانستہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

رومی نے ان عناصر کی جو تکلیف اٹھا کر ترقی اور توانائی حاصل کرتے ہیں ایک مثال بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ایک جانور ہے جس کا نام اسغر ہے اور جو لکڑی کا زخم کھا کر موٹا اور مضبوط ہوتا ہے۔ جتنا اس کو لکڑی سے مارو' اتنا ہی اس کے لیے اچھا ہے۔ وہ لکڑی کے زخم ہی سے پھلتا پھولتا ہے۔ مومن کی روح کی مثال بھی اسغر کی سی ہے۔ یہ بھی تکالیف اٹھا کر توانا ہوتی ہے اسی لیے انبیاء کو اور سب لوگوں سے زیادہ تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تاکہ ان کی روح اور لوگوں کی نسبت زیادہ توانا ہو جائے۔"

رومی نے ایک اور مثال بھی دی ہے۔ یہاں انہوں نے مصیبتیں جھیلے ہوئے افراد کو رنگے ہوئے چمڑے سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں:

"جانور کی کھال مسالوں کی تکلیف اٹھا کر طائف کا رنگا ہوا چمڑا بن جاتی ہے۔ اگر اس کو تلخ و تیز مسالوں سے خوب کمایا نہ جائے تو سڑ کر بدبو دینے لگتی ہے۔ آدمی کو بھی چمڑا ہی سمجھو۔ وہ بھی رطوبتوں سے خراب ہو جاتا ہے۔ اس کو بھی پاک و صاف اور نرم و نازک بنانے کے لیے تلخ و تیز مسالے ڈال کر خوب کمانے کی ضرورت ہے۔ اللہ کی طرف سے جو بلائیں آتی ہیں وہ تم کو پاکیزہ بنانے ہی کے

پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ کا علم تمہاری تدبیرسے بڑھ کر ہے۔"

یہ تو ہوا پہلے سوال کا جواب کہ اللہ تعالےٰ اپنے دوستوں کو بلاؤں میں مبتلا کیوں کرتا ہے۔

امتحانِ خداوندی

رہا دوسرا سوال کہ ان صورتوں میں امتحان کے کیا معنی ہیں؟ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں ایک حد تک اس سوال کا جواب بھی آگیا ہے۔ بہرحال مزید وضاحت کیے دیتا ہوں۔

کبھی کسی چیز کو اس لیے جانچتے ہیں تاکہ جو بات معلوم نہیں وہ معلوم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی چیز کو ناپ اور پیمانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا کسی سامان کو ترازو میں رکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کا درحقیقت کتنا وزن ہے۔ ترازو فقط تولنے کا آلہ ہے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ یہ بتلا دے کہ کسی چیز کا وزن کتنا ہے۔ ترازو خود کسی چیز میں کوئی کمی بیشی نہیں کرسکتی۔ ناپ تول کے تمام آلات کا یہی حال ہے۔ مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) کا کام یہ ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ ہوا میں گرمی کتنی ہے یا انسان کے بدن کا درجۂ حرارت کیا ہے۔ میٹر ایک مقررہ طول کے ناپنے کا آلہ ہے۔ علم منطق جس کو علم میزان بھی کہا جاتا ہے' اس کا کام یہ ہے کہ استدلال کی شکل کا اندازہ لگائے اور اگر اس میں کوئی خرابی ہو تو منطقی قواعد کی رو سے اس کی تعیین کرے۔

اگر امتحان کے معنی فقط یہ ہوں کہ نامعلوم کو معلوم کرنے کے لیے کوئی پیمانہ استعمال کیا جائے' جب تو یہ بات خدا کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔

لیکن امتحان کے ایک اور بھی معنی ہیں اور وہ ہیں بالقوہ کو بالفعل بنانا

اور اس کی تکمیل کرنا۔ اللہ تعالیٰ جو مصائب اور مشکلات کے ذریعے امتحان لیتا ہے، اس کا مطلب ہے جس میں جس کمال کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اس کو اس کمال تک پہنچانا۔ مصائب و مشکلات کا فلسفہ یہ نہیں ہے کہ صرف وزن، مقدار اور کیفیت کا تعین کیا جائے بلکہ وزن اور مقدار میں اضافہ اور درجہ کو بڑھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لیے امتحان نہیں لیتا کہ کسی کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگائے اور اس کے وزن اور روحانی درجے کا تعین کرے بلکہ وہ اس لیے امتحان لیتا ہے کہ اس شخص کے موجودہ روحانی درجے کو بڑھائے اور اس کے وزن میں اضافہ کرے۔ وہ اس لیے امتحان نہیں لیتا کہ یہ معلوم کرے کہ فی الواقع کون جنتی ہے اور کون جہنمی، بلکہ مصائب و مشکلات پیدا کر کے اس لیے امتحان لیتا ہے تاکہ جس میں صلاحیت ہو وہ ان مشکلات کے ذریعے بہشت میں جانے کے قابل ہو جائے اور جس میں صلاحیت نہ ہو وہ اپنی جگہ پر ہی رہے۔

امام علیؑ اپنے اس خط میں جو آپ نے والئ بصرہ عثمان بن حنیف کے نام لکھا تھا پہلے تو عثمان بن حنیف کو نصیحت کرتے ہیں کہ عیش و عشرت میں نہ پڑیں اور اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں، پھر اپنی سادہ اور عیش سے خالی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں خود جو کی روٹی پر قناعت کرتا ہوں اور کسی طرح کے عیش اور آرام میں نہیں پڑتا۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ شاید کچھ لوگوں کو اس پر تعجب ہو کہ علیؑ ایسی خوراک کھا کر کیسے اتنی طاقت برقرار رکھتے ہیں کہ دوسرے دلاوروں کا مقابلہ کر سکیں اور ان سے جیت سکیں؟ قاعدے سے تو یہ چاہیے تھا کہ اپنے اس طرز زندگی کی وجہ سے وہ طاقت کھو بیٹھتے اور کمزور ہو جاتے۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ جفاکشی کی زندگی سے طاقت نہیں گھٹتی بلکہ طاقت عیش و آرام اور ناز و نعمت کی زندگی سے گھٹتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

أَلَا وَاِنَّ الشَّجَرَةَ الْبَرِّيَّةَ أَصْلَبُ عُوْدًا وَالرَّوَائِعَ الْخَضِرَةَ أَرَقُّ جُلُوْدًا وَالنَّابِتَاتِ الْبَدَوِيَّةَ أَقْوٰی وُقُوْدًا۔

جنگلی درخت جن کی باغبان دیکھ بھال نہیں کرتے ان کی لکڑی زیادہ مضبوط ہوتی ہے اور وہ ہرے بھرے درخت جن کی باغبان پرورش کرتے ہیں نسبتاً کمزور بنتے ہیں۔ گھریلو پودوں کی نسبت صحرائی پودوں کی آگ زیادہ پائدار ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو زمانے کے نشیب و فراز اور اچھے برے حالات سے گزرے ہیں اور جنہوں نے سختیاں اور مصائب جھیلے ہیں وہ ان لوگوں کی نسبت جو ناز و نعم میں پلے ہیں زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں۔ فرق ہے اس طاقت میں جو اندر اور باہر سے جوش مارتی ہو اور اس میں جو بیرونی مدد کی محتاج ہو سبات تو یہ ہے کہ باطنی استعداد اور غیر محدود باطنی طاقت کا ظہور ہو۔

امام علیؑ فرماتے ہیں کہ یہ مت کہو کہ یا اللہ میں فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آپ نے فرمایا یہ کہو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ۔

"اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں گمراہ کرنے والے فتنوں سے۔"

یعنی پناہ مانگتا ہوں فتنہ کے ان پہلوؤں سے جو گمراہ کرنے والے ہیں۔

عیش و آرام کی زندگی

چونکہ مشکلات کا سامنا کرنے سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے، مشکلات

سے شخصیت جلا پاتی اور کندن بنتی ہے اس لیے مشکلات سے دور بھاگنے کا اثر الٹا ہوتا ہے اس لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ بچوں کے ساتھ ماں باپ کا حد سے بڑھا ہوا لاڈ پیار ان کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے یعنی حد سے زیادہ لاڈ پیار اور بچے کو ہر طرح کی مشکل سے دور رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور وہ زندگی کے میدان میں نہتا رہ جاتا ہے۔ ذرا بھی کوئی بات طبیعت کے خلاف ہو تو وہ گھبرا جاتا ہے اور حالات میں ذرا سی تبدیلی اس کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ اس کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کبھی پانی میں نہ گیا ہو اور اسے تیرنا نہ آتا ہو۔ ایسے میں اگر یکایک دریا کا سامنا ہو جائے اور تیرنا پڑ جائے تو پانی میں اترتے ہی ڈوب جائے گا کیونکہ تیرنا مشق سے آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو زبانی یا کتاب پڑھ کر اور کمرے میں بیٹھ کر سیکھی جا سکے۔ یہ ایک عملی ہنر ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ پانی میں جا کر مشق اور کوشش کی جائے اور آہستہ آہستہ سیکھا جائے۔

میں نے آغاز جنی میں ایک حدیث پڑھی تھی اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا غَتَّہُ بِالْبَلَاءِ غَتًّا۔ یعنی اللہ جب اپنے کسی بندے کو پسند کرتا ہے تو اس کو بلاؤں میں غوطہ دیدیتا ہے۔ غت کے معنی ہیں غوطہ دینا۔ بلاؤں میں اس لیے غوطہ دیا جاتا ہے تاکہ مشکلات کے سمندر میں تیر کر باہر نکلنا سیکھے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ یہ اللہ کی محبت اور اس کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندے کو دریائے حوادث میں سے تیر کر نکلنے کا سامان فراہم کرتا ہے لہٰذا مشکلات یقیناً اللہ کا لطف ہیں۔

بعض پرندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب ان کے بچے کے پر نکل آتے ہیں، اس کو اڑنا سکھانے کے لیے پرندہ اس کو اپنے ساتھ لے کر گھونسلے

سے نکلتا اور ہوا میں اڑتا ہے۔ پھر اس کو ایک دم چھوڑ دیتا ہے۔ بچہ کچھ دیر کوشش کرتا ہے پر پھڑپھڑاتا ہے اور جب تھک کر زمین پر گرنے لگتا ہے تو اس کی ماں اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیتی ہے۔ چند لمحوں بعد اسے پھر بلندی سے چھوڑ دیتی ہے۔ کچھ دیر یہ بچہ کوشش کرتا رہتا ہے کبھی اوپر اٹھتا ہے کبھی نیچے آتا ہے جب بالکل تھک جاتا ہے، ماں پھر اسے سنبھال کر اپنے بازوؤں پر اٹھا لیتی ہے۔ اس طرح کئی بار گرنے کے بعد بچہ پوری طرح اڑنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

اسی فطری اصول سے آدمی کے بچے کی تربیت میں کام لیا جانا چاہیے۔ شروع ہی سے بچے کو کام کرنے، محنت کرنے، تکلیف برداشت کرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ مگر حضرت انسان اس کا الٹ کرتے ہیں۔ اونچا طبقہ یہ سمجھ کر کہ محنت تو غریبوں کا کام ہے محنت سے جی چراتا ہے اور اپنے بچوں کو بھی بیکار اور مفلوج بنا دیتا ہے۔

ژان ژاک روسو اس طرح کی تربیت کے متعلق اپنی کتاب میں کہتا ہے:

"اگر ایسا ہوتا کہ لوگ ساری عمر اس ملک میں رہا کرتے جس میں وہ پیدا ہوتے تھے۔ اگر پورے سال ایک ہی موسم رہتا، اگر کوئی شخص اپنی تقدیر نہ بدل سکتا، جب تو اس طرح کی تربیت ایک لحاظ سے مفید ہوتی لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی کے حالات تیزی سے بدلتے رہتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس روش سے زیادہ بے معنی اور غلط کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بچے کی اس طرح تربیت کریں کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے اور ہر وقت نوکروں اور ماماؤں میں گھرا ہے۔ اگر وہ بدنصیب ایک قدم بھی باہر رکھے تو یہ سمجھیں کہ وہ فنا ہو جائے گا۔"

یہی رو سو لکھتا ہے کہ جسم اگر زیادہ آرام میں ہو تو روح میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو شخص درد و رنج سے ناواقف ہے' جو شفقت کی لذت کو نہیں جانتا جو رحم کی حلاوت سے ناآشنا ہے' اس کا دل کسی چیز سے متاثر نہیں ہو گا۔ اس لیے وہ معاشرتی زندگی کا اہل نہیں ہو گا اور آدمیوں میں وہ اجنبی بن جائے گا۔

دشوار فرائض کا فلسفہ

عبادات جن کا مذہب اسلام نے حکم دیا ہے' ایک طرح سے روح کی ورزش ہیں۔ ان کی بجا آوری میں زحمت ہوتی ہے۔ بعض عبادتیں تو واقعی سخت ہیں۔ ان کے منجملہ ایک جہاد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عبادت عیش و آرام کی زندگی کے منافی ہے۔ رسولِ اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِغَزْوٍ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ۔

"جس نے دین کے لیے جان نہیں لڑائی اور جس کے دل میں اس کی آرزو بھی پیدا نہیں ہوئی وہ ایک طرح کے نفاق میں مرے گا۔"

کچھ کھرے اور کھوٹ ایسے ہیں جو صرف جہاد' تصادم اور ٹکراؤ ہی سے بتائے جا سکتے ہیں اور بعض اخلاق عالیہ کا ظہور میدان جنگ ہی میں ہوتا ہے۔ بہادری اور دلیری کتاب خوانی اور گوشہ نشینی سے پیدا نہیں ہوتی۔

ایک اور عبادت حج ہے جس کا زندگی میں کم از کم ایک بار ادا کرنا ہر صاحب استطاعت پر واجب ہے لیکن اس اجتماعی عبادت کی بجا آوری بھی مشقت اور دشواری سے خالی نہیں۔

امام علیؑ خانۂ کعبہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ خدا کا وہ گھر جس کا طواف

ضروری ہے۔ ایک نہایت غیر آباد اور ناہموار جگہ پر واقع ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو بہت ہی سرسبز و شاداب جگہ پر ہوتا جہاں پھلدار درختوں کی کثرت ہوتی اور عمدہ قدرتی مناظر ہوتے لیکن اس وقت نہ امتحان و آزمائش کا موقع ہوتا اور نہ کوئی دشواری اور زحمت اٹھانی پڑتی۔ لوگ سیر کی غرض سے وہاں آتے اور جو مقدس مقصد ہے وہ حاصل نہ ہوتا۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں: "اللہ اپنے بندوں کو طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کرکے آزماتا ہے، ان کو قسم قسم کی مشکلات کا عادی بناتا ہے اور ان کو طرح طرح کے ناخوشگوار واقعات سے دوچار کرتا ہے تاکہ ان کے دلوں سے تکبر نکل جائے اور اس کی جگہ تواضع اور انکسار ان کے دلوں میں گھر کر جائے اور اس طرح ان کے لیے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں اور ان کی مغفرت کا سامان ہوجائے۔"

تنگی اور دشواری

آخر میں مختصر طور پر ایک اور بات کا تذکرہ کردوں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر یہ جو کہتے ہیں کہ اسلام میں کوئی تنگی اور دشواری نہیں اس کا کیا مطلب ہوا؟

دراصل یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دینِ اسلام کے احکام تکلیف دہ نہیں ہیں۔

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

"اللہ نے دین میں تمہارے لیے کوئی دشواری نہیں رکھی۔"

یہ بات نہیں ہے کہ دینی تعلیمات پر عمل انسان کے لیے تکلیف کا باعث ہو لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اسلام میں تربیت کی بنیاد لاڈ پیار یا عیش اور عشرت پر ہو۔ اسلامی فرائض کی بجا آوری دشوار نہ ہونے اور تکلیف کا سبب نہ ہونے کا مطلب کچھ اور ہے۔

ایمان کے فوائد

ایمان کے بارے میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ایک تو یہ کہ ایمان یا مذہبی عقیدہ پیدا کیسے ہوتا ہے۔وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی دین کی طرف کھنچتا ہے۔پھر وہ چیز آیا داخلی ہے یا خارجی؟ یعنی آیا مذہبی عقیدے کا سرچشمہ خود انسانی فطرت ہے یا کچھ خارجی عوامل انسان کو مذہب کی طرف متوجہ کرتے ہیں؟ بالفاظ دیگر انسان میں جو مذہبی احساس پایا جاتا ہے اس کی جڑ اور اس کی بنیاد کیا ہے اور یہ احساس کتنا حقیقی ہے؟ دوسری بات مذہب اور اس پر ایمان کے اثرات اور فوائد کی ہے۔یہ دونوں باتیں دلچسپ اور قابلِ توجہ ہیں۔

سرمایہ یا دردِ سر

ہماری آج کی گفتگو کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ایمان اور مذہب پر اعتقاد کا نتیجہ کیا ہے۔جس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک شخص راسخ العقیدہ مومن ہو، ایسے ہی

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص مذہب پر قطعاً اعتقاد نہ رکھتا ہو، لا مذہب ہو اور پوری زندگی اسی طرح گزار دے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب پر اعتقاد انسان کے لیے کوئی سرمایہ اور دولت ہے کہ اگر یہ دولت ہاتھ سے جاتی رہے تو زندگی میں سخت نقصان اور گھاٹا ہوگا یا یہ محض ایک طرح کی پابندی اور بوجھ ہے جس کے ہاتھ سے جاتے رہنے سے زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ ایک بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

ٹالسٹائی ہمارے دور کا مشہور مفکر اور عظیم مصنف ہے۔ وہ کہتا ہے ایمان وہ چیز ہے جس سے انسان کی زندگی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان زندگی کی بہترین دولت ہے۔ جس نے ایمان ضائع کر دیا اس نے زندگی کی سب سے بڑی دولت کھو دی۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو زندگی کا سرمایہ سمجھا جا سکتا ہے۔ صحت زندگی کا سرمایہ ہے، اسی طرح سلامتی سرمایہ ہے، دولت بھی سرمایہ ہے، علم بھی، سماجی انصاف بھی، نیک بیوی اور بچے بھی، مخلص دوست بھی، اعلیٰ تعلیم بھی، ذہنی اور دماغی صحت بھی۔ یہ سب زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اگر آدمی کے پاس ان میں سے کوئی ایک بھی چیز نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس ایک بڑی دولت کی کمی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی نہ ہونا ایک طرح کی بدقسمتی ہے۔

ایمان بھی زندگی کا سرمایہ ہے بلکہ ان سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ

"اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسا کاروبار بتاؤں جو تم کو

دردناک عذاب سے محفوظ رکھے یا تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ۔"

قرآن کریم نے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کو تجارت اور کاروبار سے تعبیر کیا ہے۔

پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے مادی اور محسوس چیزوں کو سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر دولت کو لیجیے۔ یہ بھی زندگی کا سرمایہ ہے۔ ہر شخص کو بہت جلد اور بآسانی اس کی قدر و قیمت کا احساس ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے لالچ بڑھ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ متعلقہ شخص اور سوسائٹی دونوں کیلئے دردسری کی شکل میں نکلتا ہے۔

دوسری طرف اچھے اخلاق، صحیح تربیت اور عمدہ عادات بھی زندگی کا سرمایہ ہیں جن سے ترقی ہوتی ہے، مسرت و خوشحالی میسر آتی ہے بلکہ ان کا اثر دولت سے بدرجہا زیادہ ہے لیکن انسان کو اس کا احساس ذرا دیر میں ہوتا ہے اور ان کی قدر و قیمت دیر سے سمجھ میں آتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ آدمی یا تو فطری طور پر ہوشیار اور نکتہ شناس ہو کر از خود عمدہ اخلاق اور اعلیٰ تربیت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھ لے یا پھر اس کو ایسی تعلیم ملے کہ وہ استاد یا پیشوایانِ انسانیت کی زبان سے ان چیزوں کی اہمیت معلوم کر سکے۔

مثلاً امام علیؑ کا قول ہے: حُسْنُ الْخُلُقِ خَيْرُ رَفِيقٍ. اچھا اخلاق بہترین ساتھی ہے۔ ـــــــ رُبَّ عَزِيزٍ اَذَلَّهُ خُلُقُهُ وَرُبَّ ذَلِيلٍ اَعَزَّهُ خُلُقُهُ۔ کتنے معزز لوگ اپنے اخلاق کی بدولت ذلیل ہو گئے اور کتنے ہی وہ جو گھٹیا سمجھے جاتے تھے اپنے اخلاق کی وجہ سے صاحبِ عزت بن گئے۔ اخلاق کے

برخلاف دولت ایسی چیز ہے کہ آدمی بچپن ہی سے اس کی قدر پہچاننے لگتا ہے۔
ایمان کا بھی یہی حال ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اس عظیم نعمت سے بہرہ مند ہیں اور اس کے زیر سایہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی صحت و تندرستی اور ان کی طویل العمری کا راز اس ایمان میں پنہاں ہے جو ان کے دل میں موجزن ہے گو خود انہیں اس کا احساس نہ ہو۔ اس کے برعکس بہت سے لوگ ہیں جن کی عمر رنج، پریشانی اور خوف میں گزرتی ہے مگر وہ خود یہ نہیں سمجھتے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ زندگی کی ایک بڑی دولت انہوں نے ہاتھ سے گنوا دی ہے۔ اسی مضمون پر ایمان کے اثرات کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اخلاق کا سہارا

پہلی بات تو یہ ہے کہ اخلاق کو ایمان ہی سے سہارا ملتا ہے۔ اخلاق خود زندگی کا ایک بڑا سرمایہ ہے لیکن ایمان کے بغیر اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی۔ سب اخلاقی اصولوں بلکہ تمام روحانیت کی بنیاد اور وجہ جواز خدا پر ایمان ہے۔ فیاضی، شرافت، تقویٰ، عفت، دیانتداری، سچائی، راستبازی، ایثار، حسن سلوک، صلح جوئی، امن پسندی، منصف مزاجی، حقوق انسانی کی علمبرداری اور وہ سب باتیں جن کو اعلیٰ درجے کی انسانی خوبیاں کہا جاتا ہے اور جن کو سب پسندیدہ اور محترم سمجھتے ہیں اور اگر ان میں وہ خوبیاں موجود نہیں بھی ہوتیں، جب بھی ظاہر یہی کرتے ہیں کہ وہ ان میں موجود ہیں۔ ان سب خوبیوں اور اوصاف کی بنیاد ایمان پر ہی ہے کیونکہ ان میں سے ہر خوبی میں کسی نہ کسی ذاتی اور مادی فائدے سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور آدمی مادی فائدوں سے محرومی جب ہی گوارا کر سکتا ہے جب وہ اس محرومی کو محرومی نہ

سمجھے جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو روحانی اقدار کا احساس ہو اور وہ ان کی لذت سے واقف ہو اور روحانی امور کی تو بنیاد ہی ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر ایمان اور اس کے عادل اور دانا ہونے پر یقین کا کم از کم یہ نتیجہ تو ہوتا ہی ہے کہ ایک مومن کو یہی یہ اطمینان رہتا ہے کہ کوئی خوبی اور کوئی نیک کام اللہ کے یہاں ضائع نہیں جاتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ "اللہ عمل کرنے والوں کا صلہ رائیگاں نہیں جانے دیتا۔" اس طرح اس نوعیت کی ہر محرومی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

آدمی کے سامنے فقط دو راستے ہیں۔ یا تو وہ محض خود غرض ہو، صرف اپنے فائدے کو دیکھے اور کسی محرومی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو یا پھر خدا پرست ہو، ایسی محرومی کو محرومی نہ سمجھے جو حسن اخلاق کا مظہر ہو یا کم از کم یہ خیال کرے کہ محرومی کی تلافی ہو گئی۔ ایثار اور احسان کی بنیاد اگر تقویٰ اور رضائے الٰہی کی طلب نہ ہو تو ایسی بنیاد خطرناک ہے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ
خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ

"آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے تقوے اور اس کی خوشنودی پر رکھی یا وہ شخص جس نے اپنی بنیاد ایسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی جو گرنے ہی والا ہو۔"

(سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۹)

جس کے اخلاق اور جس کی شخصیت کی بنیاد غیر اللہ پر ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایسے کنارے پر کھڑا ہو جہاں سے ہر لمحہ اس کے گر جانے

کا اندیشہ ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ.

"جن لوگوں نے خدا کے سوا اپنے اور دوست اور سرپرست تجویز کر رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے بودا گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے۔" (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۴۱)

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اپنے کاموں میں خدا کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اللہ کے سوا ہر سہارا کمزور اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ محض تقلید یا ترغیب کی بنا پر یا عادت ڈال کر لوگوں کو ایثار و قربانی کی عارضی طور پر جبری تربیت تو دی جا سکتی ہے لیکن یہ صورت ایک طرح سے بیوقوف بنانے اور مجبور کرنے کی کوشش ہوگی۔ غلط طریقے استعمال کر کے ہمیشہ اور سب لوگوں کو ایثار و قربانی پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکماء کہتے ہیں القسر لا یدوم یعنی غیر فطری حرکت کو دوام نہیں ہوتا۔ جس طرح اللہ کائنات کا سرچشمہ ہے اور تمام موجودات اسی کی ذات کے سہارے سے قائم اور موجود ہیں اسی طرح تمام روحانی اور اخلاقی فضائل کا سرچشمہ بھی ایمان باللہ ہے۔ خدا کے بغیر روحانیات کی مثال ایسے کرنسی نوٹوں کی سی ہوگی جن کی پشت پر کوئی سرمایہ نہ ہو۔ ایسے نوٹوں کی وقعت کاغذ کے پرزوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔

"کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے کلمہ طیبہ کی کیسی عمدہ مثال دی ہے کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑیں خوب مضبوط ہوں اور اس کی شاخیں آسمان تک جا رہی ہوں۔ وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ پھل دیتا ہو۔ اللہ ایسی مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ خوب سمجھ لیں۔" (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۲۶)

اس مثال کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ منظور ہے کہ انسانیت کا درخت پھلے پھولے تو ضروری ہے کہ اس کی جڑ توحید و ایمان کے اصولوں پر قائم ہو۔

اس کے بعد ایک اور مثال دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۔

"گندی بات (باطل اور بے بنیاد عقیدہ) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت جس کی جڑیں زمین میں پیوست نہ ہوں اور جو اپنی جگہ قائم نہ رہ سکے۔" (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۲۷)

اس کے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۔

"اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو حق و صداقت پر دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔"

ایمان کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ.

"کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا کھلانے کی دوسروں کو بھی ترغیب نہیں دیتا۔"

مطلب یہ ہے کہ جو دین سے روگردانی کرتا ہے وہ تمام خوبیوں اور نیکیوں سے روگردانی کرتا ہے کیونکہ دینی جذبہ ہی انسانیت کی بنیاد اور اس کا سہارا ہے۔ جب دین ہاتھ سے گیا تو سمجھو انسانیت اور انسانی جذبات بھی ہاتھ سے گئے۔

مجموعی طور پر روحانیت کے لیے ایک طرح کی مادّی محرومی ضروری ہے اور جب تک بنیاد درست نہ ہو انسان بلا وجہ محرومی برداشت نہیں کرتا۔ اگر خیالات مادہ پرستانہ ہیں تو اخلاق بھی مادہ پرستانہ ہوں گے یعنی ان کی بنیاد خود غرضی اور ذاتی فائدے پر ہوگی۔

حکم الٰہی ہے کہ:

کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ.

"اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لیے گواہی دو، چاہے یہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے والدین اور

رشتہ داروں کے خلاف ہو۔" (سورۂ النساء ۔ آیت ۱۳۵)

یا یہ کہ:

كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَنْ لَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔

اللہ کے لیے قیام کرو اور انصاف سے گواہی دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی (چاہے وہ دینی ہی ہو) تمہیں حق و عدالت کے راستے سے ہٹا دے۔ عدل کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ (سورۂ مائدہ ۔ آیت ۸)

یہ ایسے احکام ہیں کہ دین ہی نے ان پر عمل کرایا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اخلاق، سماجی انصاف، انسانیت، سماجی سلامتی سب سرمایہ ہیں جن کے حصول اور حفاظت کے لیے ایک اور سرمایہ کی ضرورت ہے جس کا نام ایمان ہے۔

امیر المومنین صلوات اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

"اگر کسی میں ایک بھی اچھی خصلت ہو تو میں اس کی دوسری کمزوریوں کو نظر انداز اور معاف کر سکتا ہوں لیکن دو باتیں ناقابلِ برداشت ہیں: ایک بے عقلی دوسری بے دینی ــــ اس لیے کہ جس شخص کا دین نہیں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور بغیر اطمینان اور اعتماد کے زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی اور عقل کا فقدان زندگی ہی کا نہ ہونا ہے ــــ بے عقل کا شمار مُردوں ہی میں ہو سکتا ہے۔"

بے دین شخص کی طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا ہے اور آدمی کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ کسی وقت دھوکا ہی نہ دے جائے اور جہاں عقل نہیں وہاں زندگی بھی نہیں۔ بے عقل کو مردہ ہی سمجھنا چاہیے۔

جہاں تک اخلاقی صفات کا تعلق ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ مجموعی طور پر تقویٰ، عفت اور دیانت وامانت کے اوصاف اس قدر پختہ ہوں کہ یہ آدمی کی برائیوں سے وہاں بھی حفاظت کریں جہاں کسی عیب کے ظاہر ہو جانے کا قطعی امکان نہ ہو۔ طاقت کے ہوتے ہوئے کمزوروں اور ماتحتوں سے انصاف کیا جائے، زور آوری کے مقابلے میں جرأت دکھائی جائے، بات پر قائم رہا جائے، دوسروں کی بجائے اپنی ذات پر بھروسہ کیا جائے، محبت اور صدق و خلوص کا دور دورہ ہو تو یہ سب کچھ یا تو ایمان کے سائے میں ہو سکتا ہے یا جب کوئی فرد کامل خالص ایمان کے سائے میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہو۔

جسم وجان کی سلامتی

ایمان کا ایک اور اثر جسم وجان کی سلامتی ہے۔ امام علیؑ تقویٰ کے بارے میں فرماتے ہیں:

دَوَاءُ دَاءِ قُلُوْبِكُمْ وَشِفَاءُ مَرَضِ اَجْسَادِكُمْ.

"تقویٰ روحانی بیماریوں کی دوا اور جسمانی امراض کی شفا ہے۔"

یہ تو ظاہر ہے کہ ایمان کوئی سفوف، قرص یا کیپسول نہیں ہے۔ جسمانی اور روحانی صحت پر تقویٰ کا اثر اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ ذہن نشین ہو جائے کہ باایمان آدمی کی روح زیادہ مطمئن، اس کے اعصاب زیادہ پرسکون اور اس کا دل زیادہ صحت مند ہوتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ فکر نہیں رہتی کہ کس چیز پر قبضہ کرے اور کیا ہڑپ کر جائے۔ اگر وہ دوسروں کو خوشحال دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حسد کی آگ نہیں بھڑکتی۔ وہ حرص، بخل اور لالچ کی آگ میں نہیں جلتا رہتا۔ اعصابی بے چینی اسے معدے اور آنتوں کے ناسور میں مبتلا

نہیں کرتی۔ شہوت کی زیادتی اس کو کمزور نہیں کرتی۔ وہ طویل عمر پاتا ہے۔

جسم و روح کی سلامتی کا ایمان سے گہرا تعلق ہے۔ دماغی امراض کے مریضوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ، جن سے ہسپتال بھرے ہوئے ہیں، آج کا ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی بیماریاں اس طبقہ میں زیادہ عام ہیں جو خدا پر ایمان سے بے بہرہ ہے۔ ذہنی بیماریوں کا اصل سبب محرومیوں اور سماجی ناانصافیوں کا احساس ہے۔ ایمان وہ دوا ہے جو ان امراض سے محفوظ رکھتی اور ان سے بچاؤ کی احتیاطی تدبیر کا کام دیتی ہے۔ بہرحال مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ سب محرومیوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایمان کی موجودگی میں محرومیاں آدمی کو متزلزل نہیں کرتیں اور اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔

ماحول سے مطابقت

ایمان کا ایک اور اثر فرد اور معاشرے میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ حیاتیات کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی موجود کی زندگی کی بقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ ماحول اس کی زندگی کے لیے سازگار ہو۔ اگر ماحول مناسب نہیں تو وہ زندہ موجود اپنے اندر آہستہ آہستہ تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے جن سے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے، جب تو وہ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر ایسی مناسب تبدیلیاں پیدا نہ کر سکے تو وہ لازماً فنا ہو جائے گا کیونکہ وہ ماحول کے حالات کا تجزو اور ان کے تابع ہے۔

قدرتی ماحول کے لحاظ سے انسان کی بھی یہی صورت ہے۔ اگر انسان کو نامناسب ماحول میں رہنا پڑے تو اس کے بدن کا اندرونی نظام خود بخود ایسی

کارروائی شروع کر دیتا ہے جس سے اس میں ماحول سے مطابقت پیدا ہو جائے۔ دوسری طرف انسان خود بھی کوشش کرتا ہے کہ اپنی قوت اختراع سے کام لے کر ماحول اور قدرتی عوامل کا مقابلہ کرے اور ان کو اپنے لیے سازگار بنا لے۔

قدرتی ماحول کے علاوہ انسان کا سماجی ماحول بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی اس کی مطابقت ضروری ہے۔ کسی معاشرے میں جو افراد رہتے ہیں ان کی عادات و خصائل اور اس معاشرے میں رائج قاعدے، قانون اور رسم و رواج سب مل کر سماجی ماحول تشکیل دیتے ہیں۔ انسان کو اپنی خواہشات، رجحانات اور شخصی ضروریات کو اس ماحول کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔ ان دونوں میں مطابقت ضروری ہے۔ اس کے لیے معاشرے اور فرد دونوں میں لچک کی ضرورت ہے۔ معاشرے میں لچک کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ منصفانہ ہو اور سب افراد کے مفاد کا خیال رکھے۔ فرد میں لچک کا مطلب یہ ہے کہ فرد معاشرے کے مجموعی مفاد کو برضا و رغبت قبول کرے اور بوقت ضرورت اپنی ذاتی خواہشات کو معاشرے کے مجموعی مفاد پر قربان کر دے۔ شروع میں قدرتی طور پر فرد اور معاشرے میں مطابقت نہیں ہوتی کیونکہ معاشرے میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی رائے، اپنا عقیدہ اور اپنے رجحانات ہوتے ہیں جو دوسروں کے خیالات اور خواہشات سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں طرف سے لچک ضروری ہے تاکہ باہمی مطابقت پیدا ہو جائے۔ لچک کی صورت یہی ہے کہ معاشرہ مجموعی مفاد کا لحاظ رکھے اور فرد اپنے رجحانات اور خواہشات کو معاشرے کی خواہشات اور اس کے مقاصد کے مطابق ڈھال لے۔ بنیادی طور پر یہ مطابقت مذہب کے ذریعے پیدا ہوتی ہے کیونکہ مذہب ہی

معاشرے کو انصاف مہیا کرتا ہے اور فرد کو تسلیم و رضا کا سبق سکھاتا ہے۔

تسلیم و رضا کا مفہوم

چونکہ یہاں تسلیم و رضا کا نام لیا گیا ہے اس لیے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں فوراً یہ خیال آئے کہ معاشرہ فرد کے ساتھ جو بھی سلوک کرے اس پر راضی اور قانع رہنا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ پستی اور بے عملی ہے۔ اس کے برعکس بے اطمینانی کا نتیجہ حرکت اور کوشش ہوتا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ مطمئن اور قانع ہونے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم اچھی اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حصے پر قانع اور مطمئن رہے۔ آخر ہر شخص کا کچھ حق اور حصہ مقرر ہے۔ اس لیے کسی کو اس فکر میں نہیں رہنا چاہیے کہ سب کچھ خود ہی ہتھیا لے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے حق پر قانع رہے۔

وَاجْعَلْنِیْ بِقِسْمِكَ رَاضِیًا قَانِعًا۔

"اے اللہ میرے مقسوم میں جو کچھ ہو میں اس پر خوش اور مطمئن رہوں۔"

تسلیم و رضا کی دوسری قسم ظلم و زیادتی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے لیکن یہاں مخالفت اور بے اطمینانی کا اظہار نہایت اچھی بات ہے اور صورتِ حال کو جوں کا توں بخوشی قبول کر لینا نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ گناہ ہے۔

نفس پر قابو

ایمان کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت نفس پر قابو حاصل ہو

جاتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نفس پر قابو کا مسئلہ محض ایک مذہبی بات ہے اور اس کی بنیاد عقیدے پر ہے۔ اگر مذہب نہ ہوتا تو نفس پر قابو بھی ضروری نہ ہوتا۔ نفس پر قابو ایسے ہی ایک اخلاقی خوبی ہے جیسے منصف مزاجی یا ثابت قدمی اور وضع داری۔ اگر کوئی مذہب کو نہ بھی مانتا ہو جب بھی ان اوصاف کا انکار نہیں کر سکتا۔ نہ یہ اوصاف مذہب سے نکلے ہیں نہ مذہب کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں ہاں البتہ یہ ہے کہ مذہب نے ان پر عمل کا بہتر طور پر انتظام کر دیا ہے۔

انسان کا اپنا وجود خود ایک ایسا میدان ہے جس پر زندگی کی کشمکش میں تسلط حاصل کرنا ضروری ہے۔ موجودہ دور کا ایک مشہور مفکر کہتا ہے:

انسان کے تین دشمن ہیں اور اس کو تین محاذوں پر ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ ایک محاذ ہے قدرتی عوامل کا، دوسرا محاذ دوسرے لوگوں سے مقابلے کا اور تیسرا محاذ خود انسان کی اپنی ذات کا جس کو اندرونی محاذ کہنا چاہیے۔ پہلے محاذ پر تو انسان نے ایک حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ سردی، گرمی، بیماری اور دوسری آفات پر انسان نے بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔ اگرچہ اب بھی بعض آفات جیسے زلزلہ یا کچھ بیماریاں جیسے سرطان ایسی ہیں جن پر ابھی تک انسان قابو نہیں پا سکا۔ غیروں سے مقابلہ تو جاری ہے۔ سب سے بڑھ کر خود اپنے نفس سے جنگ ہے کہ ہر شخص خود اپنے اندر ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔

یہ جو ایک مشہور حدیث میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

مَرْحَبًا بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْأَصْغَرَ

ان لوگوں کی آمد مبارک جو جہاد اصغر کا فریضہ انجام دے کر آئے ہیں (اور جہاد اکبر یعنی نفس کے خلاف جہاد کا فریضہ ابھی ان کے ذمہ باقی ہے)۔

اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ دین و ایمان ہی ایک ایسی طاقت ہے جس کی مدد سے انسان اپنی طبعی خواہشات پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مولانا رومی نے کہا ہے:

کشتن ایں، کار عقل و ہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

شیخ سعدی کہتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ۔ تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا اپنا نفس ہے جو تمہارے ہی پہلو میں ہے۔

ان بزرگ نے جواب دیا کہ اور جس کسی پر تم احسان کرو گے وہ تمہارا دوست بن جائے گا مگر تم اپنے نفس کی جتنی خاطر داری کرو گے وہ اتنی ہی تمہاری مخالفت کرے گا۔

علم اور مہارت

ایک بات اور ہے جس کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ تو صحیح ہے کہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے لیکن اس دولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی علم اور ہنرمندی کی ضرورت ہے۔ ورنہ ممکن ہے کہ پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکے یا ناواقفیت کی بنا پر آدمی کوئی غلطی کر بیٹھے یا کوئی دوسرا اس کے دینی جذبے سے فائدہ اٹھائے۔ بہر حال یہ بھی ایک لمبی بحث ہے۔

دنیا کے بارے میں دین کا نقطۂ نظر

آج ہمارا موضوعِ سخن دنیا کے بارے میں مذہب کا نقطۂ نگاہ ہے لیکن ہم صرف اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کریں گے۔ خاص طور پر قرآن نے اس ضمن میں جو تصور پیش کیا ہے اس کی وضاحت بہت ضروری ہے کیونکہ یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ مذہب کے نام پر جو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اس میں سارا زور دنیا کی مذمت اور ترکِ دنیا کی ترغیب پر ہوتا ہے۔ جو شخص واعظ بننا اور وعظ کہنا چاہتا ہے، پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آتا ہے کہ دنیا کی مذمت اور ترکِ دنیا سے متعلق کچھ اشعار یا نثر کے جملے رٹ لیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا یہ مضمون لوگوں کے کانوں میں پڑا ہے اس قدر کوئی اور مضمون نہیں پڑا۔

چونکہ اس موضوع کا تعلق اخلاقِ عامہ اور زندگی کے مسائل سے ہے اس لیے اس کی اہمیت بھی بہت ہے۔ اگر اس معاملے کی مناسب اور معقول توجیہ کی جائے تو اس کا اخلاق کی درستی، خود اعتمادی، بلند نظری، انفرادی خوشحالی اور

اجتماعی تعلقات کی عمدگی پر نہایت خوشگوار اثر مرتب ہوگا لیکن اگر اس کی تشریح نامناسب طریقے سے کی جائے تو اس کے نتیجہ میں اعصاب سن ہو جائیں گے، قوتِ عمل مفلوج ہو جائے گی اور اسی طرح کی انفرادی اور اجتماعی خرابیاں اور برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔

زہد اور ترکِ دنیا کی غلط تفسیر

لیکن بدقسمتی سے آہستہ آہستہ زہد کی منفی تشریح ہی مقبول ہوتی چلی گئی اور اس ضمن میں نظم و نثر میں جو پند و نصائح مرتب ہوئے وہ عموماً اس تشریح پر مبنی رہے ہیں جو اعصاب کو شل اور بے حس کرنے والی ہے۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو قبلِ اسلام کے بعض خیالات اور فلسفوں کا اثر جن میں اس دنیا کو بُرا کہا گیا ہے اور ہر برائی گردشِ روزگار سے منسوب کی گئی ہے۔ مختلف اقوام کے اسلام قبول کرنے اور ان کے آپس میں اختلاط کے نتیجے میں یہ خیالات مسلمانوں میں بھی پھیل گئے۔ دوسرا سبب بعض ناگوار تاریخی واقعات اور گزشتہ چودہ صدیوں کے مخصوص اجتماعی حالات ہیں جن کی وجہ سے مایوسی اور لاتعلقی کی فضا پیدا ہو گئی اور قنوطیت پر مبنی خیالات کو پھیلنے کا موقع مل گیا۔

آئیے براہِ راست یہ دیکھیں کہ خود قرآن کا اس ضمن میں کیا نظریہ ہے؟ کیا بدبینی کا یہ فلسفہ قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے یا قرآن میں اس طرح کی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔

ترکِ دنیا کے بارے میں

قرآن کا نظریہ

قرآن کہتا ہے کہ یہ دنیاوی زندگی فانی ہے اور اس قابل نہیں کہ انسان اسے اپنا مقصودِ حیات اور منتہائے آرزو قرار دے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا۔

"مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی ایک رونق ہیں اور اعمالِ صالحہ جو باقی رہنے والے ہیں آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ وہ اس قابل ہیں کہ ان سے امید وابستہ کی جائے۔" (سورۂ کہف۔ آیت ۴۶)

قرآن مجید دنیا کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ساری امیدیں اسی سے وابستہ کی جائیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ تمام مخلوقات آسمان و زمین، کوہ و دریا، جنگل و صحرا اور انسان و حیوان یا وہ تمام نظام جو اس دنیا میں جاری اور ساری ہے بے کار ہے، غلط ہے، باطل ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس نظام کو صحیح اور برحق قرار دیتا ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ "ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔" قرآنِ کریم مخلوقاتِ عالم کی از قبیلِ جمادات اور نباتات و حیوانات قسم کھاتا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ "قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اور اس کے بعد آنے والے

چاند کی۔ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ۔ قسم ہے انجیر کی، زیتون کی، طورِ سینا کی اور اس امن والے شہر (مکہ معظمہ) کی۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا۔ قسم ہے ہانپتے ہوئے دوڑنے والے اور پھر پتھر پر ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والے گھوڑوں کی"۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ "قسم ہے جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو مکمل کیا اور پھر اس کو یہ القاء کیا کہ اس کے لیے کیا صحیح ہے اور کیا غلط"۔ قرآن میں ارشاد ہے۔ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۔ "تم اللہ کی صنعت میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔ ایک بار پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو کیا تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟"

دنیا اور اس کے تخلیقی نظام کو برا سمجھنا اسلام کے اس مرکزی تصور سے جو اللہ کی وحدانیت پر قائم ہے قطعاً میل نہیں کھاتا۔ اس طرح نظریے کی بنیاد یا تو مادیت اور صانع حکیم و عادل کے انکار پر ہو سکتی ہے یا ثنویت کے اس تصور پر کہ نیکی اور بھلائی کا سرچشمہ اور ہے اور بدی اور برائی کا سرچشمہ کوئی اور جیسا کہ بعض مذاہب کا خیال ہے۔

لیکن ایک ایسے مذہب میں جس کی بنیاد توحید پر ہے اور جس کا خدا رحمٰن و رحیم اور علیم و حکیم پر اعتقاد ہے۔ اس طرح کے خیالات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔

خود قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کی تصریح ہے۔

قرآن میں دنیا کو فانی ضرور کہا گیا ہے اور اس کو ایسی گھاس سے تشبیہ بھی دی ہے جو بارش کے بعد نکل آتی ہے کچھ دن بڑھتی رہتی ہے۔ پھر زرد اور

خشک ہو کر معدوم ہو جاتی ہے لیکن اس سے مقصود دنیا کی برائی نہیں بلکہ انسان کی وقعت میں اضافہ ہے۔ یہ انسان کی شان کے مناسب نہیں کہ وہ مادی چیزوں کو اپنا منتہائے مقصود بنالے لیکن اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ ہم خود دنیا ہی کو برا سمجھیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی مفکرین میں سے کسی نے بھی اس نوع کی آیات کی یہ تفسیر نہیں کی کہ دنیا بری ہے اور آفات کی جڑ گردش روزگار ہے۔

کیا دنیا میں دلچسپی لینا مذموم ہے؟

کچھ لوگوں نے ان آیات کی ایک تفسیر یہ کی ہے کہ ان آیات کا مقصد خود دنیا کی برائی تو نہیں کیونکہ دنیا سے مراد تو یہی چیزیں ہیں جو زمین و آسمان میں موجود ہیں اور ان میں کوئی بذات خود بری نہیں یہ تو سب صانع ازلی کی حکمت و قدرت کی نشانیاں ہیں جو بری ہو ہی نہیں سکتیں۔ جو چیز مذموم ہے وہ دنیا اور امور دنیا سے دل لگانا اور ان سے محبت اور علاقہ رکھنا ہے۔ گو خود دنیا مذموم نہیں۔ اسی بنیاد پر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں دنیا سے محبت اور لگاؤ کی مذمت کے بارے میں نظم اور نثر میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ حد و حساب سے باہر ہے۔

یہ تفسیر اتنی عام ہو گئی ہے کہ اگر کسی سے یہ پوچھا جائے کہ دنیا کی برائی کا کیا مطلب ہے تو وہ عموماً یہی جواب دے گا کہ دنیا کی محبت بری ہے ورنہ دنیا خود بری نہیں۔ اگر دنیا بری ہوتی تو خدا اس کو پیدا ہی نہ کرتا۔

یہ تفسیر اگرچہ بہت مشہور ہے اور اسے مسلم الثبوت بھی سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بے غبار نہیں، نہ خود قرآنی مضامین سے مطابقت رکھتی ہے۔

پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ آدمی کو جو دنیا سے دلچسپی ہے وہ فطری اور قدرتی ہے یا نہیں یعنی کیا آدمی کی فطرت میں شروع ہی سے یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ دنیا میں دلچسپی لے یا یہ دلچسپی بعد میں دوسرے عوامل سے مثلاً عادت یا دوسروں کو دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ ماں باپ بچوں سے اور بچے ماں باپ سے محبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ہر شخص جنس مخالف میں دلچسپی لیتا ہے۔ ہر شخص مال و دولت کا شیدائی ہے' ہر شخص عزت و مقبولیت کا متمنی ہے اور بہت سی چیزیں ہیں جن سے آدمی کو دلچسپی ہے۔

کیا یہ دلچسپی اور تعلق ہر شخص میں فطری ہے یا محض مصنوعی ہے اور غلط تربیت کے نتیجے میں پیدا ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دلچسپی فطری ہے اور اگر فطری ہے تو مذموم کیسے ہو سکتی ہے؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کا یہ فرض ہو کہ وہ ان تمام تعلقات سے دستبردار ہو جائے۔ جس طرح مخلوقات عالم میں کسی چیز کو برا نہیں کہا جا سکتا اور کوئی چیز حکمت سے خالی نہیں' جس طرح خود انسان کا کوئی عضو بیکار نہیں' بدن کی چھوٹی سے چھوٹی رگ حتیٰ کہ ایک بال بھی انسان یا حیوان کے بدن میں ایسا نہیں جو ضرورت سے زائد اور خالی از مصلحت ہو' اسی طرح انسان کی فطری خواہشات اور قدرتی رجحانات میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں جو بے مقصد ہو اور جس میں کوئی مصلحت نہ ہو۔ بچوں سے محبت' والدین سے تعلق' میاں بیوی کی باہمی الفت' مال و دولت کی رغبت' ترقی کی خواہش' عزت اور مقبولیت حاصل کرنے کی آرزو۔ ان سب میں بڑی حکمتیں ہیں کیونکہ ان کے بغیر انسانی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

علاوہ ازیں خود قرآن کریم نے ان محبتوں کا تذکرہ پروردگار کی نشانیوں

کے طور پر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ روم میں جہاں انسان کی تخلیق، نیند اور بعض دوسری چیزوں کا تذکرہ حکمت و تدبیر خداوندی کی نشانیوں کے طور پر کیا گیا ہے وہیں یہ بھی ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ.

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کے زن و شوہر پیدا کیے تاکہ تم کو ان کے پاس سکون ملے اور تمہارے درمیان محبت و الفت پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو ان مسائل میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں خدا کی تدبیر، تسخیر اور حکمت کی نشانیاں ہیں۔

اگر میاں بیوی کی محبت کوئی بری چیز ہوتی تو اس آیت میں اسے اللہ کی حکمت و تدبیر کی ایک نشانی کے طور پر ہرگز بیان نہ کیا گیا ہوتا۔

ظاہر ہے کہ یہ تعلق انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ یہ تعلق وسیلہ ہے اس کا کہ دنیا کے تمام کام باقاعدگی کے ساتھ چلیں۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا تو نہ نسلِ انسانی چل سکتی، نہ زندگی اور تمدن میں پیشرفت ہوتی اور نہ لوگ روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت کرتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روئے زمین پر انسان کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔

اس مشکل کے تین حل

دنیا کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ تو ان کا ہے جو خود دنیا

توبری نہیں لیکن دنیا سے محبت اور تعلق برا ہے۔

جن لوگوں کی نگاہ میں خود دنیا بُری ہے اور جو زندگی کو ہی شر اور تباہی قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک تو انسان کے لیے اس بدبختی سے نجات کا سوائے خودکشی کے اور کوئی طریقہ ہی نہیں۔ سب سے لغویات ان ہی لوگوں کی ہے اور یہی دنیا کے سب سے بدقسمت افراد ہیں۔ بقول ولیم جیمز ان کو تو اس چھپے کی طرح جو چوہے دان میں پڑا چیں چیں کر رہا ہو' ہر وقت روتے دھوتے ہی رہنا چاہیے۔

لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ خود دنیا بری نہیں اس سے تعلق برا ہے' وہ یہ کہتے ہیں کہ جلنے بھننے کی ضرورت نہیں۔ صحیح حل یہ ہے کہ آدمی صلاح و فلاح کے حصول اور بدبختی سے نجات پانے کے لیے دنیا سے دلچسپی لینا چھوڑ دے اور اس سے تعلق منقطع کر لے اس طرح آدمی دنیا کی برائیوں کے چنگل سے رہائی پا کر سعادت ابدی سے ہم کنار ہو جائے گا۔

اس گروہ کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ طبعی اور فطری خواہشات اور رجحانات کا اور ان قوتوں کا جو روح میں رچی بسی ہوئی ہیں' ان کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کے مطابق جس کی تائید حالیہ نفسیاتی تحقیق سے بھی ہوتی ہے قلع قمع نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کو جڑ سے اکھاڑا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ریاضت و مجاہدہ کے نتیجہ میں ان کو لاشعور میں دھکیل دیا جائے۔ ایسی صورت میں وہ اکثر کسی دوسرے راستے سے خطرناک صورت میں ابھرتی ہیں اور ذہنی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ دنیا سے قطع تعلق آدمی کے لیے سو فیصد مضر اور نقصان دہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی عضو مثلاً ہاتھ' پاؤں' آنکھ یا ناک کو کاٹ دیا جائے۔

انسان میں ہر فطری قوت کسی خاص کام اور مقصد کے لیے رکھی گئی ہے اور بیکار پیدا نہیں کی گئی اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی قوت کے مرکز کو خراب اور تباہ کر دیا جائے۔

قرآن کا طرزِ فکر

قرآن مجید سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ بنیادی طور پر دنیا سے تعلق اور محبت بری بات ہے اور نہ کہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ دنیا سے بالکل منہ موڑ لیا جائے اور دنیا میں دلچسپی کو ختم کر دیا جائے بلکہ بات کچھ اور ہی ہے۔

قرآن میں جس بات کی مذمت کی گئی ہے وہ ہے "دنیا کا ہو کر رہ جانا" دنیا پر قناعت کر لینا اور صرف دنیوی اور مادی امور میں دلچسپی لینا۔

قرآن میں ہے:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا۔

"مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ انہی سے امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔" (سورۂ کہف۔ آیت ۴۶)

پس بات امید وابستہ کرنے، اپنا مقصود قرار دینے اور مطمح نظر سمجھنے کی ہے۔

قرآن مجید میں اہل دنیا کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

وَاطْمَأَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔

"وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں، جو دنیوی زندگی سے خوش اور اس پر قانع ہیں اور جو ہماری نشانیوں کو بھولے ہوئے ہیں۔"

اس آیت میں مادی زندگی سے خوش اور اس پر راضی و قانع ہونے کی بات کی گئی ہے۔ اہلِ دنیا کا یہ ذکر برے معنوں میں کیا گیا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"آپ نظر انداز کر دیجیے ان کو جو قرآن سے روگردانی کرتے ہیں اور فقط دنیوی زندگی کے خواہاں ہیں۔ وہ اتنا ہی جانتے ہیں۔" (یعنی ان کی ذہنی سطح اتنی ہی ہے)۔

یہاں پھر ان لوگوں کی بات کی گئی ہے جن کا مقصد بجز دنیا اور کچھ نہیں اور جن کی سوچ مادیات کی سطح سے بلند نہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

"اچھی لگتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی جیسے عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان زدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور عاقبت کی بھلائی اللہ ہی کے پاس ہے۔"

اس آیت میں بھی فطری خواہش اور قدرتی رجحان کی بات نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کی نظر میں وہ چیزیں جو قدرتی طور پر مرغوب ہوتی ہیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ ان ہی کی محبت میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ان کی زندگی کی غرض وغایت بس یہی چیزیں بن گئی ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

أَرَضِيتُم بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ.

کیا تم آخرت کے بدلے دنیا سے کو خوش ہو گئے ہو؟ دنیوی زندگی کی تو آخرت کے مقابلے میں وقعت بہت کم ہے۔

ان سب آیات میں دنیوی تعلقات سے محبت اور ان پر قناعت کرنے پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔

مال و دولت، زن و فرزند اور دوسرے دنیوی امور میں دلچسپی لینے اور ان ہی کو اپنا مطمح نظر اور زندگی کا ماحصل قرار دے لینے میں فرق ہے۔ اگر مقصد یہ ہو کہ آدمی کی دلچسپی کو مادی امور تک محدود ہونے سے روکا جائے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ قدرتی تعلق اور فطری دلچسپی کو ختم کر دیا جائے اور اس کا بالکل سر کچل دیا جائے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان کے بعض دوسرے رجحانات سے کام لیا جائے اور غیر مادی دلچسپیوں کو تحریک دی جائے اور ان میں جان ڈالی جائے۔

درحقیقت دینی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات کو تحریک دی جائے جو اس کی فطرت میں موجود ہیں چونکہ ان جذبات کا تعلق روحانیت سے ہے اس لیے یہ ذرا دیر میں بیدار ہوتے ہیں اور اس کے

یے انسان کے روحانی شعور کو زندہ اور بیدار کرنا ضروری ہوتا ہے۔

آدمی کا ہر فطری رجحان ایک چشمہ ہے جو اس کی روح سے نکلتا ہے۔ دین کا مقصد یہ نہیں کہ مادی دلچسپیوں کے چشموں کو مسدود کر دیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ روحانی چشموں کو بھی جاری کیا جائے بالفاظ دیگر یہ مقصد نہیں کہ ان قوتوں کو کم کیا جائے یا ان پر روک لگائی جائے جو اللہ نے اپنی حکمت کاملہ سے کام لے کر انسان میں پیدائشی طور پر ودیعت کی ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ روحانی قوتوں کو بھی بروئے کار لایا جائے۔ اس مطلب کی وضاحت ہم ایک سادہ مثال سے کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کسی کا کوئی بچہ ہے جسے وہ اسکول میں داخل کرا دیتا ہے۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ بچے کو محض کھانے اور کھیلنے ہی سے دلچسپی ہے تو اسے گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ بچے پر ناراض ہوتا ہے، اسے کھلنڈرا اور پیٹو کہتا ہے۔ اس کو ڈانٹتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ بچہ اپنے سبق اور لکھنے پڑھنے میں بھی دلچسپی لے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ لکھنے پڑھنے میں دلچسپی کھیل کود اور کھانے پینے میں دلچسپی کی نسبت دیر میں پیدا ہوتی ہے اور اس کے لیے بچے کو شوق دلانے اور آمادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی فطرت میں حصول علم کا جذبہ موجود ہے لیکن اس کو ابھارنا ضروری ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ باپ یہ چاہتا ہے کہ بچے کو کھیل کود، کھانے اور آرام کرنے سے نفرت ہو جائے اور وہ ان کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دے۔ اگر کسی وقت باپ کو یہ محسوس ہو کہ بچہ کھیلنے یا کھانے میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہا تو اس کو سخت پریشانی ہوگی اور وہ اس کو بیماری سمجھ کر کسی ڈاکٹر سے رجوع کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاں ایک تندرست بچے کو اسکول اور کتاب

سے دلچسپی ہونی چاہیے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ چست اور مستعد ہو۔ کھیل کے وقت کھیلے اور کھانے کے وقت کھائے۔ جب وہ بچے کو کھلنڈرا اور پیٹو کہہ کر ڈانٹتا ہے تو وہ درحقیقت اس بات پر خفا ہوتا ہے کہ بچہ صرف کھیلنے یا کھانے میں ہی دلچسپی لیتا ہے۔

اس طرزِ فکر کی جڑ تصورِ کائنات میں ہے

قرآن کریم کا دنیا کے بارے میں جو طرزِ فکر ہے اور اس نے جو صرف دنیا اور مادی امور میں دلچسپی کی ممانعت کی ہے' اس کی وجہ کائنات اور انسان کے بارے میں قرآن کا خاص زاویۂ نگاہ ہے۔ قرآن کریم کی نظر میں وجود اسی مادی دنیا میں منحصر نہیں ہے۔ یہ دنیا جس درجہ وسیع و عظیم ہے' قرآن اس کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ ایک اور عالم کا بھی قائل ہے جو اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ دنیا اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ انسان کے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی اسی دنیا تک محدود نہیں ہے۔ آخرت کی زندگی میں بھی ایک زندگی ہے۔ اگرچہ قرآن کی نظر میں انسان اسی دنیا کے درخت کا ایک پھل ہے لیکن اس کے وجود اور اس کی زندگی کا دامن اس دنیا سے آگے تک پھیلا ہوا ہے اس لیے یہ ضروری ہوا کہ انسان صرف اسی دنیا اور اس کے ساز و سامان کو اپنے مقصد نہ سمجھ لے۔ انسان کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ وہ اس دنیا پر قناعت کرے۔ امیرالمومنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

وَلَبِئْسَ الْمَتْجَرُ اَنْ تَرَى الدُّنْيَا لِنَفْسِكَ ثَمَنًا۔

"یہ بہت ہی گھاٹے کا سودا ہے کہ تم دنیا کو اپنی قسمت سمجھ لو۔"

پس جس طرح قرآنی فلسفہ اور قرآن جہاں بینی کا ایک باب یعنی باب زہد جیسے — جیسا کہ میں نے گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا — اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس محسوس دنیا کو بری نگاہ سے دیکھیں، اسی طرح قرآنی فلسفہ اور جہاں بینی کے ایک دوسرے باب کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان کا مقصد اعلیٰ اور مطمح نظر اس دنیا اور مادی چیزوں سے بلند تر ہو۔ اس دوسرے باب کا تعلق انسان اور آخرت سے ہے۔

اخلاق اور دنیا پرستی

ان کے علاوہ اسلام میں ایک اور باب بھی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ مادی چیزوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ یہ باب اخلاقی تربیت کا ہے۔ اس پر تو سب ہی متفق ہیں کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اس طرح تربیت دی جائے کہ اس کا نصب العین روحانی ہو اور وہ مادی چیزوں کے لالچ میں نہ پڑے۔ معاشرے میں حرص کی آگ پھیل جانے سے نہ صرف معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں بلکہ اس کا نتیجہ معاشرے کی تباہی اور بربادی کی صورت میں نکلتا ہے۔

انفرادی بھلائی کے نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر مبالغہ تو غلط ہے کہ بعض فلاسفہ کی طرح یہ کہا جائے کہ آدمی کی صلاح و فلاح اسی میں ہے کہ وہ بالکل ترکِ دنیا کر دے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فلاح کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی مستغنی الطبع ہو۔

یہاں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے۔ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ

مقصد صرف یہ ہے کہ آدمی کی دلچسپی مادّی امور تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مطلب یہ ہے کہ خدا سے بھی محبت کی جائے اور مادّی چیزوں کو بھی اپنا نصب العین قرار دیا جائے۔ یہ مطلب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو قدرتی طور پر دنیا کی چیزوں سے ایک تعلق اور دلچسپی ہے اور اس تعلق کی بنیاد ان مصلحتوں پر ہے جو انسان کی خلقت میں ہیں۔ سب انبیاء اور اولیاء کے بھی یہی جذبات تھے۔ وہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ دنیا سے فطری تعلق منقطع نہیں کیا جا سکتا اور بالفرض منقطع کیا بھی جا سکتا ہو تو دنیا سے قطع تعلق کوئی اچھی بات نہیں۔

دنیا کی طرف فطری رجحان اور میلان کے علاوہ انسان میں ایک اور صلاحیت بھی ہے اور وہ ہے کسی چیز کو اپنا نصب العین قرار دے لینے کی۔ دنیا اور دنیا کا ساز و سامان نصب العین نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہے دنیا کی وہ محبت جو مذموم ہے۔ فطری رجحانات تو زندگی کا ہتھیار ہیں لیکن کسی چیز کو اپنا مقصود اور نصب العین بنا لینے کی صلاحیت ایک خاص صلاحیت ہے جس کا سرچشمہ انسانیت کی گہرائیوں میں ہے کیونکہ یہ صلاحیت صرف انسان ہی میں پائی جاتی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں آئے کہ وہ فطری رجحانات اور جذبات کو ختم کر دیں بلکہ اس لیے آئے کہ دنیا اور امور دنیا کی بجائے خدا اور آخرت کو نصب العین کے طور پر پیش کریں۔ درحقیقت انبیاء تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ دنیا اور مادّی امور کو ان کی قدرتی جگہ پر رہنے دیا جائے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں انسان کو ان چیزوں کی طرف اس لیے کشش ہوتی ہے کہ انسان اور دنیا کی چیزوں کے درمیان ایک طرح کا قدرتی رابطہ موجود ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ دنیا اور دنیاوی چیزوں کو اس جگہ سے ہٹا کر دل میں بٹھا لیا جائے جو انسان کے وجود اور اس کی صلاحیتوں کا مرکزی

مقدس مقام اور لاہوت کی طرف کشش کا مرکز ہے۔ ایسا کرنے سے غیر متناہی کمال کی طرف انسان کی پرواز قدرتی طور پر رک جائے گی

یہ جو قرآن کریم میں آیا ہے کہ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ. یعنی "اللہ نے کسی کے اندر دو دل نہیں رکھے۔" اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ یا تو خدا سے تعلق رکھیں یا زن و فرزند اور مال وغیرہ سے ــــ مطلب یہ ہے کہ نصب العین ایک ہی ہونا چاہیے، نصب العین دو نہیں ہو سکتے۔ نصب العین یا تو رضائے خداوندی کا حصول ہوگا یا دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کا ــــ ورنہ کئی چیزوں میں بیک وقت دلچسپی تو ظاہر ہے ہوتی ہی ہے۔

اسلام اور علم

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے اسلام اور علم ـــــ دوسرے لفظوں میں آج کی بحث علم کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے متعلق ہے۔ ہماری پچھلی گفتگو کا موضوع دنیا، زندگی اور دنیا کی نعمتوں سے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر تھا اب کی مرتبہ یہ بحث ہے کہ آیا دین اور علم میں آپس میں ہم آہنگی ہے یا ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ علم کے بارے میں دین کیا کہتا ہے اور دین کے بارے میں علم کا کیا خیال ہے؟ اس موضوع پر قدیم زمانے سے بحث ہوتی آئی ہے اور دنیا اور عالمِ اسلام میں قابلِ قدر کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

دو طبقوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ دین اور علم کو ایک دوسرے کا مخالف ظاہر کریں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو اپنے آپ کو دین کا ٹھیکیدار ظاہر کرتا ہے لیکن ہے جاہل ـــــ یہ طبقہ دین کے نام پر روٹی کماتا اور لوگوں

کی جہالت سے فائدہ اٹھاتا ہے اس لیے یہ چاہتا ہے کہ لوگ جاہل ہی رہیں تاکہ دین کا نام لے کر اپنے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا رہے۔ یہ دین کے ہتھیار سے تعلیم یافتہ لوگوں کو شکست دینا اور ان کو مقابلے کے میدان سے نکالنا چاہتا ہے اور لوگوں کو یہ کہہ کر ڈراتا ہے کہ علم اور دین میں تضاد ہے۔ دوسرا طبقہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کا ہے جو اپنی انسانی اور اخلاقی ذمہ داریاں پوری کرنے سے گریزاں ہے۔ یہ اپنی بے راہ روی اور آزاد خیالی کا جواز تلاش کرنے کے لیے علم کا سہارا لیتا ہے اور اپنی مذہب سے دوری کے لیے یہ بہانہ تراشتا ہے کہ مذہبی عقائد و اعمال علمی اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔

ایک تیسرا طبقہ بھی ہے اور ہمیشہ سے ہے جس کو اللہ نے علم اور دین دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کو ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد محسوس نہیں ہوتا اور اس کی یہ کوشش رہی ہے کہ یہ دو گروہ علم اور مذہب کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلاتے رہے ہیں ان کو دور کیا جائے۔

ہم اسلام اور علم کے متعلق دو پہلوؤں سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ ایک پہلو ہے اجتماعی اور دوسرا مذہبی —— اجتماعی پہلو سے ہم یہ غور کر سکتے ہیں کہ آیا اسلام اور علم میں عملاً ہم آہنگی ہے یا نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص صحیح معنی میں مسلمان بھی ہو یعنی اسلام کے اصولوں اور بنیادی عقائد پر بھی ایمان رکھتا ہو اور دینی احکام پر بھی عمل کرتا ہو اور ساتھ ہی عالم بھی ہو؟ یا ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ضروری ہے۔ اگر اس پہلو سے گفتگو کی جائے تو سوال یہ نہیں ہوگا کہ اسلام علم کے بارے میں کیا کہتا ہے اور علم کا اسلام کے بارے میں کیا خیال ہے اور اسلام کس قسم کا مذہب ہے۔ یہ گفتگو فقط اس پر ہوگی کہ کیا اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں آدمی مسلمان بھی ہو اور صاحب علم

بھی یا اسلام اور علم میں سے کسی ایک کو ترک کرنا ضروری ہے؟ بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ علم کے بارے میں اسلام کا کیا نظریہ ہے اور اسلام کے بارے میں علم کی کیا رائے ہے۔ اس سوال کے بھی دو جزو ہیں:

پہلا جزو یہ کہ علم کے بارے میں اسلام میں کیا احکام ہیں۔ کیا اسلام علم کو خطرناک اور اپنا مدمقابل سمجھتا ہے؟ یا اس کے برعکس پورے خلوص' جرأت اور اطمینان سے علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتا اور اس کا شوق دلاتا ہے؟ سوال کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں علم کا کیا خیال ہے؟ ظہور اسلام اور نزول قرآن کو چودہ سو برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں علم برابر ترقی کرتا رہا خصوصاً پچھلی تین چار صدیوں میں تو علمی ترقی میں عظیم انقلاب آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علم کی اپنی اس تمام کامیابی اور ترقی کے بعد اسلام کے عقائد اور اسلام کے عملی اور اخلاقی اور اجتماعی احکام کے بارے میں علم کا کیا خیال ہے؟ آیا علم اسلام کے عقائد اور احکام کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں اور اس کی نظر میں ان کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے یا کمی؟

ان میں سے ہر جزو اس قابل ہے کہ اس پر بحث اور تحقیق کی جائے۔ ہم صرف ایک جزو کو لیتے ہیں یعنی علم کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو۔

اسلام میں علم کی تاکید

اس بارے میں کہ اسلام نے علم پر جس قدر زور دیا ہے شاید ہی کسی اور بات پر دیا ہو' کوئی شبہ نہیں۔

قدیم ترین زمانے سے جو اسلامی احکام کی کتابیں تصنیف ہوتی رہی ہیں ان میں روزہ' نماز' حج' جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے احکام

کے ساتھ ساتھ ایک باب "وجوب طلب العلم" کے عنوان سے بھی ہوتا ہے اور علم کو ایک فریضہ تسلیم کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی آیات سے قطع نظر رسولِ خدا کی علم کے بارے میں صریح اور واضح الفاظ میں بار بار تاکید موجود ہے اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا ہے کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض اور واجب ہے۔ اس میں کسی خاص طبقہ اور جنس کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔ یعنی دنیا کے جس حصے میں بھی علم موجود ہو وہاں جا کر اسے حاصل کرو۔

ایک اور حدیث ہے: کَلِمَةُ الْحِکْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا. علمی اور منطقی بات مومن کی گمشدہ متاع ہے' اسے جہاں ملے اپنا حق سمجھ کر لے لے۔ امیر المومنین امام علیؑ نے اس کی اور وضاحت کی ہے۔ آپ نے فرمایا: اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَاطْلُبُوْهَا وَلَوْ عِنْدَ الْمُشْرِكِ تَكُوْنُوْا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا. علم وحکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے۔ اگر مشرک کے پاس بھی ہے تو اس کو حاصل کرو، تم اس کے زیادہ حقدار ہو اور وہ تمہاری چیز ہے۔

علم ایک ایسا فرض ہے جس میں نہ سیکھنے والے کی خصوصیت ہے نہ سکھانے والے کی' نہ زمانے کی' نہ جگہ کی۔ اس کے متعلق جتنی تاکید کی گئی ہے اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

کونسا علم

بحث طلب بات کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ علم سے کونسا علم مراد ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب تاکید خود دین کے علم کے بارے میں ہے لیکن اگر اسلام کی نظر میں صرف علمِ دین ہی علم ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام نے خود اپنے متعلق معلومات حاصل کرنے کی نصیحت اور تاکید کی ہے اور حقائقِ کائنات اور معاملاتِ عالم سے واقفیت حاصل کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس طرح بات وہیں کی وہیں رہی کیونکہ کوئی بھی مسلک چاہے وہ علم و آگاہی کا کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو اور اسے لوگوں کی ذہنی سطح کا بلند ہونا کیسا ہی ناگوار کیوں نہ ہو خود اپنے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے خلاف نہیں ہو سکتا بلکہ وہ یہی کہے گا کہ مجھ سے واقفیت پیدا کرو۔ کسی اور سے واقف ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر علم سے اسلام کی مراد خاص طور پر علمِ دین ہی ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ اسلام قطعی علم کا حامی نہیں ہے اور علم کے بارے میں اسلام کا رویہ منفی ہے۔

جو شخص اسلام اور اسلام کے طرزِ فکر سے واقف ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کی نظر میں علم صرف دینی علوم ہی کا نام ہے۔ یہ خیال فقط مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے پچھلی چند صدیوں میں آہستہ آہستہ اپنی معلومات کا دائرہ تنگ اور محدود کر لیا ہے، ورنہ جہاں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے اور اگر مشرک کے پاس بھی ملے تو اپنے قبضہ میں لے لے وہاں اس حکم کے دینی علوم سے مختص ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ کسی مشرک کا دینی علوم سے کیا تعلق پھر اس فقرے میں

"اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ" چین کا نام ایک تو اس لحاظ سے لیا گیا ہے کہ وہ بعید ترین مقام تھا اور دوسرے اس لحاظ سے کہ اس زمانے میں جو علم و صنعت کے مرکز تھے وہ ان میں سے ایک تھا لیکن بہرحال یہ مسلّم ہے کہ نہ اس زمانے میں، نہ کسی اور زمانے میں چین دینی علوم کا مرکز کبھی نہیں رہا۔

اس کے علاوہ خود احادیثِ نبوی میں اس کی وضاحت ہے کہ علم سے کیا مراد ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ فلاں علم مراد ہے اور فلاں نہیں بلکہ یہ کہ علم سے مراد علمِ نافع ہے۔ یعنی ہر وہ علم جس کے جاننے سے فائدہ ہو اور نہ جاننے سے نقصان بشرطیکہ اس کے فائدے کو اسلام بھی مانتا ہو یعنی اس علم کے حاصل کرنے کا جو اثر ہو اسلام اس کو مفید اور اچھا سمجھتا ہو۔ اسلام کی نظر میں ہر ایسا علم اچھا ہے اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

لہٰذا یہ بات تو صاف ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں کیا چیز مفید ہے اور کیا چیز مضر۔ ہر وہ علم جو اسلام کے کسی انفرادی یا اجتماعی مقصد میں مدد دیتا ہو اسلام اس کے حاصل کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ہر وہ علم جس کا اسلام کے انفرادی یا اجتماعی مقاصد پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو اسلام کی اس کے بارے میں کوئی خاص رائے نہیں ہے اور وہ علم جس سے اسلام کے مقاصد کو نقصان پہنچتا ہو اسلام اس کا مخالف ہے۔

آئمۂ دین کی سیرت

ہم شیعہ ہیں اور آئمۂ اطہار علیہم السلام کو نبی اکرمؐ کا وصی مانتے ہیں۔ ان کی سیرت اور ان کا قول ہمارے لیے سند ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے پہلی صدی ہجری کے آواخر اور دوسری صدی کے اوائل سے مسلمان دنیا کے علوم سے آشنا

ہوئے۔ انھوں نے مختلف علوم پر یونان ہندوستان اور ایران کی کتابوں کا ترجمہ شروع کیا۔ دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ائمۂ اہلبیت ؑ نے خلفاء کے کاموں پر تنقید میں کبھی کمی نہیں کی۔ ہماری کتابیں اس تنقید سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر اسلام علم کا مخالف ہوتا اور علم سے مذہب کو نقصان پہنچتا ہوتا تو ائمۂ اطہار ضرور خلفاء کی اس بات پر تنقید کرتے کہ انھوں نے ایک وسیع ادارہ مترجموں اور نقل نویسوں کا کیوں قائم کیا تھا اور علم ہیئت، منطق، فلسفہ، حیوانیات، ادب، تاریخ جیسے علوم کی طرح طرح کی کتابوں کا ترجمہ کیوں کرا رہے تھے۔ جس طرح ائمہ علیہم السلام خلفاء کے دوسرے بہت سے کاموں پر اعتراض کرتے تھے، اس بات پر بھی اعتراض کر سکتے تھے، بلکہ اس بات پر تو ان کی تنقید عوام میں بہت مقبول ہوتی۔ اگر وہ اسے حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ (ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے) کے عنوان سے بیان کرتے، مگر اس ایک سو ساٹھ سال کی طویل مدت میں جو اس قصہ کی ابتدا سے امام آخر الزماںؑ کی غیبت کے درمیان گزرا اس طرح کی کوئی تنقید دیکھنے میں نہیں آئی۔

قرآن کا طرزِ فکر

ان سب باتوں سے قطع نظر علم کے بارے میں جو قرآن کا طرزِ فکر ہے اس میں کسی علم کی کوئی تخصیص نہیں۔ قرآن علم کو نور اور جہل کو ظلمت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر صورت میں نور کو ظلمت پر ترجیح ہے۔

قرآن صراحت کے ساتھ کچھ موضوعات کو مطالعے اور غور و فکر کے لیے تجویز کرتا ہے۔ یہ موضوع وہی ہیں جن کے مطالعے کے نتیجہ میں یہ سب علم جو آج دنیا میں ہم دیکھتے ہیں وجود میں آئے جیسے طبعیات، ریاضی، حیاتیات

تاریخ وغیرہ۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ.

"بلا شبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے فائدے کے لیے اور اس بارش کے پانی میں جو اللہ زمین پر برساتا ہے اور پھر زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد تر و تازہ کرتا ہے اور جس میں اس نے ہر طرح کے جانور پھیلائے ہیں اور ہواؤں کی گردش اور ابر کی مخصوص حالت میں کہ زمین و آسمان کے درمیان معلق رہتا ہے' ان سب میں اللہ کی حکمت و قدرت کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں۔"

یعنی ان سب کے کچھ قانون اور نظام ہیں اگر تم ان کو سمجھو تو وہ تمہارے لیے توحیدِ باری تک رسائی کا ذریعہ بن جائیں۔

قرآن نے صراحت کے ساتھ ان امور پر غور کرنے کی دعوت دی ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ان ہی کے مطالعے سے فلکیات' ارضیات' بحریات' حیوانیات اور فضا کا علم وجود میں آئے ہیں۔ یہی بات سورۂ جاثیہ کی دوسری

سورۂ فاطر کی پچیسویں اور دوسری آیات میں کہی گئی ہے۔

قرآن وہ کتاب ہے جس کی ان آیات میں جو سب سے پہلے نازل ہوئیں پڑھنے لکھنے اور علم کے ذکر سے بات شروع کی گئی ہے۔ وحی کا آغاز ہی ان چیزوں سے ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

"پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو خون کے لوتھڑے سے، پڑھو کہ تمہارا پروردگار کریم ہے جس نے سکھایا لکھنا قلم سے۔" (سورۂ علق۔ آیت ۱تا۴)

توحید اور علم

اسلام وہ مذہب ہے جس کا سب سے بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کا سوال ہے۔ اس میں دوسروں کی تقلید یا بغیر سمجھے ایمان لانے کی گنجائش نہیں، اس لیے اس کو دلیل سے سمجھنا ضروری ہے۔ اگر اسلام کا عقیدہ ثنویت یا تثلیث ہوتا جب تو وہ اپنے اس عقیدے پر کسی بحث کی اجازت نہ دیتا اور اس کو ممنوعہ علاقہ قرار دینے پر مجبور ہوتا لیکن اسلام کا آغاز توحید سے ہوا ہے، اس لیے اسلام اس مسئلہ پر غور و فکر اور بحث کی نہ صرف ممانعت نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کو ضروری سمجھتا ہے۔ قرآن کی رو سے اس مسئلہ پر غور و فکر کا آغاز کائنات کے مطالعے سے ہوتا ہے جس کے لیے تعلیم و تعلم پہلی شرط اور فکر و استدلال کی قوت ضروری ساز و سامان ہے۔

یہی وہ موضوع ہے جو قرآن نے مطالعے کے لیے پیش کیا ہے۔ یہی بات
مسلمانوں کو ان موضوعات کے مطالعے کی بہت کم توفیق ہوئی ہے اور انھوں
نے زیادہ تر ان موضوعات میں دلچسپی لی جن کے لیے قرآن کریم میں کوئی حکم
نہیں ہے تو یہ ایک الگ بات ہے اور اس کی خاص وجوہ ہیں جن پر بحث کا
یہ موقع نہیں۔

ان سب قرینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ دینی علوم تک
محدود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ قدیم زمانے سے بحث طلب رہا ہے کہ جس علم کو
اسلام نے واجب کہا ہے اس سے کونسا علم مراد ہے؟ ہر گروہ کی یہی کوشش
رہی ہے کہ اس حدیث نبوی کا مصداق اس علم کو قرار دیں جو اس کا اپنا علم
ہے اور جس میں خود اس کی دلچسپی رہی ہے۔ متکلمین نے کہا ہے کہ علم سے
علم کلام مقصود ہے، مفسرین نے کہا ہے علم تفسیر مراد ہے، محدثین نے کہا ہے
کہ علم حدیث مراد ہے، فقہاء نے کہا ہے کہ علم فقہ مراد ہے کیونکہ ہر شخص کے لیے
ضروری ہے کہ یا تو وہ مقلد ہو یا مجتہد ــــ علمائے اخلاق نے کہا ہے کہ علم اخلاق
مراد ہے جو یہ بتلاتا ہے کہ کونسے اوصاف باعثِ نجات ہیں اور کونسی صفات
سبب ہلاکت ــــ صوفیاء کہتے ہیں کہ سیر و سلوک اور توحید علمی کا علم مراد ہے۔
غزالی نے اس ضمن میں بیس مختلف قول نقل کیے ہیں لیکن جیسا کہ محققین
نے کہا ہے ان میں سے کوئی بھی علم خاص طور پر مقصود نہیں۔ اگر کوئی خاص
علم مقصود ہوتا تو جناب رسالتمآبؐ اس کی تصریح فرمادیتے۔ حقیقت میں علم
سے ہر وہ علم مراد ہے جو مفید ہو اور کام آسکے۔

علم ذریعہ ہے یا مقصد

اگر ایک نکتہ ذہن میں رکھا جائے تو مطلب بخوبی حل ہو جاتا ہے اور ہم یہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ علم سے اسلام کی مراد کیا ہے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں علم مقصد ہے یا ذریعہ ــــ بلاشبہ بعض علم خود مقصد ہیں جیسے خدا کی ذات و صفات کا علم یا وہ دوسرے علوم جن کا تعلق خداشناسی سے ہے جیسے حشر و نشر اور جزا و سزا کا علم یا خود اپنی ذات کا علم ــــ ان کو چھوڑ کر باقی سب علم ذریعہ ہیں، مقصد نہیں۔ ان ادبی اور منطقی رسائل کا تو ذکر ہی کیا جو عموماً دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے فقہاء اور علمائے دین کی ایک اصطلاح ہے کہ وجوب علم تہیئی ہے۔ یعنی علم حاصل کرنا اس لیے واجب ہے کہ علم آدمی کو اس کام کے لیے تیار کرتا ہے جو اسلام کے اصل مقصد کے لیے مناسب ہے۔ خود عملی مسائل یعنی نماز، روزہ، زکات، خمس، حج، طہارت وغیرہ کے احکام کا جن کا رسائل عملیہ میں ذکر ہوتا ہے، سیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک دوسرے فریضے کو صحیح طریقے سے انجام دے سکے۔ مثلاً ایک صاحب استطاعت شخص جو حج کے لیے جانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ حج کے مسائل سے واقفیت پیدا کرے تاکہ حج کے مراسم درست طور پر انجام دے سکے۔

جب ہم نے یہ اصول ذہن نشین کر لیا تو ایک دوسری بات سمجھنی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلام کس قسم کا مذہب ہے اور اس کے کیا مقاصد ہیں؟ یہ کس طرح کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے؟ اسلامی مقاصد میں کیا کیا امور شامل ہیں؟ کیا اسلام عبادات اور اخلاق کے چند مسائل پر قناعت کرتا

ہے یا اس مذہب کے احکام کا دامن اتنا وسیع ہے کہ زندگی کے تمام معاملات پر حاوی ہے اور تمام اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی معاملات اس کی نظر میں ہیں؟ اور اس کے مقاصد جن کا حصول وہ چاہتا ہے، ان تمام امور سے متعلق ہیں؟ کیا اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلم معاشرہ آزاد ہو یا وہ معاشرے کے محکوم ہونے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا؟ ظاہر ہے کہ اسلام ایک آزاد، معزز، سربلند اور خودکفیل معاشرہ چاہتا ہے۔

ایک تیسری بات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ آج کی دنیا کا پہیہ علم ہی کی دھری پر گھوم رہا ہے۔ علم ہی سب ضرورتوں کی کنجی ہے۔ علم کے بغیر کوئی مستقل، آزاد، باعزت، طاقتور اور خودکفیل معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا کیونکہ علم ہی فنی و تکنیکی معلومات کا ذریعہ ہے۔ اس سے خودبخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر زمانے میں خصوصاً اس زمانے میں علم حاصل کرنا فرض اور واجب ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام علوم سیکھیں جن سے اسلامی مقاصد بروئے کار آسکیں اور اس معاملے میں کوتاہی نہ کریں۔

اس معیار کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مفید علوم دینی علوم ہیں اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسا علم واجب کفائی ہے اور کونسا علم واجب عینی۔ ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک علم کا حاصل کرنا سب سے زیادہ ضروری اور فرض ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے زمانے میں ممکن ہے یہ صورت نہ ہو۔ اس کا تعین ان لوگوں کی ذہانت اور توجہ پر منحصر ہے جو ہر زمانے میں اجتہاد اور استنباط کا فرض انجام دیتے ہیں۔

دینی سوالات پوچھنے کے حدود

بعض باتوں کا پوچھنا اور ان کے متعلق سوال کرنا دینی نقطۂ نظر سے واجب ہے اور بعض باتوں کا پوچھنا گو بظاہر ایک مذہبی بات نظر آئے حرام ہے۔ ایسے سوالات کے جواب میں وقت ضائع کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔ ایسے موقعوں پر سکوت اور ان سوالوں کی طرف توجہ نہ کرنا ہی دینی فریضہ ہے۔ قرآن کریم بعض آیات میں صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ جو بات تم نہیں جانتے ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں۔ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

کچھ دوسری آیتوں میں بعض باتیں گو ان کی نوعیت مذہبی ہو پوچھنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَکُمْ عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ قَدْ سَاَلَھَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِھَا کٰفِرِیْنَ.

"ان باتوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر بتلائی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں اور اگر تم پوچھو گے ان کے بارے میں ایسی حالت میں قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو وہ باتیں تم پر ضرور ظاہر کر دی جائیں گی۔ جو کچھ تم پوچھ چکے ہو اللہ نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے بھی لوگوں نے (اپنے وقت کے پیغمبروں سے) ان باتوں کو پوچھا، پھر وہ اس کے منکر ہو گئے۔"

پوچھنے کی جبلی خواہش

پوچھنا انسان کی جبلت ہے اور اس کی ذہنی پختگی کی علامت۔ آدمی کو پوچھنے کا خیال اس وقت آتا ہے جب اس کے ذہن میں کسی چیز کے بارے میں شک پیدا ہوتا ہے اور مجموعی طور پر شک کا پیدا ہونا ایک طرح کی ذہنی پختگی ہے کیونکہ جانوروں کو شک نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شک سے بڑھ کر یقین کے مرتبے کو پہنچ گئے ہیں بلکہ وہ شک کے نیچے کے درجے پر ہیں۔ یہی نہیں بہت سے انسان بھی شک کے نیچے کے درجہ پر ہیں نہ کہ اس سے اوپر کے درجہ پر۔ بچہ تقریباً تین سال کی عمر سے اور کبھی کبھی اس سے بھی پہلے ماں باپ اور دادا وغیرہ سے اپنے اردگرد کی چیزوں کے بارے میں پوچھنے لگتا اور ان میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ وہ ہر وقت پوچھتا رہتا ہے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے۔ یہ چیز کس لیے ہے وغیرہ وغیرہ۔ ماہرین نفسیات

تین سال کی عمر کو پوچھنے کی عمر کہتے ہیں۔

بچوں کی تربیت سے متعلق مسائل میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ماں باپ اور دوسرے لوگ جن کے ہاتھوں میں بچوں کی تربیت ہے وہ ان کے سوالات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔ پوچھنا چونکہ بچے کی جبلت ہے اس لیے اس پر روک نہیں لگانی چاہیے۔ بچوں کو پوچھنے سے منع نہیں کرنا چاہیے، نہ ہی ان سے جھوٹ بولنا چاہیے بلکہ ہر بات کا ان کی سمجھ کے مطابق جواب دے کر ان کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ یہی حال بڑوں کے سوالوں کے جواب کا بھی ہے۔ ان کو بھی سخت جواب نہیں دینا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ چپ رہو۔ فضول باتیں مت کرو۔ ہاں یہ فرق البتہ ہے کہ بڑوں کو یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ بعض قسم کے سوال نہیں کیے جا سکتے، جبکہ بچوں سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

کوئی شخص سوال اس لیے کرتا ہے کہ کوئی بات اس کو معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس کو معلوم نہیں۔ گویا اس کے عدم علم میں بھی علم کی آمیزش ہوتی ہے اور اس کو اپنے عدم علم کا احساس ہوتا ہے۔ اگر وہ نامعلوم بات اس کو معلوم ہوتی تو وہ اس کے بارے میں سوال نہ کرتا۔ آدمی اس وقت کسی چیز کی تحقیق کرتا ہے جب وہ اسے نہیں جانتا، اسی لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ دوسرے جانداروں کے مقابلے میں انسان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کا جہل بسیط ہے اور دوسرے جانداروں کا جہل مرکب۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اپنی ناواقفیت کا علم اور احساس ہو سکتا ہے۔ جب وہ یہ جانتا ہے کہ نہیں جانتا تو وہ پوچھتا ہے۔ تحقیق اور جستجو کرتا ہے۔ اس کے برخلاف چونکہ جانوروں کا جہل مرکب ہے اس لیے وہ جو کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نہیں جانتے۔ اسی

ہے وہ اس کی تحقیق بھی نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔

پوچھنا علم کی کنجی ہے

سوال علم کی کنجی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اَلَا اِنَّ مِفْتَاحَ الْعِلْمِ السُّؤَالُ۔ یعنی یاد رکھو کہ علم کی کنجی سوال ہے۔ اس کے بعد امام نے برجستہ ایک شعر سنایا:

شِفَاءُ الْعَمٰی طُوْلُ السُّؤَالِ وَاِنَّمَا

تَمَامُ الْعَمٰی طُوْلُ السُّکُوْتِ عَلَی الْجَهْلِ

یعنی باطنی نابینائی کا علاج یہ ہے کہ آدمی جو بات نہیں جانتا اسے بغیر کسی جھجک کے پوچھ لے۔ یہ کور باطنی کی انتہا ہے کہ آدمی کو صحیح بات معلوم نہ ہو اور اس کے باوجود وہ چپ رہے اور نہ پوچھے۔

محقق کا کام جستجو اور تحقیق ہے اور مبتدی اور طالب علم کا کام یہ ہے کہ اپنی مشکلات کے لیے اس شخص سے رجوع کرے جس نے تحقیق کی ہو طالب علم کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے استاد کی مدد لے اور استاد سے پوچھے اور بیمار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ طبیب سے رجوع کرے۔

کیا پوچھنا چاہیے؟

اس موقع پر ایک نکتہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ پرسش اور سوال اچھی بات ہے اور انسان کی پختگی کی دلیل لیکن سوال دراصل کسی اور چیز کی محض تمہید ہوتا ہے کبھی تو یہ تمہید ہوتا ہے تحقیق کی اور کبھی عمل کی۔ جو لوگ کسی علمی یا تاریخی یا دینی موضوع کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے

سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان لوگوں سے پوچھیں جن کو ان کے بارے میں واقفیت ہو۔ ایک مستعد طالب علم کے سوالات کی نوعیت یہی ہے۔ کبھی پوچھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پوچھنے والا کسی کام کے کرنے کا طریقہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ایک بیمار طبیب سے سوالات کرتا اور ہدایات لیتا ہے۔ یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب ذہنی الجھنوں کے مریض نفسیاتی معالجوں سے یا روحانی بیمار معلمان اخلاق سے اپنی شکایات بیان کرتے ہیں۔

اگر سوال کا مقصد علم میں اضافہ یا کوئی عملی طریقہ معلوم کرنا نہ ہو تو محض کسی بات کا معلوم نہ ہونا اس کا کافی جواز مہیا نہیں کرتا کہ کوئی شخص اپنا اور کسی دوسرے کا وقت غیر ضروری سوالات کر کے ضائع کرے کیونکہ جو باتیں معلوم نہیں ان کی تو کوئی گنتی ہی نہیں۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ جوں ہی آدمی کے بچے کو ذرا تمیز آتی ہے، اس کو اپنے اردگرد استفہام کی علامتیں پھیلی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے ان علامتوں میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اگر ایک سوال کا جواب ملتا ہے تو دس سوال اور ابھر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو واقعی عالم ہیں اور جن کو علم سے کچھ مس ہے وہ اپنے آپ کو دوسرے سے زیادہ جاہل سمجھتے ہیں کیونکہ جتنا کچھ وہ معلوم کرتے جاتے ہیں اتنی ہی غیر معلوم باتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک عالم کے علم کی آخری حد یہی ہے کہ وہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرے۔

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو تو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر (حالیؔ)

اگر آدمی یہ چاہے کہ وہ ہر بات پوچھے تو یہ ممکن نہیں' اس لیے ان ہی باتوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو علم یا عمل کے لحاظ سے ضروری اور مفید ہوں۔

سوالات میں افراط و تفریط

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ لوگ اکثر سوالات میں افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں۔ یعنی یا تو حد سے زیادہ سوال کرتے ہیں یا ضرورت سے بہت کم۔ کچھ لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کا کام ہی پوچھتے رہنا ہے خصوصاً بعض لوگ دینی مسائل کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اپنے خیال میں یہ چاہتے ہیں کہ ہر بات کی تہہ تک پہنچ جائیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دین کو تو چھوڑیے کہ اس کا سرچشمہ تو محسوسات سے بہت بلند ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس دنیا کی محسوس اور نظر آنے والی چیزوں کے متعلق اس نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔

کچھ لوگ پوچھنے میں تفریط سے کام لیتے ہیں۔ ان پر ایک طرح کی سستی غالب ہے۔ ان میں تحقیق اور تجسس کی کمی ہے۔ وہ ضروری سوال بھی نہیں پوچھتے۔ کچھ لوگ پوچھنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں کیونکہ پوچھنا ایک طرح سے اپنی لاعلمی کا اقرار ہے۔ یہ لوگ تمام عمر جہالت کی تاریکی میں رہتے ہیں حالانکہ مناسب یہ ہے کہ اگر آدمی کو کوئی بات معلوم نہ ہو اور اس کو جاننا ضروری ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھے خواہ وہ اس سے چھوٹا ہو یا بڑا۔ درجہ میں کم ہو یا زیادہ۔

دینی روایات میں ایسے شخص کی سخت مذمت کی گئی ہے جو سیکھنے کو اپنی

شان کے خلاف سمجھے۔ کہا گیا ہے کہ عالم کے لیے ضروری ہے کہ اپنے علم سے کام لے اور جاہل کے لیے ضروری ہے کہ اسے پوچھنے میں عار نہ ہو بلکہ پوچھنے اور سیکھنے کو فخر سمجھے اور یہ خیال نہ کرے کہ اس میں مجھے چھوٹا بننا پڑتا ہے:

عَالِمٌ مُسْتَعْمِلٌ عِلْمَهُ وَجَاهِلٌ لَا يَسْتَنْكِفُ عَنْ أَنْ يَتَعَلَّمَ

اعتدال کی بات یہ ہے کہ پہلے آدمی یہ طے کرے کہ کن چیزوں کا جاننا اس کے لیے ضروری ہے اور کن چیزوں کا جاننا غیر ضروری یا ناممکن ہے۔ جن باتوں کا جاننا یا ان پر عمل کرنا اس کے لیے ضروری ہو۔ ان کی ترجیحات متعین کرکے ان لوگوں سے پوچھے جو جانتے ہیں لیکن یہ احتیاط رکھے کہ پوچھنا ہی اس کا مشغلہ اور شوق نہ بن جائے۔

گفتگو کی ابتدا میں مَیں نے امام باقرؑ کی ایک حدیث نقل کی تھی کہ سوال کی خوبی بتلاتے ہوئے آپ نے فرمایا: أَلَا إِنَّ مِفْتَاحَ الْعِلْمِ السُّؤَالُ۔ اب ہم آپ کی ایک اور حدیث ضرورت سے زیادہ اور بیجا سوال کرنے کی مذمت میں نقل کرتے ہیں:

امام باقرؑ فرمایا کرتے تھے، جب میں تم سے حدیث بیان کروں تو مجھ سے پوچھ لیا کرو تاکہ میں اس کی تائید میں کسی قرآنی آیت کا حوالہ دے سکوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، قرآن کریم کی تعلیمات پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا: رسولِ خدا نے تین چیزوں سے منع کیا ہے: فضول گوئی، اسرافِ بیجا اور کثرتِ سوال۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ جن تین باتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، یہ قرآن میں کہاں ہیں؟

امام باقرؑ نے قرآن کی تین آیتیں تلاوت کیں جن میں سے ہر ایک میں

ان تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کو منع کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ آیت جس میں ارشاد ہے لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔[1] "ان کی آپس کی گفتگو میں عموماً کوئی اچھی بات نہیں ہوتی، ہاں جب کوئی صدقہ دینے کے لیے کہے یا کسی اور نیک کام کے لیے کہے یا لوگوں میں صلح صفائی کی بات کرے۔" اس آیت میں فضول اور لغو گفتگو کی ممانعت کی گئی ہے۔

ایک دوسری آیت ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا۔ (سورۂ نساء، آیت ۵) "تم اپنے اموال جن سے تمہاری زندگی کے کام چلتے ہیں سفیہ اور کم عقل لوگوں کے ہاتھ میں نہ دو، چاہے وہ مال خود انہی کا کیوں نہ ہو کیونکہ اگر مال ان لوگوں کو دے دیا گیا تو وہ اپنی بے عقلی کی وجہ سے اس کو ضائع کر دیں گے۔"

اس آیت میں اگرچہ بات کم عقل شخص کے مال کی ہے لیکن اس کو اَمْوَالَكُمْ یعنی تمہارے مال کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر شخص کے ذاتی مال کا بھی کسی نہ کسی طرح معاشرے سے تعلق ہے اور اس پر معاشرے کا حق ہے۔ اس لیے کسی کو اپنے ذاتی مال کو بھی تلف کرنے اور بلا وجہ خرچ کرنے کا حق نہیں ہے۔

ایک اور آیت ہے: لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ[2] "ان باتوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر تمہیں بتلا دی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں۔"

اس آیت میں بعض قسم کے سوال پوچھنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ ہے اسلام کی سوچ کہ اسلام زیادہ سوال کرنے اور ہر وقت پوچھتے رہنے سے منع کرتا ہے۔ ایک طرف تو اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ جو بات تمہیں معلوم نہ ہو اور

---

[1] سورۂ نساء۔ آیت ۱۱۴ [2] سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۰۱

اس کا جاننا ضروری ہو تو ضرور پوچھو اور اس میں ذرا بھی سستی نہ کرو۔ دوسری طرف فضول اور بیکار سوال کرنے سے روکتا ہے۔

مذہب میں بہت سے اصول اور عقائد شامل ہیں جن کے بارے میں ہر شخص کو خود براہِ راست تحقیق کرنی چاہیے اور معلومات حاصل کرنے کا شوق ہونا چاہیے۔ اگر کسی کو واقعی شوق اور دلچسپی ہو اور وہ کوشش کرے تو اللہ تعالے خود اس کی دستگیری اور رہنمائی کرے گا۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اصول اور عقائد کے علاوہ مذہب میں اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات بھی ہیں جن کا جاننا ہر انسان کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔ یہ ایسے احکام ہیں جن کو سیکھنا اور ان کے متعلق پوچھنا ضروری ہے۔

لہ سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹

عقل اور دل

انسان، ایک دو مرکزی ہستی

انسان کی روح میں دو مرکز موجود ہیں جن میں سے ہر ایک مرکز ایک مختلف قسم کی سرگرمی کا سرچشمہ ہے۔ ان میں سے ایک کا نام عقل ہے اور دوسرے مرکز کا نام قلب یا دل۔ سوچنا، غور کرنا، حساب لگانا، رائے قائم کرنا، نتیجہ نکالنا اور ایسے ہی علم اور فلسفہ یہ سب کارگزاریاں عقل کی ہیں۔ جذبات کا تعلق دل سے ہے۔ خواہش، آرزو، محبت، اشتعال وغیرہ کا سرچشمہ دل ہے۔

دل کے مرکز سے گرمی اور حرکت پیدا ہوتی ہے۔ عقل کے مرکز سے ہدایت اور روشنی۔ جس کا دل اس طرح بجھا ہوا ہو کہ اس میں کسی خواہش اور امید و آرزو کا گزر نہ ہو۔ وہ بے حس و حرکت پتھر ہے، بمقابلہ زندگی کے موت سے قریب تر اور جو عقل اور سمجھ سے محروم ہے وہ کولہو کا بیل ہے جو رات بھر اندھیرے میں

چکر لگاتا رہتا ہے۔ نہ اسے کچھ سوجھتا ہے' نہ وہ کچھ سمجھتا ہے۔

کبھی تو ان دونوں مرکزوں میں موافقت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جو چیز دل کو بھاتی ہے عقل بھی اس کی اچھائی کی تصدیق کر دیتی ہے۔ اس صورت میں تو انسان کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن بسا اوقات عقل اور دل میں اس طرح کی موافقت نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی چیز دل کو پسند آتی ہے وہ اس پر مائل ہو جاتا ہے لیکن عقل کو اپنے حساب کے مطابق وہ چیز پسند نہیں ہوتی' وہ اس پر صاد نہیں کرتی یا ایسا ہوتا ہے کہ عقل تو گواہی دیتی ہے کہ چیز اچھی ہے لیکن دل کو وہ چیز ناپسند ہے۔ یہاں سے دل اور عقل میں کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہیں سے لوگ دو طبقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کچھ عقل کی بات مانتے ہیں' کچھ دل کی بات مانتے ہیں۔

اس کشمکش کی ایک چھوٹی سی مثال بیان کرتا ہوں۔ فطری طور پر ہر شخص کو اپنے بیٹے سے محبت ہوتی ہے' تعلق ہوتا ہے اور اس تعلق اور محبت کی بنا پر وہ بیٹے کے لیے ہر آسائش و راحت مہیا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے آرام کے لیے خود تکلیف اٹھاتا ہے لیکن جہاں بچے کی تعلیم و تربیت کا سوال پیدا ہو جاتا ہے عقل کہتی ہے کہ تربیت کا کتنا ہی مناسب انتظام کیا جائے' بچے کو شروع میں کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہو گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کو بچہ اپنے سے جدا کرنا پڑتا ہے جو خود ماں باپ کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔ اب اگر آدمی یہ چاہے کہ دل کے کہنے پر عمل کرے تو پھر اسے بچے کی تعلیم و تربیت کو نظر انداز کرنا ہو گا' جس پر بچے کے مستقبل کا دار و مدار ہے اور اگر عقل کا حکم مانے تو دل کی خواہش کے خلاف چلنا ہو گا۔

اس سے بھی بڑھ کر خود اپنی اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس کا معاملہ ہے۔ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہاں عموماً عقل اور دل دونوں بالکل مخالف سمتوں میں کام کرتے ہیں۔ نفس امّارہ پر قابو پانے کے لیے بہت زور لگانا پڑتا ہے۔ محض عقل اور ایمان کی طاقت کافی نہیں۔

ایک دفعہ رسول اکرمؐ جوانوں کے ایک مجمع کے پاس سے گزرے جو ایک بڑا بھاری پتھر اٹھا کر زور آزمائی کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"اگر تم چاہو تو جج کے فرائض میں انجام دوں اور فیصلہ کروں کہ تم میں سے کون زیادہ طاقتور ہے؟"

انھوں نے کہا: "ضرور یا رسول اللہ!"

ان کا خیال تھا کہ نبی اکرمؐ اسی کے حق میں فیصلہ دیں گے جس کے بازو میں زیادہ زور ہو گا اور جو زیادہ طاقتور ہو گا' لیکن ان کی توقع کے برخلاف رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"تم میں سب سے زیادہ طاقتور وہ ہے جس کی عقل کے ہاتھ سے نفس امّارہ نہ چھین سکے باگ ڈور سے نہ چھین سکے۔ طاقتور وہ نہیں ہے جس کے بازوؤں میں زیادہ زور ہو' بلکہ وہ ہے جس کی ہمت بلند اور حوصلہ قوی ہو۔"

جہاں تک تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کا تعلق ہے تو دل کے مرکز اور عقل کے مرکز کے درمیان ہمیشہ ایک کشمکش اور معرکہ برپا رہتا ہے۔ تزکیہ نفس کا مقصد یہی ان دونوں قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے تاکہ دل کی خواہشوں کو قابو میں رکھا جا سکے۔ بنیادی طور پر ترتیب و ترکیب کا تعلق عقل سے اور بے قیدآزادی کا تعلق دل سے ہے۔

جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر

نبی اکرمؐ نے ایک مشہور حدیث میں اس معرکہ کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے۔ ایک دفعہ آپ کے اصحاب جہاد سے واپس آئے تھے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: مَرْحَبًا بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْاَصْغَرَ وَبَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ ان لوگوں کا آنا مبارک ہو جو جہادِ اصغر کا فریضہ انجام دے کر آئے ہیں۔ جہادِ اکبر ابھی ان کے ذمہ باقی ہے۔"

اصحاب نے پوچھا: "جہادِ اکبر کیا ہے یا رسولؐ اللہ!"

آپ نے فرمایا: "نفس سے جہاد اور دل کی بڑھتی ہوئی خواہشوں کا مقابلہ۔"

اس کشمکش میں کبھی عقل دل کی خواہشوں پر قابو پا لیتی ہے اور کبھی اس کے برعکس دل عقل پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ عقل کے دل پر قابو پا لینے کا مطلب تو واضح ہے۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ مگر دل کے عقل پر غلبہ حاصل کرنے کی وضاحت البتہ ضروری ہے۔

عقل کے فیصلہ پر دل کی اثراندازی

اگر انسان کی عقل آزاد ہو تو وہ معاملات کا صحیح فیصلہ کرتی ہے۔ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط سمجھتی ہے لیکن اگر عقل دل کی خواہشوں کے تابع ہو جائے تو پھر وہ بھی وہی فیصلہ کرتی ہے جو دل چاہتا ہے خواہ حقیقت کچھ بھی ہو۔ اپنی جگہ عقل بڑی منصف ہے بشرطیکہ اس کے فیصلوں کا احترام کیا جائے ورنہ اگر فیصلوں کو نافذ کرنے والی قوت پر میلانات اور خواہشات غالب آجائیں تو پھر عقل بیچاری کیا انصاف کر سکتی ہے۔

مولائے متقیان حضرت امام علیؑ کا ایک قول ہے:

مَنْ عَشِقَ شَیْئًا اَعْشٰی بَصَرَہٗ وَاَمْرَضَ قَلْبَہٗ

کسی چیز کی محبت کا غلبہ آدمی کو اندھا اور اس کے دل کو بیمار کر دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اس چیز کے بارے میں عقل و فہم سے کام لے کر صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا کیونکہ حب و بغض اور دوستی و دشمنی قدرتی طور پر فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

وَعَیْنُ الرِّضَا عَنْ کُلِّ عَیْبٍ کَلِیْلَۃٌ

کَمَا اَنَّ عَیْنَ السُّخْطِ تُبْدِی الْمَسَاوِیَا

اگر کوئی شخص کسی سے خوش ہو تو اسے اس کا کوئی عیب نظر نہیں آتا لیکن اگر ناراض ہو تو برائیاں ہی برائیاں دکھائی دیتی ہیں۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے سے متعلق ہر چیز کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے بقولِ سعدی ہر شخص کو اپنی عقل کامل اور اپنا بچہ حسین نظر آتا ہے۔ اپنی ذات سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسے اپنی ذات سے جتنی دلچسپی ہے اتنی کسی اور چیز سے نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اور اس چیز کو جس کا اس کی ذات سے تعلق ہے اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے یعنی اپنے اور متعلقین کے متعلق وہی فیصلہ کرتا ہے جس سے اس کا دل خوش ہو جائے چاہے وہ حقیقت پر مبنی ہو یا نہ ہو۔ انسان اپنی بداخلاقیوں کو بھی خوبیاں تصور کرتا ہے

اور اپنے ناپسندیدہ افعال کو بھی پسندیدہ قرار دیتا ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا.

"کیا وہ شخص جس کو اپنے اعمالِ بد اچھے نظر آتے ہیں اس کے برابر ہو سکتا ہے جو بری بات کو برا اور اچھی بات کو اچھا سمجھتا ہے؟" (سورۂ فاطر۔ آیت ۸)

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

"خدا کی قسم ہم نے آپ سے پہلی امتوں کے پاس پیغمبر بھیجے لیکن شیطان نے ان لوگوں کی نظر میں ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا۔" (سورۂ نحل۔ آیت ۶۳)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا.

"کہہ دیجیے کیا ہم تم کو بتلائیں کہ سب سے زیادہ گھاٹے والے اعمال کس کے ہیں؟ ان کے جن کی محنت دنیوی زندگی میں برباد گئی اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔"

امیر المومنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ لَا يُصْبِحُ وَلَا يُمْسِيْ اِلَّا وَنَفْسُهٗ ظَنُوْنٌ عِنْدَهٗ.

"مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے نفس کی نسبت بدگمان

رہتا ہے۔"

مومن کو ہر لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی ناپسندیدہ عمل سرزد نہ ہو جائے۔ جب انسان اس منزل پر پہنچتا ہے کہ وہ اپنے نفس سے بدگمان رہنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ مجھ سے کسی وقت بھی گناہ اور غلطی ہو سکتی ہے تو لامحالہ اپنے اعمال کی نگرانی کرے گا اور اپنے نفس کو کبھی حد سے بڑھنے نہیں دے گا۔ بدقسمت ہے وہ شخص جس کو یہ غلط فہمی ہو کہ وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات انسان کی قوتِ فیصلہ کمزور اور بیمار ہو جاتی ہے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے انصاف نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ اگر سوچنے سمجھنے کی قوتیں دل اور اس کی خواہشات کے تابع ہو جائیں تو آدمی نہ صرف زبان سے اپنے آپ کو پاک اور بے عیب ظاہر کرنے لگتا ہے بلکہ دل سے بھی اپنے آپ کو بے عیب سمجھنے لگتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ایسے شخص کی نہ عقل آزاد رہتی ہے، نہ سوچ اور نہ اس کے بول۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سچائی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ جیسے اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور گردن آزاد نہ ہوں تو وہ حرکت نہیں کر سکتا یہی حال عقل اور سوچ کا ہے۔ ہاتھ پاؤں رسی اور زنجیر سے باندھے جاتے ہیں۔ گردن میں طوق ڈالا جاتا ہے۔ عقل ہوا و ہوس، نفسانی خواہشات، اندھی تقلید اور تعصب کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں رسولِ اکرمؐ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ

لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ

یعنی "آپ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں۔ پاک چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں اور لوگوں پر طوق و زنجیر کا جو بھاری بوجھ ہے اس کو ہٹاتے ہیں۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۷)

یہ طوق و زنجیر کا بھاری بوجھ وہی ہے جس میں ان کی عقل اور روح جکڑی ہوئی تھی جس سے رسولِ خدا نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں نجات دلائی۔

اپنے متعلق خوش فہمی اور دوسروں کے متعلق بدگمانی

معاشرے کی اصلاح میں ہماری ناکامی کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو اور اپنے اعمال و افعال کو دیکھتا ہے تو خوش فہمی کی عینک چڑھا لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی اپنا قصور نہیں مانتا قصور ہمیشہ دوسروں کا ہوتا ہے۔ سماجی انصاف چاہتے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ سماجی انصاف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب ہر شخص انصاف سے کام لے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى

اَنْ تَعْدِلُوْا.

"اے ایمان والو! خوب انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو خواہ وہ گواہی تمہارے اپنے والدین یا رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی امیر ہو یا غریب، دونوں کا اللہ سے زیادہ تعلق ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم خواہشِ نفس کا اتباع کر کے انصاف کے راستے سے ہٹ جاؤ" (سورۃ نساء۔ آیت ۱۳۵)

دینی تربیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انصاف پسندی روح اور ضمیر میں رچ بس جاتی ہے۔ فرق ہے اس شخص میں جو ایمان سے بہرہ مند ہو اور خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہو اور اس شخص میں جو محض معاشرے کی بھلائی کی خاطر کوئی کام کرتا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ.

"اے ایمان والو! اپنی خبر لو۔ اگر تم راہِ راست پر ہوگے تو کسی اور کی گمراہی سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا"۔[1]

ہمیں معلوم ہے کہ اسلام میں دوسروں کے اعمال کی نگرانی بھی واجبات میں سے ہے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ.

"تم میں سے ہر شخص کچھ دوسروں کا نگران ہے اور اپنے زیرِ نگرانی افراد کے لیے جوابدہ ہے"۔

---

[1] سورۃ مائدہ۔ آیت ۱۰۵

لیکن یہ شیطانی خیال ہر شخص کو اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ معاشرہ خراب ہے، دوسرے خراب ہیں۔ کسی کے خراب یا گمراہ ہونے کا عذر ہم اپنی بداعمالیوں کے جواز میں خدا کے سامنے پیش نہیں کرسکیں گے۔ یہ محض نفس کا دھوکا ہے کہ وہ آدمی کو اپنا گناہ دوسروں کی گردن پر ڈالنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

سوچنے اور سمجھنے کی عادت

ان خواہشوں کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو جسم و جان، عقل و ایمان اور دنیا و آخرت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ آدمی کے پاس ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ عقل کو قوی بنایا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سوچنے اور سمجھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کوئی فیصلہ بے سوچے سمجھے اور جلدی میں نہ کیا جائے۔

ایک دفعہ ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا۔ اس نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا: "میں نصیحت کروں تو اس پر عمل کرو گے؟"

اس شخص نے جواب دیا: "جی ہاں!"

آپ نے یہی سوال تین دفعہ دہرایا اور اس نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا۔ جب آپ نے اس شخص سے پکا وعدہ لے لیا تو فرمایا:

اِذَا هَمَمْتَ بِاَمْرٍ فَتَدَبَّرْ عَاقِبَتَهٗ.

"جب کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کا انجام پہلے سوچ لو۔" اگر اس کام کا نتیجہ رشد و ہدایت ہو جب تو وہ کام کرو اور اگر اس کا نتیجہ

قریبی اور شر و فساد ہو تو اس سے دور ہی رہو۔

رسول اللہ نے جس طرح اس شخص سے وعدہ لیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنے اس قول کو غیر معمولی اہمیت دے رہے تھے۔ دراصل آپ ہمیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ہمیں سوچنے اور غور کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور کوئی کام اس وقت تک شروع نہیں کرنا چاہیے جب تک اس کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور نہ کرلیں اور اس کے نتائج و عواقب کو خوب پرکھ نہ لیں۔

آدمی کو جذبات کی بجائے عقل سے کام لینا چاہیے۔ جو کام سوچ کر کیا جائے گا وہ پہلے سے حساب لگا کر اور ضروری غور و فکر کے بعد عقل کی روشنی میں کیا جائے گا۔ اس کا ہر پہلو پیش نظر ہوگا لیکن جو کام جذبات کے تحت ہوگا اس کی نہ منصوبہ بندی ہوگی، نہ اس میں کسی قاعدے کو کوئی دخل ہوگا۔ ایسا کام صرف وقتی جوش کے تحت اور جذبات کی تسکین کے لیے کیا جاتا ہے اور جذبات کے بھڑکنے سے جو دھند چھا جاتی ہے، اس کے اندھیرے میں انجام نہیں سوجھتا اور نتیجہ پر غور کرنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔

ہر شخص کم و بیش عقل اور جذبات دونوں ہی کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی مجمع میں کوئی بات کرتا ہے یا معاشرے میں کوئی کام کرتا ہے تو ایک طرف تو اس کی بات یا کام کا تعلق اس کے جذبات اور احساسات سے ہوتا ہے اور دوسری طرف چونکہ وہ کچھ نہ کچھ غور و فکر سے بھی کام لیتا ہے اس لیے اس بات یا کام کا تعلق عقل اور سمجھ سے ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ کچھ لوگ زیادہ جذباتی ہوتے ہیں اور کچھ عقل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ عمرانیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ فرق صرف افراد ہی میں نہیں، قوموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بعض قومیں عقل سے زیادہ کام لیتی ہیں اور بعض جذبات سے۔

رسول اللہ کے اس فرمان کا منشا یہ ہے کہ ہر کام میں عقل سے کام لو اور جذبات پر قابو رکھو۔ سمجھدار بنو جذباتی نہ بنو۔ کوئی شخص یا کوئی قوم جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے، وہ اتنا ہی آہستہ آہستہ جذبات سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ عقل کی بات ماننا اور جذبات کے غلبہ سے آزاد ہونا آدمی کی ذہنی اور روحانی پختگی کی دلیل ہے۔ بچپن میں آدمی قطعاً احساسات اور جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ وہ سوچنا سمجھتا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ اپنے کاموں کی دیکھ بھال کر سکتا ہے اور نہ اپنے مفاد کی حفاظت کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کو آسانی سے کسی بھی کام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر اس سے کوئی سا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ تاہم عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے تجربے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کی عقل اور سمجھ بھی بڑھتی رہتی ہے۔

لیکن صرف وقت کے گزرنے اور عمر میں اضافے ہی سے آدمی سمجھدار نہیں ہو جاتا۔ دوسری اخلاقی خوبیوں کی طرح اس کے لیے بھی مشق اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ معلومات کافی ہوں اور دوسرے یہ ضروری ہے کہ آدمی ذرا سی تکلیف گوارا کر کے ہر معاملے پر غور کرے اور خوب سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرے تاکہ ہر بات کے انجام اور نتیجے کو پیش نظر رکھ سکے اور جذبات سے مغلوب نہ ہو۔

رسول اللہ کا فرمان ہے:

مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الْفَقْرَ وَلَكِنْ أَخَافُ عَلَيْهِمْ سُوْءَ التَّدْبِيْرِ.

مجھے اپنی امت کی غریبی کی فکر نہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ نا سمجھی

کے کام نہ کریں۔

ایک اور حدیثِ نبوی میں ایک قصہ منقول ہے جس سے عقل اور جذبات کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔

ایک اعرابی نے رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔

آپ نے اس کے جواب میں ایک چھوٹا سا جملہ فرمایا: لَا تَغْضَبْ یعنی "غصہ مت کرو"

اس شخص نے بھی اتنے فقرہ پر قناعت کی اور اپنے قبیلے میں واپس چلا گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی واقعے کے نتیجے میں اس کے قبیلے اور ایک دوسرے قبیلے میں کچھ جھگڑا ابھرا۔ نوبت محاذ آرائی تک پہنچ گئی۔ قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی۔ قدیم روایات اور عادت کے مطابق جذبات میں اشتعال پیدا ہوا تو یہ شخص بھی ہتھیار زیبِ تن کر کے اپنی قوم کی صف میں استادہ ہو گیا۔ اس حالت میں یکایک اسے رسول اللہؐ کا فرمان یاد آ گیا کہ غصہ نہیں کرنا چاہیے۔ جذبات پر قابو پا کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کے اندر استدلال کی قوت بیدار ہو گئی۔ سوچنے لگا کہ یہ کیسی لغو بات ہے کہ دو فریق ایک دوسرے پر تلواریں سونت کر ٹوٹ پڑیں۔ فوراً دشمن کی صف کے نزدیک گیا اور کہا کہ "جو کچھ تاوان یا جرمانہ تم چاہو میں اپنے مال سے ادا کرنے کو تیار ہوں"

انھوں نے بھی جب اس کا یہ حوصلہ دیکھا تو اپنا دعوٰے واپس لے لیا۔ مصیبت ٹل گئی۔ جذبات کی بھڑکی ہوئی آگ آخر عقل اور سمجھ کے پانی سے بجھ گئی۔

موسمِ بہار اور نمودِ حیات

تنوّع اور جدّت کی خواہش

انسان کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ یکسانیت سے جلد اکتا جاتا ہے اور ہمیشہ جدت اور تنوع چاہتا ہے۔ رنگارنگی انسان کی ضرورت ہے۔ آخر اس میں راز کیا ہے کہ آدمی بڑے شوق سے کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور جیسے ہی وہ چیز اسے مل جاتی ہے اس کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے آہستہ آہستہ دل بھرنے لگتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو نفرت اور بیزاری تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ خیر اس وقت میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ ان چیزوں کا جو اس کے پاس نہیں ہوتیں مشتاق اور آرزومند رہتا ہے اور جو چیز مل جاتی ہے اس سے اس کی محبت اور دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ اور لوگ جن کی نظر

زیادہ گہری اور دقیق ہے کہتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی طلب واقعی فطری اور اصلی ہو تو اس کی خواہش کبھی سرد نہیں پڑ سکتی۔ انسان کی فطرت میں ایک ایسے محبوب کی تلاش ہے جو کامل و اکمل ہو اور جس کے کمالات لامتناہی ہوں۔ آدمی جس چیز کے پیچھے بھی دوڑتا ہے دراصل اس میں اپنے محبوب حقیقی ہی کی کوئی نشانی دیکھتا ہے لیکن اس کے مل جانے پر جب اس میں اپنے اصل محبوب کی خصوصیات نہیں پاتا تو اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ چیز تو میرے وجود کے خلا کو پر نہیں کر سکتی، لہٰذا وہ کسی اور محبوب کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔ یہی سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ آدمی اپنے محبوب حقیقی کو نہ پالے۔ محبوب حقیقی کو پالینے کے بعد ہی انسان اپنے اصلی کمال کو پہنچتا ہے کیونکہ اس کا اعلیٰ ترین درجۂ کمال یہی ہے کہ اسے کمال لامتناہی سے اتصال حاصل ہو جائے۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد آدمی مسرت و شادمانی میں غرق اور ہمیشہ کے لیے پرسکون و مطمئن ہو جاتا ہے۔ بعیر نزادہ اسی اس تک راہ پا سکتی ہے نہ افسردگی و بددلی!

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

"یاد رکھو اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔" (سورۂ رعد، آیت ۲۸)

قرآنِ کریم بہشت کے بارے میں فرماتا ہے لَا یَبْغُوْنَ عَنْھَا حِوَلًا۔[1] یعنی جنتی جنت سے نکلنا نہیں چاہیں گے۔ دنیوی نعمتوں اور آخرت کی نعمتوں میں یہی فرق ہے۔ آدمی دنیا میں ہمیشہ اپنی حالت میں تغیر اور تبدل چاہتا ہے لیکن آخرت میں وہ کسی تغیر کا خواہاں نہیں ہوگا۔

بہر حال یہ مسلّم ہے کہ انسان اس دنیا میں تغیر اور تنوع چاہتا ہے۔

---

[1] سورۂ کہف، آیت ۱۰۸

تبدیلی اور رنگا رنگی سے طبیعت میں شگفتگی اور انبساط پیدا ہوتا ہے۔ آدمی خوشی محسوس کرتا ہے خصوصاً اگر اس تبدیلی سے زندگی میں تازگی کا احساس پیدا ہو۔ تغیر اور تنوع سے رنج و غم اور کدورت و ملال دور ہو جاتا ہے۔

اسلامی احکام میں بھی اس نکتے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ہفتے میں ایک دن اور سال میں ایک مہینہ عبادت کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ قدرتی نظام کو قانون بنا کر سہارا دیا گیا ہے۔ ایامِ ہفتہ میں جمعہ کا دن اور سال میں ماہِ رمضان، روحانی زندگی کی تجدید اور طبیعت کو مادی کدورتوں سے پاک صاف کرنے کے اوقات ہیں۔

حدیث میں ہے:

لِكُلِّ شَيْءٍ رَبِيعٌ وَرَبِيعُ الْقُرْاٰنِ شَهْرُ رَمَضَانَ.

"ہر چیز کا اپنا موسمِ بہار ہے جس میں اس کی زندگی کی تجدید ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان کے دل میں قرآن کی زندگی کی تجدید کا موسم ماہِ رمضان ہے۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ فَإِنَّهُ رَبِيعُ الْقُلُوبِ.

"قرآن سیکھو کیونکہ قرآن دلوں کی بہار ہے۔"

قدرتی بہار گرم سورج کی زندگی بخش شعاعوں سے وجود میں آتی ہے جن سے زمین میں از سرِ نو جان پڑتی ہے۔ قرآن کا نیرِ درخشاں مردہ دلوں اور افسردہ روحوں کو جگاتا اور ان میں بہار لاتا ہے۔ ہمارے لیے ضروری اور مناسب ہے کہ ہم روحانی بہار سے بھی استفادہ کریں اور قدرتی بہار کا لطف بھی اٹھائیں۔

رسولِ اکرم ﷺ نے روحانی بہار یعنی رمضان کے مبارک مہینے کے متعلق فرمایا ہے:

فَاسْئَلُوا اللّٰهَ بِنِيَّاتٍ صَادِقَةٍ وَقُلُوبٍ طَاهِرَةٍ اَنْ يُوَفِّقَكُمْ لِعِبَادَتِهِ وَتِلَاوَةِ كِتَابِهِ۔

"اللہ سے نیت کی سچائی اور دلوں کی پاکیزگی کے ساتھ دعا کرو کہ وہ تمہیں اپنی عبادت اور اپنی کتاب کی تلاوت کی توفیق عطا فرمائے۔"

موسمِ بہار میں انسان کا حصہ

موسمِ بہار میں جو زمین میں نئی زندگی آتی ہے، قرآنِ حکیم نے اس کا بار بار تذکرہ کیا ہے لیکن صرف اس حیثیت سے کہ اس سے کیا سبق اور کیا تعلیم ملتی ہے اور اس سے آدمی کو کیا فائدہ اٹھانا اور کیا فیض حاصل کرنا چاہیے۔ موسمِ بہار پر زمین کے سب بیٹوں کا وہ چاہے اشجار ہوں، حیوانات ہوں یا انسان ہوں، حق ہے۔ سب کا اس حیات بخش فصل میں حصہ ہے۔ اس موسم میں سبزہ و گل کمل نمو حاصل کرتے ہیں اور اپنے حسن کی پوری بہار دکھاتے ہیں۔ گائے، گھوڑے، بھیڑ، بکری خوب چرتے ہیں، موٹے تازے ہوتے ہیں، اچھلتے کودتے ہیں۔ اس فیضِ عام میں انسان کا بھی حصہ ہے کیونکہ بحیثیت انسان وہ عقل اور سمجھ کے ساتھ ساتھ دل بھی رکھتا ہے۔ اسکے احساسات اور جذبات بھی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ انسان کا حصہ کیا ہے؟

کچھ لوگ تو واقعی موسمِ بہار سے فیض حاصل کرتے ہیں، سبق سیکھتے ہیں نکتے حل کرتے ہیں، حقیقت تک رسائی حاصل کرتے ہیں لیکن افسوس کی بات

ہے کہ بعض لوگ اس جاں بخش موسم سے جو فائدہ اٹھاتے ہیں' وہ جانوروں کی حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ تخلیق کے ان پر شکوہ مظاہر میں سے ان کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ پیٹ بھرتے چلے جائیں' اچھل کود اور بدمستی کریں اور حیوانیت کے سب سے نچلے درجے تک پہنچ جائیں۔ ایسے لوگ موسم بہار سے متاثر ضرور ہوتے ہیں لیکن اس موسم سے فیض حاصل نہیں کرتے بلکہ اپنی ناپسندیدہ عادات اور بری صفات کے اعتبار سے کسب فیض کرتے ہیں اور وہ فیض ہوتا ہے۔ جرائم' آدم کشی' بے حیائی' اخلاقی بگاڑ اور انسانی حدود سے تجاوز۔

کیا یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں ہے کہ ایسے خوشگوار اور پر بہار ایام کی آمد کا ثمرہ روح و دل کی تاریکی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جبلت ہی کی راہ پر چلتا ہے۔

بہرحال بہار کے موسم میں ہماری زمین کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ یہ یوم زمین کی سرسبزی اور شادابی کا ہے۔ زمین کی حالت میں تبدیلی آنے لگتی ہے' وہ خدا کی عظیم نعمتوں سے بھرپور ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی میں ایک رونق آجاتی ہے۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ اس حالت کو زمین کی حیات نو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پندرہ بار یا شاید اس سے بھی زیادہ قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے جو ایک سبق' ایک تعلیم اور ایک حکمت کے طور پر ہے کہ جس کو سمجھنے اور یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

زندگی کی حقیقت اور اس کے آثار

زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ انسان ابھی تک

اس کی پردہ کشائی نہیں کر سکا۔ بعض اہلِ تحقیق کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اس راز سے کبھی بھی پردہ نہیں اٹھے گا کیونکہ ان کے نزدیک زندگی اور وجود اصل میں دونوں ایک ہیں۔ جس طرح وجود کی حقیقت کی تعریف اور اس کا تعین ممکن نہیں اسی طرح زندگی کی حقیقت کی بھی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح وجود کی حقیقت کے مختلف درجے ہیں' کہیں قوی ہے' کہیں ضعیف' یہی حال زندگی کی حقیقت کا ہے۔ کوئی موجود جس درجہ کا وجود رکھتا ہے' اسی درجے کی زندگی بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ زمین یا کسی بھی اور چیز کے زندہ ہونے کے معنی زندگی کا ایک بہتر اور بلند تر درجہ حاصل کرنے کے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جس میں کسی نہ کسی درجے کی زندگی نہ ہو۔ بالکل مردہ شے کا کہیں کوئی وجود نہیں۔ مردہ محض معدوم مطلق ہے۔

اگرچہ زندگی کی حقیقت کا انسان کو علم نہیں' یا یوں کہیے کہ زندگی کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا' پھر بھی زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز نمایاں اور ظاہر نہیں ہے۔ ہم خود زندگی کو محسوس تو نہیں کر سکتے' کیونکہ نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں' نہ چھو سکتے ہیں' نہ چکھ سکتے ہیں لیکن اس کے آثار ہمیں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ان کو چھو بھی سکتے ہیں' محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ زندگی کے آثار ظاہر ہیں اور خود زندگی باطن۔ اس ظاہر سے اس باطن کا علم ہوتا ہے۔ چھلکے سے گودے تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

غیر محسوس حقائق

دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم صرف ان چیزوں کے قائل ہیں جن کا وجود ہم اپنے حواسِ خمسہ میں سے کسی کے ذریعہ محسوس

کرسکیں کیونکہ صرف انہی چیزوں کا یقین کیا جا سکتا ہے جن کو براہ راست محسوس کیا جا سکے۔ جس چیز کو محسوس نہیں کیا جا سکتا، اس کا وجود بھی باقی نہیں ہے۔ نتیجہ میں جو کچھ ہے وہ تو واقعی موجود ہے، اس لیے کہ اس کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ کسی مافوق الفطرت چیز کا وجود نہیں ہے کیونکہ مافوق الفطرت چیزیں نہ چھوئی جا سکتی ہیں نہ دیکھی جا سکتی ہیں۔

علاوہ اس کے کہ یہ طرزِ استدلال بذاتِ خود ناقص ہے کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جو چیز ہمیں محسوس نہیں ہوتی اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس طرزِ بیان میں ایک اور بڑا عیب ہے جس کا ان لوگوں نے خیال نہیں کیا اور وہ یہ کہ خود فطرت میں ایسے ناقابلِ انکار مسلّم حقائق ہیں جن کا حواس کے ذریعے سے ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی بھی ان ہی حقائق میں سے ایک ہے۔

کچھ دانشوروں نے پورے غور و خوض کے بعد حساب لگا کر ثابت کیا ہے کہ اس جہانِ فطرت میں جس کے دامن میں ہم زندگی گزار رہے ہیں بہت سے ایسے مسلّم الثبوت حقائق موجود ہیں جن کا براہ راست ادراک ممکن نہیں، مگر جن کا وجود مسلّم ہے۔ کیا ہم خود جسم اور مادہ کو براہ راست محسوس کر سکتے ہیں؟ حواس سے جس چیز کا ادراک کیا جاتا ہے وہ یا تو رنگ اور شکل ہے یا مقدار اور حجم، یا سردی، گرمی اور نرمی، سختی کی قسم کی کوئی بات۔ ان میں سے کچھ بھی خود وہ مادہ نہیں جو خارج میں موجود ہے۔ یہ سب اس کے آثار ہیں۔ زمین اور فرزندانِ زمین کی زندگی بھی ایک مسلّم حقیقت ہے مگر غیر محسوس۔ ہم اس کے آثار اور ظواہر کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے حواس سے اس کا پتہ لگا سکتے ہیں لیکن ہم ایک پھول میں کیا دیکھتے ہیں؟ اس کی شادابی اور تر و تازگی۔

اس کا رنگ اور اس کی بو اور ان چیزوں کے وجود کی بنا پر فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں زندگی ہے۔ اس پھول کے باطن کے متعلق ہمارا یہ فیصلہ کیونکہ زندگی ایک باطنی چیز ہے، ہم حواسِ ظاہری سے نہیں کرتے بلکہ ایک دوسری طاقت کے ذریعہ کرتے ہیں جو ہمارے اندر یعنی ہمارے باطن میں موجود ہے۔ ہم اپنے ظاہری حواس سے اشیاء کے ظاہر کا احساس کرتے ہیں اور اپنے عقل وضمیر کی باطنی قوت سے اشیائے عالم کے باطن کے ساتھ ارتباط پیدا کرتے اور غیر محسوس حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں 'لُبّ' کا لفظ

قرآنِ کریم کا ایک نہایت لطیف پیرایہ بیان ہے۔ جب وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی ایسی حقیقت کو بیان کرے جو ظاہری آثار کے پسِ پردہ ہو، تو وہ یہ کہتا ہے کہ اس حقیقت کا ادراک صرف اولوالالباب کر سکتے ہیں یعنی اصحابِ لُبّ۔ لُبّ کے معنی ہیں چھلکے سے الگ خالص مغز۔ لغت کی مشہور کتاب المنجد میں ہے:

"اَللُّبُّ خَالِصُ كُلِّ شَيْءٍ، اَلْعَقْلُ الْخَالِصُ مِنَ الشَّوَائِبِ"

راغب اصفہانی مفردات غریب القرآن میں کہتا ہے:

اَللُّبُّ، اَلْعَقْلُ الْخَالِصُ مِنَ الشَّوَائِبِ.

یعنی لُبّ کے معنی ہیں ہر قسم کی آمیزش سے صاف شدہ عقل۔ یہ نہیں کہتا کہ آمیزش سے پاک بلکہ کہتا ہے کہ آمیزش سے صاف شدہ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ابتداء میں جب آدمی کی فکر ابھی ناپختہ اور خام ہوتی ہے اس کے

محسوسات، تخیلات اور معقولات ایک حد تک آپس میں گڈمڈ اور مخلوط ہوتے ہیں۔ یہ مرحلہ بعد میں آتا ہے جب یہ سب ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور ہر ایک کا معاملہ الگ الگ ہو جائے۔ جب انسان کی عقل اس درجے پر پہنچ جائے کہ وہ وہم و خیال اور حواس کی گرفت سے آزاد ہو جائے اس وقت اس کی صاف شدہ عقل کا نام لب ہو جاتا ہے۔ عقل جو انسان کی باطنی قوت ہے اس کو ظاہری حواس سے وہی نسبت ہے جو مغز اور گودے کو چھلکے سے۔ جب بادام یا اخروٹ کچا ہوتا ہے، اس کا چھلکا اور گودا ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب میوہ پک کر تیار ہو جاتا ہے چھلکا اور گودا ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کے اپنے خواص اور اپنا مخصوص اثر رہ جاتا ہے اور چھلکے اور مغز کے خواص کسی طرح آپس میں مخلوط نہیں ہوتے۔

اگر انسان علم و معرفت میں کمال حاصل کرے تو اس کی عقل بھی حس، وہم اور تخیل کی کارفرمائیوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور وہ ان میں سے کسی ایک کا حکم دوسرے پر جاری کرنے کی غلطی نہیں کرتی۔ ایسے کامل العقل شخص کو لبیب کہا جاتا ہے یعنی ایسا شخص جس کی عقلی قوت ارتقا کی اس منزل پر پہنچ گئی ہو کہ وہ وہم و خیال کی گرفت سے آزاد ہو چکی ہو۔

عرفاء کہتے ہیں کہ جس طرح عالم جبروت، عالم ملکوت اور عالم ناسوت ہیں، اسی طرح انسانی وجود کے بھی مختلف درجے ہیں جو ان عالموں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ انسان اپنے وجود کے ہر درجے میں کسی ایک عالم کلی کے ساتھ ارتباط پیدا کر سکتا ہے۔

انسان کی قوت عقلیہ کی بنیاد بھی حواس پر ہی ہے۔ محسوسات ہی سے معقولات کو راستہ جاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ محسوسات کے ذریعے

معقولات کا علم حاصل کرے، البتہ محسوسات ہی میں اُلجھ کر رہ جائے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

"زمین و آسمان کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں نشانیاں ہیں سمجھدار لوگوں کے لیے۔" (سورۃ آلِ عمران۔ آیت ۱۹۰)

یعنی ہیکلِ عالم کے مشاہدے سے روحِ عالم اور مغزِ عالم کا نشان ملتا ہے لیکن صرف ان کو جن کے پاس دماغ اور محسوسات سے صاف شدہ عقل ہے۔

الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

"جو لوگ ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور ہمیشہ نظامِ عالم کے بارے میں غور کرتے رہتے ہیں اور موجوداتِ عالم کی غایت کو سمجھ سکتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بیکار پیدا نہیں کیا ہے، قیامت آنے والی ہے اور اعمال کا نتیجہ ضرور ظاہر ہو کر رہے گا۔"

ایک اور جگہ ارشادِ ربانی ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِکَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

"خوشخبری دے دیجیے میرے ان بندوں کو جو بات سنتے ہیں پھر

اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور وہی ہیں لب (عقل، سمجھ اور شعور) والے۔"

آدمی اپنے کان سے بات سنتا ہے۔ کان ہمارے بدن کا ایک حاسہ ہے۔ اس کو اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا سنتا ہے۔ کان کا کام اچھے برے میں تمیز کرنا نہیں ہے۔ اس کام کے لیے انسان میں ایک اور طاقت ہے جو کان کے فراہم کردہ مواد کی چھان بین کرتی اور اس کے متعلق طے کرتی ہے کہ کونسی بات اچھی ہے اور کونسی بری۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ یہ ایک باطنی اور غیر محسوس طاقت ہے اور اس کا کام بھی غیر محسوس ہے۔

انسان اپنے وجود کی ظاہری اور غیر محسوس دنیا کے ذریعے عالم کبیر کے ظاہری اور محسوس حصے سے ارتباط پیدا کرتا ہے اور اپنے وجود کے مغز اور باطنی حصے کے ذریعے عالم کبیر کے باطنی اور غیر محسوس پہلوؤں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

کسی شخص نے امیر المومنینؑ سے پوچھا: هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ ؟ کیا آپ نے اپنے خدا کو دیکھا ہے؟

آپ نے فرمایا: لَمْ اَعْبُدْ رَبًّا لَمْ اَرَهُ ۔ میں ایسے خدا کی پرستش نہیں کرتا جس کو میں نے دیکھا نہ ہو۔

پھر فرمایا: لَمْ تَرَهُ الْعُيُونُ بِمُشَاهَدَةِ الْعِيَانِ وَلٰكِنْ رَأَتْهُ الْقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الْاِيْمَانِ ۔ خدا آنکھ سے نہیں دیکھا جاتا، آنکھ اس کام کے لیے نہیں ہے۔ وہ ایمان سے منور دل سے نظر آتا ہے۔

دیدن روئے ترا دیدۂ جاں بیں باید
ایں کجا مرتبۂ چشم جہاں بین من است

حواس کی نارسائی

آدمی اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے آزاد نہیں ہے۔ وہ صرف مخصوص حالات میں زندہ اور باقی رہ سکتا ہے۔ اس کے زندہ رہنے کے لیے ایک خاص درجۂ حرارت، خاص مقدار میں ہوا کا دباؤ اور ایک خاص اندازہ میں غذا ضروری ہے۔ وہ صرف محدود مدت تک، محدود جگہ میں زندگی گزار سکتا ہے لیکن اس کی روح اور باطن پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر روحانی اعتبار سے بھی انسان مخصوص حدود کا پابند ہوتا تو وہ علومِ طبیعیہ اور علومِ ریاضی کے کلی قواعد کا ادراک نہ کر سکتا۔ چونکہ انسانی جسم محدود ہے، وہ اپنے جسمانی آلات یعنی اپنے حواس کے ذریعہ صرف محدود چیزوں کا ہی ادراک کر سکتا ہے۔ انسان محدود سے غیر محدود، جزئی سے کلی اور اضافی سے مطلق کی طرف سفر کرتا ہے لیکن وہ اپنے جسمانی حواس سے غیر محدود کا ادراک نہیں کر سکتا، البتہ اپنی عقل سے غیر محدود کو سمجھ سکتا ہے اور بصیرت کی آنکھ سے اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر محدود، محدود میں اور غیر متعین، متعین میں سما جائے۔

رومی کہتے ہیں:

چشمِ حس ہمچوں کفِ دست است و بس
نیست کف را بر ہمہ آں دسترس

انسان کے حسی ادراک کے محدود ہونے کے بارے میں ایک تمثیل بیان کرتے ہوئے مولانا رومی نے مندرجہ بالا شعر لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی ایسی جگہ جہاں کے لوگوں نے ہاتھی کا نام تو سنا تھا لیکن ہاتھی کو دیکھا نہیں تھا۔ ایک ہاتھی ہندوستان سے لایا گیا۔ ہاتھی کو اندھیرے میں کھڑا

کر دیا گیا۔ لوگ اندھیرے میں جاکر ہاتھی کو چھو کر دیکھتے تھے اور باہر آجاتے تھے اور پھر باہر آکر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ایک شخص نے ہاتھی کی سونڈ پر ہاتھ پھیرا تھا۔ جب وہ باہر نکلا، لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ہاتھی کس شکل کا ہے؟ اس نے کہا کہ نلکی کی شکل کا تھا۔ دوسرے کا ہاتھ ہاتھی کے کان پر پڑا جب اس سے ہاتھی کی شکل پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ پنکھے کی شکل کا ہے۔ تیسرے نے ہاتھی کے پاؤں کو ہاتھ لگایا۔ اس نے بیان کیا کہ ہاتھی ستون کی طرح ہے۔ چوتھے نے ہاتھی کی پیٹھ کو چھوا تھا، وہ کہنے لگا کہ ہاتھی تو تخت کی شکل کا ہے۔

اس قصہ سے مولانا رومی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے چونکہ صرف ایک جزو دیکھا تھا اس لیے وہ اسی جزو کو سمجھ سکا جہاں اس کا ہاتھ پڑا تھا۔ چنانچہ ان سب کا نقطۂ نظر مختلف ہو گیا۔ اگر ان کے ساتھ روشنی ہوتی تو کوئی اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ ظاہری آنکھ کی مثال بھی ہاتھ کی ہتھیلی کی سی ہے۔ جس طرح ہاتھ سے پورے ہاتھی کو ٹٹول کر نہیں دیکھا جا سکتا، اسی طرح ظاہری آنکھ بھی کسی چیز کا کامل ادراک نہیں کر سکتی۔

قرآن اور موسم بہار

قرآن کریم نے ایک جگہ اس سبق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

"تم دیکھتے ہو کہ زمین بالکل بیجان ہے مگر جب ہم اس پر

پانی برسا دیتے ہیں تو اس میں جنبش پیدا ہوتی ہے، اس پہ بہار
آجاتی ہے اور وہ ہر طرح کے شگفتہ و شاداب پھول بوٹے اگاتی
ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہی صداقتِ مطلق ہے۔ وہی
مُردوں میں جان ڈالتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔"
(سورۂ حج۔ آیت ۵)

تمام کائنات میں اور ہر چیز میں خواہ جاندار ہو یا بیجان ایک نظم، باہمی ربط اور ایسی ہم آہنگی موجود ہے کہ پورا عالم جسمِ واحد کی طرح نظر آتا ہے جس کے اجزا میں ایسا تناسب اور ہم آہنگی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم ایک وحدت ہے اور ایک مشیت اور ایک نظام کے تابع ہے۔ اس کے کسی جزو اور کسی ذرہ کو اس طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس مجموعی نظام میں اس کا کوئی مقصد اور کوئی کام نہ ہو، بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ ہر ذرّہ اس کارخانہ کا ایک کل پرزہ ہے جو اپنی جگہ پہ الگ بھی کام کرتا ہے لیکن اس کارخانہ کے دوسرے اجزاء کے ساتھ بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں تمام موجوداتِ عالم اپنی تمام طاقت کے ساتھ ایک مشیت اور ایک ارادہ کے تابع فرمان ہیں۔ ان کا انتظام یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس عالم کا کوئی انتظام کرنے والا بھی ہے۔ اس طرح انسان مصنوعات کے آئینہ میں صانع کا جلوہ دیکھتا ہے۔

جہاں تک جانداروں کا تعلق ہے، ان کے وجود سے ایک اور سبق بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ خداوندِ عالم مُردوں کو زندگی بخشتا ہے اور وہ اس طرح کہ جانداروں کے مادّی اجزاء میں ربط اور ترتیب کے علاوہ ان کو وہ کمال عطا کرتا ہے جو ان کے اجزاء میں موجود نہیں۔ ہم عالم میں موجود ذرات کو جس شکل میں ترتیب دیں، کسی ترتیب سے بھی کوئی ایسی حقیقت وجود میں

نہیں ہو سکتی جو پہلے سے موجود نہ ہو لیکن جانداروں کے معاملے میں بات صرف نظم و ترتیب تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ایک ایسی حقیقت بھی بروئے کار آتی ہے جس کا پیشتر سے وجود نہیں تھا۔ بے جان مادّہ میں زندگی نہیں ہے۔ زندگی پیدا ہوتی ہے۔ شعور اور ادراک نہیں ہیں۔ شعور اور ادراک پیدا ہوتے ہیں ذوق اور شوق نہیں ہیں، یہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ عقل اور ہوش نہیں ہیں، عقل اور ہوش پیدا ہوتے ہیں۔ احساس، ادراک اور لذت نہیں ہے، یہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے پیدا ہونے سے ہم زندہ موجودات میں اللہ تعالیٰ کی بخشش، فیاضی، وجود و کمال کی عطاء، اور تکمیل، قبض و بسط، اور احیاء و اماتہ کا جلوہ دیکھتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ دراصل وہی دینے والا ہے اور وہی واپس لینے والا۔ وہی اشیاء کو وجود میں لاتا ہے اور وہی ان کو معدوم بھی کرتا ہے۔

اس ضمن میں دو تین طرح کی قرآنی آیات ہیں۔ ایک تو وہ آیتیں جن میں زمین کو زندگی بخشنے کا توحید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے دیگر وہ آیتیں ہیں جن میں احوالِ قیامت کا تذکرہ ہے۔ کچھ آیتوں میں ان دونوں باتوں کا بیان ہے۔ ان شاء اللہ ان سب کی تفصیل آئندہ کسی موقع پر عرض کروں گا۔

قرآن اور مطالعۂ کائنات

تفکر کا اصول

قرآن کریم نے غور و خوض اور تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔ مخلوقات خداوندی میں تفکر تاکہ تخلیق کے اسرار معلوم کیے جاسکیں۔ اپنے احوال اور اعمال میں تفکر تاکہ اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام دیے جائیں۔ گزشتہ لوگوں کی زندگی اور تاریخ میں تفکر تاکہ وہ قواعد معلوم کیے جائیں جو اللہ نے انسانی جماعتوں کی زندگی کے لیے مقرر کیے ہیں۔

تفکر اگر منتشر اور سطحی ہو تو بہت آسان ہے۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ اور نتیجہ نہیں نکلتا لیکن اگر تفکر گہرے مطالعے اور صحیح طریقے پر مبنی ہو اور علمی طریقے سے انجام دیا جائے یا کم از کم کوئی آدمی اہل دانش کے نتائج فکر کا ہی بغور مطالعہ کرے تو پھر یہ خاصا مشکل کام ہے لیکن نتیجہ خیز اور مفید اور انسان کی دینی اور

روحانی ترقی کے لیے ایک عظیم سرمایہ۔

دین اسلام کا بنیادی رکن توحید ہے۔ یہ وہ عظیم ترین تصور ہے کہ انسانی ذہن نے جس تک رسائی حاصل کی ہے مگر یہ نہایت نازک مسئلہ ہے جس کے لیے بڑے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ اسلام اپنے اصولوں کے بارے میں خصوصاً سب سے بڑے اصول توحید کے بارے میں تقلید کی اجازت نہیں دیتا۔ تحقیق کو ضروری سمجھتا ہے۔ اسی لیے اسلام لازمی طور پر تفکر و تدبر اور تحقیق و جستجو کو فرض قرار دیتا ہے۔ قرآنی آیات کا ایک بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔

قرآنِ کریم نے تفکر کے موضوع کو مبہم نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے صرف یہ کہہ کر بات ختم نہیں کر دی کہ جاؤ غور و فکر کرو، خواہ غور و فکر کا موضوع کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اس نے اصولی طور پر وہ موضوع بھی بتلا دیے ہیں جن پر غور و فکر ضروری ہے مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت ۱۶۴ میں مطالعہ کے لیے موضوعات کا تعین کر کے کہا گیا ہے کہ جاؤ کمرِ ہمت باندھو اور ان موضوعات کی تحقیق اور ان کا مطالعہ کرو۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّیْلِ وَالنَّهَارِ .

آسمانوں کا مطالعہ کرو۔ زمین کا مطالعہ کرو، ستاروں اور سیاروں کے نظام سے واقفیت پیدا کرو، زمین، اس کے طبقات، اس کے آثار اور ان اسباب کو سمجھو جن کی وجہ سے زمین چوبیس گھنٹے میں سورج کے گرد ایک چکر مکمل کر لیتی ہے جس کے نتیجہ میں رات اور دن کا ظہور ہوتا ہے۔ ان سب کا مطالعہ اور تحقیق کرو۔ علم ہیئت کا مطالعہ کرو۔ علم طبقات الارض سے واقفیت پیدا کرو۔

وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ

یہ جہاز اور کشتیاں جو سمندر کے سینہ پر رواں دواں ہیں جن سے انسان نفع حاصل کرتا ہے۔ مسافت طے کرتا ہے۔ اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے تجارت میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے۔ یہ سمندر اور کشتیاں اور کشتیوں کا غرق نہ ہونا اور وہ سب فائدے جو انسان جہاز رانی کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے، یہ سب کچھ ایک قانون ' ایک طریقے اور ایک نظام کے تابع ہے جس سے انسان فقط مطالعہ اور تحقیق کے ذریعے سے ہی آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا۔ یہ بارش کا پانی جو اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس سے مردہ زمین میں جان ڈالتا ہے اس میں ہزاروں راز پنہاں ہیں جو صرف ان لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں جو ان کی تحقیق اور مطالعہ میں جان کھپاتے ہیں فضا اور کائنات کے راز معلوم کرتے ہیں۔ بارش کے خواص دریافت کرتے ہیں اور جڑی بوٹیوں کی پہچان حاصل کرتے ہیں۔ وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ ہواؤں کا چلنا اور آسمان و زمین کے درمیان معلق بادلوں کی حرکت سب اللہ کی حکمت و صنعت کی نشانیاں ہیں۔ لیکن ان باتوں کو وہی سمجھتے ہیں جو غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کرتے اور تخلیق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر کوئی ایسا شخص جس سے کبھی آپ کی ملاقات نہ ہوئی ہو کوئی کتاب تصنیف کرے اور آپ کو خط لکھے کہ اگر مجھ سے مکمل واقفیت حاصل کرنا ہو تو میری کتاب کا مطالعہ کریں اور خصوصاً فلاں فلاں ابواب کو غور سے پڑھیں تو ظاہر ہے کہ یہ ضروری ہے کہ ان ابواب کا پورے غور و فکر سے مطالعہ کیا

جائے۔ اگر ضروری ہو تو کسی استاد سے بھی مدد لے لی جائے، لغت کی کتاب دیکھی جائے، اس کتاب کا رسم الخط سیکھا جائے یا وہ زبان سیکھی جائے جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے تاکہ ہم اس کتاب کو پڑھ کر نادیدہ مصنف سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ صرف کتاب کی جلد پر اوپری نگاہ ڈال لینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

کائنات کا علمی مطالعہ جس میں وہ علمی تحقیق شامل نہ ہو جو ہر فن کے علماء مثلاً ہیئت و فلکیات، ارضیات، حیاتیات، نفسیات اور فضائیات کے علماء نے کی ہیں، صرف اوپر سے کتاب کی جلد کا دیکھ لینا ہے۔ ایسا مطالعہ کافی نہیں اور اس طرح کوئی آدمی بات ٹھیک طور سے نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے برخلاف ایسا علمی و تحقیقی مطالعہ جس کی بنیاد تفکر اور معلومات کے تجزیہ اور تحلیل پر ہو ایسا ہے جیسے آدمی دریا میں تیر کر ایک طرف سے دوسری طرف جائے۔ پس ضروری ہے کہ انسان وسیع معلومات حاصل کرے تاکہ ان پر غور و فکر کر سکے۔ پانی ہونا چاہیے تاکہ آدمی اس میں تیر سکے۔

ایسا شخص جو کسی پھول کے پودے سے پوری طرح واقف ہے جو اس کی جڑ، تنے اور پتیوں کو جانتا ہے، اس کے غذا حاصل کرنے، سانس لینے اور نشو و نما پانے کے عمل سے آگاہ ہے، وہی اس پر غور کر سکتا ہے کہ اس پھول کی تخلیق میں کس قدر علم و حکمت اور تدبیر و قدرت سے کام لیا گیا ہے لیکن جس شخص کی نظر صرف پھول کی شکل اور اس کے جسم تک ہی محدود ہے اور وہ اس کے خواص سے ناواقف ہے وہ کبھی اس بات پر غور نہیں کر سکتا کہ اس پھول کا صانعِ ازلی کی اس حکمت و تدبیر سے کیا تعلق ہے جو تمام عالم میں کارفرما ہے۔

غور و فکر کا دار و مدار علم پر ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے جب کسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام کرو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے جو ضروری تدابیر ہیں وہ بھی اختیار کرو چونکہ غور و فکر علم اور معلومات کے بغیر ممکن نہیں اس لیے تفکر و تدبر کے حکم میں مخلوقات کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کا حکم بھی شامل ہے کیونکہ غور و فکر ان ہی معلومات کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے لوگوں کو غور و فکر کی ہی ترغیب نہیں دی ہے، بلکہ اس آیت میں اور دوسری بہت سی آیتوں میں غور و فکر کے موضوع بھی معین کر دیے ہیں۔

مسلمانوں کا اسلامی غور و فکر کے راستے سے انحراف

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمان اس راستے کو چھوڑ کر جس پر ان کی مقدس آسمانی کتاب نے ان کو چلایا تھا بالکل مخالف سمت میں چل پڑے۔ صرف کچھ تھوڑے سے لوگ جو قرآنی تعلیمات کی روح سے آشنا تھے وہی یہ سمجھ سکے کہ وہ کونسے موضوعات ہیں جن پر غور و فکر مناسب ہے۔ پس انہی لوگوں نے ان موضوعات پر غور و فکر کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر آج نہ صرف عالم اسلام فخر کرتا ہے بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ مگر اکثریت قرآن کے بتلائے ہوئے طریقے سے منحرف ہو گئی اور ان موضوعات پر مباحثہ و مجادلہ شروع کر دیا جن کی قرآن نے نہ صرف ترغیب نہیں دی تھی بلکہ ان میں دلچسپی لینے سے منع بھی کیا تھا۔ جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کو بیکار اور لغو باتوں میں نہیں پڑنا

چاہیے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. خواہ یہ بیکار باتیں علمی یا دینی بحث کا پیرایہ ہی کیوں نہ اختیار کریں۔

علمِ کلام کی بحثیں

اگر کوئی شخص متکلمین کی کتابوں کا مطالعہ کرے اور ان مباحث کو دیکھے جن پر متکلمین نے صدیوں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں اور ان مباحث کا ان موضوعات سے مقابلہ کرے جن کے مطالعہ کی قرآن نے ترغیب دی ہے، تو وہ دیکھے گا کہ دونوں میں قطعی کوئی مناسبت نہیں۔ بیکار اور لغو مباحث پر تو لوگ برسوں جھگڑتے رہے اور جن موضوعات کے مطالعہ کی قرآن مجید نے ترغیب دی تھی ان کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ یہاں تک کہ کچھ غیر لوگوں کو شوق پیدا ہوا اور یہ کام انھوں نے اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ وہ دنیا میں سربلند ہو گئے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ سبق جن کے سیکھنے کی ہماری آسمانی کتاب نے ترغیب دی تھی اب ہمیں غیروں سے سیکھنے پڑتے ہیں۔

میں نے پہلے کہا تھا کہ آدمی جتنا موجوداتِ عالم کی بناوٹ میں غور کرتا اور گہرائی میں جاتا ہے وہ اس دنیا کے مختلف اجزا میں ایک خاص طرح کا ربط، باہمی تعلق اور ہم آہنگی پاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو اس دنیا میں موجود ہر چیز اور ہر ذرے میں ایک مستقل طاقت اور حرکت ہے لیکن وہ اپنی جگہ پر بالکل آزاد اور بے تعلق نہیں، دوسرے اجزا کے ساتھ بھی اس کا ربط اور تعلق قائم ہے۔ اس عالم کا ہر جزو مجموعۂ عالم کے ڈھانچے ہی میں اپنا فرض انجام دے رہا اور اپنا مقصد بروئے کار لا رہا ہے اس لحاظ سے تمام عالم ایک وحدت ہے۔

قرآن میں خالقِ کائنات

کا وجود اور وحدانیت

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید میں خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کی ایک ہی دلیل دی گئی ہے جو دلیل خدا کے وجود کو ثابت کرتی ہے، ٹھیک وہی اس کی وحدانیت کی دلیل بھی ہے۔ فلسفی عموماً واجب الوجود کے وجود اور اس کی وحدانیت کے ثبوت سے الگ الگ بحث کرتے ہیں۔ مسلمان متکلمین نے بھی فلاسفہ کی پیروی کی ہے لیکن قرآن میں یہ بات نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک جگہ تو اس کی دلیل دی جائے کہ وہ واجب الوجود قائم بذاتہ ہے، قائم بغیرہ نہیں اور دوسری جگہ اس کی دلیل دی جائے کہ وہ یکتا ہے۔ قرآن کا طرزِ استدلال ایسا حیرت انگیز ہے کہ اس کی موجودگی میں ذاتِ باری کے تعدّد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مضمون آیاتِ قرآنی میں تو بطور اشارہ آیا ہے۔ مگر امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اس کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کو قرآنی معارف میں شمار کرنا چاہیے جو درحقیقت قرآن کا اعجاز ہے اور اس کا جو تذکرہ حضرت علیؑ نے کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر ایک خاص اعجاز ہے۔

حدیث میں ہے کہ کسی نے امیرالمومنینؑ سے پوچھا کیا آپ کے پاس بھی کوئی وحی آتی ہے؟ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ مِنَ الْوَحْيِ.

لا ، وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَءَ النَّسَمَةَ إِلَّا أَنْ يُعْطِيَ اللهُ عَبْدًا فَهْمًا فِي كِتَابِهِ.

قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو چیرا اور جانداروں کو

پیدا کیا صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے کسی بندے کو اپنی کتاب کی سمجھ عطا کر دے۔

امام علیؑ اس جملے میں یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو حیرت انگیز معارف آپ کے وجودِ مقدس سے ظاہر ہوتے ہیں وہ نتیجہ ہیں قرآن کے معانی و مقاصد کو سمجھنے اور ان کا ادراک کرنے کا۔

میں نے کہا ہے کہ تخلیق کا جو نظام ہے وہ خود موجودات میں ربطِ باہمی اور ہم آہنگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اجزائے عالم ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں۔ کسی مجموعہ کے اجزاء میں باہمی ربط و وحدت اور ہم آہنگی کا ہونا بھی ممکن ہے اور نہ ہونا بھی۔ میں ایک مثال سے اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔

بھیڑوں کا گلہ بھی ایک مجموعہ ہے لیکن اس کے اجزاء میں باہمی اتصال اور ہم آہنگی مفقود ہے۔ ہر بھیڑ خود چلتی ہے، گھاس چرتی ہے، خود سوتی ہے۔ بھیڑوں کے مجموعہ کی بناوٹ ایسی نہیں کہ اس سے خود بخود کوئی وحدت تشکیل پا سکے۔ بھیڑوں میں ہم آہنگی صرف اسی قدر ہے کہ ان کو ایک گڈریا ہانکتا ہے۔

لیکن ہر بھیڑ کے جسم میں لاکھوں کروڑوں زندہ خلیے موجود ہیں جن میں سے کچھ جلد کی بافتوں کی تشکیل کرتے ہیں اور باقی تمام اجزا کے لیے غلاف کا کام دیتے ہیں۔ کچھ پٹھوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دل کی بناوٹ میں کام آتے ہیں اور کچھ آنکھ کی۔ غرض یہ سب متفرق اور الگ الگ کام کرتے ہیں۔ سب کا اپنا اپنا کام اور الگ الگ مقصد ہے۔ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی کچھ خبر نہیں۔ خون کے خلیوں کو معلوم نہیں کہ گوشت کے خلیے بھی موجود ہیں۔ گوشت کے خلیوں کو اعصاب کے خلیوں کا علم نہیں۔ اعصاب کے خلیے جلد کے خلیوں کے وجود سے بے خبر ہیں۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ وہ سب مل کر ایک مجموعے

اور ایک وحدت کے لیے کام کر رہے ہیں جس کا نام ہیرٹیج ہے اور اس کی اپنی زندگی اور اپنا مقصد ہے جو ان سب خلیوں کے الگ الگ مقاصد سے بلند تر ہے۔ یہ سب خلیے اجزاء ہیں' ایک کل کے' یہ سب وسائل ہیں ایک زیادہ بڑے مقصد کے۔

چونکہ آج کی رات ماہِ رمضان المبارک کی انیسویں شب اور مولائے متقیان حضرت علیؑ کے زخمی ہونے کی رات ہے، میں اس مناسبت سے اپنی گفتگو کا اختتام آپ کے کچھ حالات بیان کر کے کرتا ہوں۔

رسولِ اکرمؐ نے امیرالمومنین علیؑ کے قاتل کو اشقی الآخرین کا لقب دیا تھا۔ رسولِ خدا کوئی بات ایسے ہی نہیں کہہ دیتے تھے۔ آپ نے اس کو یہ لقب اس لیے دیا تھا کہ اس نے حضرت علیؑ کی شہادت سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ عظیم ہستیوں کا وجود تو ہمیشہ ہی غنیمت اور مفید ہوتا ہے مگر کبھی اجتماعی نقطۂ نظر سے ان کی پوزیشن ایسی ہو جاتی ہے کہ کسی خاص موقع پر ان کی اہمیت بے حد بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی کسی اجتماعی شخصیت کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ پوری قوم کی قسمت کا فیصلہ اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ ایسے نازک مرحلے میں اس شخصیت کا چلے جانا حق کا خاتمہ اور ایک مسلک اور ایک دور کا خاتمہ بن جاتا ہے۔

حضرت علیؑ نے اپنے دورِ حیات میں فرمایا تھا کہ جب تک میں موجود ہوں لوگ دو جماعتوں میں بٹ کر رہے ہیں۔ آپ کا مقصد یہ کہنا نہیں تھا کہ دو میر الحجاج ہیں بلکہ یہ جتلانا تھا کہ اس وقت لوگوں کے دو مسلک ہیں' زندگی کے دو طریقے ہیں۔ ان دونوں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی معاویہؓ نے بنائی تھی جس میں اہلِ دنیا کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ دوسری پارٹی علیؑ کی تھی جو واقعی اسلام' قرآن'

اسلامی احکام اور سماجی انصاف کے حامیوں کی جماعت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد سب ایک ہی جماعت ہو کر حج کیا کریں گے۔ یحجون صفا واحداً۔ بات ایک طرف ہو جائے گی اور واقعی ہوا بھی یہی۔ حضرت علیؓ کے بعد اس معاملے کا فیصلہ ہو گیا۔

یہ ہے شہادتِ علیؓ کا سانحہ۔ علیؓ کو بارگاہِ خداوندی میں جو تقدس اور قرب حاصل تھا اس سے قطع نظر آپ ملتِ اسلامیہ کی زبان تھے جس کا اثر تاریخ میں قائم و دائم رہے گا۔

عبدالرحمٰن بن ملجم بذات خود ایک خارجی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو علیؓ کی تکفیر کرتے تھے۔ یہ لوگ معاویہ کو بھی کافر کہتے تھے۔ خوارج چاہتے تھے کہ ان دونوں کا اور عمرو بن عاص کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔ تین آدمیوں نے مل کر باہم طے کیا کہ ان تینوں کو ایک ہی رات حملہ کر کے قتل کر دیا جائے۔ انہی میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی تھا۔ جو شخص عمرو بن عاص کے قتل کے لیے مقرر ہوا تھا وہ مسجد میں گیا لیکن اس رات عمرو بن عاص کی نیابت کوئی اور شخص کر رہا تھا جو بظاہر مصر کا قاضی تھا۔ وہ نماز پڑھا رہا تھا۔ قاتل اس کو پہچان نہ سکا اور وہ ناواقفیت میں مارا گیا۔ جو شخص معاویہ کے قتل پر مامور تھا اس نے اپنا وار کیا لیکن ضرب اتنی کاری نہیں پڑی کہ وہ قتل ہو جاتا۔ فقط عبدالرحمٰن بن ملجم اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

حضرت علیؓ کے اس طرح دنیا سے اٹھ جانے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ اسلام کی خطرناک ترین پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ حضرت علیؓ کی شہادت محض ایک شخص کی موت نہیں تھی‘ ان کی اپنے مخالفین سے جنگ بھی شخصی نوعیت کی نہیں تھی جس میں ایک فریق کی فتح کے بعد ایک شخص دوسرے

شخص کی جگہ سے لیتا ہے۔ یہ عقیدہ اور مقصد کی جنگ تھی، مسلک کی جنگ تھی، طرز حکومت کی جنگ تھی۔ ایک فریق کا طرز حکومت انبیاءؑ اور اولیاءؒ کا سا تھا، دوسرے فریق کا فراعنہ اور جبابرہ کا سا، یہ توحید و شرک اور عدل و ظلم کا مقابلہ تھا لہٰذا حضرت علیؓ کے ساتھ ہی اور بھی بہت سی چیزیں دفن ہو گئیں۔

قرآن نے حیات کو دلیل توحید قرار دیا ہے

بہار اور انقلاب

زندہ کرنے اور مارنے کی سنتِ جاریہ ایک عجیب موضوع ہے جس کے بارے میں سوچنے اور تحقیق کرنے پر انسان ہمیشہ مجبور رہا ہے۔ قرآن کریم میں اس کا تذکرہ ایک عظیم نشانی کے طور پر کیا گیا ہے۔ بعض آیات میں اس سنتِ جاریہ کو ذاتِ احدیت کی نشانی کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی ۱۵۹ ویں آیت میں جس پر ہم نے کسی جلسہ میں گفتگو کی تھی۔ بعض دوسری آیات میں اسی کو حیاتِ نو اور قیامتِ کبریٰ کے ایک چھوٹے نمونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً

سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۔

"اور اللہ ایسا ہے کہ بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں' پھر ہم بادل کو کسی خشک اور مردہ زمین کی طرف بھیج دیتے ہیں اور اس بادل کے ذریعہ مردہ زمین میں جان ڈالتے ہیں۔ اسی طرح قیامت میں آدمیوں کا جی اٹھنا ہے۔"

اسی طرح سورۂ قٓ میں ارشاد ہے:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ

"اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا، پھر اس سے بہت سے باغ اگائے اور کھیتی کا غلہ اور کھجوروں کے تناور درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہیں' بندوں کو رزق دینے کے لیے پیدا کیے اور ہم نے بارش کے ذریعے سے مردہ زمین میں جان ڈالی اور اسی طرح قبر سے نکلنا ہوگا۔"

بعض آیات میں نشانِ خداوندی اور حیاتِ نو دونوں باتوں کا تذکرہ ہے۔ سورۂ حج کی پانچویں آیت میں ہے:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

"تم دیکھتے ہو کہ زمین بالکل بے جان ہے مگر جب ہم اس پر

پانی برسا دیتے ہیں تو پھر اس میں جنبش پیدا ہوتی ہے، اس پر بہار آجاتی ہے اور وہ ہر طرح کے شگفتہ و شاداب پھول بوٹے اگاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہی سچا ہے۔ وہی مُردوں میں جان ڈالتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔"

اس طرح کی اور بھی آیتیں ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے محیی و مُمیت ہونے پر خاص زور دیتا ہے اور زندگی بخشنے کو اس کی خاص صفت قرار دیتا ہے۔ اس ضمن میں بکثرت آیات آئی ہیں۔ اس وقت ان سب کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اس بارے میں قرآن کے طرزِ استدلال سے آگاہی حاصل کریں۔

جس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو توحید کی نشانی اور قدرتِ الٰہی کی علامت کہا گیا ہے وہ یہی مارنے اور جلانے کا فعل ہے جو ہم عام طور پر دیکھتے ہیں یعنی وہی چیز جو سب کی نظروں کے سامنے ہے اور جس کو دیکھنے کے ہم عادی ہیں۔ یہی قدرتِ الٰہی کا ایک جلوہ ہے کہ زندگی سے متعلق بہت سے مسائل ابھی تک انسان کی دسترس سے باہر اور اس کے لیے معمّا بنے ہوئے ہیں، یہی انسان جو ایک طرف تو ایٹم کو پھاڑ کر اس کی اصلیت تک پہنچ گیا ہے اور دوسری طرف جس نے خلائی سفر کی طاقت حاصل کر لی ہے اور ممکن ہے کہ کسی دن چاند، سورج اور ستاروں کو مسخر بھی کرے (مسخر تو اب بھی ہیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی دن ایسا آجائے کہ زمین کی طرح ان سے بھی قریب سے فائدہ اٹھانے لگے) وہی انسان زندگی کے مخفی اسرار معلوم کرنے میں عاجز و درماندہ ہے۔

دورِ جدید کا ایک دانشور کہتا ہے: جانتے ہو وہ کیا چیز ہے جو زمین اور سیاروں کی تخلیق بلکہ ساری کائنات سے اہم تر اور بالاتر ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا ذرہ ہے جو مادہ حیات کو تشکیل دیتا ہے۔ اس کا نام پروتو پلازما یا جرثومۂ زندگی ہے۔ اس کے بعد یہ دانشور اس ذرہ کی حیرت انگیز وضع اور اس کی اور بھی حیرت افزا کارکردگی کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

اگرچہ زندگی سے مربوط بیشتر مسائل لاینحل ہیں لیکن ایک سبق نہایت آسان اور مفید ہے جو ہمیں ضرور لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ زندگی یا جان مادے سے بالاتر ہے۔ گویا کہ زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جو مادہ سے بالاتر ہے۔

ہم یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی یا حیات یا جان ایک نور ہے جو ایک بلند تر افق سے تاریک مادے پر چمکتا ہے ورنہ مادہ خود بے جان اور مردہ ہے۔ صرف خاص حالات میں اس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک بالاتر افق سے اس میں ایسی روشنی پیدا ہو جو مخصوص قوانین کے تحت اسے اپنے زیرِ تصرف لے آئے اور اس کو اپنا محکوم بنا لے۔ جن لوگوں کی سوچ مادے اور جسم تک محدود ہے زندگی کا عمل ان کے لیے بھی ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ ایک بالاتر افق بھی موجود ہے جس کی تجلی بے جان مادے پر پڑتی ہے۔ یہ افق ایسا ہے کہ اپنی تجلی واپس بھی لے سکتا ہے۔ بسط اور قبض اور احیاء و اماتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

البتہ توحید اور خداشناسی کے نقطۂ نظر سے مادے اور زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور دونوں کا وجود اسی کے سہارے سے قائم ہے۔ البتہ جن لوگوں کی سوچ محدود ہے اور جن کی نظر جسم اور اس کے خواص سے اوپر نہیں جاتی ان کے لیے یہ محسوس کرنا ضروری ہے کہ اس

دنیا میں وجودیت جسم اور اسکے خواص تک محدود نہیں ہے۔ ایک اور افق اجسام سے بالاتر بھی ہے جس کا اثر اجسام پر پڑتا ہے۔ وجود کی دنیا جسم تک محدود نہیں جس کی حیثیت محض چھلکے کی سی ہے۔ اجسام کی دنیا کے باطن میں اور بھی دنیائیں ہیں جو اس جہان کا احاطہ کیے ہوتے ہیں۔ زندگی در اصل ایک روشنی ہے جو ایک دوسرے جہان سے آ رہی ہے۔ جب خاص حالات میں مادہ صیقل پا جاتا ہے یعنی اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں جان پڑ جائے تو اس میں یہ نور چمکنے لگتا ہے اور اس وقت تم اس مردہ مادے کے پیکر میں زندگی کی روشنی دیکھنے لگتے ہو اور مادے کے اس سیال اور متحرک جوہر میں جو مرتا اور زندہ ہوتا ہے زندگی کا واضح تعلق نظر آنے لگتا ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز ہے جو اپنی ذات سے مردہ اور بیجان ہے تو ایسی چیز بھی ہے جو اپنی ذات سے زندہ ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز ہے جو اپنی ذات سے متغیر اور ناپائدار ہے تو ایسی چیز بھی ہے جو اپنی ذات سے غیر متغیر اور پائدار ہے۔ اگر کوئی چیز اپنی ذات سے بے نقش اور بے صورت ہے تو ایسی چیز بھی ہے جو خود ہی نقش و صورت ہے۔ بقول شخصے مخلوق کی مثال صاف پانی کی ہے جس کے اندر خدائے ذوالجلال کی صفات کا جلوہ نظر آتا ہے۔

آیا زندگی مادہ کی بالذات خاصیت ہے؟

یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ خیال کرے کہ زندگی مادے کے خواص میں شامل ہے اور کوئی اضافی کمال نہیں۔

اس سوال کے جواب کے لیے عمیق علمی بحث کی ضرورت ہے۔ سر دست اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ مادے کا کوئی عنصر خود زندگی کا حامل نہیں۔ اس کے کسی جزو میں زندگی نہیں پائی جاتی۔ جب دو یا دو سے زیادہ عناصر باہم ترکیب پاتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سب عناصر میں ایک ایسی مشترک خصوصیت پائی جانے لگے جو ہر عنصر کی خصوصیات سے مختلف نہ ہو۔ اصطلاحاً اس کو متوسط کیفیت کہتے ہیں۔ جیسا کہ دانشوروں نے خصوصاً زمانۂ حال کے سائنسدانوں نے تحقیق کی ہے کہ زندگی اور اس کی خصوصیات کی مادے کے خواص سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔

ایک سائنسدان کہتا ہے: مادہ صرف اپنے قوانین اور نظام کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس میں ایجاد کی طاقت نہیں۔ اس کے برخلاف زندگی میں ایجاد کی طاقت ہے۔ وہ ہر لمحہ نئی نئی ایجادات کرتی رہتی ہے۔

زندگی مادے کے خواص کی تابع اور محکوم نہیں بلکہ وہ مادے کی حاکم اور اس پر غالب ہے۔

یہی سائنسدان یہ بھی کہتا ہے کہ زندگی کی خواہ کوئی بھی شکل ہو چاہے اس کی شکل ایک خلیے والے جاندار کی ہو یا مچھلیوں کی یا کیڑے مکوڑوں کی یا دودھ پلانے والے جانوروں کی یا پرندوں کی یا انسان کی، خواہ کوئی بھی شکل ہو، زندگی قدرتی عناصر پر غالب رہتی ہے اور ان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی قدرتی وضع بدل کر ایک نئی ترکیب اختیار کر لیں۔

آج سائنسدان عموماً اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جوہر حیات اگر اپنے سائز اور قالب کے لحاظ سے اس مادے کے تابع ہے جس میں وہ موجود ہوتا ہے، پھر بھی کسی لحاظ سے وہ مادے پر غالب اور حاکم ہوتا ہے۔ یہ نہیں

کہ سو فیصد مادّے کے تابع ہو اور مادّے ہی کی ایک خاصیت سمجھا جائے۔ زندگی میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو مادّے میں قطعاً موجود نہیں، جیسے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے طرح طرح کی حرکات جن کا پہلے وجود نہیں تھا ظہور میں آنے لگتی ہیں۔ نئے نقشے اور نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، حسن وجود میں آتا ہے، شعور و ادراک پیدا ہوتا ہے، شوق و ذوق پیدا ہوتا ہے، منصوبے اور تدبیریں وجود میں آتی ہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جن کا بیجان مادّے میں بالکل نشان نہیں ہوتا۔ تمام عالم جمال و کمال باری تعالیٰ کا آئینہ ہے۔ خود بیجان مادہ بھی اپنی حیثیت کے مطابق قدرتِ حق کا ایک آئینہ ہی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ یہ تمام عالم شاہدِ ازلی کے حسن کا آئینہ ہے۔ اس کے ہر پہلو میں اس کا چہرۂ زیبا دیکھنے کی کوشش کرو۔

لیکن جس درجے میں زندگی مادّے سے برتر اور کامل تر ہے، اسی درجے میں صانعِ حقیقی کے وجود پر زندگی کی گواہی بھی زیادہ صاف اور واضح ہے۔

موجودہ نظام اور دستور

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں قرآنِ کریم میں زندگی اور موت کے اسی نظام سے جو عام ہے، استدلال کیا گیا ہے اور اسی کو بطورِ شہادت پیش کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس عام نظام کو چھوڑ کر شاذ اور نادر الوقوع حالات و واقعات سے استدلال کیا جاتا۔ یہی زمین کا ہر سال زندہ ہونا، نطفہ سے جنین کا پیدا ہونا اور پھر اس کا نشوونما یہی سب اللہ کی خلاقی کی مثالیں ہیں جو ہم ہر لمحہ دیکھتے ہیں اور یہی فیض ہے جو غیب سے پہنچتا رہتا ہے۔ کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ انہی

باتوں کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اللہ کی خلاقی اور اس کی مسلسل ایجاد کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ سورۂ مومنون میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا پھر اس کو نطفہ کی صورت میں ایک محفوظ جگہ رکھ دیا۔ پھر نطفہ کو خون کے لوتھڑے کی شکل دے دی۔ پھر اس میں ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر اسے ایک دوسری صورت دے دی۔ عظمت والا ہے وہ اللہ جو بہترین خالق ہے"

اسی طرح قرآن کریم میں موت وحیات کا یہی نظام دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہی جو تخلیق وتکوین اور ایجاد کا قدرتی نظام ہے۔ اس کو ہم اگر گہری نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مادے کے افق سے بالاتر ایک اور افق ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم انسانی معلومات کے مثبت پہلو سے خدا کے وجود کی دلیل دیتا ہے نہ کہ ان کے منفی پہلو سے۔ اس بات کی مزید وضاحت ضروری ہے تاکہ اس ضمن میں قرآنی تعلیمات کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جائے۔

خدا کی جستجو معلومات میں ہونی چاہیے، مجہولات میں نہیں:

کچھ لوگوں کی عادت ہے کہ خدا کو مجہولات میں تلاش کرتے ہیں، یعنی

جب کوئی بات ان کو معلوم نہیں ہوتی تو خدا کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ جب کوئی معمّہ حل نہیں ہوتا تو اس کو خدا سے منسوب کرتے ہیں۔

بعض لوگوں سے اگر یہ پوچھو کہ یہ روٹی جو تم کھا رہے ہو اس نے یہ شکل کیسے اختیار کی اور روٹی کیسے بنی تو وہ کہیں گے کہ:

پہلے آٹا تھا، نانبائی نے اسے گوندھ کر خمیر کیا، تنور میں پکا کر روٹی تیار ہو گئی۔

آٹا کہاں سے آیا؟

پہلے گیہوں تھا۔ چکی میں پیس کر آٹا بن گیا۔

گیہوں کہاں سے آیا؟

کسان نے کاشت کی، گیہوں اگا، پھر کسان نے اسے کاٹا، اس کا ڈھیر لگایا۔ اس کو گاہا، بھوسا الگ کیا۔

گیہوں کیسے اگا؟

بارش ہوئی۔ دھوپ چمکی، گیہوں اگ آیا۔

بارش کیسے ہوئی؟

اللہ نے مینہ برسایا۔

گویا اب تک تو کہیں خدا کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس مرحلہ پر خدا بھی اس قصہ میں شریک ہو گیا۔

خدا کے بارے میں اس طرح کا تصور نہ صرف غلط اور گمراہ کن ہے بلکہ کفر و الحاد ہے۔ ایسے تصور میں خدا کو اس کی کسی مخلوق کے برابر اور اس کے مشابہ فرض کر لیا گیا ہے۔ اس دنیا کے دوسرے اسباب کی طرح اس کو بھی ایک سبب سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام علل اور اسباب سے بالاتر

اور تمام علل اور اسباب کا سرچشمہ ہے۔

اس طرح کے طرز فکر کا مطلب یہ ہے کہ گویا خدا اور مادی اسباب کے درمیان ایک طرح سے تقسیم کار ہے۔ کچھ کام خدا کرتا ہے اور کچھ دوسرے عوامل۔ کچھ کام مادی اسباب کے نتیجے میں ہوتے ہیں اور کچھ خدا انجام دیتا ہے۔ گویا سب کاموں میں خدا کا دخل نہیں۔ بارش ہونا اور کھٹا چھانا خدا کے کام ہیں ان میں کسی اور سبب کا دخل نہیں۔ اگر یہ کہو کہ ابر و باراں کے بھی اور کاموں کی طرح ظاہری اسباب ہیں تو پھر خدا کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

جہاں تک قدرتی اور ظاہری اسباب نظر آتے ہیں۔ جیسے روئی کا پکنا، غلے کا پسنا، زمین میں ہل چلانا، تخم پاشی کرنا، بارش کا ہونا۔ یہاں تک تو خدا کا ذکر نہیں آتا، اس کے بعد چونکہ ظاہری اسباب دکھائی نہیں دیتے اس لیے خدا بیچ میں آجاتا ہے۔ یعنی آدمی خدا کی جستجو ان باتوں میں کرتا ہے جن کا اسے علم نہ ہو۔ گویا خارق العادۃ قوتوں کا اس کے پاس ایک اسٹور ہے۔ جو چیز نہ ملے وہاں تلاش کری جائے۔

جس خدا کی حیثیت قدرتی اور مادی اسباب کے مساوی ہو وہ ہرگز وہ خدا نہیں ہو سکتا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ قرآن کا خدا اس سے مختلف ہے۔ بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق تو اس طرح کی سوچ بھی توحید کے منافی اور کفر و الحاد ہے۔ جس خدا کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے وہ تو ہر چیز کے ساتھ اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں۔ اس کا تعلق سب موجودات اور تمام علل و اسباب کے ساتھ مساوی ہے اور علل و اسباب کا یہ منظم اور باقاعدہ سلسلہ اسی کی ذات سے قائم ہے۔

سطحی ذہن کے لوگوں کا یہ عام طریقہ ہے کہ وہ خدا کی تلاش ان چیزوں میں کرتے ہیں جن کا ان کو علم نہیں ہوتا اور خدا کا نام وہاں لیتے ہیں جہاں کسی واقعہ کا ظاہری سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا لیکن قرآن موت اور زندگی کے باقاعدہ نظام سے استدلال کرتا ہے اور اس حقیقت کو جتلا کر زندگی کا افق مادے کے افق سے بلند و بالاتر ہے۔ زندگی ایک روشنی ہے جو مادے کے بیجان پیکر پر چمکتی ہے۔ ایک کمال جو مادے کو عطا ہوتا ہے۔ ایک حقیقت ہے جس کو قبول کرنے کی تو مادے میں صلاحیت ہے، مگر کوئی مادی چیز کسی دوسری مادی چیز میں نہ زندگی کی صلاحیت پیدا کر سکتی ہے نہ کسی دوسری چیز کو زندگی کی حقیقت دے سکتی ہے۔ یہ جتلا کر قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں عالم ملکوت اور کائنات کے باطن سے نزدیک تر کر دیتا ہے۔

اس بیان اور طرز فکر کے مطابق زندگی اور جان جہاں بھی پیدا ہوتی ہے جس مادے میں بھی پیدا ہوتی ہے اور جن حالات میں اور جن شرائط کے تحت بھی پیدا ہوتی ہے خواہ اس کا ظہور تخلیق کے آغاز میں ایک دم ہو یا تدریجی ارتقاء کے اصول کے مطابق۔ خواہ کوئی زندہ چیز کسی دوسری زندہ چیز سے پیدا ہو یا کسی اور طرح زندگی کے لیے سازگار حالات پیدا ہوں۔ خواہ ان حالات کو پیدا کرنے میں انسان ہی کا دخل کیوں نہ ہو بشرطیکہ انسان کسی وقت اس پر قادر ہو جائے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، ہر صورت میں زندگی اور جان خدا کا نور اور فیضان الٰہی ہے۔ یہ ایسی روشنی ہے جس کا مادے پر نزول خاص حالات میں مادے میں صلاحیت اور استعداد پیدا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

زندگی کی ابتدا کا معاملہ

بعض لوگ ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ان باتوں کو چھوڑ کر جو ان کو معلوم ہیں خدا کی جستجو ان باتوں میں کریں جو ان کو معلوم نہیں۔ یہ رویہ عقیدۂ توحید کے لیے بہت ہی خطرناک ہے۔ اس رویہ کے نتیجہ میں کچھ بے خبر اور بات کی تہ سے ناواقف زندگی اور خدا شناسی کے تعلق کے ضمن میں یہ سوال چھیڑ دیتے ہیں کہ زندگی کا آغاز روئے زمین پر کیسے ہوا۔ ایک طرف تو سائنس یہ کہتی ہے کہ ایک جاندار سے ہی دوسرا جاندار پیدا ہوتا ہے۔ آج تک یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی جاندار، خواہ وہ صرف ایک ہی خلیے کا ہو، کبھی بیجان مادے سے پیدا ہوا ہو۔ دوسری طرف سائنس کے پاس اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ قرن ہا قرن ایسے گزرے ہیں جب ہماری زمین پر کسی جاندار کا وجود نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس علم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اربوں سال قبل زمین اس قدر گرم تھی کہ اس پر کسی ذی حیات کا وجود ممکن ہی نہیں تھا۔ اوپر سے ٹھنڈی ہو جانے کے بعد بھی کروڑوں برس تک زمین پر صرف غیر نامیاتی مادے ہی پائے جاتے تھے۔ ایسے میں زندگی اور جان کا کیا سوال تھا۔ جو لوگ خدا کی جستجو مجہولات یعنی ان باتوں میں کرتے ہیں جو ان کو معلوم نہیں، وہ کہتے ہیں کہ چونکہ عام طریقے سے زندگی کی توجیہ نہیں کی جا سکتی اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ کہا جائے کہ پہلی بار زندگی کی صورت یہی ہوئی کہ قدرتِ الٰہی نے غیب سے ظاہر ہو کر مادے میں زندگی کی روح پھونک دی۔

ڈارون اور نفخۂ الٰہی

حیاتیات کا مشہور عالم اور فلسفۂ ارتقاء کا بانی ڈارون ذاتی طور پر ایک مذہبی آدمی اور عیسائی مذہب کا پیرو تھا۔ اگرچہ دوسرے لوگوں نے اس کے نظریہ کی غلط تعبیر کی اور اس کو خالق کے انکار کا ذریعہ بنالیا لیکن جب ڈارون نے جانداروں کے تسلسل اور ایک نوع کے جانوروں کا دوسری نوع کے جانوروں کی ترقی یافتہ شکل ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ابتدا میں چند جاندار یا کم از کم جانداروں کی کوئی ایک قسم روئے زمین پر موجود تھی جو کسی دوسری قسم کی ترقی یافتہ شکل نہیں تھی۔ اس موقع پر وہ کہتا ہے کہ یہ ابتدائی قسم نفخۂ الٰہی سے وجود میں آئی تھی یعنی خدا نے اپنی طرف سے روح پھونک کر اس میں جان ڈالی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ پہلا جاندار نفخۂ الٰہی ہی سے وجود میں آیا تھا لیکن اور سب جاندار بھی اسی طرح نفخۂ الٰہی ہی سے وجود میں آتے ہیں بظاہر اس شخص کا خیال یہ تھا کہ صرف پہلا جاندار نفخۂ الٰہی سے پیدا ہوا۔ گویا اس کام کی ابتدا خدا نے کی۔ خدا کا کام صرف ایک سلسلہ شروع کرنا تھا۔ بعد میں خود مادہ زندگی کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرسکتا تھا حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اول، آخر اور درمیان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زندگی ہمیشہ اور ہر حال میں نفخۂ الٰہی ہی ہے۔ ابتدا میں ہو یا ارتقاء کے کسی مرحلے میں۔

سورۂ سجدہ میں ایک آیت ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح ابوالبشر آدمؑ نفخۂ الٰہی سے وجود میں آئے تھے، اسی طرح نوع انسانی کے دوسرے افراد کا وجود بھی فیضانِ الٰہی ہے جس کو قرآن میں نفخہ کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

"وہی خدا ہے جس نے جو چیز بنائی خوب ہی بنائی اور انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی۔ پھر چلائی اس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی اور تم کو کان، آنکھ اور دل دیے۔ مگر تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔" (سورۃ سجدہ۔ آیت ۷۔۹)

سورۃ اعراف کی گیارھویں آیت میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ

"اور ہم ہی نے تم کو پیدا کیا اور پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی۔ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے روبرو جھکو، سو سب جھکے بجز ابلیس کے۔"

یہاں جھکنے سے مراد نفخِ روح ہی ہے۔ ان آیات کے علاوہ قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے کہ صرف آدمِ اول ہی تنہا نفخۂ الٰہی سے پیدا نہیں ہوئے تھے۔

قرآن میں آدم کا قصہ

یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن میں ابو البشر آدمؑ کا قصہ آیا ہے لیکن اس میں کچھ اور تعلیم دی گئی ہے اور اس سے مقصد توحید الٰہی پر گواہی نہیں ہے اور نہ یہ مطلب ہے کہ چونکہ زندگی کی ابتدا اس صورت میں ہوئی ہے اس لیے تم خدا کی خدائی کا اعتراف کرو۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے تخلیق آدم کی ایک خاص صورت بیان کی ہے جو کم و بیش ہم سب کو معلوم ہے اور بالفرض حیاتیات کے نظریہ کو ہی درست مان لیا جائے اور اشتقاق انواع کی بات تسلیم کر لی جائے۔ جب بھی کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں جس کے مطابق کسی اچانک تبدیلی کا پیش آنا ناممکن سمجھا جا سکے اور کہا جائے کہ ایک مٹی کا ڈھیر یک بیک ایک کامل الاعضاء انسان میں نہیں بدل سکتا اور اس کے لیے بہت سے ایسے مرحلوں سے گزرنا ضروری ہے جو قرنوں اور قسلوں ہی میں طے ہو سکتے ہیں۔ یہ مراحل خاص حالات میں تیزی سے بھی طے ہو سکتے ہیں اور ایسا ہونا کائنات میں جاری سنت الٰہی کے خلاف بھی نہیں۔ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ مختلف احوال میں حرکت کی رفتار تیز یا سست ہو جائے۔ حالات بدلنے سے حرکت کی رفتار بڑھ بھی سکتی ہے اور اسی طرح گھٹ بھی سکتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ خاص حالات میں بچپن، جوانی یا بڑھاپے کا دور طویل تر کیا جا سکتا ہے بلکہ بہت زیادہ طویل بھی کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن نے اپنی تعلیمات میں زندگی کے آغاز کو وحدانیت الٰہی کی دلیل قرار نہیں دیا اور یہ نہیں کہا کہ خدا کو اس لیے مانو کیونکہ زندگی ہمیشہ سے نہیں ہے۔ اس کا آغاز ہوا ہے خواہ یہ آغاز صرف ایک خلیے والے

جاندار کی شکل میں ہو یا لاکھوں خلیوں والے جاندار کی شکل میں۔ قرآن نے ابوالبشر آدم کا قصہ ایک دوسرے مقصد سے بیان کیا ہے۔ اس قصے سے کچھ اور ہی نا مقصود ہے۔ قرآن میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں ان میں شاید ہی کسی قصے میں اس قدر نکات مضمر ہوں۔ اس قصے سے مقصد انسان کا درجہ بلند کرنا اور یہ جتلانا ہے کہ اگر انسان اسمائے الٰہی کی تعلیم کے مرتبہ تک پہنچ جائے تو اس کا درجہ فرشتوں سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے سامنے فرشتے بھی جھکتے ہیں اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اس قصے میں تنبیہ کی گئی ہے کہ شیطان انسان کا دشمن ہے۔ آدمی کو اپنے اندرونی وسوسوں سے خبردار رہنا چاہیے تاکہ وہ اسے راہِ راست سے دور نہ ہٹا دیں۔ تکبر سے بھی خبردار کیا گیا ہے۔ شیطان کو ایک لمحہ کے تکبر نے قربِ الٰہی سے محروم کر دیا تھا۔ یہ قصہ لالچ اور احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کے نتیجے میں سقوط کے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے بھی آیا ہے اور انسان کو اس کے بلند مرتبہ اور اس کی اعلیٰ صلاحیت کی خبر دینے کے لیے بھی جس کو خلافتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ اس قصے میں اور بھی متعدد اخلاقی اور روحانی تعلیمات کی طرف اشارہ ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً
قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَ
نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ
فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ قَالُوا
سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ
قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ.

"جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تو زمین پر ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو اس پر فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی۔ دراں حالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکیزگی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ نے کہا: یقیناً میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اللہ نے آدم کو سب نام سکھلا دیے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا ذرا مجھے بتلاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو۔ وہ بولے کہ تو پاک ذات ہے۔ ہمیں تو کچھ علم نہیں۔ مگر وہی جو تو نے سکھلا دیا ہے۔ بے شک تو ہی ہے بڑا علم والا، حکمت والا۔ اللہ نے کہا کہ اے آدم! بتلا دو انھیں ان کے نام۔ جب آدم نے نام بتلا دیے تو اللہ نے کہا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور وہ سب جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۰۔۳۳)

ان آیات کے مضمون میں بہت سے نکتے ہیں جن کی تشریح کا بالتفصیل موقع نہیں ہے، مگر ایک چیز جس کا تذکرہ نہ ان آیات میں ہے نہ آدمؑ کے قصے والی دوسری آیات میں، وہ ہے آدمؑ کی غیر معمولی تخلیق سے اللہ کی وحدانیت پر استدلال۔

دعا و مناجات

آج مولائے متقیان اور پیشوائے خدا پرستان حضرت علی مرتضیٰؑ کی شہادت کی رات ہے۔ ۲۱ رمضان کی شب مولا کی شب شہادت ہونے کے علاوہ شب ہائے قدر میں سے ایک شب بھی ہے۔ یہ وہ رات ہے جس میں زندہ دل، شب بیداری کرتے ہیں اور صبح تک نماز دعا اور توبہ و استغفار میں مشغول رہتے ہیں اور اس پاک رات میں اپنے دل کو گناہوں کی کدورت سے پاک صاف کرکے جلا دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے چند کلمات دعا کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔

دعا کا روحانی اثر

دعا کی قبولیت اور اس کے اجر و ثواب سے قطع نظر اگر دعا دل کی گہرائیوں سے نکلے اور روح کو وجد میں لے آئے تو اس کا روحانی اثر بھی

زبردست ہوتا ہے اور ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو گویا نور میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ ایسے میں جوہرِ انسانیت کی قدر و قیمت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور آدمی یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے باقی سب وقت جن کاموں میں گزارا اور جن باتوں کے لیے تکلیف اٹھائی وہ باتیں کس قدر معمولی اور فضول تھیں۔ جب آدمی اللہ کے سوا کسی اور سے کچھ مانگتا ہے تو وہ اس میں قدرے ذلت محسوس کرتا ہے لیکن جب اللہ سے مانگتا ہے تو اسے عزت کا احساس ہوتا ہے۔ دعا طلب بھی ہے اور مطلوب بھی، وسیلہ بھی ہے اور مقصد بھی۔ تمہید بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ اولیاء اللہ کو دعا سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں۔ وہ اپنے دل کی تمام آرزوؤں اور خواہشوں کو اپنے محبوبِ حقیقی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو چیز ان کو مطلوب ہوتی ہے اس سے زیادہ اہمیت وہ خدا سے مانگنے اور اس سے راز و نیاز کو دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کو کسی اکتاہٹ یا تھکن کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ کمیل نخعی سے امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا:

هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلٰى حَقِيْقَةِ الْبَصِيْرَةِ وَ بَاشَرُوْا رُوْحَ الْيَقِيْنِ اسْتَلَانُوْا مَا اسْتَوْعَرَهُ الْمُتْرَفُوْنَ وَ اَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُوْنَ وَ صَحِبُوا الدُّنْيَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰى۔

"دعا کرنے والوں کے علم و بصیرت میں اچانک اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کو یقین کی لذت کا احساس ہوتا ہے جس کو اہلِ دنیا مشکل سمجھتے ہیں وہ بات انہیں آسان معلوم ہونے لگتی ہے اور جس بات سے جاہل گھبرا کر بھاگتے ہیں اس میں ان کا دل لگتا ہے۔ ان کے جسم دنیا میں ہوتے ہیں مگر ان کی روح کا تعلق

ملاپ اعلیٰ سے ہوتا ہے۔"

دل کا خدا سے تعلق

ہر ایک کے دل کا خدا سے تعلق ہے۔ شقی ترین افراد بھی جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے اور ظاہری اسباب سے ان کو نا امیدی ہو جاتی ہے خدا ہی سے التجا کرتے ہیں۔ گویا یہ ایک فطری رجحان ہے۔ بعض اوقات سنگ دلی اور گناہ اس رجحان کو دبا دیتے ہیں لیکن جیسے ہی کوئی تکلیف آتی ہے 'یہ پردہ ہٹ جاتا ہے۔ اس رجحان کو تحریک ملتی ہے اور وہ قوی ہو جاتا ہے۔

ایک شخص نے صادقِ آلِ محمد علیہ السلام سے پوچھا کہ خدا کے وجود کی کیا دلیل ہے؟

آپ نے فرمایا: کبھی کشتی پر سوار ہوئے ہو؟

کہا' جی ہاں!

فرمایا: کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ کشتی طوفان میں گھر کر ڈوبنے لگی ہو اور کسی طرف سے کوئی امید باقی نہ رہی ہو؟

اس نے کہا: جی ہاں' ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا تھا۔

آپ نے فرمایا: کیا ایسا بھی ہوا کہ اس وقت تمہارا دل ایک خاص سمت میں اس لگائے ہوئے تھا، وہیں پناہ ڈھونڈ رہا تھا اور نجات کی التجا کر رہا تھا۔

کہنے لگا: بے شک۔

آپ نے کہا: وہی خدا ہے۔

امام صادقؑ نے خود اس کے دل کے راستے سے اس کو سمجھایا۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

کیا تم خود اپنے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے ؟ (ذاریات ۔ ۲۱)
یہ رجحان' یہ توجہ انسان کی فطرت میں ہے ۔ جب اسباب کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے' آدمی اس طاقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو تمام ظاہری اسباب پر غالب ہے ۔ یہی اس طاقت کے وجود کی دلیل ہے اگر یہ طاقت موجود نہ ہوتی تو یہ رجحان بھی نہ پایا جاتا ۔

البتہ اس رجحان کے وجود میں اور اس بات میں کہ آدمی اس رجحان سے باخبر اور اس کے مقصد کو بھی سمجھتا ہو بڑا فرق ہے ۔ بچے میں شروع ہی سے دودھ پینے کا رجحان ہوتا ہے ۔ جب اسے بھوک لگتی ہے اور اسے ضرورت کا احساس ہوتا ہے تو اس کے دودھ پینے کے رجحان کو تحریک ملتی ہے ۔ وہ رجحان بچے کی رہنمائی کرتا ہے اور بچہ اس پستان کو تلاش کرنے لگتا ہے جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا اور جس سے وہ بالکل مانوس نہیں ہوتا ۔ یہی رجحان اس کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ منہ کھول کر پستان کی تلاش کرے اور اگر نہ ملے تو رونا شروع کر دے ۔ یہ رونا ماں سے مدد مانگنے کے لیے ہے اس ماں سے جس کے وجود کی بھی ابھی اسے خبر نہیں ۔ بچے کو خود معلوم نہیں کہ اس رجحان اور خواہش کا مقصد کیا ہے ۔ وہ کیوں روتا ہے ۔ وہ نہیں جانتا کہ جسم کی پرورش کے لیے غذا درکار ہے' غذا کو ہضم کرنے کے لیے جس کی اسے ضرورت ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا اور کیوں چاہتا ہے ۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کے رونے کا راز یہ ہے کہ ماں کو خبر ہو جائے' وہی ماں جسے وہ ابھی پہچانتا بھی نہیں' آہستہ آہستہ ہی پہچانے گا ۔

جہاں تک بلند تر انسانی رجحانات کا تعلق ہے' جیسے خدا کی تلاش اور

خدا سے التجا اور دعا ان امور کے بارے میں ہماری حالت بھی اس نومولود بچے کی سی ہے جس نے ابھی نہ ماں کو دیکھا ہے نہ اس کے پستان کو، لیکن اس کا رجحان ان کی طرف ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر پستان اور وہ دودھ نہ ہوتا جو بچے کے معدے کی ضرورت کے عین مطابق ہے، تو فطرت ان کی طرف اس کی رہنمائی بھی نہ کرتی۔ اس غذا اور بچے کے رجحان میں ایک خاص تعلق ہے۔ یہی حال انسان کے دیگر تمام رجحانات کا ہے۔ انسان میں کوئی بھی رجحان بلاوجہ نہیں ہے۔ سب رجحانات ضروری ہیں اور کسی ضرورت ہی کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔

اسباب کا اضطراری انقطاع

اور اختیاری انقطاع

آدمی دو صورتوں میں خدا کو یاد کرتا ہے۔ ایک وہ وقت کہ جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو اور ظاہری اسباب سے ناامید ہو جائے یا وہ وقت کہ جب وہ اس روحانی بلندی پر پہنچ جائے کہ خود ہی اسباب سے لاتعلق اور بے پروا ہو جائے۔ پہلی صورت میں اسباب کا انقطاع اضطراری ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو خود ہی خدا یاد آتا ہے اور کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن یہ کوئی کمال نہیں۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ از خود اسباب کو چھوڑ دے اور روحانی ترقی کی منزلیں طے کرے۔

دعا کی شرائط

دعا کی کچھ شرطیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ انسان سراپا احتیاج اور مجسم طلب بن جائے۔ اس کے وجود کا ذرّہ ذرّہ یہ ظاہر کرتا ہو کہ وہ واقعی ضرورت مند اور محتاج ہے۔ وہ مانگ رہا ہے اور التجا کر رہا ہے۔ جیسے کہ انسان کے جسم کے کسی حصے کو کوئی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے تمام اعضا و جوارح اس تکلیف کا احساس کرنے لگتے ہیں بلکہ خود اپنے کام میں کمی کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کو سخت پیاس لگے تو اس کے چہرے پر پیاس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کا حلق، جگر، معدہ، ہونٹ، زبان، گلا سب پانی پانی پکارنے لگتے ہیں۔ اگر اسی حالت میں سو جائے تو خواب میں بھی پانی ہی کو دیکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے بدن کو واقعی پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان نظامِ قدرت کا ایک جزو اور عالمِ کبیر کا ایک حصہ ہے۔ اس کی روح عالمِ وجود کا ایک جزو ہے۔ اگر اس کے وجود کی واقعی کوئی خواہش اور ضرورت ہو تو نظامِ قدرت اسے بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

لیکن واقعی دعا مانگنے اور دعا پڑھنے میں فرق ہے۔ جب تک دل اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو تو حقیقی دعا نہیں ہوتی۔ آدمی کے دل میں واقعی طلب ہونی چاہیے اور اس کے وجود میں حاجتمندی کا احساس ہونا چاہیے۔

دعا کے قبول ہونے کا یقین اور بھروسہ

دعا کی ایک اور شرط ایمان اور یقین ہے۔ ذاتِ باری کی لامتناہی رحمت پر ایمان، اس بات پر ایمان کہ فیضانِ الٰہی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس پر ایمان

کہ خدا کی رحمت کا دروازہ بندے پر کبھی بند نہیں ہوتا۔ کمی اور قصور جو ہے وہ بندے کا ہے۔ حدیث میں ہے اِذَا دَعَوْتَ فَظُنَّ حَاجَتَکَ بِالْبَابِ۔ یعنی دعا کرو تو یہ سمجھو کہ تم جو چاہتے ہو وہ بس دروازے پر ہے۔

امام علی بن الحسین زین العابدینؑ اپنی مشہور دعا میں جو دعائے ابو حمزہ ثمالی کے نام سے مشہور ہے اور جس میں امید اور اطمینان کی واضح جھلک نظر آتی ہے اور جس کو آپ رمضان کے مبارک مہینے میں پڑھا کرتے تھے اپنے رب سے یوں عرض کرتے ہیں۔ ۱۶۱

"ایسی ہی طلب کے راستوں کو تیری طرف کھلا ہوا اور امید کے چشموں کو ابلتا ہوا دیکھتا ہوں۔ تو نے اپنے فضل سے اسی کی اجازت دی ہے کہ تجھ سے مدد طلب کی جائے جو تجھے پکارتے ہیں ان کے لیے دعا کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو تجھ سے آس لگاتے ہیں تو ان کی ضرورت ہے اور جو تجھ سے پناہ کے طالب ہیں ان کو پناہ دیتا ہے۔ تیری بخشش کی آرزو اور تیری قضا پر رضا سے بخیلوں کے بخل اور غاصبوں کے ظلم کی تلافی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے جو تیری طرف بڑھتا ہے' اس کو زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑتا۔ تو اپنی مخلوق سے پردہ نہیں کرتا' البتہ ان کی ہوس پردہ بن کر ان کے اور تیرے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔"

حافظ شیرازی کہتے ہیں:

جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ ولے
غبارِ رہ بنشاں تا نظر توانی کرد

دعا قانون فطرت یا قانون شریعت کے خلاف نہیں ہونی چاہیے

دعا کی ایک اور شرط یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کے لیے دعا نہ کی جائے جو قانونِ فطرت یا قانونِ شریعت کے خلاف ہو۔ دعا اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ کی مدد اور اعانت سے انسان اپنے وہ مقاصد حاصل کر سکے جو قانونِ فطرت یا قانونِ شریعت نے مقرر کیے ہیں۔ ایسی دعا ایک قدرتی ضرورت ہے۔ چونکہ نظامِ کائنات میں توازن ضروری ہے اس لیے جہاں مدد کی ضرورت ہوتی ہے، مدد کی جاتی ہے لیکن ایسی دعا جو فطری یا شرعی قانون کے خلاف ہو جیسے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کی دعا یا قطع رحم کی دعا، ایسی دعائیں قبول نہیں ہو سکتیں۔ اس قسم کی دعائیں درحقیقت دعائیں ہی نہیں۔

دعا کرنے والے کے حالات کی دعا سے مطابقت

ایک اور شرط یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا ہر پہلو دعا سے مطابقت رکھتا ہو، یعنی مقاصدِ فطرت اور مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ ہو۔ دل پاک صاف ہو، روزی حلال کی ہو، کسی پر ظلم کا بار گردن پر نہ ہو۔

امام صادقؑ کی حدیث ہے:

دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔ بغیر کوشش کے دعا کا اثر نہیں ہوتا۔

دعا کوشش کی جگہ نہیں لے سکتی

ایک اور شرط یہ ہے کہ واقعی دعا کی ضرورت ہو۔ دعا وہاں کی جائے جہاں مطلب انسان کی دسترس سے باہر ہو' انسان مجبور ہو۔ اگر مطلوبہ مقصد کی کنجی خود آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہو اور وہ کفرانِ نعمت کرکے اس کنجی سے کام نہ لے اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ خدا خود اس کے لیے دروازہ کھول دے اور کنجی سے کام لینے کا بوجھ اس کے کندھے سے ہٹادے تو ظاہر ہے ایسی دعا اس قابل نہیں کہ قبول ہو۔

ایسی دعاؤں کو تکوینی سنت کے منافی سمجھنا چاہیے۔ دعا تو اس لیے ہے کہ اللہ تعالےٰ دعا کرنے والے کو ایسی طاقت دے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے۔ اگر مطلوبہ طاقت پہلے ہی اسے حاصل ہے تو پھر دعا تحصیلِ حاصل یعنی جو چیز حاصل ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش ہوگی جو لغو بات ہے۔ اسی وجہ سے ائمۂ دین نے فرمایا ہے:

خَمْسَةٌ لَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ یعنی پانچ گروہ ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ایک اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جس کی بیوی اسے آزار پہنچاتی اور تنگ کرتی ہو اور اس کے بس میں ہو کہ اسے مہر دیکر طلاق دیدے لیکن اسے طلاق نہ دیتا ہو بلکہ اس پر دعا مانگتا ہو خدایا! مجھے اس عورت کے شر سے نجات دے۔

دوسرے اس شخص کی دعا جس کے پاس کوئی غلام ہو جو بار بار اس کے پاس سے بھاگ جاتا ہو لیکن وہ پھر بھی اس کو اپنے قبضے میں رکھنے پر مُصر ہو اور

دعا یہ کرتا ہو کہ خدایا مجھے اس کے شر سے بچا۔ حالانکہ وہ اگر چاہے تو اس کو بیچ دے۔ تیسرے ایسے شخص کی دعا جو ایسی ٹیڑھی دیوار کے نیچے سے گزرے جو گرنے والی ہو۔ وہ اس دیوار سے ہٹنے تو نہیں ہاں اپنی جان کی سلامتی کی دعا مانگتا رہے۔ چوتھے اس شخص کی دعا جو اپنا مال کسی کو بغیر گواہ اور رسید کے قرض دے اور جب قرضدار قرض ادا نہ کرے تو یہ دعا کرتا رہے کہ خدایا میرا روپیہ واپس دلا دے حالانکہ اگر وہ چاہتا تو شروع ہی سے بغیر رسید اور گواہ کے قرض نہ دیتا۔ پانچویں اس شخص کی دعا جو کوئی کام نہ کرے، اپنے گھر میں بیٹھا یہ دعا کرتا رہے کہ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ الٰہی رزق بھیج۔

ظاہر ہے کہ بات ان ہی پانچ قسم کے افراد کی نہیں۔ ان پانچ کا تذکرہ تو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اپنے عمل اور تدبیر سے اپنے مقصد کو حاصل کر سکتا ہو مگر کوتاہی سے کام لے اور کوشش و تدبیر کی بجائے دعا کرتا رہے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔ نظامِ کائنات میں دعا اس لیے نہیں ہے کہ وہ عمل اور تدبیر کی جگہ لے لے۔ دعا عمل کی قائم مقام نہیں اس کا تتمہ ہے۔

دعا اور قضا و قدر

دعا کے بارے میں عہد قدیم سے بحثیں ہوتی رہی ہیں اور سوالات پوچھے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کا ایک سوال یہ ہے کہ کیا دعا تقدیر پر اعتقاد کے منافی نہیں؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ جو کچھ مقدر میں ہے وہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے تو پھر دعا کی تاثیر کے کیا معنی؟

دعا اور اللہ کی حکمتِ کاملہ

ایک اور سوال یہ ہے کہ دعا پر اعتقاد اس اعتقاد کے منافی ہے کہ اللہ حکیم ہے اور اس کا کوئی کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال جس کو ہم دعا سے بدلنا چاہتے ہیں اس کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہے یا مخالف۔ اگر مطابق ہے تو ہمیں خدا سے ایسی بات کی دعا نہیں کرنی چاہیے جو اس کی مصلحت کے مطابق نہ ہو اور نہ خدا ایسی دعا قبول کرے گا اور اگر موجودہ صورت اس کی مصلحت کے خلاف ہے تو یہ کیسے مان لیا جائے کہ اس نظامِ عالم میں جو باری تعالےٰ کی حکیمانہ مشیئت کے مطابق چل رہا ہے' کوئی بات اس کی حکمت و مصلحت کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔

دعا اور مقامِ تسلیم و رضا

ایک سوال یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیش آئے وہ اس پر راضی اور خوش رہے۔ دعا اس اصول کے منافی ہے۔

یہ سب بحثیں اور سوالات بہت پرانے ہیں حتیٰ کہ ہمارے ادب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ اس وقت ان پر بحث کی گنجائش نہیں۔ دراصل یہ سب الجھاوے اس غلط فہمی سے پیدا ہوتے ہیں کہ خود دعا قضاء و قدر کے دائرے سے باہر ہے۔ حکمتِ الٰہی سے الگ کوئی چیز ہے۔ حالانکہ دعا اور اس کی قبولیت بھی قضاء و قدر ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس وجہ سے دعا نہ رضا بقضا کے منافی ہے اور نہ مصلحتِ خداوندی کے۔ اس وقت اس سے زیادہ گفتگو کی گنجائش نہیں۔

شبہائے قدر

ائمہ دین کے اتباع میں ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ماہ رمضان کے آخری عشرہ کی برکات سے ضرور بہرہ مند ہونا چاہیے۔

میں نے گفتگو کے آغاز میں اس آیت کی تلاوت کی تھی۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔

"جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں (تو کہہ دیجیے) کہ میں نزدیک ہی ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں لہٰذا وہ میری سنیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔"

یہ آیت رمضان سے متعلق آیتوں کے بیچ میں ہے۔ شاید روزے اور رمضان سے متعلق آیتوں کے درمیان یہ آیت اسی لیے آئی ہے کہ رمضان کے مہینے کو دعا اور استغفار سے خاص مناسبت ہے۔ ائمہ دین ان راتوں کو جو شبہائے قدر اور جاگنے کی راتیں ہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا تو رسول اکرمؐ حکم دیتے تھے کہ اس مہینے کے آخر تک آپ کا بستر نہ بچھایا جائے کیونکہ آپ مسجد میں اعتکاف فرماتے تھے اور یکسو ہو کر عبادت و دعا اور اپنے خالق سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ علی بن الحسین علیہما السلام رمضان کے مبارک مہینے میں ہر رات شب بیداری کرتے تھے اور ساری رات نماز اور دعا اور

فقیروں اور ضعیفوں کی دستگیری میں گزارتے تھے۔ سحری کے وقت ایک خاص دعا پڑھتے تھے جو دعائے ابو حمزہ کے نام سے مشہور ہے۔

دعا اور مخلوق سے

انقطاع کی لذت

جنہوں نے دعا اور مخلوق سے بے تعلقی کا مزا چکھا ہے انہیں اس سے بڑھ کر کسی چیز میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔ دعا اپنی عظمت اور لذت کے عروج پر اس وقت پہنچتی ہے۔ جب دعا کرنے والا اللہ کی خاص مہربانی کا مشاہدہ کرتا ہے اور دعا کی قبولیت کے آثار دیکھتا ہے۔

وَاَنِلْنِیْ حُسْنَ النَّظَرِ فِیْمَا شَکَوْتُ وَاَذِقْنِیْ حَلَاوَۃَ الصُّنْعِ فِیْمَا سَاَلْتُ.

"اے اللہ میری شکایت پر نظر عنایت کر اور میری درخواست کو حسن قبول سے نواز۔"

حکماء کا قول ہے کہ علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین میں فرق ہے۔ وہ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ فرض کرو کسی جگہ آگ جل رہی ہے۔ تم دور سے دھواں دیکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں آگ ہے۔ اسی کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ اگر تم آگ کو نزدیک سے دیکھو تو یہ عین الیقین ہے۔ یہ آگ کو آنکھ سے دیکھ لینا ہے اس لیے صرف جان لینے سے بڑھ کر ہے۔ اگر آگ کی گرمی اور تپش بھی محسوس کرو تو پھر یہ حق الیقین ہے۔

اگر انسان خدا کو اچھی طرح پہچانتا اور اس کی پاک ذات پر یقین رکھتا ہے،

وہ اگر خدا کے لطف و کرم کا مشاہدہ نہ کرے جو اللہ تعالےٰ بسا اوقات اپنے خاص بندوں پر فرماتا ہے تو ایسا شخص علم الیقین کے مرتبے میں ہے لیکن جب وہ توحید کے آثار کا عملی مشاہدہ کرتا ہے، خدا سے دعا کرتا ہے، دعا کو قبول ہوتے ہوئے دیکھتا ہے، اپنے کاموں میں خدا پر بھروسا اور اعتماد کرتا ہے اور غیر اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اللہ پر اعتماد کا اثر اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہے تو پھر وہ عین الیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ ایسے بندگانِ حق ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ جو لوگ اہلِ دل اور اہلِ توکل ہیں اور اپنی دعا اور اللہ پر اپنے توکل و اعتماد کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں، ایسے لوگ ایک ایسے کیف و سرور سے بہرہ مند ہوتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے بڑھ کر اس شخص کا درجہ ہے جو دعا کرتے ہوئے یہ محسوس کرے کہ ذاتِ حق سے براہِ راست اس کا رابطہ قائم ہے۔ ایسا شخص خود اپنی ذات کا بھی مشاہدہ نہیں کرتا۔ ہر فعل اور ہر صفت میں اسے خدا ہی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔

آدمی جب کوئی معمولی سا ہنر بھی سیکھتا ہے یا کسی علم و فن کی تحصیل کرتا ہے، تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ڈاکٹر یا انجینئر بنتا ہے تو سالہا سال تک کی تکلیف اور محنت کے بعد کہیں وہ اپنی محنت کا پھل اور اپنے ہنر کا اثر دیکھتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر کسی مریض کا علاج کرتا ہے اور وہ اچھا ہو جاتا ہے۔ انجینئر کسی عمارت کو ڈھا کر نہایت خوبصورت اور پاکیزہ نئی عمارت تعمیر کر دیتا ہے۔ اس طرح آدمی کو جو خوشی اور فخر و عزت کا احساس ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں ہو سکتی۔

اب غور کیجیے اس وقت انسان کا کیا حال ہو گا جب وہ اپنے ایمان کا اثر دیکھے گا یعنی اپنے اوپر خدا کا خاص لطف و کرم محسوس کرے گا۔

راہِ توحید سے اپنی کامیابی کو دیکھ کر جو سرور اور انبساط ہوتا ہے وہ دنیوی کامیابی سے ہزار درجہ لذیذ تر اور شیریں تر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دعا اور مناجات کی توفیق دے اور اس مقدس روحانی منزل کے ثمرات سے بہرہ مند کرے۔

انسان کی قوت ادراک

ایک جملہ اہلِ علم کی زبان پر ہے کہ تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا یعنی ہر چیز اپنی ضد یا مخالف چیز سے پہچانی جاتی ہے اور اس سے اس کے وجود کا پتا لگتا ہے۔ لیکن پہچاننے سے مراد منطق کی اصطلاحی تعریف نہیں ہے کیونکہ منطق کا تو یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی چیز کی تعریف اس کی ضد کے ذریعے سے نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح ضد سے اصطلاحی ضد بھی مراد نہیں کیونکہ فلسفہ میں ضد اور نقیض میں فرق ہے۔ یہاں ضد سے مطلق متقابل مراد ہے۔ جیسے مثلاً علم کا متقابل جہل یا نور کا متقابل ظلمت۔ اگرچہ اس جملہ میں کوئی ایسا کلمۂ حصر نہیں ہے جس کے معنی فقط یا صرف کے ہوں، لیکن مراد حصر ہی ہے یعنی ہر چیز صرف اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر کسی چیز کی کوئی ضد نہ ہو تو انسان اس کے وجود کے ادراک پر قادر نہیں، چاہے وہ چیز کتنی ہی ظاہر اور عیاں کیوں نہ ہو۔ درحقیقت اس جملے سے انسان کے فہم و ادراک کی ایک طرح کی خامی

اور کمی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ انسانی فہم و ادراک کی ساخت ایسی ہے کہ انسان صرف ان ہی چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جن کی کوئی ضد ہو۔

مثلاً نور اور ظلمت یعنی روشنی اور تاریکی کو لو۔ آدمی ان دونوں کو ایک دوسرے سے مقابلہ کی وجہ سے ہی سمجھتا اور پہچانتا ہے۔ اگر دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ روشنی ہی ہوتی اور کہیں تاریکی کا وجود نہ ہوتا تو آدمی روشنی کو بھی نہ سمجھ سکتا۔ یعنی وہ یہ تصور ہی نہ کر سکتا کہ دنیا میں روشنی بھی کوئی چیز ہے۔ نہ وہ سمجھ سکتا کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے' روشنی ہی کی مدد سے نظر آتا ہے۔ روشنی سے زیادہ ظاہر' واضح اور صاف کیا چیز ہو سکتی ہے۔ روشنی تو خود نام ہی ہے ظہور کا لیکن پھر بھی روشنی کا واضح اور ظاہر ہونا کافی نہیں۔ اس میں روشنی کا کوئی قصور نہیں۔ کمی خود ہم میں ہے۔ اب جو ہم روشنی کا ادراک کرتے ہیں' وہ اسی وجہ سے ہے کہ روشنی کو دوام نہیں۔ وہ غائب ہو جاتی ہے' تاریکی چھا جاتی ہے۔ ہم اندھیرا دیکھ کر ہی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کوئی چیز تھی جس کی مدد سے ہم ہر جگہ اور ہر چیز دیکھ سکتے تھے۔ اگر روشنی غائب نہ ہوتی تو ہمارا اس طرف دھیان بھی نہ جاتا' لہٰذا روشنی اپنی ضد یعنی تاریکی کی مدد سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہر طرف ہمیشہ اندھیرا ہی رہتا تو نور اور روشنی کو کوئی سمجھ ہی نہ سکتا۔

اسی طرح انسان اگر تمام عمر ایک ہی طرح کی آواز سنتا رہے۔ مثلاً اگر دودھ کی بوتل کی گھنٹی مسلسل بجتی رہے اور بچہ اسی ماحول میں بڑا ہو جائے تو ہرگز وہ آواز اس کے کان میں نہیں آئے گی اور اس آواز کو محسوس کرنے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہے گی۔ ایک قدیم فلسفی غالباً فیثاغورث اس کا مدعی ہے کہ آسمانوں کی حرکت سے ایک ہی طرح کی موسیقی ہر وقت نکلتی رہتی ہے لیکن چونکہ لوگ یہ آواز ہر وقت سنتے رہتے ہیں' انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر آدمی ہر وقت کسی ایسے ماحول میں رہے جہاں خوشبو یا بدبو ہو تو اسے ان میں سے کسی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ امراء میں لذت اور خوشی کی حس باقی نہیں رہتی اور غریبوں کو اپنی تکلیفیں محسوس نہیں ہوتیں یعنی چونکہ امیر لوگ ہر وقت عیش و عشرت میں رہتے ہیں' انہیں اس کی لذت کا کم ہی احساس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر غریب کو تھوڑی سی خوشی بھی میسر آجائے تو اسے بہت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح غریب چونکہ تکلیفیں برداشت کرنے کے عادی ہوتے ہیں' ان کو تکلیف کا احساس کم ہوتا ہے۔ امیر ذرا سی تکلیف سے گھبرا جاتا ہے۔

یہی حال قدرت اور عجز کا ہے۔ فرض کرو انسان ہر چیز پر قادر ہوتا جو چاہتا کر سکتا اور اسے عاجزی اور مجبوری سے کوئی واسطہ نہ پڑتا تو وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ قدرت اور طاقت بھی دنیا میں کوئی چیز ہے حالانکہ وہ سب کام قدرت اور طاقت ہی کے بل پر کیا کرتا۔ یہی حال بے چارگی اور مجبوری کا ہے۔ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو وہ عجز کے مفہوم سے نا آشنا رہتا۔

علم و جہل کی بھی یہی صورت ہے۔ فرض کرو انسان سب کچھ جاننے والا ہوتا۔ کہیں بھی اس کو اپنی ناواقفیت محسوس نہ ہوتی اور ہر چیز اس پر روشن اور آشکارا ہوتی تو وہ اس کے باوجود کہ ہر چیز کو علم کی روشنی سے دیکھتا اور خود اگرچہ علم میں وہ ڈوبا رہتا پھر بھی علم کو نہ سمجھ سکتا۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا اور سمجھتا اور ہر چیز کی طرف اس کی توجہ ہوتی لیکن خود علم کے وجود سے غافل اور بے خبر ہی رہتا۔

لیکن جب علم کے مقابلے میں جہل سامنے آیا اور اس کا احساس ہوا' علم کی طرف بھی خیال منعطف ہوا اور سمجھ میں آیا کہ یہ بھی دنیا میں کوئی چیز ہے۔

جانوروں کو چونکہ اپنی بے خبری کا کوئی احساس نہیں اس لیے ان کو علم کا بھی علم نہیں۔
یہی حال سائے اور چیزوں کا ہے۔ اگر آدمی ہمیشہ کچھ چیزوں کا سایہ ہی دیکھتا رہتا اور خود ان چیزوں کو نہ دیکھتا تو وہ اس سائے ہی کو اصل چیز سمجھتا رہتا لیکن وہ چونکہ سائے اور اصل دونوں کو دیکھتا ہے اس لیے جانتا ہے کہ یہ اصل ہے اور یہ اس کا سایہ۔

افلاطون کا ایک مشہور نظریہ ہے جو امثالِ افلاطون کے نام سے مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے: اس جہان میں جو کچھ ہے وہ ایک طرح کا سایہ ہے۔ اصل چیزیں ایک دوسری دنیا میں ہیں۔ اس دنیا کی چیزیں حقیقت ہیں اور اس دنیا کی چیزیں اس کا عکس۔ لوگ سائے کو حقیقت سمجھتے ہیں۔

پھر ایک مثال دیتا ہے۔ کہتا ہے: فرض کرو کہ کچھ لوگ ابتدا ئے عمر ہی کسی غار میں اس طرح رکھے جائیں کہ ان کا منہ غار کے اندر کی طرف ہو اور ان کی پشت غار کے دروازے کی طرف۔ غار میں باہر سے دھوپ آتی ہو اور جو لوگ غار کے سامنے سے گزرتے ہوں، ان کا سایہ اس دیوار پر پڑتا ہو جو ان لوگوں کے سامنے ہے جو غار میں قید ہیں۔ یہ قیدی چونکہ شروع ہی سے غار میں بند ہیں اس لیے باہر کی دنیا کی ان کو کچھ خبر نہیں۔ مجبوراً وہ گزرنے والوں کے سائے ہی کو اصل آدمی سمجھیں گے اور ان کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آئے گا کہ یہ سائے کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف عکس ہیں، اس حقیقت کا جو باہر ہے۔

انسان بھی نیچر کے غار میں قید ہے۔ وہ اس دنیا کے افراد کو ہی حقیقت سمجھتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یہ افراد خود حقیقت نہیں محض حقیقت کا سایہ اور عکس ہیں۔ اگر وہ اصل اشخاص کو دیکھ لے تو بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔

یہاں افلاطون کا نظریہ بیان کرنا مقصود نہیں۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ

انسان کی قدرتی ساخت ایسی ہے کہ وہ اشیاء کو ایک دوسری سے مقابلہ کر کے اور ان کی اضداد کے تقابل سے سمجھتا ہے۔ یہی سمجھانے کے لیے میں نے نور و ظلمت، علم و جہل، قدرت و عجز اور شخص و سایہ کی مثالیں دی ہیں۔ خیر و شر، حرکت و سکون، حدوث و قدم اور فنا و ابدیت کی بھی یہی صورت ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اس مضمون کا تعلق ہمارے فہم و ادراک کی ساخت سے ہے۔ ہماری بناوٹ ایسی ہے کہ عام طور پر جب تک ہم کسی چیز کے مقابل یا ضد کو نہ دیکھیں، ہمیں اس کے وجود کا پتا نہیں چلتا۔ اس بات کا تعلق اس چیز سے نہیں، ہماری سمجھ سے ہے۔

فرض کرو یہی روشنی جو سب کو محسوس ہوتی ہے، اگر کسی وقت غائب نہ ہوتی اور اس میں کوئی رکاوٹ نہ پڑتی۔ بند دروازوں کے مکان میں بھی ایسی ہی روشنی ہوتی جیسی باہر ہے۔ تمام دنیا میں یکساں روشنی پھیلی ہوئی ہوتی، اس وقت اگر کوئی شخص آکر یہ کہتا کہ تمام عالم میں روشنی پھیلی ہوئی ہے اور تم جو کچھ دیکھتے ہو، اسی کی بدولت دیکھتے ہو۔ اگر روشنی نہ ہوتی تو تم کچھ بھی نہ دیکھ سکتے تو اقرار ہے یہ بات ان لوگوں کے لیے جو ہر وقت روشنی میں رہ رہے تھے، ناقابلِ یقین ہوتی۔

مچھلی اور پانی

کہتے ہیں کہ ایک مچھلی جو کبھی پانی سے باہر نہیں نکلی تھی اور جس نے پانی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا سوچنے لگی کہ پانی جس کی اتنی تعریف کی جاتی ہے، کہتے ہیں کہ اسی پر زندگی کا دار و مدار ہے، یہ چیز کیا ہے اور کہاں ہے؟ کیوں نظر نہیں آتا؟ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو اسے پانی کا پتا بتلا سکے۔ ایک دن ایسا ہوا

کر وہ پانی سے باہر جا گری اور تڑپنے لگی۔ جب اس کی سمجھ میں آیا کہ پانی کیا ہے اور کس طرح اس کی زندگی پانی پر موقوف ہے۔

خدا نورِ مطلق اور ظہورِ مطلق ہے

خدائے واحد کی ذات نورِ مطلق ہے۔ وہ ایسا نور ہے جس کے بالمقابل ظلمت نہیں۔ وہ تمام جہان اور آسمان و زمین کا نور ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وہ ہر ظاہر سے زیادہ ظاہر ہے اور ہر چیز سے زیادہ نزدیک۔ ہر چیز کا ظہور اسی کی ذات کی وجہ سے ہے۔ وہی ظاہر مطلق اور ظاہر بالذات ہے۔ وَبِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَضَاءَ لَهٗ كُلُّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کی روشنی اسی کے نور کا عکس ہے۔ اس کا نور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ وہ نہ غروب ہوتا ہے نہ گھٹتا ہے۔ وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ نہ اس کے نور کے مثل کوئی نور ہے۔ نہ اس کے نور کی کوئی ضد ہے۔

چونکہ یہ نور نہ گھٹتا ہے نہ چھپتا ہے نہ اس کو زوال ہے اور نہ فنا، اس کے بالمقابل کوئی ظلمت نہیں۔ ضعیف الادراک انسان جو ہر چیز کو اس کے مقابل اور ضد کے ذریعے سے سمجھتا ہے اور جس کی سمجھ اور جس کے ادراک کی ساخت ایسی ہے کہ مقابل کی مدد کے بغیر اس کو کسی چیز کی طرف توجہ اور التفات نہیں ہوتا۔ ذاتِ حق کی طرف توجہ اور التفات سے غافل ہے۔

عجیب نکتہ ہے۔ چونکہ ذاتِ حق کسی وقت بھی پوشیدہ نہیں، اس لیے وہ ہمیشہ نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اگر وہ ذات کبھی پنہاں اور کبھی آشکارا ہوتی تو نظروں سے پنہاں نہ ہوتی۔ انسان اس سے اس لیے غافل ہے کہ اس میں تغیر، زوال اور حرکت نہیں۔

یہی مطلب ہے حکماء کے اس قول کا کہ ذاتِ حق کثرتِ ظہور اور شدتِ ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔

یَا مَنْ هُوَ اخْتَفَى لِفَرْطِ نُورِهِ
الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ فِي ظُهُورِهِ

چونکہ وہ ظاہر و آشکارا ہے' اسی لیے باطن و پنہاں ہے۔ اس کا ظہور ہی عدمِ ظہور ہے۔

امام علیؑ نے بڑی لطیف اور بلند پایہ بات کہی ہے۔ کہتے ہیں:
وَكُلُّ ظَاهِرٍ غَيْرَهُ غَيْرُ بَاطِنٍ وَكُلُّ بَاطِنٍ غَيْرَهُ غَيْرُ ظَاهِرٍ
یعنی اللہ کے سوا ہر ظاہر باطن نہیں ہے اور اللہ کے سوا ہر باطن ظاہر نہیں ہے!

یہ صرف اللہ ہے جو بیک وقت ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور یہ نہیں کہ کچھ حصہ ظاہر ہو اور کچھ باطن بلکہ وہ جس لحاظ سے ظاہر ہے اسی لحاظ سے باطن بھی ہے اور جس لحاظ سے باطن ہے اسی لحاظ سے ظاہر بھی۔

اس حقیقت کا منبع اور سرچشمہ خود قرآن کریم ہے۔ ارشاد ہے:
هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ
اللہ اول و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ:
أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ
تم جدھر رخ کرو' ادھر ہی خدا کا رخ ہے

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "اگر تم رسّی کی مدد سے زمین کے ساتویں طبقے میں اتر جاؤ' جب بھی خدا ہی کی طرف جاؤ گے۔"

حدیث میں ہے کہ جاثلیق (ایک عیسائی عالم) نے امیرالمومنین علیؑ سے کہا: اَخْبِرْنِیْ عَنْ وَجْہِ الرَّبِّ. مجھے بتلاؤ خدا کا رخ کس طرف ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا ہے۔

فَدَعَا عَلِیٌّ بِنَارٍ وَحَطَبٍ فَاَضْرَمَہٗ.

حضرت علیؑ نے آگ اور لکڑیاں منگوائیں اور آگ روشن کر دی جس سے پوری فضا منور ہو گئی۔ فَلَمَّا اشْتَعَلَتْ قَالَ اَیْنَ وَجْہُ ھٰذَا النَّارِ یَا نَصْرَانِیُّ. آپ نے اس عیسائی سے پوچھا کہ اس آگ کا رخ کس طرف ہے؟

عیسائی نے کہا اس کا رخ تو ہر طرف ہے۔

آپ نے فرمایا: ھٰذَا النَّارُ مُدَبَّرَۃٌ مَصْنُوْعَۃٌ لَا تُعْرَفُ وَجْھُھَا. یہ آگ مصنوعی ہے۔ مخلوق ہے لیکن اس کا کوئی رخ نہیں تم چاہتے ہو کہ اس کے خالق خدا کا کوئی معین رخ ہو۔ وَخَالِقُھَا لَا یُشْبِھُھَا. ظاہر ہے خالق مخلوق سے بالاتر ہے اس کا کوئی مثل اور نظیر نہیں۔ اسے کسی چیز کے مثل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ. مشرق اور مغرب سب خدا کا ہے۔ پس تم جدھر رخ کرو گے ادھر ہی خدا کا رخ ہے۔ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ خَافِیَۃٌ. کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ مشرق بھی خدا کا مغرب بھی خدا کا۔ پورا جہان خدا کا۔ ظہور اس کا فعل ہے۔ وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ کوئی چیز اس سے خالی نہیں۔ جدھر رخ کرو۔ ادھر ہی خدا کا رخ ہے۔

بسکہ ہست از ہمہ سو و ز ہمہ رو راہ بتو
بتو برگردد اگر راہ روی برگردد

خود شناسی

کہتے ہیں کہ خود شناسی خدا شناسی سے بھی مقدم ہے۔ جب تک انسان خود کو نہ پہچانے وہ خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ یہ بات ایک لحاظ سے نہیں کئی لحاظ سے درست ہے۔ ایک تو یہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ خود اس کی قوت ادراکیہ کام کیسے کرتی ہے وہ اپنی کمی اور کمزوری کو سمجھے' تاکہ خدا کے غیر متناہی کمال اور طاقت کو سمجھ سکے۔ یہ سمجھے کہ یہ اس کے فہم و ادراک کی کمزوری ہے کہ وہ کسی چیز کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک اس چیز کی کوئی ضد اور مقابل موجود نہ ہو۔ اس لیے آدمی کو یہ ہوس نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنے حواس سے خدا تعالٰے کا ادراک کرے گا۔ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ محسوسات کی اگر ہمیشہ ایک ہی حالت رہتی اور وہ ان کو ایک ہی رنگ میں دیکھتا رہتا تو وہ ان کو نہ سمجھ سکتا۔ اگر ایک ہی آواز سنتا رہتا تو وہ اس آواز کو نہ پہچان سکتا اور اس کے وجود سے بھی واقف نہ ہوتا۔ اگر ایک ہی بُو اس کی ناک میں آتی رہتی تو اسے اس کا خیال بھی نہ آتا۔ انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ خدا مخفی ہے۔ صرف کسی حقیقت کا ظہور اس کے لیے کافی نہیں کہ انسان اس کو سمجھ سکے۔ مقابل کا وجود بھی ضروری ہے۔ خدا کا نور ازلی' ابدی اور ہر شے پر محیط ہے۔ وہ نہ گھٹتا ہے اور نہ غائب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان اس کے ادراک سے عاجز ہے۔

محدود انسان خدا کو اس کے محدود آثار سے پہچانتا ہے

انسان کی فکری قوت خدا کو ان چیزوں کی مدد سے پہچانتی ہے جو خود انسا

کی طرح ناقص اور محدود ہیں۔ انسان خدا کو اس کی روشنی کی مدد سے پہچانتا ہے جو کہیں ہے اور کہیں نہیں جیسے نباتات اور حیوانات میں جان اور وہ شعور جو مادہ میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ انسان خدا کو ان باتوں سے پہچانتا ہے جو کسی وقت ہوتی ہیں اور کسی وقت نہیں یعنی کبھی ان کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی غائب ہو جاتی ہیں۔ خدا کے افعال ہیں۔ اس کی مخلوقات ہیں۔ اس کی پیدا کی ہوئی روشنیاں ہیں جو طلوع وغروب ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کے ذریعے سے اپنے آپ کو پہچنواتا ہے۔ زندگی اس کا نور اور روشنی ہے جو تاریک مادہ پر جلوہ فگن ہوتی ہے اور پھر خدا ان کو واپس لے لیتا ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُوْنَ.

یہ ہم ہی ہیں جو دنیا میں زندگی کی روشنی پھیلاتے ہیں اور اس کو واپس لے لیتے ہیں، سب چیزیں ہماری ہی طرف لوٹتی ہیں۔ ہم ہی سب چیزوں کے وارث ہیں۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ. وَهُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ. وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے۔ وہ خود زندہ ہے جس پر کبھی موت واقع نہیں ہوگی۔ وہ ایسا نور ہے جو نہ کبھی گھٹتا ہے نہ غائب ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

زندگی جو زمین میں پیدا ہوتی ہے، زمان کے لحاظ سے بھی محدود ہے

اور مکان کے لحاظ سے بھی۔ خاص جگہ پر اور خاص وقت میں ظاہر ہوتی ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسان اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ زندگی کے جتنے پہلو اور جتنے مظاہر ہیں، جیسے رشد و نمو، زیبائی اور دلکشی، حسنِ ترتیب اور نظم، احساس و ادراک، عقل اور ہوش، محبت و الفت، فطری رہنمائی، یہ سب ذاتِ احدیت کے جلوے اور اس کا آئینہ ہیں۔ ان میں ہمیں ذاتِ خداوندی کا عکس نظر آتا ہے۔

قرآنِ کریم زندگی اور اس کے آثار سے عموماً خدا کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔ زندگی کے حسن اور دلکشی سے، اس کے حسنِ نظم و ترتیب سے، اس کی فطری رہنمائی سے، الفت و محبت سے، ماں کی مامتا سے، نر و مادہ میں باہمی کشمکش سے، ان سب امور سے استدلال کرتا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ ابراہیمؑ نے نمرود سے کہا:

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔

قرآن حضرت موسیٰؑ کا قول نقل کرتا ہے کہ انھوں نے فرعون سے کہا:
رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى. ہمارا خدا وہی ہے جس نے ہر چیز کو وہ کچھ دیا جس کے قابل وہ تھی اور ایسا محکم نظام بنایا کہ تمام موجودات کو ان کے مناسب کمال تک پہنچایا۔ اس نے ہر پودے کو یہ طاقت بخشی کہ ایک ماہر انجینیر کی طرح اپنے وجود کا نقشہ بنائے اور اپنی آرائش و زیبائش کرے۔ اسی نے چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لے کر ترقی یافتہ حیوانات تک سب کو ایسی جبلی صلاحیتیں عطا کیں کہ عقل ان کے ادراک اور بیان سے عاجز ہے۔ اسی نے شہد کی مکھی کو پہاڑوں میں درختوں اور لکڑی کے ٹھٹھروں پر چھتہ بنانا سکھایا۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ.

"اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں میں اپنے چھتے بنائے اور لوگوں کے بنائے ہوئے مکانوں میں بھی اور پھر طرح طرح کے پھلوں (پھولوں) سے رس چوس کر اپنے رب کی راہوں میں فرمانبرداری کے ساتھ چلی جائے۔ ان مکھیوں کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا ایک مشروب نکلتا ہے جس میں لوگوں کی بیماریوں کی شفاء ہے۔" (سورۃ نحل۔ آیت ۶۸۔۶۹)

چیونٹی، حضرت علیؑ کی نگاہ میں

حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

اُنْظُرُوْا اِلَى النَّمْلَةِ فِيْ صِغَرِ جُثَّتِهَا وَلَطَافَةِ هَيْئَتِهَا لَا تَكَادُ تُنَالُ بِلَحْظِ الْبَصَرِ وَلَا بِمُسْتَدْرَكِ الْفِكْرِ كَيْفَ دَبَّتْ عَلٰى اَرْضِهَا وَصُبَّتْ عَلٰى رِزْقِهَا.

چیونٹی کو دیکھو کیسی ذرا سی ہے اور کیسی صاف ستھری اس کی شکل ہے۔ بمشکل سے نظر آتی ہے۔ اس کی بناوٹ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس پر بھی کیسے زمین پر رینگتی ہے اور اپنی روزی تلاش کرتی اور اس کی حفاظت کرتی ہے۔

جن سائنسدانوں نے اس ضمن میں تحقیق کی ہے ان کا کہنا ہے کہ صحراؤں میں بعض اقسام کی چیونٹیاں ہوتی ہیں جو اپنی خوراک کے دانے دنکے کی تلاش پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ خود ایک طرح کی کھمبی کاشت کرتی ہیں اور اسے کھاتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ کچھ چیونٹیاں

بعض کیڑوں کو اس طرح پالتی ہیں جیسے انسان گھوڑے، گائے اور بھیڑ بکریوں کو پالتا ہے اور ان کا دودھ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح چیونٹیاں ان کیڑوں سے ایک طرح کا رس نکالتی اور استعمال کرتی ہیں۔

تَنْقُلُ الْحَبَّةَ اِلٰی جُحْرِهَا وَ تُعِدُّهَا فِیْ مُسْتَقَرِّهَا تَجْمَعُ فِیْ حَرِّهَا لِبَرْدِهَا وَ فِیْ وِرْدِهَا لِصَدَرِهَا.

یہ دانہ اپنے سوراخ میں لے جا کر مناسب جگہ پر ذخیرہ کرتی ہیں۔ گرمی میں سردی کے لیے جمع کرتی ہیں۔ مناسب جگہ پر رکھتی ہیں تاکہ خراب نہ ہو۔ اس کے ٹکڑے کر دیتی ہیں تاکہ اگنے نہ پائے۔

حشریات کے ماہرین کہتے ہیں کہ چیونٹیوں کی ایک قسم ایسی ہے جو باقاعدہ اجتماعی زندگی گزارتی ہیں۔ ان میں ہر گروہ کا اپنا ایک مخصوص کام ہے جو ان کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ مزدور ہیں جو دانہ دنکا سوراخ میں لا کر جمع کرتی ہیں تاکہ سردی کے موسم میں کام آئے۔ اس مقصد کے لیے مخصوص جگہ ہوتی ہے جہاں دوسری چیونٹیاں موجود ہوتی ہیں جن کے جبڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ ان دانوں کو کچلتی ہیں اور کھانے کے لیے تیار کرتی ہیں۔

وَ لَوْ فَكَّرْتَ فِیْ مَجَارِیْ اُكُلِهَا وَ فِیْ عُلْوِهَا وَ سُفْلِهَا وَ مَا فِی الْجَوْفِ مِنْ شَرَاسِيْفِ بَطْنِهَا وَ مَا فِی الرَّاْسِ مِنْ عَيْنِهَا وَ اُذُنِهَا لَقَضَيْتَ مِنْ خَلْقِهَا عَجَبًا وَ لَقِيْتَ مِنْ وَصْفِهَا تَعَبًا.

اگر تم ان چیونٹیوں کی غذائی نالیوں پر غور کرو اور یہ دیکھو کہ وہ کیسے اپنی غذا کھاتی ہیں، کیسے اس کو نگلتی ہیں، کیسے اس کو ہضم کرتی ہیں، کیسے فضلہ خارج کرتی ہیں، ان کے پیٹ اور

معدہ کی بناوٹ پر غور کرو۔ ان کے دیکھنے اور سننے کی قوتوں کا مطالعہ کرو۔ اگر ان سب چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ یہ سب باتیں بمشکل بیان کی جاسکتی ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے مستقل کتابوں کی ضرورت ہے اور برسوں کی محنت اور مطالعہ درکار ہے۔

آج سائنسدانوں نے اس ضمن میں تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ سیکڑوں آدمیوں نے اپنی تمام عمر اسی کام پر صرف کی ہے۔ کتابیں لکھی ہیں تکلیفیں اٹھائی ہیں اور عجیب عجیب انکشافات کیے ہیں بالخصوص جن مسائل کا تعلق چیونٹیوں کے فہم و شعور اور آپس میں ایک دوسری کو اپنا مطلب سمجھانے سے ہے وہ تو بہت ہی عجیب ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کی داستان کے ضمن میں چیونٹیوں کا ایک دوسری کو اپنا مطلب سمجھانے کا ایک عجیب قصہ قرآن میں آیا ہے۔ سورۂ نمل میں ارشاد ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ.

"سلیمان اور ان کے لشکری جب ایک مرتبہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا۔ اے چیونٹیو! اپنے

سوراخوں میں جا گھسو۔ کہیں سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں روند نہ ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ سلیمانؑ اس بات پر ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ اے میرے پروردگار مجھے اس کی توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کیا کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا کی ہیں اور اس کی بھی کہ میں نیک کام کیا کروں جس سے تو راضی ہو اور مجھے اپنی رحمت سے داخل رکھ نیک بندوں میں۔"

امیر المومنینؑ نے ان فقروں میں فرمایا تھا:

وَمَا فِي الرَّأْسِ مِنْ عَيْنِهَا وَ أُذُنِهَا

اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ چیونٹی کی دیکھنے اور سننے کی قوتیں اس کے سر میں ہیں۔ موجودہ دور کے سائنسدان بھی اپنی تحقیق سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ چیونٹی کے سر پر چھوٹے چھوٹے سینگ ہوتے ہیں۔ یہی ننھے منے سینگ خبر رسانی کا ذریعہ ہیں۔

امام علیؑ آخر میں فرماتے ہیں: "اگر تم غور و فکر سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرو گے، تو اس کے سوا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچو گے کہ ننھی چیونٹی اور کھجور کے تناور درخت کا خالق ایک ہی ہے جو دقیق نظام خلقت اس میں روبکار لایا گیا ہے وہی اس میں ہے۔ اللہ کی خلاقی کے سامنے چھوٹا بڑا ہلکا بھاری اور قوی اور کمزور سب برابر ہیں۔

بہرحال قرآن کا فرمان ہے کہ اللہ ہر ظاہر سے ظاہر تر ہے بلکہ درحقیقت اصل ظاہر وہی ہے۔ تمام عالم اسی کے نور سے ہویدا ہے۔ ساتھ ہی انسان کی فکری ساخت ایسی ہے کہ عام طور پر اشیاء کو ان کے مقابل اور ضد کی

مدد سے پہچانتا اور سمجھتا ہے۔ اللہ کو بھی وہ اس کی ان تجلیات اور مظاہر کے ذریعہ سے پہچانتا ہے جو دائمی نہیں۔ جو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں۔ نور کے ساتھ ظلمت ہم آغوش ہے، حیات کے ساتھ موت ملی ہوئی ہے۔ قرآن جو زندگی، اس کے آثار اور کیفیات کو بار بار یاد دلاتا ہے اس کا منشا یہی سمجھانا ہے۔

نامعلوم امور کا بے جا انکار

مشہور حدیث ہے کہ علم کے تین درجے یا مرحلے ہیں۔ پہلے مرحلے میں آدمی مغرور ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ خود بینی کا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں جب اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اسے اس کائنات کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنی معلومات کو اس کارخانۂ قدرت کی وسعت اور عظمت کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ ایک تواضع کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت پسندی اور کائنات کے صحیح تصور کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں آدمی صرف اپنی معلومات کو نہیں دیکھتا بلکہ کائنات پر نظر ڈالتا ہے اور اس سے معلومات کا اندازہ لگاتا ہے۔ بالآخر تیسرا مرحلہ وہ آتا ہے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ عَلِمَ اَنَّهٗ لَا يَعْلَمُ شَيْئًا

یہ حیرت کا مرحلہ ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں آدمی کو اپنی فکری نارسائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اپنے فکری پیمانوں سے اس عظیم کائنات کا اندازہ لگانے سے قاصر ہے۔ اس کے علم و فکر کے پیمانے صرف اس کی محدود زندگی کے ماحول کے لیے ہی کارآمد ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ شعر مولانا رومی کا دیوانِ شمس تبریز میں ہے:

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم، پختہ شدم، سوختم

رومی نے اپنے روحانی و ذہنی سلوک کے مختصراً تین مرحلے بیان کیے ہیں۔ خامی کا دور، پختگی کا دور اور سوختگی کا دور۔ خامی کا دور غرور، تکبر اور اپنے آپ کو عالم سمجھنے کا دور ہے لیکن جب آدمی پختگی یا سوختگی کے دور تک پہنچ جائے تو اور بات ہے۔

ناقص علم پر غرور

انسان کبھی اپنے مال کی وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے۔ دولت اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دولت سے اسے سب کچھ مل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگانی جاوید بھی حاصل کر سکتا ہے۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ.

کبھی انسان اپنی عزت اور قوت کی وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے۔ اپنے مرتبہ اور مقام کی بڑائی اس طرح اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے کہ وہ زمین میں شر و فساد کا باعث بن جاتا ہے اور آخر میں کہتا ہے: انا ربکم الاعلیٰ

بجانے لگتا ہے۔

اسی طرح آدمی اپنے علم پر بھی غرور کرنے لگتا ہے۔ جس طرح دولت آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اسی طرح علم سے بھی آدمی کا دماغ خراب ہو سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دولت کی زیادتی دماغ خراب کرتی ہے اور علم کی کمی سے دماغ خراب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ مگر علم کی بات مختلف ہے۔ ناقص علم سے علم کا نہ ہونا بہتر ہے کیونکہ ناقص علم ایک طرح کا نشہ ہے جو دماغ کو خراب کر دیتا ہے۔ دولت اور مرتبہ بھی دماغ خراب کرتے اور نشہ پیدا کرتے ہیں لیکن ان کی زیادتی سے دماغ خراب ہوتا ہے۔ برخلاف علم کے کہ اس کی کمی ایسی مستی اور نشہ پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں آدمی حقائق کو جھٹلانے لگتا ہے۔ میں یہاں امام صادق سلام اللہ علیہ کی ایک اور حدیث نقل کرتا ہوں:

انسان کے خدا سے دو عہد

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ قرآن کریم کی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کسی بات کی بیجا تصدیق یا بیجا تکذیب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے:

أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ.

"آیا ان لوگوں سے آسمانی کتاب میں پختہ وعدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے بارے میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہیں گے"

اپنی طرف سے یہ نہیں کہیں گے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے یا اللہ

نے اس معاملے میں یہ حکم دیا ہے اور اس معاملے میں وہ حکم دیا ہے۔ جہاں اللہ نے کوئی حکم نہیں دیا وہ بھی سکوت کریں۔ یہ نہیں کہ اپنی طرف سے بدعتیں تراش لیں اور احکام الٰہی کے نام سے خود ہی حکم گھڑ لیں۔

جہاں اللہ نے کوئی حکم نہیں دیا اور لوگوں کو مصلحتاً آزاد چھوڑ دیا ہے، بعض دفعہ انسان اپنی طرف سے کوئی حکم وضع کر لیتا ہے اور اس کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے یا کوئی برا کام جو اس کی خواہش نفسانی کے مطابق ہوتا ہے، کرتا ہے اور اپنی طرف سے حکم گھڑ کر کہتا ہے کہ اللہ نے ایسا حکم دیا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۲۸ میں ہے:

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ.

"جب وہ کوئی گندا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور اللہ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ کہہ دیجیے کہ اللہ ہرگز کسی گندی بات کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر بغیر جانے بوجھے الزام لگاتے ہو؟"

ایک عہد تو یہ ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے کہ جب تک کسی بات کا علم اور یقین نہ ہو یہ ہرگز نہ کہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

ایک دوسرا عہد وہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے:

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ.

جن مسائل سے وہ پوری طرح آگاہ نہیں اور جن مسائل کی

روح سے ناواقف ہیں، بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ ہمیں یہ مسائل معلوم نہیں اور ہم ان کو نہیں سمجھتے، غرور اور خود پسندی کی وجہ سے ان کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ محض نہ جاننے کی وجہ سے اس کی تردید کر دیتے ہیں۔" (سورۂ یونس۔ آیت ۳۹)

قریب قریب اسی مضمون کے شیخ الرئیس بو علی سینا کے بھی دو فقرے ہیں۔ بے دلیل بات مان لینے کے متعلق کہتے ہیں:

مَنْ تَعَوَّدَ اَنْ یُّصَدِّقَ بِغَیْرِ دَلِیْلٍ فَقَدِ انْخَلَعَ عَنِ الْفِطْرَۃِ الْاِنْسَانِیَّۃِ.

جس کی عادت یہ ہو کہ جو سنے بغیر دلیل مان لے، ایسا شخص فطرتِ انسانی سے خارج ہے۔ وہ درحقیقت انسان ہی کہلانے کا مستحق نہیں۔

دلیل کے باوجود نہ ماننے کے متعلق کہتا ہے:

کُلُّ مَا قَرَعَ سَمْعَکَ مِنَ الْغَرَائِبِ فَذَرْہُ فِیْ بُقْعَۃِ الْاِمْکَانِ مَا لَمْ یَذُدْکَ عَنْہُ قَائِمُ الْبُرْہَانِ.

یعنی کسی بات کے صرف عجیب معلوم ہونے کی وجہ سے اس کا انکار نہ کرو۔ البتہ اگر اس کے ناممکن ہونے کی کوئی عقلی دلیل موجود ہو تو دوسری بات ہے۔

اپنی حد کو پہچاننا

جس طرح ہر شخص کا جسم محدود ہے اسی طرح اس کی روح، عقل اور علم

کی بھی ایک حد ہے۔ علم اور عقل بھی غیر محدود نہیں اس لیے انسان کو چاہیے کہ اپنی حد میں رہے، اس سے تجاوز نہ کرے۔ اَلْعَالِمُ مَنْ عَرَفَ قَدْرَہٗ دانا وہ ہے جو اپنی حد کو پہچانتا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ کسی شخص کی معلومات بہت وسیع ہوں۔ اسے ریاضی، طبعیات اور عمرانیات کے مسائل سے گہری واقفیت ہو۔ اسے ساری دنیا کا علم ہو۔ تاریخ سے خوب واقف ہو۔ گزشتہ حالات و واقعات سے باخبر ہو۔ بہت سے معاملات کا صحیح اندازہ ہو لیکن اسے خود اپنی حدود کا اندازہ نہ ہو۔ وہ اپنی حدود سے ناواقف ہو۔ اس نے اپنی روح اور فکر کا اندازہ نہ لگایا ہو۔ دوسرے تمام مسائل کا علم اس ایک ناواقفیت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اپنی حدود سے ناواقفیت ہزار نادانیوں کو جنم دیتی ہے۔ مسلم حقائق کی تکذیب پر اکساتی اور بیجا غرور پیدا کرتی ہے۔

میں نے پچھلے جلسے میں انسانی سوچ کے محدود ہونے کے متعلق عرض کیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہماری سمجھ کی ساخت ایسی ہے کہ کوئی حقیقت کتنی بھی عیاں اور ظاہر ہو، اس وقت تک ہماری سمجھ میں نہیں آتی جب تک اس کی ضد اور مقابل موجود نہ ہو اور دونوں کا باہم موازنہ نہ کیا جائے۔ صرف یہی ایک بات اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی غیر معلوم حقائق کی تکذیب کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے۔

دو تین جلسے پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ فصلِ بہار میں زمین کی حیاتِ نو کو قرآن کریم کبھی توحید کے ثبوت میں پیش کرتا ہے اور کبھی قیامت کے ایک چھوٹے سے نمونے اور موت کے بعد زندگی کی مثال کے طور پر خداوند تعالیٰ انسان کو تنبیہ فرماتا ہے کہ جس طرح زمین کی زندگی کے محدود نظام میں موت و حیات دونوں ہیں۔ جس طرح بیج جو ایک فصل میں زمین میں بویا جاتا ہے سال کی

دوسری فصل میں اگتا اور بڑھتا ہے۔ جس طرح بیج ایک خاص وقت میں جامد اور بیجان نظر آتا ہے پھر دوسرے موقع پر وہی بیج زندہ اور جاندار بنکر ابھرتا ہے۔ یہی حال کائنات کے وسیع تر نظام کا ہے اور یہی صورت عمومی موت کے بعد زندگی اور مجموعی حشر و نشر کی ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ حَتّٰى إِذَا جَآءُوْا قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا.

اور جس دن ہم ہر قوم سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی اکٹھا کریں گے جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ جب وہ آئیں گے اللہ ان سے کہے گا: کیا تم نے میری ان نشانیوں کو جھٹلایا تھا جن کا تم کو پورا علم نہیں تھا۔ (سورۂ نمل۔ آیت ۸۴)

جو چیز اکثر ہوتی رہتی ہے وہ معمول بن جاتی ہے اور اس کی اہمیت نظروں سے گر جاتی ہے۔ زمین کا مرنا اور پھر زندہ ہونا بھی اسی قسم کی بات ہے۔ ہماری عمر طبیعی کا بھی یہی حال ہے۔ ہم اپنی زندگی میں دسیوں بار اس معمول کو دیکھتے ہیں اس لیے ہماری نظر میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔

ہمارے ارد گرد متعدد چھوٹے بڑے نظام موجود ہیں۔ ہمیں کسی طرف سے بھی معلوم نہیں کہ ہم کہاں تک جا سکتے ہیں اور کس حد تک ان سے واقفیت پیدا کر سکتے ہیں۔ چھوٹے نظام میں ہم خلیے، سالمے اور جوہر تک پہنچے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم اور آگے کہاں تک جائیں گے۔ اس سے بڑے نظام میں ہم نے نظام شمسی اور اس نظام کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں جس کا نظام شمسی ایک حصہ ہے اور جس کے وہ تابع ہے۔ اب ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ نظام

کس نظام کے تابع ہے اور اس سے آگے یہ سلسلہ کہاں تک چلتا ہے۔

اس لحاظ سے ہماری اور اس کائنات کی مثال اس کیڑے کی سی ہے جو کسی سیب یا کسی لکڑی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی دنیا اور اس کے زمین و آسمان وہی پھل یا لکڑی ہیں۔ سیب کے کیڑے کو معلوم نہیں کہ یہ سیب جزو ہے' اس نظام کا جس کا نام درخت ہے اور وہ درخت خود جزو ہے ایک اور بڑے نظام کا جس کا نام باغ ہے اور اس باغ کا کوئی مالی اور کوئی سرپرست ہے جس نے باغ لگایا ہے۔ پھر وہ باغ ایک دیہات کا حصہ ہے اور وہ دیہات ایک ملک کا حصہ ہے اور وہ ملک کرۂ ارض کا ایک حصہ ہے اور کرۂ ارض فضائے لامتناہی کا ایک بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے۔ یہی حال اس مکڑی کا ہے جو کسی کمرے کی چھت میں پیدا ہوتی ہے اور وہیں مر جاتی ہے۔ اسے قطعاً معلوم نہیں کہ یہ کمرہ ایک مکان کا جزو ہے اور وہ مکان ایک شہر کا جزو ہے اور شہر ایک ملک کا جزو ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

قدرتی طور پر انسان کی نسبت کیڑوں کا ادراک اور فہم بہت کم اور محدود ہے۔ انسان کے لیے جو بات بدیہی اور مسلّم ہے' وہ ان کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ مگر جس عالم میں انسان اپنی زندگی گزارتا ہے' اس سے بڑے عالموں کی نسبت اس کا بھی یہی حال ہے۔ رومی کہتے ہیں:

جو کیڑا لکڑی کے اندر پیدا ہوا ہے اسے اس وقت کا حال کیا معلوم جب یہ لکڑی ایک چھوٹا سا پودا تھی۔ جو مچھر موسم بہار میں باغ میں پیدا ہوا اور وہیں مر جائے گا' اس کو کیا معلوم باغ کس کا ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ گھر ناپائیدار ہے۔ مکڑی جو اس گھر میں رہتی ہے اسے کچھ خبر نہیں۔

یہ صورت تو ہے اس وسیع دنیا کی کہ ہمیں اس کے بارے میں بہت کم معلوم

ہے لیکن دوسری دنیائیں جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور ہماری زندگی کی تدبیر و تقدیر ان سے وابستہ ہے' ان کے بارے میں تو ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ ان کے مقابلے میں تو ہماری اس دنیا کو وہی نسبت ہے جو عالم خواب کو عالم بیداری سے۔

غزالی کی جو روحانی کایا پلٹ ہوئی تھی' اس کے ضمن میں انہوں نے بھی خواب ہی کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم خواب میں ایک دنیا دیکھتے ہیں لیکن اس حالت میں ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ دراصل یہ حالت بھی ہمارے نظام زندگی کا ایک حصہ ہے' گو اصل بیداری ہے۔ جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو ہمیں اس حالت کے جزوی ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ ہماری دنیوی زندگی دوسری زندگی کے مقابلے میں ایک خواب ہی ہے۔ ہمارا یہ یقین کہ دنیوی زندگی ہی اصل ہے' اس یقین سے زیادہ کچھ نہیں جو خواب دیکھنے والے کو خواب کی حالت میں ہوتا ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ جب ہم جاگتے ہیں اس وقت سمجھتے ہیں کہ دنیوی زندگی حقیقت نہیں تھی' محض خواب و خیال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی زندگی کے مقابلے میں یہ بے حقیقت ہے۔ کامل زندگی کے دو حصے ہیں۔ اس کا چھوٹا سا حصہ خواب ہے۔ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن اگر وسیع تر زندگی کا خیال کیا جائے تو یہ ایک خواب ہے۔

اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوا انْتَبَھُوا۔

لوگ خواب میں ہیں۔ مرنے کے بعد جاگتے ہیں۔

بقول رومی یہ دنیا سوتے ہوئے کا خواب ہے۔ سوتا ہوا شخص خواب ہی کو حقیقت سمجھتا ہے۔ جب موت آ پہنچتی ہے تب وہم و گمان کے اندھیرے دل

سے نجات ملتی ہے۔ اس دنیا میں خواب میں جو کچھ کیا تھا' جاگنے پر وہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَة

دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو ہم یہاں بوتے ہیں وہی وہاں کاٹتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے خیالی میں گیہوں کا کوئی دانہ آدمی کے ہاتھ سے گر کر مٹی میں گم ہو جاتا ہے۔ کسان گیہوں کو بھوسے سے جدا کرتا ہے اور بھوسے کو مٹی میں ملا کر لیپنے کے کام میں لے آتا ہے۔ اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس میں گیہوں کا کوئی دانہ بھی موجود ہے لیکن جب خریف کی فصل آتی ہے وہ دانہ جو نظر نہیں آ رہا تھا' خاک سے سر نکالتا ہے' اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ کہتا ہے: میں وہی ہوں جسے تو سمجھتا تھا کہ گم ہو گیا۔ یہاں کچھ گم نہیں ہوتا۔

قَالُوْا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا

(جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے سب اعمال لکھے ہوئے موجود ہیں تو) وہ کہیں گے کہ "یہ کیسی کتاب ہے کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی چیز چھوڑی ہے نہ بڑی' سب کو گنوا دیا ہے۔"

ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے تو یہ طے کرے کہ اس کے سوچنے اور سمجھنے کی حدود کیا ہیں' دونوں لحاظ سے' بحیثیت ایک انسان کے بھی اور ذاتی اور شخصی لحاظ سے بھی۔ اپنی قابلیت کا اندازہ لگانے کے بعد اس کی حدود میں رہتے ہوئے اگر وہ کسی چیز کی تصدیق یا تکذیب' اقرار یا انکار کرے گا تو اس وقت غلطی اور لغزش سے محفوظ رہے گا۔

عربی عبارات

اس کتاب کے متن میں بعض آیات واحادیث وغیرہ کا اردو ترجمہ لکھا گیا ہے
اور یہ نشان سے ؎ نمبر کے ساتھ دے دیا گیا ہے۔ ہم یہاں قارئین کی سہولت کے لیے
ان آیات واحادیث وغیرہ کی اصل عربی عبارت درج کر رہے ہیں:

؎۱ اَلْوِقَايَةُ حِفْظُ الشَّيْءِ مِمَّا يُؤْذِيهِ وَالتَّقْوٰى جَعْلُ النَّفْسِ
فِيْ وِقَايَةٍ مِمَّا يُخَافُ هٰذَا تَحْقِيقُهُ. ثُمَّ يُسَمَّى الْخَوْفُ
تَارَةً تَقْوٰى وَالتَّقْوٰى خَوْفًا حَسَبَ تَسْمِيَةِ مُقْتَضَى الشَّيْءِ
بِمُقْتَضِيْهِ وَالْمُقْتَضِيْ بِمُقْتَضَاهُ وَصَارَ التَّقْوٰى فِيْ عُرْفِ
الشَّرْعِ حِفْظُ النَّفْسِ مِمَّا يُؤْثِمُ وَذٰلِكَ بِتَرْكِ الْمَحْظُوْرِ.

؎۲ إِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ حَمَتْ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ مَحَارِمَهُ وَأَلْزَمَتْ قُلُوْبَهُمْ
مَخَافَتَهُ حَتّٰى أَسْهَرَتْ لَيَالِيَهُمْ وَأَظْمَأَتْ هَوَاجِرَهُمْ.

؎۳ ذِمَّتِيْ بِمَا أَقُوْلُ رَهِيْنَةٌ وَأَنَا بِهِ زَعِيْمٌ إِنَّ مَنْ صَرَّحَتْ لَهُ
الْعِبَرُ عَمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْمَثُلَاتِ حَجَزَتْهُ التَّقْوٰى عَنْ
تَقَحُّمِ الشُّبُهَاتِ.

؎۴ أَلَا وَإِنَّ الْخَطَايَا خَيْلٌ شُمُسٌ حُمِلَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا وَخُلِعَتْ
لُجُمُهَا فَتَقَحَّمَتْ بِهِمْ فِي النَّارِ. أَلَا وَإِنَّ التَّقْوٰى مَطَايَا
ذُلُلٌ حُمِلَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا وَأُعْطُوا أَزِمَّتَهَا فَأَوْرَدَتْهُمُ الْجَنَّةَ.

٥ إِنَّ التَّقْوَى دَارُ حِصْنٍ عَزِيزٍ وَالْفُجُورُ دَارُ حِصْنٍ ذَلِيلٍ لَا يَمْنَعُ أَهْلَهُ وَلَا يُحْرِزُ مَنْ لَجَأَ إِلَيْهِ.

٦ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ.

٧ فَإِنَّ تَقْوَى اللَّهِ مِفْتَاحُ سَدَادٍ وَذَخِيرَةُ مَعَادٍ وَعِتْقٌ مِنْ كُلِّ مَلَكَةٍ وَنَجَاةٌ مِنْ كُلِّ هَلَكَةٍ بِهَا يَنْجَحُ الطَّالِبُ وَيَنْجُو الْهَارِبُ وَتُنَالُ الرَّغَائِبُ.

٨ أُوصِيكُمْ عِبَادَ اللَّهِ بِتَقْوَى اللَّهِ فَإِنَّهَا حَقُّ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَالْمُوجِبَةُ عَلَى اللَّهِ حَقَّكُمْ وَأَنْ تَسْتَعِينُوا عَلَيْهَا بِاللَّهِ وَتَسْتَعِينُوا بِهَا عَلَى اللَّهِ.

٩ دَوَاءُ دَاءِ قُلُوبِكُمْ وَشِفَاءُ مَرَضِ أَجْسَادِكُمْ وَصَلَاحُ فَسَادِ صُدُورِكُمْ وَطُهُورُ دَنَسِ أَنْفُسِكُمْ.

١٠ مَا أَخْلَصَ الْعَبْدُ الْإِيمَانَ بِاللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، أَوْ قَالَ مَا أَجْمَلَ عَبْدٌ ذِكْرَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ أَرْبَعِينَ يَوْمًا إِلَّا زَهَّدَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي الدُّنْيَا وَبَصَّرَهُ دَاءَهَا وَدَوَاءَهَا فَأَثْبَتَ الْحِكْمَةَ فِي قَلْبِهِ وَأَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهُ.

١١ لَوْلَا أَنَّ الشَّيَاطِينَ يَحُومُونَ حَوْلَ قُلُوبِ بَنِي آدَمَ لَنَظَرُوا إِلَى مَلَكُوتِ السَّمٰوَاتِ.

١٢ الْهَوَى عَدُوُّ الْعَقْلِ.

١٣ قَدْ أَحْيَى عَقْلَهُ وَأَمَاتَ نَفْسَهُ حَتَّى دَقَّ جَلِيلُهُ وَلَطُفَ غَلِيظُهُ وَبَرَقَ لَهُ لَامِعٌ كَثِيرُ الْبَرْقِ فَأَبَانَ لَهُ الطَّرِيقَ وَسَلَكَ بِهِ

السَّبِيلَ فَقَدْ فُتِحَتْ لَهُ الْأَبْوَابُ إِلَى بَابِ السَّلَامَةِ.

٤٤ه فَمَنْ أَخَذَ بِالتَّقْوَىٰ عَزَبَتْ عَنْهُ الشَّدَائِدُ بَعْدَ دُنُوِّهَا وَ
احْلَوْلَتْ لَهُ الْأُمُورُ بَعْدَ مَرَارَتِهَا وَانْفَرَجَتْ عَنْهُ الْأَمْوَاجُ
بَعْدَ تَرَاكُمِهَا وَأَسْهَلَتْ لَهُ الصِّعَابُ بَعْدَ إِنْصَابِهَا.

٤٥ه يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ
فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ.

٤٦ه قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ
جَاهِلُونَ.

٤٧ه قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ.

٤٨ه قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا.

٤٩ه فَكِدْ كَيْدَكَ وَاسْعَ سَعْيَكَ وَنَاصِبْ جُهْدَكَ فَوَاللّٰهِ لَا تَمْحُو
ذِكْرَنَا وَلَا تُمِيتُ وَحْيَنَا وَلَا تُدْرِكُ أَمَدَنَا وَلَا تَرْحَضُ عَنْكَ
عَارَهَا.

٣٠ه وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ
الزَّكٰوةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ.

٣١ه بِهَا تُقَامُ الْفَرَائِضُ وَتَأْمَنُ الْمَذَاهِبُ وَتَحِلُّ الْمَكَاسِبُ وَ
تُرَدُّ الْمَظَالِمُ وَتُعْمَرُ الْأَرْضُ وَيُنْتَصَفُ مِنَ الْأَعْدَاءِ وَيَسْتَقِيمُ
الْأَمْرُ.

٣٢ه بِهَا تُقَامُ الْفَرَائِضُ وَتَأْمَنُ الْمَذَاهِبُ وَتَحِلُّ الْمَكَاسِبُ وَتُرَدُّ

الْمَظَالِمُ وَتَعْمُرُ الْأَرْضُ وَيُنْتَصَفُ مِنَ الْأَعْدَاءِ وَيَسْتَقِيمُ الْأَمْرُ

٢٣ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ يَكُونُ بِالْيَدِ وَاللِّسَانِ فَأَمَّا بِالْيَدِ فَهُوَ أَنْ
يَفْعَلَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَجْتَنِبَ الْمُنْكَرَ عَلَى وَجْهٍ يَتَأَسَّى بِهِ النَّاسُ.

٢٤ وَأَمَّا بِاللِّسَانِ فَهُوَ أَنْ يَدْعُوَ النَّاسَ إِلَى الْمَعْرُوفِ وَيَعِدَهُمْ
عَلَى فِعْلِهِ الْمَدْحَ وَالثَّوَابَ وَيَزْجُرَهُمْ وَيُحَذِّرَهُمْ فِي
الْإِخْلَالِ بِهِ مِنَ الْعِقَابِ.

٢٥ وَقَدْ يَكُونُ الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ بِالْيَدِ بِأَنْ يَحْمِلَ النَّاسَ عَلَى ذٰلِكَ
بِالتَّأْدِيبِ وَالرَّدْعِ وَقَتْلِ النُّفُوسِ وَالْإِضْرَارِ بِهَا مِنَ الْجِرَاحَاتِ
إِلَّا أَنَّ هٰذَا الضَّرْبَ لَا يَجِبُ فِعْلُهُ إِلَّا بِإِذْنِ سُلْطَانِ الْوَقْتِ
الْمَنْصُوبِ لِلرِّئَاسَةِ.

٢٦ نَعَمْ مِنْ أَعْظَمِ أَفْرَادِ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَأَعْلَاهَا وَأَتْقَنِهَا وَأَشَدِّهَا تَأْثِيرًا خُصُوصًا بِالنِّسْبَةِ إِلَى رُؤَسَاءِ
الدِّينِ هُوَ أَنْ يَلْبَسَ رِدَاءَ الْمَعْرُوفِ وَاجِبَهُ وَمَنْدُوبَهُ وَيَنْزِعَ
رِدَاءَ الْمُنْكَرِ مُحَرَّمَهُ وَمَكْرُوهَهُ وَيَسْتَكْمِلَ نَفْسَهُ بِالْأَخْلَاقِ
الْكَرِيمَةِ وَيُنَزِّهَهَا عَنِ الْأَخْلَاقِ الذَّمِيمَةِ.

٢٧ فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْهُ سَبَبٌ تَامٌّ لِفِعْلِ النَّاسِ الْمَعْرُوفَ وَنَزْعِهِمُ
الْمُنْكَرَ خُصُوصًا إِذَا أَكْمَلَ ذٰلِكَ بِالْمَوَاعِظِ الْحَسَنَةِ الْمُرَغِّبَةِ
وَالْمُرَهِّبَةِ فَإِنَّ لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالًا وَلِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً وَطِبُّ النُّفُوسِ
وَالْعُقُولِ أَشَدُّ مِنْ طِبِّ الْأَبْدَانِ.

٢٨ نَسْأَلُ التَّوْفِيقَ لِهٰذِهِ الْمَرَاتِبِ.

٢٩ مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ إِمَامًا فَلْيَبْدَأْ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ

غَيْرِهِ وَلْيَكُنْ تَأْدِيبُهُ بِسِيرَتِهِ قَبْلَ تَأْدِيبِهِ بِلِسَانِهِ وَمُعَلِّمُ
نَفْسِهِ وَمُؤَدِّبُهَا أَحَقُّ بِالْإِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَمُؤَدِّبِهِمْ.

۳۰ھ أَجْهَدُ بِرَأْيِي.

۳۱ھ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا.

۳۲ھ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ
بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ.

۳۳ھ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا
يُحْيِيكُمْ.

۳۴ھ أَعْلَانَا مُرْجِئٌ وَأَسْفَلُنَا مُرْجِئٌ.

۳۵ھ لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا.

۳۶ھ الْعَدْلُ يَضَعُ الْأُمُورَ مَوَاضِعَهَا وَالْجُودُ يُخْرِجُهَا مِنْ جِهَتِهَا.

۳۷ھ وَاجْعَلْ لِذَوِي الْحَاجَاتِ مِنْكَ قِسْمًا تُفَرِّغُ لَهُمْ فِيهِ شَخْصَكَ
وَتَجْلِسُ لَهُمْ مَجْلِسًا عَامًّا فَتَتَوَاضَعُ فِيهِ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَكَ
وَتُقْعِدُ عَنْهُمْ جُنْدَكَ وَأَعْوَانَكَ مِنْ أَحْرَاسِكَ وَشُرَطِكَ حَتَّى
يُكَلِّمَكَ مُتَكَلِّمُهُمْ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ يَقُولُ: فِي غَيْرِ مَوْطِنٍ، لَنْ تُقَدَّسَ أُمَّةٌ
حَتَّى يُؤْخَذَ لِلضَّعِيفِ فِيهَا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ.

۳۸ھ إِعْطَاءُ كُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ.

۳۹ھ أَمَّا بَعْدُ، فَوَاللَّهِ مَا يَنْبَغِي لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ بِالرَّحْمٰنِ وَيُنِيبُونَ
إِلَى حُكْمِ الْقُرْآنِ أَنْ تَكُونَ هٰذِهِ الدُّنْيَا آثَرَ عِنْدَهُ بِالْمَعْرُوفِ
وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْقَوْلِ بِالْحَقِّ وَإِنَّ مَنْ وَصَلَ فَإِنَّهُ مِنْ

يُمْنٌ وَبَصَرٌ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا فَإِنَّ ثَوَابَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رِضْوَانُ
اللهِ وَالْخُلُودُ فِي جَنَّاتِهِ فَأَخْرِجُوا إِخْوَانَنَا مِنْ هٰذِهِ الْمَظَالِمِ
الظَّالِمِ أَهْلُهَا إِلَى بَعْضِ كُوَرِ الْجِبَالِ أَوْ إِلَى بَعْضِ هٰذِهِ
الْمَدَائِنِ مُنْكِرِينَ لِهٰذِهِ الْبِدَعِ الْمُضِلَّةِ.

ــه أَنْشَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ. أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ.

ــه وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا.

ــه صِفْ لِي عَلِيًّا.

ــه كَانَ وَاللهِ بَعِيدَ الْمَدَى شَدِيدَ الْقُوَى يَقُولُ عَدْلًا وَ
يَحْكُمُ فَصْلًا تَتَفَجَّرُ الْحِكْمَةُ مِنْ جَوَانِبِهِ وَالْعِلْمُ مِنْ
نَوَاحِيهِ يَسْتَوْحِشُ مِنَ الدُّنْيَا وَزَهْرَتِهَا وَيَسْتَأْنِسُ بِاللَّيْلِ
وَوَحْشَتِهِ وَكَانَ وَاللهِ غَزِيرَ الدَّمْعَةِ طَوِيلَ الْفِكْرَةِ يُحَاسِبُ
نَفْسَهُ إِذَا خَلَا وَيُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَى مَا مَضَى وَكَانَ فِينَا كَأَحَدِنَا
يُجِيبُنَا إِذَا سَأَلْنَاهُ وَيُدْنِينَا إِذَا أَتَيْنَاهُ وَنَحْنُ مَعَ
تَقْرِيبِهِ لَنَا وَقُرْبِهِ مِنَّا لَا نُكَلِّمُهُ لِهَيْبَتِهِ وَلَا نَرْفَعُ أَعْيُنَنَا
إِلَيْهِ لِعَظَمَتِهِ. فَإِذَا تَبَسَّمَ فَعَنْ مِثْلِ اللُّؤْلُؤِ الْمَنْظُومِ يُعَظِّمُ
أَهْلَ الدِّينِ وَيَتَحَبَّبُ إِلَى الْمَسَاكِينِ لَا يَخَافُ الْقَوِيُّ
ظُلْمَهُ وَلَا يَيْأَسُ الضَّعِيفُ مِنْ عَدْلِهِ فَأُقْسِمُ لَقَدْ رَأَيْتُهُ
لَيْلَةً وَقَدْ مَثَلَ فِي مِحْرَابِهِ وَأَرْخَى اللَّيْلُ سِرْبَالَهُ وَدُمُوعُهُ
تَتَحَادَرُ عَلَى لِحْيَتِهِ وَهُوَ يَتَمَلْمَلُ تَمَلْمُلَ السَّلِيمِ وَيَبْكِي
بُكَاءَ الْحَزِينِ فَكَأَنِّي الْآنَ أَسْمَعُهُ وَهُوَ يَقُولُ: يَا دُنْيَا إِلَيَّ
تَعَرَّضْتِ أَمْ إِلَيَّ أَقْبَلْتِ؟ ...... قَالَ فَوَكَفَتْ عَيْنَا مُعَاوِيَةَ

وَجَعَلَ يَشُمُّهَا بِكُمِّهِ ثُمَّ قَالَ ، رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا الْحَسَنِ كَانَ كَذٰلِكَ فَكَيْفَ صَبْرُكَ عَنْهُ ؟ قَالَ كَصَبْرِ مَنْ ذُبِحَ وَلَدُهَا فِىْ حِجْرِهَا فَهِىَ لَا تَرْقَأُ دَمْعَتُهَا وَلَا تَسْكُنُ عَبْرَتُهَا .

٤٣ كَمْ عَاقِلٍ عَاقِلٍ أَعْيَتْ مَذَاهِبُهُ
وَجَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلْقَيْهِ مَرْزُوْقًا

٤٤ يَا بُنَىَّ إِنِّىْ أَخَافُ عَلَيْكَ الْفَقْرَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ فَإِنَّهُ مَنْقَصَةٌ لِلدِّيْنِ مُدْهِشَةٌ لِلْعَقْلِ دَاعِيَةٌ لِلْمَقْتِ .

٤٥ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ .

٤٦ لَا يَمْلِكُ لِنَفْسِهِ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَلَا نُشُوْرًا .

٤٧ وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهِ حَتّٰى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ .

٤٨ اُنْظُرُوْا إِلَى النَّمْلَةِ فِىْ صِغَرِ جُثَّتِهَا وَلَطَافَةِ هَيْئَتِهَا لَا تَكَادُ تُنَالُ بِلَحْظِ الْبَصَرِ وَلَا بِمُسْتَدْرَكِ الْفِكْرِ كَيْفَ دَبَّتْ عَلٰى أَرْضِهَا وَصُبَّتْ عَلٰى رِزْقِهَا تَنْقُلُ الْحَبَّةَ إِلٰى جُحْرِهَا وَتُعِدُّهَا فِىْ مُسْتَقَرِّهَا تَجْمَعُ فِىْ حَرِّهَا لِبَرْدِهَا وَفِىْ وُرُوْدِهَا لِصَدَرِهَا .

٤٩ مَنْ غَرِقَ فِىْ بَحْرِ الْمَعْرِفَةِ لَمْ يَقَعْ فِىْ شَطٍّ وَمَنْ تَعَلّٰى إِلٰى ذُرْوَةِ الْحَقِيْقَةِ لَمْ يَخَفْ مِنْ حَطٍّ .

٥٠ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَىَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِىْ إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّىْ كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ فَاسْتَجَابَ لَهُ

رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ
مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ.

وَالشَّمْسُ لَوْلَا أَنَّهَا مَحْجُوبَةٌ
عَنْ نَاظِرَيْكَ لَمَا أَضَاءَ الْفَرْقَدُ
وَالنَّارُ فِي أَحْجَارِهَا مَخْبُوءَةٌ
لَا تَصْطَلِي إِنْ لَمْ تُثِرْهَا الْأَزْنُدُ
وَالْحَبْسُ مَا لَمْ تَغْشَهُ لِدَنِيَّةٍ
شَنْعَاءَ نِعْمَ الْمَنْزِلُ الْمُسْتَوْرَدُ

فَقُلْتُ لَهَا وَالدَّمْعُ شَتَّى طَرِيقُهُ
وَنَارُ الْهَوَىٰ فِي الْقَلْبِ يُذْكَىٰ وَقُودُهَا
فَلَا تَجْزَعِي إِمَّا رَأَيْتِ قُيُودَهُ
فَإِنَّ خَلَاخِيلَ الرِّجَالِ قُيُودُهَا

لَوْلَا اشْتِعَالُ النَّارِ فِي مَا جَاوَرَتْ
مَا كَانَ يُعْرَفُ طِيبُ عَرْفِ الْعُودِ

أَيْ فُلَانُ اتَّقِ اللهَ وَقُلِ الْحَقَّ وَإِنْ كَانَ فِيهِ هَلَاكُكَ وَإِنَّ
فِيهِ نَجَاتُكَ وَدَعِ الْبَاطِلَ وَإِنْ كَانَ فِيهِ نَجَاتُكَ فَإِنَّ فِيهِ
هَلَاكُكَ.

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَىٰ مُوسَى بْنِ جَعْفَرٍ وَصِيِّ الْأَبْرَارِ وَإِمَامِ الْأَخْيَارِ
وَعَيْبَةِ الْأَنْوَارِ وَوَارِثِ السَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ وَالْحِكَمِ وَالْآثَارِ
الَّذِي يُحْيِي اللَّيْلَ بِالسَّهَرِ بِمُوَاصَلَةِ الْاِسْتِغْفَارِ.

٥٥ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتْنَةِ .

٥٦ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَخْتَبِرُ عِبَادَهٗ بِاَنْوَاعِ الشَّدَائِدِ وَيَتَعَبَّدُهُمْ بِاَنْوَاعِ
الْمَجَاهِدِ وَيَبْتَلِيْهِمْ بِضُرُوْبِ الْمَكَارِهِ اِخْرَاجًا لِلتَّكَبُّرِ
مِنْ قُلُوْبِهِمْ وَاِسْكَانًا لِلتَّذَلُّلِ فِيْ نُفُوْسِهِمْ وَلِيَجْعَلَ ذٰلِكَ
اَبْوَابًا فُتُحًا اِلٰى فَضْلِهٖ وَاَسْبَابًا ذُلُلًا اِلٰى عَفْوِهٖ .

٥٧ مَنِ اسْتَحْكَمَتْ لِيْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْ خِصَالِ الْخَيْرِ احْتَمَلْتُهٗ
عَلَيْهَا وَاغْتَفَرْتُ فَقْدَ مَا سِوَاهَا ، وَلَا اَغْتَفِرُ فَقْدَ عَقْلٍ وَلَا
دِيْنٍ لِاَنَّ مُفَارَقَةَ الدِّيْنِ مُفَارَقَةُ الْاَمْنِ فَلَا يَتَهَنَّأُ بِحَيَاةٍ مَعَ
مَخَافَةٍ وَفَقْدُ الْحَيَاةِ وَلَا يُقَاسُ اِلَّا بِالْاَمْوَاتِ .

٥٨ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ .

٥٩ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَجِدُ سُبُلَ الْمَطَالِبِ اِلَيْكَ مُشْرَعَةً وَّمَنَاهِلَ
الرَّجَاءِ لَدَيْكَ مُتْرَعَةً وَّالْاِسْتِعَانَةَ بِفَضْلِكَ لِمَنْ اَمَّلَكَ مُبَاحَةً
وَّاَبْوَابَ الدُّعَاءِ اِلَيْكَ لِلصَّارِخِيْنَ مَفْتُوْحَةً وَّاَعْلَمُ اَنَّكَ
لِلرَّاجِيْنَ بِمَوْضِعِ اِجَابَةٍ وَّلِلْمَلْهُوْفِيْنَ بِمَرْصَدِ اِغَاثَةٍ وَّاَنَّ
فِي اللَّهْفِ اِلٰى جُوْدِكَ وَالرِّضَا بِقَضَائِكَ عِوَضًا مِّنْ مَّنْعِ الْبَاخِلِيْنَ
وَمَنْدُوْحَةً عَمَّا فِيْ اَيْدِي الْمُسْتَاْثِرِيْنَ وَاَنَّ الرَّاحِلَ اِلَيْكَ
قَرِيْبُ الْمَسَافَةِ وَاَنَّكَ لَا تَحْتَجِبُ عَنْ خَلْقِكَ اِلَّا اَنْ تَحْجُبَهُمُ
الْاٰمَالُ دُوْنَكَ .

٦٠ وَلَوْ ضَرَبْتَ فِيْ مَذَاهِبِ فِكْرِكَ لِتَبْلُغَ غَايَاتِهٖ مَا دَلَّتْكَ الدَّلَالَةُ